خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

فروری 2012

نگران اعلیٰ

معراج رسول

سسپنس ڈائجسٹ
مدیر اعلیٰ: عذرا رسول

جلد 41 • شمارہ 02 فروری 2012 • زرسالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے •
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

انشائیہ

مخول!

جون ایلیا

زمانے کا بھٹکایا ہوا ایک مسافر، ایک عام سا مسافر، ایک عام سا راہ گیر اپنے آپ کو شاہ جہاں آباد کی جنوبی سمت سے شمال کی طرف گھسیٹنے کی حالت میں ہانپ رہا ہے، ہانپ رہا ہے اور اپنے آپ کو گھسیٹ رہا ہے۔ وہ اس راستے میں اپنے آپ ہی کو نہیں گھسیٹ رہا، اپنے ماضی اور اپنی تاریخ کی یادوں کو بھی گھسیٹ رہا ہے۔ فقط وہی نہیں ہانپ رہا، اس کے ساتھ اس کی تاریخ کی یادیں بھی ہانپ رہی ہیں۔

اس وقت نہ دن کا پہلا پہر ہے، نہ دوسرا، نہ تیسرا پہر ہے نہ چوتھا۔ اور نہ رات کا پہلا پہر ہے اور نہ دوسرا...... بس وقت ہے جو بہہ رہا ہے اور بہے جا رہا ہے۔ ہر لمحہ آغاز اور ہر لمحہ انجام۔

وقت کا بھٹکایا ہوا مسافر اب ایک چوراہے سے گزر رہا ہے اور لمحہ لمحہ بکھر رہا ہے۔ لمحہ لمحہ بکھر رہا ہے اور گزر رہا ہے۔ گزرتے جاؤ اور بکھرتے جاؤ۔ اپنے ہونے کا رنگ رچاؤ اور اپنے ہونے کے ساتھ اپنے سکوں بخش نہ ہونے کا سوگ مناؤ۔

اب وہ اپنے آپ کو ایک سنگی دروازے کے روبرو پاتا ہے اور اس کا جگر خون ہو جاتا ہے۔ وہ خوں ریز دھماکوں کی آواز سنتا ہے اور 1857ء کے کسی مہینے کے کسی دن لہولہان ہو جاتا ہے اور دم توڑ دیتا ہے۔

"کہاں لہولہان ہو جاتا ہے، کہاں دم توڑ دیتا ہے؟" میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں اور پھر اپنے آپ کو جواب دیتا ہوں۔

"خونی دروازے کے سامنے۔"

زمانے کا بھٹکایا ہوا مسافر دم توڑتے ہوئے ایک خوں چکاں ہنسی ہنستا ہے، ایک فالتو، ایک فضول اور ایک یکسر رائگاں ہنسی اور پھر سانس لینے لگتا ہے اور جینے کا عذاب سہنے لگتا ہے۔ ازاں بعد وہ پتھر کی طرح ساکت اور صامت کھڑا رہ جاتا ہے۔ اس پر ایک بے غیرت بے حسی مسلط ہو جاتی ہے پھر وہ اپنے آپ کو آگے کی طرف گھسیٹتا ہے۔ آگے کی طرف گھسیٹتا ہے اور ایک بار کی نظر اٹھاتا ہے تو اپنے آپ کو دلی دروازے کے روبرو پاتا ہے۔

"نگاہ روبرو، نگاہ روبرو" 17 ویں اور 18 ویں صدی کی مؤدبانہ آواز وقت کے گنبد میں گونجتی ہے اور ہاں، 19 ویں صدی کے سینے کی زخم خوردہ اور ہزیمت نصیب آواز بھی۔

مسافر کا سر تعظیم اور تکریم سے جھک جاتا ہے۔ تاریخ کی تعظیم اور تکریم اور تاریخی تعظیم اور تکریم سے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھی جائے کہ مسافر مذکور شاہوں اور کج کلاہوں کے تخت و تاج کو بری طرح روندتا چلا آیا ہے۔

مسافر اپنا بایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کورنش بجالاتا ہے۔ اسی اثنا میں ایک آواز اس کے دل میں گونجتی ہے۔ "اور بستی نہیں یہ دلی ہے" اور پھر ایک اور آواز "دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے" اس آواز میں ایک اور آواز گڈمڈ ہو جاتی ہے "دلی، دلی ہائے دلی بھاڑ میں جائے دلی" پھر یہ آوازیں ایک اور آواز کے آہنگ سے اور بھی گھنی ہو جاتی ہیں "سواد رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے۔"

مسافر کے پیر شل ہو چکے ہیں پھر بھی وہ اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے...... بہ صد اشتیاق اور بہ صد اذیت آگے بڑھ رہا ہے۔ فیض بازار (دریا گنج) کی طرف۔ وہ بری طرح ہلکان ہے پر آگے تو جانا ہے، پیروں کو چھالوں سے تو سجانا ہے۔ سو وہ اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا آگے جا رہا ہے کہ اس زندیق، اس دوزخی کی نظر تاریخ کی ایک مقدس سربلندی، شاہ جہانی مسجد کی دید سے شرف اندوز ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس مسجد میں ماہِ رمضان کے آخری جمعے کی نماز ادا کرنے کا ثواب حج کے ثواب کے برابر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس کی نگاہ میں دھند پھیل جاتی ہے۔ دھند اور وقت، خیال کا وقت، یاد کا وقت اور تاریخ کا وقت۔ لمحے سسک رہے ہیں اور مر رہے ہیں اور وقت ماضی میں گزرتا چلا جا رہا ہے۔

شاہ جہانی مسجد کے حوض پر غنی کاشمیری اور ناصر علی بیٹھے ہوئے باہم سخن کر رہے ہیں اور مسافر اپنے لڑکپن کے زمانے میں اپنے گمان کے مطابق ان دونوں کے برابر بیٹھا ہے کہ اتنے میں شعلے کی طرح بھڑکتا ہوا ایک قامت، ایک مرد قلندر، ایک شاعر سویدائے سرمد عالمِ برہنگی میں ہاؤ ہو کرتا ہوا مسجد کے شمالی دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ غنی کاشمیری اور ناصر علی یکبارگی گنگ ہو جاتے ہیں اور پھر...... اور پھر احترام اور تعظیم کی حالت میں گویا ہوتے ہیں۔

"سرمد، آغا جان چہ گونہ ای، چہ حالت است۔ کیا حال ہے کیا حالت ہے؟"......

✣ ✣ ✣

آپ کے خط

عزیز قارئین!

تسلیمات

آپ کے من پسند جریدہ سسپنس، فروری 2012ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔ نیا سال صرف ہندسوں کی حد تک بدلا ہے...... ورنہ حال میں تبدیلی ہے، نہ چال میں البتہ چالبازوں کے لیے در کھلتے جارہے ہیں۔ بجلی اور گیس کا بحران گزرے ہوئے سال میں سنگین سے سنگین تر ہو چکا ہے۔ اس گھور اندھیرے میں تھر کے صحرا سے روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی ہے...... کاش کہ یہ کرن ہماری صنعتوں اور رہائش گاہوں کو منور کرنے کا پیغام بن جائے۔ ڈاکٹر ثمر مبارک مند کی کوششوں کا ثمر نتیجہ خیز ہوتا نظر آرہا ہے۔ رب العزت سے دعا ہے کہ ہمارے حکمراں ان منصوبوں کے لیے بلا تاخیر اور مطلوبہ مقدار میں مالی معاونت فراہم کردیں تاکہ سرد اندھیاروں میں ٹھٹھرتی ہوئی قوم کو توانائی کی حرارت میسر آسکے۔ ویسے بھی فروری میں ربیع الاول کی آمد ہے۔ آقائے دو عالم، رحمۃ اللعالمین کی ولادت باسعادت کی یاد میں ہر مسلمان کے دل میں ایمان کی حرارت تیز تر ہو جاتی ہے۔ کاش یہ حدت ہمارے سیاہ و سفید کے مالکوں کے دلوں کو بھی گرمادے اور وہ ایمان داری و انصاف کو اپنا شعار بنالیں...... اس شمارے میں اناڑی کی آخری قسط پیش کی جارہی ہے، اگلے ماہ سے آپ نئی سلسلے وار کہانی مسافر سے لطف اندوز ہوں گے اور اب چلتے ہیں...... اپنے ''محبوب نامے'' کی جانب مگر...... آپ کے ساتھ۔

✠ **محمد جاوید بلوچ،** تحصیل علی پور سے محفل میں تشریف لائے ہیں ''انکل ذاکر یہ کیا......؟ لبوں کے ساتھ ساتھ ٹائٹل گرل کے دانت بھی لہو رنگ بنا ڈالے۔ (واہ کیا نگاہ ہے آپ کی۔ ذاکر صاحب نے لپ اسٹک کا شیڈ دانتوں پر کیا بنایا آپ نے اسے لہو رنگ قرار دے دیا) کوئی بات نہیں بڑے بڑے لوگوں سے چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں (بالکل درست) چند ماہ پہلے کسی بک اسٹال سے چند پرانے سسپنس ڈائجسٹ خریدے جن میں دو شمارے مئی، اگست 1979ء کے تھے۔ مئی 1993ء جس میں خطوط کی تعداد 61، آؤٹ لسٹ 32 نام شمار کیے۔ اپریل 1986ء میں ان لسٹ خطوط کی تعداد 64 آؤٹ لسٹ کم و بیش 200 نام شمار کیے تو حیرت سے گنگ ہو کے رہ گیا۔ کشکول میں شیخ حامد نے چارلی اور اس کی نوخیز محبوبہ کو حد درجہ خطرناک، جان لیوا اور شرمناک سزا دی۔ ارضی شیطان شیخ حامد کا انجام بھی یادگار ہونا چاہیے۔ آخری سانسیں لیتی ہوئی اناڑی اس بار بھی فاسٹ ہی رہی۔ دلاور، نواب رفیق کے لیے تو لوہے کا چنا ثابت ہو رہا ہے۔ ڈیتھ مین رانا حبیب کو منظر سے بالکل غائب کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید ناجائز تعلقات کی تباہ کاریوں پر مشتمل تحفۂ خاص لے کر آئے۔ بے باک جنریشن کے لیے یہ نیا دور نیا خاندان بہترین نصیحت ہے۔ منظر امام کی قطعہ کہانی کا سارا انچ قطعہ میں تھا۔ محترم نے آخر تک عنوان کے حوالے سے سسپنس قائم کیے رکھا۔ عشق لاحاصل نے شاید فراز کو کنگلا کر کے ہی چھوڑا۔ بابر نعیم کی کہانی تحفہ میں مغربی جوڑے کی محبت نے حیرت کی حد تک متاثر کیا۔ اسٹوری سے ثابت ہوا کہ مغرب میں بھی مشرقی تہذیب کی علامات پائی جاتی ہیں۔ عکسِ ماضی میں رضوانہ منظر نام نہاد شرفا جن کے لباس رات کے اندھیروں میں ہیرا منڈی کی کوٹھیوں پر ننگے ملتے ہیں، کے منہ پر سے شرافت کا نقاب اتارنے میں کامیاب رہی ہیں۔ مختار آزاد کی رخصتی میں ساری زندگی خودداری کی زندگی جینے والے بشارت نے زمانے کی بے حسی اور اکلوتی بیٹی کی کورٹ میرج سے دلبرداشتہ ہو کر موت کو زندگی پر ترجیح دے دی۔ ایچ اقبال کی آخری رابطہ میں شاہانہ نے آخری فیصلہ کر کے درست اقدام کیا کہ کسی غیر مرد پر اعتبار کرنا عورت کے لیے سب سے بڑا جوا ہوتا ہے۔ کاشف زبیر کی جواری میں مارین کی سازش کو بان ہین نے ناکام کر کے مارین کو چالاکی سے دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ شعر و سخن کی محفل میں پہلا اور آخری شعر باقی اشعار سے زیادہ پسند آئے۔ مجرم چاہے کتنی ہی بے داغ پلاننگ کیوں نہ کرے اسے ایک نہ ایک دن قانون کی آہنی گرفت میں ضرور آنا ہوتا ہے، سلیم انور کی دام صیاد میں ایسا ہی کچھ حال چالاک جیمسن کے ساتھ ہوا۔ تنویر ریاض کی انوکھی دعا میں ایسا ہی کچھ حال موت کی پیامبر بیرل ایوانس کے ساتھ ہونے والا ہے۔ ثمر عباس کی انجام بخیر کا انجام بھی متاثر کن رہا۔ خالہ جی، یہ کیا...... صنف اولی اوئی کا صرف ایک خط......؟ جس طرح جنت عورت کے وجود سے ادھوری ہے، ٹھیک اسی طرح محفل میں قدرت کے اس شاہکار کی حاضری لازمی بنائیں۔ اس کے لیے چاہے ہمایوں سعید راج کا خط ہی بلیک لسٹ کیوں نہ کرنا پڑے۔ نعمان پیارے، آپ کا سوہنا من موہنا سا تبصرہ آپ کے نام کے دوسرے حصے کی طرح لگا۔ مبارک ہو محترمہ ملی کی بے سرو پا بات تما بنگلو کو دل پہ نہ لیتو۔ اس بے چاری کی عقل ہو یا دانت دونوں اپنی اپنی جگہ سے کھسکے ہوئے ہیں۔ سردار ظفر اقبال، لیجیے ادھر آپ نے یاد کیا اور ادھر آپ کی پہلی سانس کی طرح حاضر ہوگئے۔ ایم ڈبل اے بھائی آپ کو بھی نام چھپانے کا مرض لاحق ہے اور زیادتی یا شدت کسی بھی چیز کی ہو اچھی نہیں ہوتی۔ اتنا افسردہ نہ ہوں قدرت اللہ کے ریمارکس صرف مزاح کی حد تک تھے ورنہ محفل کا ہر قاری ایک دوسرے کو صدق دل سے یاد کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ تفسیر عباس آپ کی شاعری کے تو ہم مداح ہو چکے ہیں۔ محترمہ کالی بلی، ہمایوں سعید اپنا تبصرہ اپنے ذاتی دماغ اور قلم سے تحریر کرتے ہیں۔ حاجی محمد اسحاق انجم آپ کا تبصرہ چھوٹا سا مگر انتہائی جامع تھا۔ جنید نواز پہلی فرصت میں آپ اپنی بصارت اور بصیرت کا علاج کرائیں تاکہ آپ کو چڑیل اور سرورق کا فرق معلوم ہو سکے۔ محترم بابر عباس، آپ کے محبت نامے کا تمام محفل کو انتظار رہے گا۔''

✠ **راجا ثاقب نواز ثاقب،** رتی ٹبی، ساہیوال سے محفل میں تشریف لائے ہیں ''سالگرہ نمبر بکتے دسمبر کے آخر میں ملا۔ (راجا صاحب، خیریت تو ہے یہ دسمبر کیوں بہک رہا ہے) سرورق پر لرزتی شمع بھی نمایاں ہے۔ تھرتھراتی لو یہ گواہی دیتی ہے کہ دسمبر ڈوب جانے کو ہے۔ دعا ہے کہ نئے سال میں ارضِ پاکستان دنیا کے نقشے پر جگمگاتا رہے (ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا) جون ایلیا جی نے قانون اور قانون کی پاسداری جیسے مشکل الفاظ کے مطلب کو کتنی آسانی سے سمجھا دیا۔ خیالات کی محفل میں محمد نعمان پیارے حق صدارت ادا کرتے ہوئے نظر آئے۔ سردار ظفر اقبال وڑائچ محمد قدرت اللہ نیازی محمد

جاوید بلوچ اور امتیاز چوہدری نمایاں لگے۔ تاریخی کہانی ظہیر الدین بابر کے رموز سلطنت کو بے نقاب کرتی نظر آئی۔ جواری میں مارین اپنی زندگی کا سب سے بڑا جوا ہار گیا مگر بدلے میں اس کی جان بخش دی گئی۔ قطعہ کہانی میں منظر امام جی نے بڑے ہی دلچسپ پیرائے میں موجودہ دور کی محبت کو بیان کیا ہے۔ دام صیاد میں جیمسن آج تک جو گڑھا دوسروں کے لیے کھودتا چلا آرہا تھا آخر کو وہ اسی میں جا گرا۔ بیگ صاحب عدالتی بکھیڑوں میں پڑے بغیر پکا دھاگا میں کچی شادی کو پکا کرنے میں کامیاب رہے۔ رخصتی کا دل دہلا دینے والا انجام ہوا۔ نیا دور نیا خاندان، دل کی آنکھ سے پڑھی جانے کے قابل ہے۔ عکسِ ماضی، یادِ ماضی عذاب ہے یارب، کی عملی تفسیر لگی۔ پرائیویٹ سراغ رساں نے انجام بخیر میں بے وفائی کے حمام میں بے وفائی کرنے والوں کو بیچ بیچ ننگا کر دیا۔ انوکھی دعا میں مسیحائی کا انوکھا روپ سامنے آیا۔ اسلامی کہانی کے اگلے پہلو کا ابھی سے انتظار رہے گا۔ تحفہ میں ایلی تو ہو بہو مشرقی بیوی جیسی لگی۔ آخری رابطہ میں جذباتی فیصلوں اور قربانی کے درمیان جنگ جاری رہی، مگر کیا اس خوشگوار اختتام کے لیے اتنا خون بہا ضروری تھا اور پھر کیا اس انجام کو خوشگوار بھی کہا جاسکتا ہے؟ عرصہ دراز بعد خاکوں کو دوبارہ دیکھ کر اچھا لگا۔ اگر ہو سکے تو اس سلسلے کو جاری رہنا چاہیے۔ (شکریہ، کوشش کریں گے) سسپنس کے اندرونی صفحات سے سندیسہ ملا ہے کہ عنقریب ناصر ملک کے قلم سے ایک قسط وار کہانی مسافر شمارے کی زینت بننے جارہی ہے۔ صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ موجودہ قسط وار کہانیوں میں سے کسی ایک کا اختتام کر کے اس کی جگہ مسافر کو دی جائے گی یا پھر یہ نیا اضافہ ہوگی؟ (اس سوال کا جواب خطوط میں تلاش کریں) مجموعی طور پر سالگرہ نمبر اپنا بھرپور تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہا جس کے لیے آپ خصوصی طور پر اور سسپنس کی پوری ٹیم مجموعی طور پر دلی مبارکباد کی مستحق ہے۔'' (شکریہ)

✠ **ہمایوں سعید راج،** بنوں سے تبصرہ کر رہے ہیں ''ہم سوچنے کی زحمت کبھی کبھی فرماتے ہیں مگر ابھی سال کی طویل ترین رات کے دو بجے ہیں اور ہم سوچ رہے ہیں کہ ایسی کیا بات ہے کہ ہم نیند کی آغوش میں جانے کے بجائے سسپنس کو آغوش میں لیے ہوئے ہیں۔ یہ محفل کی کشش ہے یا کہانیوں کی جولانیاں یا پھر معراج انکل اور عذرا آنٹی کی زندگی کا حاصل جس نے مجھ جیسے غیر مستقل مزاج کو مستقل مزاج بنا دیا۔ نعمان پیارے نے بہت سی چیزیں لانگ کے کرسی تک رسائی حاصل کی۔ حبیب صاحب! کس ماہا کا ذکر فرمارہے ہیں آپ؟ ایم ڈبل اے صاحب! اب دل کی دنیا بدل گئی ہے یار، اب یہ گھڑی گھڑی متاثر نہیں ہوتا۔ جاوید بلوچ! میری ذات شریف پہ آپ نے اتنی تحقیق کی ہے کہ آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نہ نوازنا زیادتی ہوگی۔ آج تمہاری تنقید بھی بھلی لگ رہی ہے یار۔ قدرت اللہ صاحب! ایک دانا کا قول ہے کہ جو تم سے جیلس ہوتا ہے، اس کی قدر کرو کیونکہ وہ جیلس ہی اس لیے ہوتا ہے کہ تمہیں خود سے برتر سمجھتا ہے۔ رمضان پاشا! بلاشبہ آپ کو اور راجا ثاقب نواز ثاقب کو سب سے سپر تبصرہ نگار کا اعزاز حاصل ہے۔ عقل مند طاہرہ بی آغا صاحب نے صرف طنز فرمایا تھا، اصولاً آپ کو بھی طنزیہ جواب دینا چاہیے تھا۔ جنید صاحب! چونکہ تمہاری آنکھیں ٹائٹل گرل کو دیکھ کر چندھیا گئی تھیں اسی لیے محفل میں مجھے نہیں دیکھا۔ جعفر بھائی! میرا نفسیاتی مسئلہ یہ ہے کہ مجھے مشکل ٹارگٹ اچھے لگتے ہیں۔ اس بار سلسلے وار کہانیوں کو نہایت بے دلی سے پڑھا۔ کشکول بھی لیاقت کے گرد گھومنے کے بجائے کہیں اور نکل پڑی ہے۔ ایچ اقبال آخری صفحات پر شان سے براجمان تھے۔ آخری رابطہ بے حد متاثر کن رہی۔ اعجاز کا جنون حیران کن تھا۔ یہ ہوس انسان کو نہ جانے اور کتنا رسوا کرے گی۔ مختار آزاد کی رخصتی ملکی نظام کا احاطہ کرتی سنجیدہ کہانی تھی۔ کاشف زبیر کا جواری زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گیا۔ فطرت نے اسے موت کی دہلیز پہ لا کھڑا کیا تھا۔ قطعہ کہانی حقیقت سے کافی دور لگی۔ صرف ہولناک انسان کو اس نہج پہ نہیں پہنچاتی کہ وہ نوکری سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ نازک جذبات کی حامل تحفہ بھی خوب رہی۔ محبت انسان سے کچھ بھی کروا سکتی ہے۔ دام صیاد بھی قابل ذکر رہی۔ شکاری جب شکار سے ہزیمت اٹھاتا ہے تو مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ مرزا صاحب اس بار معمول سے ہٹ کر منفرد کہانی لائے۔ بیگ صاحب کی دانش مندی تھی کہ انہوں نے دونوں فریقین کے بیان سنے اور پھر اپنے انداز میں اس کی جانچ پڑتال کی۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی کہانی ہمیشہ کی طرح دل میں درد پیدا کرنے میں کامیاب رہی۔ ایک انسان کی لغزش نے پورے خاندان کو روند دیا۔''

✠ **محمد جواد بن اشرف،** تحصیل لیاقت پور سے چلے آرہے ہیں ''میں پہلی مرتبہ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ (خوش آمدید) اس مرتبہ [illegible] ایک خوبصورت لڑکی سے مزین تھا، یہ ذاکر انکل کا ہی کمال ہے۔ محفل دوستاں میں پہنچے تو نعمان پیارے کو کرسی صدارت پر پایا۔ [illegible] آپ کا تبصرہ بہت ہی اچھا تھا اس کے علاوہ ایم ڈبل اے اور محمد قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ اس مرتبہ ایک ہی صنف نازک تھی، [illegible] چھائے رہے۔ صنف نازک ڈر سے پتا نہیں کہاں چھپ گئی ہیں۔ ماہا ایمان، بلیک کیٹ، سعدیہ بخاری، سیدہ نسرین بھی غائب [illegible] کمی محسوس ہوئی۔ عبدالغفور خان آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی جنگ آزما پڑھی جس میں ایک بہن اپنے بھائی بابر [illegible] کو قربان کر دیتی ہے اگر وہ فیصلہ نہ لیتی تو بعد میں بھی یہی ہونا تھا۔ بابر کو اپنوں کی مخالفت نے نقصان پہنچایا۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی [illegible] میں مارین ہر خطرے سے بچنے کے باوجود آخر میں اپنی غلطی کی وجہ سے مر گیا۔ منظر امام کی قطعہ کہانی پڑھی جس میں شاہد، سرفراز اور حسن [illegible] میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور اپنی ساری دولت اس لڑکی پہ لٹا دیتا ہے۔ سلیم انور کی دام صیاد میں جیمسن نے مارتھا کو پھنسانے کی کوشش [illegible] یہی تھا۔ مرزا امجد بیگ کی پکا دھاگا پڑھی جس میں رئیس شاہ جادو ٹونہ وغیرہ کرتا ہے اور لوگوں کو لوٹتا ہے اور خاص طور پر [illegible] جس کی وجہ سے اس کی بیوی اس سے خفا ہو جاتی ہے اور بالآخر بیگ صاحب کی وجہ سے ان کی ازدواجی زندگی تباہ ہونے سے بچ [illegible] تحریر تھی، بہت اچھی لگی۔ نیا دور اور نیا خاندان جس میں شائستہ کا شوہر بے راہ روی کی وجہ سے ایڈز جیسی مہلک بیماری میں [illegible] جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ محفل شعر و سخن میں جنید نواز کا شعر بہت اچھا لگا۔ عکسِ ماضی میں کامران شامی کا رول بہت اچھا لگا۔ انجام [illegible] اس کے بعد اناڑی پڑھی جس میں رفیق شیرازی نے مشکلوں کے باوجود بہت ساری کامیابیاں حاصل کیں۔ اسلامی کہانی حضرت [illegible] اچھی تھی۔ آخری رابطہ کچھ خاص نہیں تھی۔ سب سے آخر میں کشکول پڑھی جس میں افضل خان سب بڑی مشکلوں سے بچ گیا۔ میڈم روبی نے بھی

خفیہ طور پر شیخ حامد سے خفیہ جنگ شروع کر دی۔ مجھے سراج اور لیاقت کے کردار بہت اچھے لگتے ہیں۔ خواجہ مدنی کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔" (اور آپ کے لکھے گئے خط کے کاغذ نے ہمیں حیرت میں ڈال دیا کیونکہ خواجہ مدنی صاحب نے بھی بالکل اسی طرح کے رائٹنگ پیڈ پر خط ارسال کیا ہے۔ آپ دونوں کی یہ مماثلت ہمیں تو حیران کر گئی)

✠ **محمد نعمان پیارے**، ایس اے گنگ، جھنگ سے تبصرہ فرما رہے ہیں "سسپنس "سالگرہ نمبر" 17 دسمبر کو وارد ہوا۔ ہاں! تو جی، سال 2011ء کا اختتام ہو چکا ہے، یہ سال بھی گزشتہ بیتے گئے سالوں کی طرح بہت سے سوال اپنے پیچھے چھوڑے جا رہا ہے کہ کب ہمارے پیارے پاکستان کے حالات سدھریں گے اور لوگوں کو انصاف کب ملے گا؟ خیر پھر بھی آپ سب کو میری طرف سے نیا سال 2012ء بہت بہت مبارک ہو۔ اس امید کے ساتھ کہ یہ سال گزرے سال سے بہتر بلکہ بہترین ہو۔ سرورق پر بجی حسینہ گہرا میک اپ کیے ہوئے تھی۔ جلتی ہوئی موم بتی کے شعلے سے لکھا ہوا "سال نو مبارک" جھلالگ رہا تھا، خوشبو لگا کے۔ لو جی، سردار ظفر صاحب! آپ نے کہا اور ہم حاضر ہو گئے، آپ کو میرے جیسا نوجوان فرمانبردار دوست کہیں نہیں ملے گا۔ ہمایوں سعید جی! آپ کو سدھرنے کا خیال اپنی عمر کی ساٹھ بہاریں دیکھنے کے بعد ہی کیوں آیا ہے؟ ڈاکٹر وسیم صاحب! سالگرہ بہت بہت مبارک ہو، گلے لگا کے.....! کاشف زبیر صاحب کی جواری عمدہ داستان تھی۔ مارسن نے پستول کی گولی کھانے کے بجائے دوسرے راستے کا جو کھیلا جو کارگر رہا۔ قسط وار کہانی کشکول مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی منزل کی جانب گامزن ہے، جوں جوں کہانی آگے بڑھ رہی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہی لیاقت حسین کی ذات اسرار و تحیر کے پردوں سے باہر چھلک رہی ہے۔ منظر امام کی قطعہ کہانی ایک سبق آموز کہانی تھی، اب بندہ عشق میں اتنا آگے بھی نہ نکل جائے کہ اس کو اپنا سب کچھ بیچنا پڑ جائے، دل لگا کے......! سلیم انور کی دام صیاد بالکل اپنے نام کی طرح تھی، مارتھا اور الزبتھ نے جیسن کو نہایت خوبصورتی سے ٹریپ کیا اور منشیات کے اسمگلر جیسن کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا، خوشبو لگا کے۔ مرزا امجد بیگ کی پکار دعا کا دلچسپ کاوش تھی۔ رئیس شاہ اور سلطانہ نے بروقت اور درست فیصلہ کر کے اپنا گھر ٹوٹنے سے بچا لیا، دماغ لگا کے۔ بختیار آزاد کی رخصتی ہمارے معاشرے کی بدعنوانیوں پر مشتمل ایک دل سوز کہانی تھی۔ ہمارا معاشرہ سلیم جیسے کرداروں سے بھرا پڑا ہے جو رشوت لیے بغیر کوئی کام نہیں کرتے اور بشارت جیسے غریبوں کے لیے خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کیونکہ رشوت کا بھاری نذرانہ دینے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی نیا دور نیا خاندان ایک دلخراش سچائی تھی۔ ہم نے ایٹم بم تو بنا لیا، ہمارے پاس ایف 16 جہاز بھی ہیں مگر عوام کے دوٹوں سے جیت کر اقتدار میں آنے والوں نے بھی کچی بستیوں میں رہنے والے کی حالت زار کبھی نہیں دیکھی۔ رضوانہ منظر کی عکس ماضی بہت ہی لاجواب تھی، شامی نے چند شرفا کا پول کھولنے کے لیے بہت زبردست چال چلی اور زبیدہ بیگم کے ہاتھ بہت سی رقم بھی لگ گئی۔ ثمر عباس کی انجام بخیر چند رحم نے نسا توں کی عبرت ناک داستان تھی، دل لگا کے......!"

✠ **ڈاکٹر وسیم خالد گہیاں**، گجرات سے محفل میں تشریف لائے ہیں "سب سے پہلے تو میں مدیرہ آنٹی اور انکل جی کا شکریہ ادا کروں گا جنہوں نے میرا خط شامل کر کے مجھے سالگرہ کے موقعے پر خوشی سے نوازا۔ اس بار ماہنامہ سسپنس پندرہ دسمبر کو ہی موصول ہوا۔ اوراق کو الٹتے ہوئے جون ایلیا کے انشائیہ، قانون پر جا پہنچے، جب اپنے ملک پاکستان میں کوئی قانون ہی نہیں تو اس پر تبصرہ کرنے سے کیا فائدہ۔ محفل یاراں میں محمد نعمان پیارے بڑے پیار سے کرسی صدارت پر جھولے لے رہے تھے، ہماری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔ جوں سے ہمایوں سعید راج صاحب، بقول آپ کے، اب جب آپ سدھر چکے تو آپ کو اس کی کلائی پر چوڑیوں کی تعداد اور کانوں میں دو عدد بالیوں کی تعداد کس طرح معلوم ہوئی۔ کھاریاں سے بابر عباس مختصر تبصرے کے ساتھ حاضر ہو کر محفل میں اپنی موجودگی کا احساس دلا گئے۔ سرگودھا سے طاہرہ یاسمین صاحبہ، میں آپ کی والدہ صاحبہ کے لیے تہ دل سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس بیماری سے نجات دلا دے۔ خانیوال سے ظفر اقبال صاحب اس عمر میں سرورق کو نظر انداز کر کے اس کے اندر جو مواد ہے اسی کو ہی پڑھنا ہے۔ دوسرے کاموں کے لیے ہم ہیں تو پھر کیا غم ہیں۔ سب سے پہلے ایچ اقبال کی کہانی آخری رابطہ پڑھی جہاں پر شاہانہ اور خالہ ذکیہ آنے والے واقعات پر بڑی بڑی چالیں چلنے لگیں، وہ یہ بات بھول گئیں کہ جب قدرت اپنی چالیں چلتی ہے تو روئے زمین پر تمام بازی گروں کی چالیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اس کے بعد انور صدیقی کی کشکول پڑھی جہاں پر پہلی دو اقساط کے بعد نقش مناظر کا نقشہ کھینچنے سے انہوں نے توبہ کی ہے۔ ان کی یہ تبدیلی ہمیں بہت پسند آئی۔ مرزا امجد بیگ کے پکے دھاگے میں انہوں نے رئیس شاہ کے چہرے پر بھی دھول ہٹا کر ان کا صاف شفاف چہرہ ہمارے سامنے پیش کیا تو ہم دنگ رہ گئے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی کہانی جنگ آزما ہمیں صبر آزما مرحلے سے گزارنے کے بعد اختتام پذیر ہوئی، بہت اچھی لگی۔ ایک اور بات جو ہم بابر عباس صاحب سے کرنا بھول گئے کہ ہم اور آپ ایک ہی ضلع گجرات سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرا آپ کے قریبی شہر ڈنگہ میں ہمارے ننھیالی ہیں اس طرح آپ رشتے کے حساب سے میرے انکل ہوا اور آپ کی مجھ سے بے رخی اچھی نہیں۔"

✠ **رمضان پاشا گلشن اقبال** سے محفل میں تشریف لائے ہیں، فرماتے ہیں "سال 2012ء کے پہلے ماہ کا سسپنس وقت مقررہ سے ایک روز پہلے ہی بازار میں آ گیا، یہ ایک خوش آئند واقعہ ہے۔ نئے سال کے پہلے مہینے کے سسپنس کا سرورق بہت خوب تھا، خاص کر سال نو مبارک دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ انشائیہ میں جون صاحب کا قانون پڑھا لیکن پلے کچھ نہیں پڑا خود اپنے وطن عزیز ہی کا قانون آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔ اس بار محفل دوستاں میں بہت ہی پیارا پیارا دوست تخت پر بیٹھا نظر آیا، دل و جان سے مبارکباد۔ ہمایوں سعید راج کا تبصرہ پسند آیا۔ طاہرہ یاسمین کا تبصرہ بھی لائق تحسین تھا۔ میں ان کی والدہ صاحبہ کی صحت یابی اور تندرستی کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا کرتا ہوں۔ اشعار کی محفل میں سرگودھا کے زندان سے آیا ہوا عاصم اقبال چھپال کا شعر دل کو بھا گیا۔ نئے سال کے پہلے ماہ کی چھوٹی کہانیاں تمام کی تمام بہت عمدہ تھیں، خصوصی طور پر مجھے انجام بخیر بہت پسند آئی۔ ایسی ہی کہانیوں کی خاطر میں سسپنس خریدتا ہوں۔ تاریخی کہانی جنگ آزما میں بابر کی داستان میں بہت سے واقعات بیان ہونے سے رہ گئے ہیں جس سے لطف

اور معلومات ادھورے رہ گئے۔ کشکول اپنے مخصوص ڈگر پر رواں دواں ہے۔ یہ کہانی جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے، لطف دوبالا ہوتا جا رہا ہے، توقع ہے کہ اگلی قسط بہت ہی دبنگ ہو گی۔ کچا دھاگا اچھی کہانی تھی، مگر عدالتی کارروائی کے مزے سے محروم ہی ملی۔ اناڑی اب تیسرے نمبر پر ہونے کے باوجود اس مہینے کی قسط بہت زوردار تھی۔ آخری رابطہ کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ تھی تو بہت اچھی کہانی لیکن یہ خالص "عورتانہ" کہانی تھی۔" (یہ کیا ہوتا ہے؟)

✠ **جعفر حسین**، بھوآنہ، ضلع چنیوٹ سے محفل میں چلے آرہے ہیں "ٹائٹل خوبصورت تھا مگر عورت نما لڑکی کی پھیکی مسکان کی وجہ سے پہلی بار پڑھنے والے خطوط میں حزن و ملال کی کیفیت نمایاں تھی۔ شاید گزرے برس میں پاکستان کے دگرگوں حالات نے بھی بیچاری کو متاثر کیا ہو۔ کراچی کے حالات اور لاقانونیت پہ برسوں پرانا لکھا گیا انشائیہ قانون اپنی بے حرمتی پہ نوحہ کناں تھا۔ محفل میں پیارے نعمان، آپ نے تو 4,5 دماغوں کا استعمال کر کے کمال کر دیا۔ حبیب الرحمٰن صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو جلد رہائی عطا فرمائے (آمین)۔ طاہرہ یاسمین صاحبہ، ہائے یہ سادگی..... اس پہ ہمارا کیا کہنا۔ ایم ڈبل اے اور محمد قدرت اللہ صاحب کے تبصرے شاندار رہے۔ انہی صفحات کی وساطت سے برادر چودھری سرفراز صاحب سے گزارش ہے کہ واپس آ جاؤ ورنہ...... مختصر کہانیوں میں ابتدا جواری سے کی۔ موت ایک مسلمہ حقیقت ہے اور اس سے فرار ناممکن مگر کاشف صاحب کی جواری میں مارسن موت کو جل دینے میں کامیاب رہا۔ نوجوان نسل کی ہوٹنگ پر شگفتہ پیرائے میں طنز کرتی قطعہ کہانی نے محظوظ کیا۔ سودن چور کے، کی عملی تفسیر دام صیاد بہترین انتخاب رہا۔ معاشرے کو گھن کی طرح کھاتی کرپشن، اقرباپروری، بدعنوانی اور بدانتظامی کے ساتھ ساتھ جائز کاموں کا سرخ فیتے کی نذر ہوتے کے پس منظر میں لکھی گئی رخصتی ہمارے فرسودہ اور گھن زدہ سسٹم کی صحیح معنوں میں نمائندگی کر رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے مخصوص انداز میں لکھی گئی نیا دور نیا خاندان کافی دل سوز کہانی تھی۔ موضوع میں تنوع ہونے کے باوجود عکس ماضی کچھ خاص نہیں لگی۔ مغربی معاشرے کی جنسی بے راہ روی اور اس کے ازدواجی تعلقات کے بگاڑ پہ روشنی ڈالتی انجام بخیر اچھی کاوش تھی۔ الو کھی دعا نے بہت بور کیا۔ محبت کے آفاقی جذبے کو تمام تر شدتوں سے بیان کرتی تحفہ بہت دل گداز رہی۔ جنگ آزما میں ظہیر الدین بابر کی کارزار حیات تقریباً انہی حالات و واقعات پر مشتمل تھی جو ہم پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ ادارے سے گزارش ہے کہ تیمور بیگ المعروف تیمور لنگ کے بارے میں بھی کچھ لکھا جائے۔ حضرت عزیرؑ اور حضرت دانیالؑ کے حالات زندگی اور بنی اسرائیل قوم کی وعدہ خلافیوں کا احوال متاثر کن رہا۔ اگلے حصے کا انتظار رہے گا۔ مرزا امجد بیگ صاحب نے کمال مہارت سے ازدواجی زندگی کے حالات جو پوائنٹ آف نو ریٹرن کی نہج تک پہنچ چکے تھے، کو گفتار کا غازی بن کر سلجھا دیا، ویلڈن بیگ صاحب۔ کشکول کی یہ قسط بھی شاندار رہی۔ کہانی کا کینوس تھوڑا وسیع ہوا ہے اور کچھ کردار مکمل کر سامنے آرہے ہیں۔ لیاقت حسین کے ساتھ پیش آنے والے ماورائی واقعات کو عقل تسلیم تو نہیں کرتی، بہرحال ہو سکتا ہے کہ مصنف بعد میں اس کی مناسب عقلی توجیہہ پیش کر دیں۔ اناڑی کی یہ قسط بھی اوسط سی رہی۔ تحریر کی موجودہ وسعت اور کہانی کے رخ سے قطعاً مشکل لگ رہا ہے کہ ناصر صاحب کی مسافر اس کی جگہ مارچ میں لے سکے۔ محبت کا دوسرا نام قربانی ہے اور قربانی اپنی ذات کی نفی کا نام ہے۔ محبت کے مفہوم کو اسی تناظر میں بیان کرتی آخری رابطہ زندگی کی تلخ اور سفاک حقیقتوں کے آگے محبت کے ٹمٹماتے چراغ کی روداد لیے ہوئے تھی۔ محفل شعر و سخن میں سنیہ منظور اور زرش آصف کا انتخاب پسند آیا۔"

✠ **خواجہ مدنی**، چوک ظاہر پیر، بہاولپور سے محفل میں تشریف لائے ہیں "جنوری 2012ء کا شمارہ ملا اور مزے کی بات یہ تھی کہ سالگرہ نمبر بھی [illegible] ہوتا ہے۔ سرورق پہ ایک خوبصورت حسینہ جلوہ افروز تھی۔ یہ ذرا انکل کو کریڈٹ جاتا ہے۔ اشتہارات پر سے گزرتے ہوئے جون ایلیا [illegible] جس میں قانون کو موضوع گفتگو بنایا گیا تھا۔ واقعی جون ایلیا نے ٹھیک کہا کہ جب حکمران قانون کا احترام نہیں کریں گے تو ایک عام انسان بھی حکمرانوں کی روش اختیار کرے گا۔ محفل خطوط میں محمد نعمان پیارے کو کرسی صدارت پر فائز پایا، مبارکاں جی۔ نعمان پیارے، ہیروئن جس ہیرو [illegible] تھی، وہ تو نعمان پیارے ہی تھا کیونکہ نعمان کی خوشبو کا اثر اس ہیروئن کو بھی دیوانہ کر گیا۔ سردار ظفر اقبال وڑائچ، میرا تبصرہ پسند کرنے کا [illegible] سعید راج مجھے پتا ہے کہ آپ کیوں جیلس ہو رہے ہو۔ ڈاکٹر وسیم خالق، آپ کو پیدائش کا دن مبارک ہو۔ عبدالغفور خان آپ کے انکل کی [illegible] افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین) طاہرہ یاسمین جی اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو صحت یابی دے (آمین) [illegible] نازک شریک ہوئی۔ باقی پتا نہیں کہاں غائب ہیں۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی جنگ آزما پڑھی۔ خانزادہ نے بابر کے [illegible] اور بابر کو شکست کھاتے کھاتے آخرکار فتح نصیب ہوئی اور یہ بڑے کرداروں کی بدقسمتی ہی ہوتی ہے کہ مشکل وقت اپنے ساتھ [illegible] کاشف زبیر کی جواری میں مارسن جیسا چالاک دولت کی خاطر اپنی زندگی خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ انوار صدیقی کی کشکول میں شیخ حامد [illegible] کے ساتھ بہت برا کیا۔ قطعہ کہانی منظر امام کی بہت اچھی کہانی تھی جس میں شاہد فراز اور ثمن ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار [illegible] ساری کہانی ثمن پر لٹا بیٹھے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی نیا دور نیا خاندان بس گزارا تھی۔ اناڑی اس مرتبہ کچھ تیز ہی تھی، تو اب نے مسکین [illegible] ہے۔ حضرت عزیر علیہ السلام اسلامی معلومات پر مشتمل اچھی تحریر تھی۔ آخری رابطہ ایچ اقبال کی اچھی تحریر تھی۔ عزیر اور شاہانہ کی [illegible] الدین کی مجبوری کے لیے رضامند ہونا اس کہانی کے اچھے پہلو تھے۔ مگر فرزانہ کی بے وقوفی سے شاہانہ اپنی راہیں الگ کر [illegible] محفل شعر و سخن میں تقریباً سارے اشعار اچھے تھے۔"

✠ **آغا فرید احمد خان**، بکھر سے تبصرہ کر رہے ہیں "خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ ہاتھوں میں ہے۔ سال نو کی حسینہ نے ذرا متاثر نہ کیا۔ [illegible] اور کہانی اناڑی ایسی ہی تھی جیسے چل آرہی ہے اور ابھی تک نور کا کچھ پتا نہیں۔ جو لوگ 30 کروڑ دینے کو تیار تھے ان سے نور کا ہاتھ نہ مانگنا سمجھ سے

باہر ہے۔ غنی ہمیشہ سے ایکشن میں ہی نظر آتے ہیں۔ دوسری سلسلہ وار کہانی کشکول بھی اب تیزی پکڑ چکی ہے۔ ابھی تک تو کہانی زبردست جا رہی ہے۔ افضل خان بگ باس کے پاس اب نہیں جائے گا۔ بگ باس نے اس کے ساتھ جو کیا اس کا پتا افضل کے سوا کوئی اور کیا جان سکتا ہے۔ اب ڈی ایس پی سراج کو اسے بگ باس کے خلاف استعمال کرنا چاہیے۔ اب دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ آخری صفحات پر ایچ اقبال آخری رابطہ لائے۔ کہانی تو خیر اچھی تھی لیکن آخری صفحات کے معیار کے مطابق ہرگز نہ تھی، خاص کر یہ کہ فرزانہ کے ساتھ جو ہوا وہ نہ ہوتا۔ رضوانہ منظر عکس ماضی لائیں لیکن یہ کہانی سسپنس کے معیار کی نہیں تھی۔ محفل شعروسخن میں معیاری شعر پڑھنے کو ملے۔ ڈاکٹر شیر شاہ کی کہانی نیا دور نیا خاندان افسردہ کر گئی۔ مختار آزاد کی کہانی رخصتی پڑھتے ہوئے ایسا لگا جیسے یہ کہانی نہیں، کسی کی سچ زبانی سن رہا ہوں۔ بیگ صاحب اس دفعہ پکا دھاگا لائے جو بہت ہی اچھی تحریر تھی۔ بیگ صاحب کو ہمیشہ میں آنکھوں سے نہیں، دل سے پڑھتا ہوں۔ مظفر امام کی قطعہ کہانی ایک اچھی تحریر تھی، جی ہاں یہ عشق ہی ہے جو آدمی کو اندھا بنا دیتا ہے لیکن شاید شاہد فراز اور شن کو اپنے عشق کی سچائی کا پتا نہیں تھا۔ وہ ایک دوجے کو دھوکا ہی دے رہے تھے۔ تاریخی کہانی جنگ آزما اور مغربی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ پنجاب سے ہمارے پیارے دوست نعمان پیارے وکٹری اسٹینڈ پر کھڑے تھے جنہیں تہ دل سے مبارک باد۔ دوسرے نمبر پر ہمارے سینئر قاری سردار ظفر وڑائچ صاحب تھے جو کافی عرصے کے بعد دوستوں کی محفل میں رونق بڑھانے آئے، ویل کم بیک سردار بھائی۔ ہمارے تیسرے ساتھی ہمایوں سعید راج بھائی بھی آخر سد ھر ہی گئے۔ ڈاکٹر وسیم خالق بھائی نے بارہ سال رسالہ پڑھ پڑھ کر آخر محفل میں انٹری مار ہی دی۔ لاہور سے اپنے حبیب الرحمن بھائی نے سفو پینے کی مثال قائم کر دی۔ ایم ڈبل اے صاحب نے بہترین تبصرے سے انٹری ماری۔ میرے پیارے بھائی قدرت اللہ نیازی صاحب کا طویل تبصرہ بہت پسند آیا۔ ایک اور بہت ہی پیارے دوست محمد جاوید بلوچ بھی محفل میں تھے گویا سب دوستوں کی اس مہینے عید ہی ہو گئی۔ ہمیں بھی اپنے نہ ہونے پر افسوس نہیں رہا۔ رمضان پاشا صاحب اس بار آسان اردو میں ہی انٹری مارنے آگئے۔ ارے یہ کیا ایک اور پیارے دوست بابر عباس جو مختصر تبصرے کے ساتھ بیٹھے تھے۔ محفل کی واحد لڑکی ہماری بہن طاہرہ یاسمین نے خوب تبصرہ کیا۔"

✠ **طاہرہ یاسمین،** ضلع سرگودھا سے محفل میں آئی ہیں "بہت شکریہ خط شائع کرنے پر ورنہ پکا سوچ لیا تھا کہ آئندہ خط نہیں لکھنا۔ اتنی مشکل سے رسالہ منگواتی ہوں پھر وقت نکال کر پڑھتی ہوں پھر مشکل سے روزانہ وقت نکال کر دو تین دن میں آپ کو خط لکھ پاتی ہوں پھر ایک ایک دن انتظار کرتی ہوں ڈائجسٹ اور خط کا، اگر خط نہ چھپے تو مایوسی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس ماہ کا شمارہ 15 کی شام کو بھائی جان نے لا کر دیا تو بے تابی سے کھولا۔ محفل میں اپنا خط پا کر خوشی دوبالا ہو گئی۔ کرسی صدارت پر محمد نعمان پیارے کو پایا۔ مبارک ہو نوی بھائی۔ ڈاکٹر وسیم خالق، شکر ہے آپ کو میرا نام بلیک لسٹ دیکھ کر افسوس ہوا۔ ٹائٹل پر قدرت اللہ جی فون کان سے لگائے شاید ماہا ایمان کو سال نو کی مبارک دے رہے تھے۔ عاصم اقبال جسپال، سرگودھا جیل، خدا آپ کے بھائی کو جلدی رہائی دے۔ جنید نواز، محفل میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ لکھتے رہنا، آپ کا مختصر سا تبصرہ پسند آیا۔ بابر عباس، کھاریاں، شیر صاحب آپ نے اتنے عرصے بعد جنگل، میرا مطلب ہے محفل میں انٹری دی وہ بھی اتنی مختصر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ویسے قدرت اللہ نیازی جی، آپ اس بار محفل میں وزیراعظم کی کرسی پر تھے، بڑے خوش ہوں گے یہ اعزاز پا کر، ہے ناں؟ ماہا جی تو اس بار بالکل ہی غائب تھیں، خیریت ماہا سسٹر جی؟ اور اب بات ہو جائے کہانیوں کی تو سب سے پہلے تو پڑھی کشکول، کیا شاندار جا رہی ہے۔ دل کرتا ہے تمام قسطیں ایک ہی بار پڑھ لیں، پھر اناڑی پڑھی، بہت اچھی تھی۔ انوکھی دعا نے بہت متاثر کیا۔ مختار آزاد کی رخصتی بہت اچھی تحریر تھی۔ مرزا امجد بیگ کی ذہانت کی داد دیتے ہیں، کیا عمدگی سے کیس حل کر لیا، ویلڈن بیگ صاحب۔ ویسے بیگ صاحب سے پوچھنا تھا کہ اب بھی وہ وکالت کرتے ہیں یا ریٹائر ہو چکے ہیں (ریٹائر ہو چکے ہیں) پچھلے شمارے میں جنت پڑھی۔ دونوں اقساط بہت اچھی تھیں مگر جنت کے انجام پر افسوس ہوا۔ کاش مصباح زندہ رہتی۔ اس ماہ کے شمارے کی کہانی آخری رابطہ، ایچ اقبال کو مبارک باد اتنی اچھی کہانی لکھنے پر۔ تمام شمارہ ایک طرف اور آخری رابطہ ایک طرف۔ نمبرون شعروں کے انتخاب میں سب سے نمبرون شعر تھا عبدالغفور خان، چھب ضلع اٹک سے قدرت اللہ نیازی اور طاہر وجدانی، فیصل آباد کے شعر بھی اچھے تھے۔"

✠ **سردار ظفر اقبال وڑائچ،** جودھ پور، خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں "حسب معمول جنوری کا شمارہ 19 دسمبر کو ملا۔ اس ماہ کا شمارہ سالگرہ نمبر تھا۔ اس مرتبہ ہر کہانی ایک شاہکار تھی۔ نعمان جی کیسے ہیں آپ؟ مرچ لگا کے! دوسرے نمبر پر ہم خود ہی تھے، ہمارا تبصرہ بھی ماشاءاللہ پورے شمارے کو چار چاند لگائے ہوئے تھا۔ ہمایوں سعید تیسرے نمبر پر راج کر رہے تھے۔ سدا خوش رہو راج بھیا! آپ کی ایک بات دل کو لگی ہے وہ یہ کہ سب کو اصل نام کے ساتھ آنا چاہیے۔ ڈاکٹر وسیم خالق جی، اب تو آپ خوش ہیں نا کہ آپ کا خط شامل ہو گیا۔ ہماری طرف سے بھی سالگرہ مبارک ہو۔ حبیب الرحمن، اللہ آپ کو جلد آزادی نصیب فرمائے۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب جی آپ تبصرہ خوب لکھتے ہیں، سجا سجا کے۔ عبدالغفور خان صاحب آپ کے چچا کی وفات کا سن کر دکھ ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کے چچا کو اپنی رحمت کے صدقے جنت میں اعلیٰ وارفع مقام عطا فرمائے (آمین)۔ ویسے آپ کا تبصرہ اچھا لگا، خصوصاً آخری نصیحت بھی۔ طاہرہ یاسمین جی ہم سب لوگوں کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو صحت کلی عطا فرمائے۔ جنید نواز صاحب باقاعدگی کے ساتھ آتے رہیے گا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اناڑی پڑھی۔ کہانی کا ٹیمپو کافی تیز رہا۔ نواب صاحب نے بہت اچھا کیا جو ارم کو واپس کر دیا۔ اس طرح نواب صاحب کے ساتھ آفتاب خان بھی مل گیا ہے۔ انور صدیقی کی کشکول پڑھی، اناڑی کی طرح یہ قسط بھی شاندار رہی۔ شیخ حامد اور سراج میں لگتا ہے معاملہ گڑبڑ ہونے والا ہے۔ کہانی میں کچھ اور لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں، لگتا ہے اس کہانی کا اینڈ کافی طویل ہے۔ ایچ اقبال کی آخری رابطہ پڑھی، زبردست اسٹوری تھی اس ماہ کی۔ فرزانہ کی وجہ سے شاہانہ کی محبت کی موت ہو گئی۔ واقعی جو لوگ بڑوں کا کہنا نہیں مانتے ان کے ساتھ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی جنگ آزما اچھی تحریر تھی۔ اسی طرح دام صیاد، قطعہ کہانی، پکا دھاگا، انوکھی دعا و دیگر تمام کہانیاں اس ماہ کی شاہکار کہانیاں تھیں۔"

✠ **سعدیہ بخاری،** اٹک سے محفل میں آئی ہیں "دسمبر کے یخ بستہ موسم میں 18 تاریخ کو سسپنس ملا۔ نئے سال کا مختلف رنگوں سے سجا سرورق بہت زبردست ہے۔ حسینہ کے گال پتا نہیں سردی سے لال ہیں یا غصے سے؟ انشائیہ ہمارے آج کے حالات کی مکمل عکاسی کیے ہوئے تھا۔ جون ایلیا نے جو کچھ کئی سال پہلے لکھا تھا وہ آج حقیقت کا روپ دھارے ہمارے سامنے ہے، کراچی کے حالات اب کراچی سے نکل کر پورے ملک میں وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ یہی تو منفرد بات ہوتی ہے ہمارے ادیبوں میں۔ ابتدائیہ میں مدیر اعلیٰ نے جن مسائل کا ذکر کیا۔ اندرونی حالات، بیرونی عالمی سازشیں پاکستان کے خلاف اور آخر میں امیدوں کے نئے چراغ جلاتی نظر آئیں۔ یہ سب ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے، اللہ کرے ان کی امیدیں اس ملک کے لیے ضرور پوری ہوں۔ خطوں کی محفل معمول سے ہٹ کر کچھ پھیکی پھیکی لگی شاید اس لیے کہ لڑکیوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ انکل قدرت اللہ نیازی حیرت انگیز...... آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں نے 25، 30 سال بعد خط لکھا۔ آپ کا اندازہ 100 فیصد غلط ہے، آپ کے حافظے کا تو اللہ ہی حافظ۔ محمد پیارے نعمان، مبارک ہو کرسی۔ کیا خوب تبصرہ لکھا، صرف دل لگا کے، دماغ لگانا بھول گئے۔ جاوید بلوچ صاحب، اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی۔ سنسر باتوں سے پرہیز کیجیے۔ تاریخی کہانی میں مغل بادشاہ بابر کی داستان تو اختتام پذیر ہوئی۔ اناڑی کی تو ہمارے خیال سے آخری قسط ہو گی کیونکہ رانا زوہیب اور دلاور کا انجام بلکہ اختتام نظر آ رہا ہے، نور کے مل جانے کے بعد اور کچھ باقی نہیں رہ جاتا (آپ کا اندازہ بالکل درست ہے) نئی کہانی مسافر کا انتظار ہے۔ ناصر ملک اچھے رائٹر ہیں (ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا) پکا دھاگا شاندار رہی، شاہ جی جیسے کردار تو جگہ جگہ نظر آتے ہیں، لاقانونیت اور عوام کی جاہلیت کا منہ بولتا ثبوت۔ آخری رابطہ میں ایچ اقبال کا قلم تو جادو نہ دکھا سکا البتہ کہانی کے واقعات جادوئی طریقے سے رونما ہوتے رہے۔ موجودہ دور میں ایسی اور اس سے ملتی جلتی کہانیاں میڈیا کے توسط سے منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ کشکول جاسوسی ٹائپ کی ہوتی جا رہی ہے۔ حامد جیسے مکروہ کردار تو ہر جگہ نظر آتے ہیں لیکن ڈی ایس پی سراج اور لیاقت حسین جیسے کردار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مظفر امام کی قطعہ کہانی کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ رخصتی میں جس مسئلے کو اٹھایا گیا یعنی کرپشن، اس نے تو ہمارے ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ نیا دور نیا خاندان نے خاصا متاثر اور دکھی کیا، اس غربت کا کیا کیا جائے، زندگی سے ہے گلہ، پھر بھی ہمیں جینا تو ہے۔ عکس ماضی نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ مغرب سے درآمدہ کہانیوں میں جواری، انوکھی دعا، اور تحفہ عام سی کہانیاں تھیں البتہ انجام بخیر بہترین رہی۔ جون میلون اینڈ جولی فلپس کے ساتھ جو ہوا، بالکل ٹھیک ہوا۔ کتر نیں خاص نہیں تھیں۔ اشعار میں عبدالغفور خان، ظفر اقبال اینڈ طاہرہ یاسمین کے اشعار پسند آئے۔"

✠ **ابرار وارث،** سندھیلیانوالی سے محفل میں تشریف لائے ہیں "خاموش قاری ہوں، تقریباً سات سالوں سے۔ اس دفعہ ہم نے بھی اپنی چپ توڑنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ آج ہی ٹائم ملا ہے اور ایک ہی نشست میں سارا رسالہ پڑھ ڈالا۔ حسب معمول اناڑی سے آغاز کیا۔ نور صاحبہ بدستور غائب ہیں البتہ رفیق کی ست بدھائی کی طرف واپسی خوشگوار لگی اور ارم کا اپنے باپ سے ملنا بھی۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی جواری پڑھی جہاں مارٹن بے چارا بڑی مشکل سے اپنی زندگی کا جوا ہارتے ہارتے بچا، اچھی تحریر تھی۔ کشکول نہیں پڑھی کیونکہ اس میں غیرملکی زیادہ اور ملکی لوگ کم ہیں۔ مظفر امام کی قطعہ کہانی پڑھی، واقعی بہت پسند آئی کیونکہ شاعر صاحب تو فقط اپنے حال میں زندہ تھے۔ دام صیاد سلیم انور کی اچھی کاوش تھی بین بے چارہ اپنے بنے ہوئے جال میں خود ہی پھنس گیا۔ رخصتی پڑھی، آنکھیں ڈبڈبا گئیں بلکہ میں تو حیرت سے گنگ رہ گیا۔ جہاں رابعہ اور وجاہت نے کس غلط طریقے [illegible] اپنے بڑوں کی غیرت کا جنازہ نکالا۔ عکس ماضی پڑھی، جس میں رضوانہ منظر نے کامران شاہی کی بدولت نیلم پور کے لوگوں کو ایسے خوبصورت طریقے [illegible] کسی کو پتا ہی نہ چل پایا۔ محفلِ شعروسخن میں ذیشان افتخار، این ایس مدثر، عامر رسول، ایم ڈبل اے اور جنید احمد ملک کے اشعار بہت پسند [illegible]۔ انجام بخیر میں جون اور جولی کا انجام پڑھ کر واقعی بہت لطف اٹھایا۔ اس کے بعد سب سے بہترین یعنی اسٹوری آف دا منتھ یعنی آخری رابطہ [illegible] کے ساتھ بہت برا ہوا۔ میرے خیال میں شاہانہ نے عزیر کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ ایچ اقبال نے ایک بہت اچھوتے موضوع کو لے کر یہ [illegible]"

✠ **[illegible] یلیسین تونتاری،** چوک سرور شہید سے "یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اناڑی کا اختتام ہو رہا ہے۔ اس تحریر سے اب بوریت محسوس [illegible] مسافر بھی بہترین کہانی ثابت ہو گی۔ اس بار سکین شاہ کے متعلق کافی ثبوت حاصل کر لیے گئے جو کہ خوش آئند بات ہے۔ کشکول [illegible] انسان کے استعفیٰ دینے پر بہت افسوس ہوا۔ سراج کا کردار بہت اچھا جا رہا ہے۔ فلموں کی طرح اب کہانیوں میں بھی دو دو [illegible] لاکار میں عمران اور تابش جبکہ کشکول میں لیاقت حسین اور سراج۔ لیکن اس طرح تحریر مزید بہتر لگتی ہے۔ ایک دماغ سے دو [illegible] قطعہ کہانی میں مظفر امام ایک خیالی شاعر کی خیالی محبت کی خوب منظر نگاری کر رہے تھے۔ تحریر نے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ پکا [illegible] گھریلو مسئلے کو مرزا صاحب نے نہایت عقل و فہم سے حل کیا۔ جواری میں زندگی اور دولت کی اہمیت دکھائی گئی۔ زندگی [illegible]۔ حضرت عزیر کے متعلق ایک دلچسپ معلوماتی تحریر پڑھنے کو ملی۔ آخری رابطہ پسند نہ آئی۔ محفل میں محمد قدرت اللہ نیازی کا [illegible]"

✠ **[illegible] رشید،** [illegible] شریف، ڈیرہ غازی خان سے محفل میں تشریف لائی ہیں "جمعرات 15 دسمبر کو میرے چچا انتقال فرما گئے۔ ان کی موت [illegible] نماز عشا پڑھ کر سو گئے صبح نماز کے لیے اٹھایا تو وہ اس دنیا میں ہی نہیں تھے (اللہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ اور لواحقین کو صبر [illegible] ہی ملا۔ سب سے پہلے بلیک لسٹ کو کھنگالا تو دیکھا نام واقعی بلیک لسٹ میں شامل تھا۔ بہت خوشی ہوئی، اس لیے [illegible] شامل تھا بلکہ اس لیے کہ دل نے بالکل ٹھیک بتایا تھا کہ بیٹا آپ کا نام بلیک لسٹ میں ہوگا۔ سردار ظفر اقبال، آپ نے مجھے کنجوس

کہا۔ حالانکہ میرا خط بہت مختصر کر کے شائع کیا اور جب میں نے شکایت ظاہر کی تو میرا نام ہی بلیک لسٹ میں ڈال دیا (کبھی جگہ کی کمی اور کبھی خطوط کا بوجھل پن ایسا کرنے پر مجبور کر دیتا ہے) جاوید بلوچ، آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ہمارے لکھاری روایتی انداز میں لکھتے ہیں؟ مجھے تو آپ کی سوچ روایتی لگ رہی ہے۔ شاید آپ نے کبھی اپنے رائٹرز کو زیادہ پڑھا ہی نہیں، جو ایسی بات کی۔ عبدالغفور خان، آپ کے چچا بھی چلے گئے۔ صبر سے کام لیں۔ ہر انسان کو مقررہ وقت گزار کر واپس چلے جانا ہے۔ اقبال چودھری کیا فرمایا آپ نے؟ کیا آپ اسٹیج اداکاراؤں کو بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔ جو آپ کو یہ ننھی سی جان بھی انہی کی طرح اچھل کود مچاتی ہوئی محسوس ہوئی؟ جعفر حسین نے اچھا تبصرہ کیا ہے، پسند آیا۔ رضوانہ منظر کی عکسِ ماضی میں جس نیلم پور نامی قصبے کا ذکر ہے۔ شاید وہ پاکستان کا نہیں تھا، کیونکہ یہاں بڑے شہر صفائی سے محروم ہیں تو چھوٹے موٹے کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ بڑی ہنسی آئی کہ نیلم پور ایک خوبصورت اور پر بہار قصبہ تھا۔ نیا دور نیا خاندان میں ڈاکٹر شیر شاہ نے آج کے دور کی بہت اچھی عکاسی کی ہے۔ رخصتی پڑھ کر بھی بات سمجھ میں آئی کہ ہم نے خود ہی اپنی زندگیوں کو مشکل بنالیا ہے۔ بیٹی کو زیادہ جہیز دینا عادت بنالی ہے اور جب زندگی کو اپنے اوپر زیادہ ہی تنگ کر لیتے ہیں تو حرام موت کو گلے لگا کر اپنی آخرت کو مزید بھیانک بنا دیتے ہیں۔ پکار دعا گانے متاثر نہیں کیا۔ پہلے سلطانہ بیگم اپنے مجازی خدا پر پتا نہیں کیا کیا الزام لگاتی ہیں مگر بعد میں انہیں لگتا ہے کہ انہیں مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی ہے۔ دام صیاد پڑھ کر لگا کہ انگریز دھوکا دہی میں زیادہ ماہر ہوتے ہیں۔"

✠ **شارقہ سلجوق،** جہانگیر آباد سے تبصرہ کر رہی ہیں "2012ء کا پہلا شمارہ 23 دسمبر کو ملا۔ سرورق بہترین تھا حسینہ نئے سال کی طرح تر و تازہ تھی۔ انشائیہ میں جون ایلیا لاقانونیت کا رونا روتے نظر آئے۔ اداریہ پاکستان کی معکوس ترقی کے بارے میں آگاہ کر رہا ہے، ایماندار قیادت کے بغیر پاکستان کی ترقی دیوانے کا خواب ہی ہے۔ پچھلے دنوں اخباری ذرائع کے مطابق ایوان صدر کے کچن کی تزئین نو کے لیے 26 کروڑ روپے خرچ کیے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے صدر صاحب جیب سے تو یہ خرچ نہیں کر رہے۔ تمام وزرا کی آسائشات و زندگی کے اخراجات یہ سارا بوجھ ملکی خزانے کو ہی برداشت کرنا ہے۔ ترقی ہو بھی تو کیسے ہو۔ خطوط کی محفل میں محمد نعمان پیارے کرسی صدارت پر موجود تھے، تبصرہ ٹھیک ہی تھا۔ نعمان صاحب عورتیں احمق نہیں ہوتیں بلکہ بہت عقل مند ہوتی ہیں یہ تو مرد حضرات ہی ہیں جو ان کی مت مار دیتے ہیں۔ سردار ظفر صاحب ہم آپ کو کیسے پہچانیں، آپ شاید ہماری پیدائش سے پہلے لکھتے رہے ہیں سسپنس میں ہے نا؟ ہمایوں سعید! اوروں کو نصیحت کر رہے ہیں خود آپ کیا کرتے ہیں، کبھی سوچا ہے؟ ڈاکٹر وسیم خالق! اچھی زبردستی ہے بھئی! سالگرہ کا کہہ کر مجبور کر دیا کہ آپ کا خط شامل کیا جائے، ہماری طرف سے سالگرہ مبارک ہو اگر واقعی ہے تو۔ ایم ڈبل اے کرسی صدارت پر ملی بیٹھے یا کوا آپ کو اس سے کیا لینا دینا؟ قدرت اللہ نیازی! سعدیہ بخاری ابھی تو 25 کی نہیں ہوئیں اور آپ نے ان کو 55 کا بنا دیا۔ جاوید بلوچ! آپ نے ماما کے سر میں کیا مارا تھا پچھلے ماہ؟ اور آپ کو ان سے کیا پرخاش ہے جو اتنا غصہ کر رہے ہیں؟ عبدالغفور خان، اللہ آپ کے چچا کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) مجھے جس بات نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ ہماری صنف نازک کے خطوط کی مسلسل کم ہوتی تعداد ہے جو اس بار صرف ایک خط تک محدود رہی، شکر ہے طاہرہ جی! آپ نے جلدی خط لکھ لیا جو شائع ہو گیا۔ دو نام اور تھے بلیک لسٹ میں آنٹی جی آپ وہ شائع کر دیتیں کچھ تو تناسب بہتر ہو جاتا۔ میری بہنوں سے گزارش ہے کہ خط لکھیں اور جلدی لکھا کریں، مرد حضرات دو چار اونگیاں بونگیاں کاغذ پر گھسیٹ کر پوسٹ کر دیتے ہیں جو چھپ جاتی ہیں...... آپ تفصیلی خط لکھنے کے چکر میں دیر کر دیتی ہیں جس کا خمیازہ بلیک لسٹ میں دھکیل دیے جانے کی صورت میں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ماما جی! آپ کہاں کھو گئی ہیں؟ صنف کرخت کی الٹی سیدھی باتوں سے گھبرا تو نہیں گئیں آپ؟ پلیز واپس آجائیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی جنگ آزما تاریخ ہندوستان سے روشناس کراتی ہوئی تحریر تھی۔ بابر کی بھاگ دوڑ آخر کار رنگ لائی اور وہ فتح یاب ہوا۔ ناصر ملک کی مسافر اگر مارچ سے شامل ہو رہی ہے تو لازمی طور پر اناڑی یا کشکول میں سے ایک ختم ہو رہی ہے، ہے نا؟ کشکول تو ابھی پوری طرح سے کھلی ہی نہیں۔ لگتا ہے، اناڑی ہی اینڈ ہوگی۔ (آپ کا اندازہ بھی درست ہے) اناڑی میں راجا اور ناصر مسکین شاہ کو گھیرتے نظر آ رہے ہیں۔ لگتا ہے اس کا انجام برا ہونے والا ہے۔ شامی اور گوگی کی واپسی تو ہو گئی لیکن رابعہ کہاں ہے؟ نواب صاحب ابھی تک نور کو بازیاب نہیں کروا سکے۔ کشکول میں لیاقت حسین کو اس کی جاں نثاری کا انعام خوب صورت ایجنسی کی صورت میں مل رہا ہے۔ شبنم بھی شیخ حامد کے جال میں جکڑی گئی ہے۔ ہاشم اور لوچن وغیرہ کے بارے میں ابھی کچھ پتا نہیں چل رہا کہ کس کے آدمی ہیں؟ میجر اور کیپٹن نے خود موت کو گلے لگا لیا، اتنی محنت سے سراج وغیرہ نے انہیں پکڑا لیکن حاصل کچھ نہ ہوا۔ ایچ اقبال کی آخری رابطہ، مرد کی ہوس سے پیدا ہونے والی ایک طویل داستان جس نے اپنے ساتھ اپنے گھر والوں کو بھی تباہ کر دیا۔ فرزانہ کے دل و دماغ میں جو کچھ بھی تھا لیکن اس طرح رات کو اعجاز کے کمرے میں جانا بدترین بے وقوفی تھی۔ رضوانہ منظر کی عکسِ ماضی بہت دلچسپ تھی۔ برے کردار کے مالک بھٹی اینڈ کمپنی کو شامی نے جس طرح ڈرا کر لوٹا وہ اسی کے مستحق تھے۔ مختار آزاد کی رخصتی رشوت کی لعنت سے پیدا ہونے والی تکلیف دہ صورت حال کی کہانی تھی۔ بیوی کے ککنگلوں کا بندوبست کرتے کرتے اسلم دو خاندانوں کی تباہی کا ذمے دار بن گیا لیکن اسے پھر بھی کوئی ندامت نہ ہوئی۔ مرزا امجد بیگ کی روداد پکار دعا کا عدالت جانے سے پہلے ہی کیس ختم، واہ بیگ صاحب کیا کہنے۔ کاشف زبیر کی جواری میں مارٹن کو کڑی سزا ملی...... اسے چاہیے تھا کہ میری اور ہان کو بلیک میل کرنے کے بجائے ڈاکٹر کو ان کے کرتوت بتا دیتا اور اس کے احسان کا بدلہ اتار دیتا۔ تحفہ میں ہنری اور ایمی کی محبت اپنی جگہ لیکن جرم کر کے ایک دوسرے کو تحفہ دینے والی بات کچھ جچی نہیں۔ انجام متوقع ہی تھا۔ محفل شعر و سخن میں کافی اچھے شعر تھے۔ ظفر اقبال ظفر، کامرہ۔ رائے نعیم احمد بھٹی اور این ایس آر مدثر کے اشعار بہت پسند آئے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

خاطر علی ہمدم، ضلع تربت گاؤں سولائی گورکوپ۔ علی اصغر نواب شاہ۔ یعقوب علی، سرگودھا۔ محمد غضنفر، لاہور۔ محمد کمال انور، اورنگی ٹاؤن، کراچی

کشور کُشا

ڈاکٹر ساجد امجد

تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ ظہیر الدین بابر... وہ بابر نہیں رہا تھا جو اپنی بہن کی محبت میں روتا تھا... جو دشمنوں کو معاف کرکے نقصان اٹھاتا تھا... رفتہ رفتہ اس نے بادشاہت کے تمام اصول ازبر کرلیے۔ بابر ذہانت کا قدردان تھا... اس کی پرجوش تقاریر کے بعد ایقان کی لہر تمام افواج میں ایک نئی روح پھونک دیتی تھی۔ پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی ہاتھیوں کے ساتھ اس کے مدمقابل تھا جس کی شکست ناقابل یقین تھی... پھر ایسا ہوا کہ ابراہیم لودھی کا سر کاٹ کر بابر کی خدمت میں پیش کردیا گیا... یہ سر نہیں بلکہ دہلی کا تخت تھا جو بابر کے پیروں تلے بچھادیا گیا تھا... اس دوران اس کے بیٹے ہمایوں کے ہاتھ کوہ نور ہیرا لگا مگر قلندر باپ کی سخاوت دیکھیے کہ وہ ہیرا اس نے بیٹے کو بخش دیا... بابر کی آنکھوں میں ہندوستان سے بدخشاں تک اپنی سلطنت قائم کرنے کا خواب بس خواب ہی رہتا اگر وہ سازشوں سے گھبرا کر ہمت ہار دیتا مگر رفتہ رفتہ اس کے عزم نے اس خواب کی تعبیر پالی... کیونکہ اسے بچپن میں یہ سبق پڑھایا گیا تھا کہ شہزادے ماؤں کی گود میں نہیں پلتے بلکہ ان کی تربیت میدان جنگ میں کی جاتی ہے اور پھر وہ سلطنت کے تمام رموز سے واقف ہوتا چلا گیا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

یوسف زئی قبیلے کا سردار ملک احمد، بابر سے ملاقات کے لیے کابل آرہا تھا۔ ملک احمد کے مخالف قبیلے کے کچھ افراد جو اس وقت بابر کے قریب بیٹھے تھے اور بارہا اپنی وفاداریوں کا یقین دلا چکے تھے، ان سے یہ خبر برداشت نہ ہوئی۔ وہ پہلے بھی یوسف زئی قبیلے کی شکایتیں بابر کے گوش گزار کر کے اسے اس قبیلے سے بدظن کر چکے تھے، یہ موقع غنیمت جانا اور بابر کو اس کے قتل پر اکسایا۔

''وہ آپ کے بارے میں جو ہرزہ سرائی کرتا رہتا ہے اس کی سزا دینے کا یہ مناسب موقع ہے۔ اسے یہاں آتے ہی قتل کر دینا چاہیے۔ اس کے قبیلے میں اتنی ہمت نہیں کہ کابل پر چڑھائی کریں اور اگر کرتے ہیں تو ہم سمیت تمام قبائل آپ کا ساتھ دیں گے۔''

''لیکن یہ بھی کوئی مناسب طریقہ نہیں کہ کسی کو اپنی صفائی پیش کرنے سے پیشتر ہی قتل کر دیا جائے۔'' بابر نے عذر پیش کیا۔

''حضور، وہ ایسا چالاک شخص ہے کہ اگر اسے بولنے کا موقع مل گیا تو کسی نہ کسی طرح آپ سے جاں بخشی کرا لے گا۔ یہ موقع ہاتھ سے چلا گیا تو وہ شخص دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ سندھ کی پٹی تک اس کا عمل دخل ہے۔ وہ بچ کر چلا گیا تو پھر آپ کبھی ہندوستان کا منہ نہیں دیکھ سکیں گے۔ اس قبیلے کو مرعوب کرنے کے لیے اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں۔''

بابر اب وہ بابر نہیں رہا تھا جو اندجان میں تھا اور اپنے دشمنوں کو معاف کر کے نقصان اٹھایا کرتا تھا۔ زمانے کی ٹھوکروں نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اس نے یہ تجویز مان لی اور ملک احمد کے قتل پر آمادہ ہو گیا۔ ملک احمد کی آمد پر بابر نے بڑا دربار لگایا۔ تخت پر متمکن ہوا اور ملک احمد کو حاضری کا اذن دیا۔ یہ یوسف زئی سردار ایک شانِ بے نیازی سے دربار میں حاضر ہوا اور آداب بجا لانے کے بعد فوراً اپنے گلے کی گھنڈیاں کھول دیں۔

''یہ کیا کرتا ہے۔ تجھے آدابِ شاہی کا بھی خیال نہیں؟'' بابر نے کہا۔

وہ اس سوال پر چپ رہا۔ یہ بھی گستاخی تھی کہ بادشاہ کوئی بات پوچھے اور کوئی چپ رہے لہٰذا بابر نے ذرا غصے کے ساتھ اپنے سوال کو دُہرایا۔ اس مرتبہ ملک احمد کو بولنا پڑا۔

''میں نے سنا ہے حضور مجھے اپنے ہاتھ سے تیر مار کر ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے خیال ہوا اتنے بھرے دربار میں جبکہ سب کی نگاہیں ادھر لگی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ حضور کا وار خالی جائے اسی لیے اپنا بھاری، گدے دار گلا ہٹائے دیتا ہوں تاکہ تیر پوری طرح کارگر ہو۔''

بابر ذہانت کا قدردان تھا اور ملک احمد نے ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ بابر نے نہایت قدردانی سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ ''تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں تمہیں قتل کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں؟''

''آپ تو یہاں نئے آئے ہیں۔ ہم یہاں صدیوں سے آباد ہیں۔ یہاں سے سوات تک پھیلے ہوئے پہاڑ ہمارے دوست ہیں۔ ہمیں ہر راز کی بات بتا دیتے ہیں۔ انہوں نے تو مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ سکندر یونانی خلعت عطا کرنے والا تھا اور بابر بادشاہ زندگی عطا کرنے والا۔''

بابر کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ ''بے شک ایسا ہی ہوگا۔''

بابر تھوڑی دیر کے لیے ملک احمد کی حاضر جوابی پر ششدر رہ گیا۔ اس نے باتوں باتوں میں بابر کو سکندر کا ہم پلہ قرار دے دیا تھا بلکہ اگلے ہی جملے میں اس سے بڑھا بھی دیا تھا کہ وہ تو صرف خلعت عطا کرنے والا تھا آپ تو زندگی عطا کرنے والے ہیں۔

بابر جس کے قتل کا سامان کیے بیٹھا تھا، ایسا مہربان ہوا کہ ہاتھ پکڑ کر تخلیے میں لے گیا۔ ساقی گروں نے شراب لا کر رکھ دی۔ حکم ہوا کہ ساقی گری وہ خود کرے گا، سب واپس چلے جائیں۔ بابر نے جام بنایا اور ہونٹوں کو لگا لیا۔ ملک احمد کو سخت طیش آرہا تھا کہ یہ کیسی مہمان داری ہے۔ شراب کا ایک ہی جام بنایا اور مجھے پیش کرنے کے بجائے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بابر نے تھوڑی سی پینے کے بعد وہی جام ملک احمد کی طرف بڑھا دیا۔

''جب ہم دونوں ایک ہو گئے تو جام دو کیوں ہوں۔''

پھر یہ دور اسی طرح چلتے رہے۔ بابر تھوڑی سی پیتا اور پھر وہی جام ملک احمد کو دے دیتا، ملک احمد نے یہ اندازِ مہمانی پہلی مرتبہ دیکھا ہوگا۔

جب شراب کا نشہ چڑھا تو بابر مست ہو کر ناچنے لگا۔ ملک احمد جو فارسی خوب جانتا تھا، وہ بھی ترنگ میں آگیا۔ اب عالم یہ تھا کہ وہ گا رہا تھا اور بابر مست ہو کر ناچ رہا تھا۔

مخالفوں کی کوششیں رائگاں گئیں اور دونوں کے درمیان دوستی پروان چڑھتی رہی۔

☆☆☆

بابر کی عمر اب بیالیس برس ہو گئی تھی۔ اس عمر کا ایک بڑا حصہ کوئی محفوظ ٹھکانا ڈھونڈنے میں گزر گیا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے اپنے تمام علاقے گنوا چکا تھا۔ آسمان پر اڑتے ہوئے

پرندوں کو دیکھ کر وہ سرد آہ بھر کر رہ جاتا تھا۔ سوچتا تھا وہ کابل کا بادشاہ ضرور بن گیا ہے لیکن وہ ان پرندوں سے بھی گیا گزرا ہے۔ یہ وادی فرغانہ سے گزر کر آرہے ہوں گے لیکن وہ وہاں نہیں جا سکتا۔ ''اندجان'' کا وہ محل یاد آتا تھا جہاں اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ آخشی کا قلعہ یاد آتا تھا ان کبوتروں کی یاد آتی تھی جو اس کے باپ کو بہت عزیز تھے۔ اب انہیں دانہ کون ڈالتا ہوگا۔ اسے اپنی شمالی میراث کا خیال اداس رکھتا تھا۔ آج وہاں کے تمام بڑے علاقوں پر ازبک خاں کی بادشاہی تھی۔ تاشقند، سمرقند، بخارا، قرشی سب اس کے باج گزاروں میں بٹے ہوئے تھے۔ شیبانی خاں اس کا سب سے بڑا دشمن مر چکا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے علاقے دوبارہ واپس لینے کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔

ان افسردہ برسوں میں ایک خانزادہ بیگم تھی جو اسے اچھے دنوں کی یاد دلا کر حوصلہ دلاتی رہتی تھی۔ خالی وقت میں وہ ''ظفر نامہ'' پڑھنے بیٹھ جاتا تھا۔ امیر تیمور کی فتوحات کی پرتکلف فارسی میں مدح و ثنا پڑھ کر اسے اپنی ناکامی اور بھی نمایاں نظر آنے لگی تھی۔

اس نے اپنی اس کمزوری کو خود اپنی نظروں سے چھپانے کے لیے ''بادشاہ'' کا لقب اختیار کر لیا لیکن اس کی قوت کا دارومدار ان مغل شمشیر زنوں پر تھا جن کی وفاداری پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چند دانش مند مشیر تھے جن سے وہ بہت کم مشورہ کرتا تھا۔ غلے کے لیے افغانی قبائل پر دھاوے کرنے پڑتے تھے۔

وہ روز بہ روز شراب میں غرق ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی دونوں تینوں بیگمات اسے باز رکھنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں لیکن وہ بادشاہ تھا اسے کون روک سکتا تھا۔ گھر کی عورتیں اسے کیسے راہِ راست پر لا سکتی تھیں۔ شراب کے ساتھ ساتھ اب اس نے افیون کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔ کبھی کبھی اسے اپنی حالت پر خود افسوس ہوتا لیکن بے بس تھا۔ اسی نشے میں وہ بے پناہ سفاکی کا مظاہرہ بھی کر بیٹھتا تھا جس سے اسے بہرحال فائدہ ہوا۔ اس کا رعب دور دور تک قائم ہو گیا۔ اہل و عیال کے علاوہ بہت سے پناہ گزین کابل پہنچے۔ ان کی خبر گیری کی ذمے داری بھی اس کی تھی۔ پھر قدیم الملازمت امرا تقریباً سبھی صاحب اہل و عیال تھے اور انہیں گزر اوقات کے لیے زمینداری درکار تھی۔ کابل کی غیر آباد وادیوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتا۔

ابتدائی عمر میں اس کے بچے نہیں ہوئے۔ سب سے بڑا ایک ہمایوں تھا۔ وہ خود ابھی نگرانی کا محتاج تھا۔ دوسرے چھوٹے بچے محل سراؤں میں پرورش پا رہے تھے۔ وہ ابھی سے سوچنے لگا تھا کہ جب یہ جوان ہوں گے تو انہیں کون سی ولایت دے گا؟ کنبے کی خواتین شاہی توقیر کے ساتھ کہاں رہیں گی؟

وہ نئی جاگیروں کی تلاش میں ہندوستان کی فتح کے خواب دیکھنے لگا تھا لیکن کبھی امرا کے فساد میں الجھ جاتا۔ کبھی بھائیوں کی سازشوں میں الجھنا پڑ جاتا تھا۔ وہ ہندوستان پر اپنا حقِ وراثت سمجھتا تھا کیونکہ اس کے جدِامجد امیر تیمور نے وہ علاقہ فتح کیا تھا۔

خیبر کا راستہ ہو یا سوات کے بلند پہاڑ یا درۂ قراقرم۔ تمام گزرگاہوں پر پٹھانوں کا پہرا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہاں بسنے والے یوسف زئی اور آفریدی کسی کمزور یا غافل سپہ سالار کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ جب سے اس نے ہندوستان جانے کا ارادہ کیا تھا اسی فکر میں تھا کہ ہندوستان کے دولت کدے تک پہنچنے سے قبل ان پہرے داروں کو اتنا مرعوب کر دیا جائے کہ جب وہ ان راستوں سے گزرے تو یہ شاہین اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے اسی منصوبے کی تکمیل کے لیے وہ اس طرح ان علاقوں میں جاتا تھا جیسے کوئی سیر و تفریح کے لیے جاتا ہے۔ کچھ دنوں وہاں لوٹ مار کرتا تھا اور پھر واپس چلا آتا تھا۔

ایسے ہی ایک معرکے میں وہ یوسف زئیوں کے علاقے میں چلا گیا۔ ان کی زمینیں پامال کر ڈالیں لیکن ان کا سنگو (قلعہ) فتح ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ یہ قلعہ ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ قلعے سے زیادہ پٹھان مضبوط ثابت ہو رہے تھے۔ اس کا بوڑھا امیر قاسم بیگ اس کوشش میں مصروف تھا کہ اگر دشمنی راس نہیں آرہی ہے تو ان قبائل کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ اس رات بھی ''دیارن'' کے پڑاؤ پر یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ بابر صلح کے حق میں نہیں تھا۔ وہ قاسم بیگ کی ہر بات مانتا تھا لیکن اس وقت الجھ رہا تھا۔

''اگر میں اتنا بوڑھا ہو گیا ہوتا جتنے تم ہو گئے ہو تو میں بھی یہی سوچتا جو تم سوچ رہے ہو۔ خون بہانے سے بہتر ہے کہ صلح کر لو لیکن میں یہاں قبضہ کرنے نہیں آیا ہوں۔ مجھے راہداری چاہیے اور اس کے لیے اپنا رعب قائم کرنا ہے۔''

''یہ بات ان موٹی عقل کے پٹھانوں کو صلح کے بعد ہی سمجھائی جا سکتی ہے۔''

''ان علاقوں میں آفریدی بھی ہیں، عیسیٰ خیل بھی ہیں اور بھی کئی ہیں، کس کس سے صلح کرو گے۔ صلح کی طرف وہ ہاتھ بڑھاتا ہے جو کمزور ہوتا ہے۔ میں خود کو کمزور نہیں طاقتور

ثابت کرنے کے لیے نکلا ہوں۔ مجھے ہر حال میں یہ قلعہ فتح کرنا ہے۔ یہ قلعہ ایک ایسی جگہ واقع ہے جہاں سے تمام قبائل کی نگرانی کی جاسکتی ہے۔ یہ قلعہ میرے لیے بہت اہم ہے۔ یوسف زئی سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ اگر ان پر ہم نے قابو پالیا تو دیگر قبائل خود بخود ہمارے زیرنگیں آجائیں گے۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک قلندر نہ جانے کہاں سے پڑاؤ پر آگیا۔ لوگ اسے پکڑ کر بابر کے پاس لے آئے۔ یہ قلندر فارسی بالکل نہیں جانتا تھا لیکن ایسی ایسی حرکتیں کر رہا تھا کہ لوگ ہنسے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر وہ ترنگ میں آیا اور ناچنے لگا۔ بابر اس کے ناچ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے ایک نوکر کو طلب کیا کہ وہ عود بجائے۔ عود کی لے پر قلندر خوب ناچ رہا تھا پھر وہ تھک کر بیٹھ گیا۔

دلہ زاک قبیلے کے کئی لوگ لشکر میں شامل تھے۔ بابر نے ان میں سے ایک کو بلایا کہ وہ قلندر سے مقامی زبان میں بات چیت کرے۔ معلوم تو ہو وہ کیا کہتا ہے۔

"منگو کے رستے دشوار ہیں۔ قلندر بن جا پھر قلعہ بھی تیرا قلعے والے بھی تیرے۔"

قلندر ناچتا ہوا اٹھا اور ٹیلے سے نیچے اتر گیا۔ بابر اس کے جانے سے ایسا اداس ہوا کہ شراب پینے بیٹھ گیا۔ وہ دماغ کی بیداری ایسی غیر معمولی رکھتا تھا کہ نشۂ شراب سے مغلوب نہ ہوسکتا تھا۔ نشہ طاری کرنے کے لیے شراب میں دو آتشہ سہ آتشہ "عرق" ملالیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ یہی کر رہا تھا لیکن اس کا ذہن پھر بھی کام کر رہا تھا۔ قلندر کا جملہ ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

"قلندر بن جا پھر قلعہ بھی تیرا قلعے والے بھی تیرے۔"

وہ اس رات کو صبح میں تبدیل ہونے تک اس جملے کی معنویت پر غور کرتا رہا اور پھر ساری بات سمجھ میں آگئی۔ وہ جوانی میں اکثر یہ تماشے کیا کرتا تھا، اسے یاد آیا جب وہ فرغانہ میں تھا تو اکثر بھیس بدل کر پہاڑی قبیلوں میں چلا جاتا تھا۔ کوئی اسے پہچان نہیں پاتا تھا اور وہ اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ کابل میں رہتے ہوئے بھی وہ بھیس بدل کر شہر کی نندی تک چلا گیا تھا اور کھیل تماشوں میں شریک ہو کر واپس آگیا تھا۔ "قلندر بن جا" سے مراد یہ ہے کہ میں قلندر کا بھیس بدل لوں۔ یہ خیال آتے ہی اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ آگئی۔ اس نے قلندر کا بھیس بھرا اور دیارن کے پڑاؤ سے ماہورہ پہاڑی پر چلا گیا جہاں قلعہ واقع تھا۔

ماہورہ پہاڑی کے عقب میں ملک احمد کے چھوٹے بھائی شاہ منصور کا مکان تھا۔ یہ جگہ شاہ منصور کا تخت کہلاتی تھی۔ بابر مکان کے پیچھے گیا۔ وہاں سے صحن بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ یہاں بہت سی بھیڑ بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ شاہ منصور کے بال بچے اور ایک لڑکی جس کا نام بی بی مبارکہ تھا دوسری عورتوں کے ساتھ ایک خیمے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

بی بی مبارکہ نے دیکھ لیا کہ دروازے پر کوئی فقیر کھڑا ہے تو اٹھی اور چند روٹیوں میں تھوڑا سا گوشت کا سالن رکھ کر نوکر کے ہاتھ بھیج دیا کہ جاکر فقیر کو دے آ۔ نوکر آیا اور روٹیاں فقیر کو پکڑا دیں۔

"یہ روٹیاں کس نے بھیجی ہیں؟"

"بی بی مبارکہ نے، بڑی سخی ہے بی بی مبارکہ۔"

"کہاں ہے وہ بی بی مبارکہ۔ میں اسے دیکھوں تو دعا دوں۔"

"وہ سامنے بیٹھی ہے جس کے سر پر نیلی اوڑھنی پڑی ہے۔"

بابر اس کی خوبصورتی دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ نوکر اسے دیکھ رہا ہے۔ نوکر یہی سمجھا ہوگا کہ بابا اس کی طرف دیکھ کر کوئی دعا کر رہے ہوں گے۔

"کیا تم اسے میرے پاس لاسکتے ہو؟"

"آپ قلندر ہیں۔ آپ کا حکم سرآنکھوں پر۔ میں ابھی ان سے کہے دیتا ہوں۔"

دوسرے ہی لمحے چودہ پندرہ سال کی ایک لڑکی اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ بابر نے ایسا حسن اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی گھنی پلکیں اس کی آنکھیں کا غلاف بنی ہوئی تھیں۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

"بی بی مبارکہ۔ ہماری طرف دیکھو۔"

لڑکی نے حکم کی تعمیل کی۔ اب وہ مرعوب بھی نظر آرہی تھی۔ سوچ رہی ہوگی اس فقیر کو اس کا نام کیسے معلوم ہوگیا۔

"تمہاری کہیں منگنی تو نہیں ہوئی۔"

اس سے پہلے نوکر بول پڑا۔ "نہیں جی ابھی منگنی تو نہیں ہوئی۔"

"ہوگی بھی نہیں۔" بابر نے کہا۔ لڑکی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں جی، کیوں نہیں ہوگی؟" نوکر نے پوچھا۔

"اس لیے کہ اس کی شادی ہوگی اور عنقریب ہوگی۔"

لڑکی شرما کر بھاگ گئی۔ بابر نے دروازہ چھوڑ دیا۔ روٹی سالن وہیں ایک پتھر کے پیچھے چھپا دیا۔ لشکر گاہ میں واپس آیا تو بی بی مبارکہ کے عشق کا اسیر ہوچکا تھا۔

لشکر کے امیر رات کی مجلس کے لیے اس کے پاس جمع ہوئے اور قلعے کو فتح کرنے کی باتیں ہونے لگیں لیکن بابر اس گفتگو میں جیسے شریک ہی نہیں تھا۔ اس نے یہ کہہ کر انہیں خاموش کردیا کہ ابھی تین چار دن تک اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی جائے۔ وہ خود کوئی ترکیب نکال لے گا۔

اس نے ترکیب یہ نکالی کہ ملک احمد کو خط لکھا اور اس کے بھائی شاہ منصور کی بیٹی مانگی۔ ملک احمد کو اس کی اس "مانگ" پر سخت اعتراض تھا۔ اس نے لکھا کہ آپ کے چچا الغ بیگ اور خان مرزا الاغری سے بھی یوسف زئی بیٹیاں بیاہی گئیں لیکن نتیجہ قوم کی خرابی کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ دوسرے اس نے یہ بھی لکھا کہ شاہ منصور کی کوئی لڑکی شادی کے لائق نہیں۔

بابر نے دوسرا خط لکھا اور ملک احمد کو لاجواب کردیا۔ اس نے پورا واقعہ لکھ بھیجا کہ کس طرح وہ بھیس بدل کر شاہ منصور کے گھر گیا اور بی بی مبارکہ پر اس کی نظر پڑ گئی۔ وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اس گھر میں کوئی لڑکی شادی کے لائق نہیں۔

احمد اور منصور پھر بھی تیار نہیں تھے کہ بابر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ انکار کی صورت میں اس کی آتش غضب مزید بھڑکے گی۔ اس مسئلے پر ملک احمد نے جرگہ بلالیا تاکہ سب لوگوں کی رائے لے لی جائے۔ جرگے نے متفق ہو کر فیصلہ بابر کے حق میں دے دیا۔

"پہلے بیٹیاں دی جاچکی ہیں تو اب بی بی مبارکہ کو دینے سے انکار کرنا اور بادشاہ کو قبیلے کا دشمن بنانا درست نہ ہوگا۔"

دونوں بھائی بھی رضامند ہوگئے کہ اگر قبیلے کی بھلائی اسی میں ہے تو بہت اچھا۔ یونہی سہی۔

بابر کو رضامندی کی خبر پہنچی تو خوشی کے نقارے بجنے لگے۔ جشن برپا ہوا۔ دلہن کے لیے بیش بہا تحائف بھیجے گئے۔

عام طور پر دلہا، دلہن کو لینے اس کے گھر جاتا ہے لیکن یہاں دوسرا ہی بندوبست کیا گیا تھا۔ دونوں ملک نوکروں چاکروں کے ساتھ لڑکی کو لے کر شاہی لشکر گاہ میں آئے۔ قاضی بھی ان کے ساتھ تھے۔ عین وسط میں بہت بڑا خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ اسی خیمے میں نکاح کی رسم ادا ہوئی۔ بی بی مبارکہ اپنی دایہ اور چند نوکرانیوں کے ساتھ اپنے خیمے میں چلی گئی۔

بی بی مبارکہ نے اپنی نوکرانیوں سے کہہ دیا تھا کہ بادشاہ کے آنے کی خبر رکھیں۔ ملک احمد نے جس طرح بتادیا تھا وہ اسی طرح بادشاہ کا استقبال کرنا چاہتی تھی۔

نوکرانیوں نے آکر خبر دی کہ بادشاہ تمہارے خیمے کی طرف آرہے ہیں۔

بی بی مبارکہ فوراً تخت سے اتر کر قالین پر دست بستہ کھڑی ہوگئی۔ جب بابر نے خیمے کے اندر قدم رکھا۔ وہ تقریباً زمین تک جھک گئی اور نہایت جھک کر آداب بجالائی۔ اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ بابر نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا اور تخت پر بیٹھ گیا۔

"میری افغانی بیگم آؤ میرے پاس آکر بیٹھو۔"

اس نے اس عزت افزائی پر ایک مرتبہ پھر جھک کر آداب کیا لیکن آگے نہیں بڑھی۔

بادشاہ نے بے قرار ہو کر پھر کہا۔ "کیوں ترساتی ہو۔ آؤ ہمارے پاس آکر بیٹھو۔ آپ نے تو ابھی تک اپنا چہرہ بھی ہمیں نہیں دکھایا جس پر ہم مرمٹے تھے۔"

بی بی مبارکہ نے چہرہ بے نقاب کیا لیکن ساتھ ہی اپنا دامن بھی اوپر اٹھادیا۔

بی بی نے کہا۔ "مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں؟"

"کہو کیا کہتا ہے؟" بادشاہ نے کمال عنایت سے کہا۔

"یہ دامن آپ دیکھ رہے ہیں۔" اس نے اپنے اٹھے ہوئے دامن کی طرف اشارہ کیا۔ "سمجھ لیجیے ساری یوسف زئی قوم میرے دامن میں اکٹھی ہے۔ میری خاطر ان کے قصور معاف کردیجیے۔ آئندہ ان کی طرف آپ کی تلوار نہ اٹھے۔ بس یہی میری التجا ہے۔"

بابر اس وقت جتنا نادم ہوا کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے تخت سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ "میں نے یوسف زئی کے سب قصور معاف کردیے۔ تمہارے سامنے ان کو تمہارے دامن میں ڈال دیا۔ اب میرے دل میں یوسف زئی سے کوئی کدورت نہیں۔"

وہ پھر جھک کر آداب بجالائی۔ بادشاہ ہاتھ پکڑ کر اسے تخت پر لے گیا۔

جب نماز عصر کا وقت ہوا۔ بابر تخت سے اٹھا تو بی بی مبارکہ جلدی سے اٹھی اور اس کی جوتیاں لاکر رکھیں۔

"میں تم سے بہت خوش ہوا۔ تمہاری خاطر تمہاری قوم کی خطائیں بخش دیں۔" پھر ایک قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ بات ضرور ملک احمد نے تم کو سکھائی ہوگی۔"

"جس نے بھی سکھائی بات تو اچھی سکھائی۔" بی بی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

سندھ کو جانے کا ایک راستہ اسی طاقتور قبیلے کی زد میں

تھا۔ بی بی مبارکہ سے شادی کے بعد یہ راستہ بابر کے حق میں ہموار ہوگیا۔

اب اس نے وعدہ کرلیا تھا کہ یوسف زئیوں پر حملہ نہیں کرے گا۔ اس نے اپنے امرا سے صاف صاف تو نہیں کہا لیکن یہ عذر ضرور پیش کیا کہ قمری سال ختم ہو رہا ہے۔ کاشت کار فصلیں اٹھا کر جاچکے ہیں۔ اب اگر سوات تک بڑھے چلے گئے تو غلہ میسر نہیں آئے گا اور لشکر کم رہ جائے گا۔ آئندہ کسی برس فصلوں کے تیار ہونے کے وقت ان کی خبر لی جائے۔

اس کا یہ غصہ کہیں تو اترنا تھا۔ اس کا نشانہ قصبہ باجوڑ بنا۔ اس کے گرد مضبوط سنگین فصیل تھی۔ بابر نے ایک سفارت یہاں کے سلطان کے پاس بھیجی کہ وہ دروازے کھول دے اور بادشاہ کی اطاعت قبول کرے۔ سلطان کی طرف سے نہایت حقارت آمیز جواب آیا۔ اب حملہ کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ فوج کو حکم دیا کہ فوج والے زرہ اور ہتھیاروں سے مسلح ہوکر تیار ہوجائیں۔

یہ تیاری ہو رہی تھی کہ سو ڈیڑھ سو آدمیوں نے قلعے سے نکل کر حملہ کردیا۔ بابر کے سپاہیوں نے ایک ہی ہلے میں انہیں واپس جانے پر مجبور کردیا۔ دوسرے دن باقاعدہ جنگ ہوئی۔ اس معرکے میں کچھ نہیں تو تین ہزار باجوڑ مارے گئے اور قلعہ فتح ہوگیا۔ بابر نے سلطان کے محل میں قیام کیا۔

باجوڑ کا قلعہ تو دن بھر میں فتح ہوگیا تھا لیکن اس فتح کے مزے لوٹتے ہوئے اس نے تین چار مہینے یہیں گزار دیے۔

باجوڑ میں کچھ زیادہ دولت ہاتھ نہیں آئی تھی لہٰذا اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ امرا نے مخالفت کی لیکن وہ اپنی بات پر ڈٹا رہا اور دریائے سندھ کی طرف یلغار کی اور دریا کے قریب پہنچ کر کوئی قابل عبور گھاٹ تلاش کرنے کے لیے کئی آدمی مقرر کیے۔ دوسرے دن اس کے آدمی ایک گھاٹ کی خبر لائے۔ مال واسباب کے اونٹ، پیادہ سپاہ اور سوار دریا پار ہوئے۔

بابر کسی معصوم بچے کی طرح اس علاقے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ دریا کے دوسری طرف آتے ہی دریا کی ہیئت ہی بدل گئی ہے۔ آسمان بھی دوسرا تھا۔ کابل کے صاف مطلع کے بجائے ابر آلود اس کے سر پر چھایا ہوا تھا۔ کسانوں کے گاؤں اور پالتو جانوروں کے گلے تک۔ انتہا یہ کہ پرندے اور جنگلی جانور تک مختلف تھے۔

جب ساری فوج دریا عبور کرچکی تو وہ آگے بڑھا۔ کچھ کوٹ پہنچا۔ سکندا کے پہاڑ کو قطع کیا اور دوسرے دن دوپہر کے وقت سوہان ندی پر پہنچ گیا۔ اسے پار کیا اور رات اسی کے کنارے بسر کی۔

اب اس کا سفر ''بھیرہ'' کی جانب تھا۔ اس علاقے میں وہ اس لیے جانا چاہتا تھا کہ جب امیر تیمور نے ہندوستان سے واپسی اختیار کی تھی، یہ علاقہ مدت تک اس کی اولاد کے پاس رہا تھا۔

بھیرہ سے سات میل پہلے اس نے خود کو جودہ پہاڑ کے قریب پایا۔ اس پہاڑ پر دو قومیں آباد تھیں۔ آدھے پہاڑ کی مالک جودہ قوم اور آدھے کی جنجوعہ قوم تھی۔ جنجوعہ قوم کا حاکم ان دنوں ہست نامی ایک شخص تھا۔

حاکم ہست بابر کے پاس آیا۔ اس کی اطاعت قبول کی اور نذر پیش کی۔ یہ علاقہ جو بھیرہ خوشاب اور چنیوٹ پر مشتمل تھا، تیموری قلم رو میں شامل سمجھا جاتا تھا اس لیے بابر نے حکم دیا کہ اس علاقے کے کسی باشندے کو آزار نہ پہنچایا جائے اور نہ لوٹ مار کی جائے۔

یہ حکم دے کر پیش قدمی پھر شروع کردی۔ یہاں سے چل کر وہ ایک نہایت پرفضا مقام پر پہنچا۔ یہاں ایک تالاب تھا جو تقریباً تین میل کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ ایک ندی بھی تھی اور دامن کوہ میں ایک چشمہ بھی پھوٹتا تھا۔ یہ ماحول اسے اتنا پسند آیا کہ اس نے یہاں ایک باغ لگوایا اور اس کا نام باغ صفا رکھا۔ اس مقام کا نام کلاہ کتار معلوم ہوا۔

اس علاقے کی فیض رسانی سے لطف اندوز ہونے کے بعد اب فاصلہ ہی کتنا تھا۔ دامن کوہ میں ستانے کے بعد بھیرہ پہنچ گیا۔ یہ علاقہ کافی مدت تک امیر تیمور کی اولاد کے قبضے میں رہا تھا لیکن اب ابراہیم لودھی سلطانِ دہلی کے ایک امیر دولت خاں کے بیٹے علی خاں کی جاگیر میں تھا۔

بابر نے یہاں دربار لگایا اور ابراہیم لودھی کے نام ایک مراسلہ اس مضمون کا لکھوایا کہ چونکہ یہ علاقہ ترکوں کا ہے اس لیے وہ اس سے دست بردار ہوجائے۔ یہ مراسلہ اس نے اپنے ایک قاصد کے حوالے کیا۔ بھیرہ کی حکومت اپنے ایک امیر ہندو بیگ کے سپرد کی۔ کچھ امیروں کو اس کی معاونت کے لیے یہاں چھوڑا۔

اس نے اٹک کے ساحل تک یلغار کی اور پنجاب کی سرحدوں پر کھکروں اور دوسرے مفسدوں کی سرکوبی کی۔ جو علاقے امیر تیمور کی فتوحات میں شامل تھے ان کی ازسرنو تقسیم کی اور ہر جگہ بادشاہی حاکم مقرر کردیے۔

وادیِ سندھ میں یلغار کرکے گرمیوں کے آخر میں فوج واپس آرہی تھی کہ درۂ خیبر کے قریب قیام ہوا۔ ایک مقامی [illegible] اس نے خبر دی کہ آفریدی درے کے [illegible] قافلہ لوٹنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ اس نے [illegible] کہ اسی وقت آفریدیوں پر حملہ کیا جائے لیکن [illegible] محسوس کی۔

[illegible] رالی بی فکر ہے۔''

اس کی مخاطب بی بی مبارکہ تھی جسے حفاظت کی غرض [illegible] چھوڑ آیا تھا۔

''[illegible] کی دل پسند پہاڑی پر بنایا ہوا وہ شراب کا [illegible] ہے جو میں نے سرخ رنگ ساق سے بنوایا [illegible] میں نے اپنا ایک شعر کندہ کرایا ہے۔

[illegible] بہار و دلبرے خوش ایست

[illegible] کوش کہ عالم دوبارہ نیست

[illegible] یاد آرہی ہیں جو گرمیوں کی راتوں کو [illegible] لی تھیں۔ میں اب کسی جنگ میں الجھنا نہیں چاہتا۔''

[illegible] سے بی بی مبارکہ کو ساتھ لیتا تھا اور پھر [illegible] مراجعت کرجاتی تھی۔

☆☆☆

[illegible] آیا تو اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا [illegible] نے آنکھیں دکھانی شروع کردی تھیں۔ اس [illegible] بڑی سختی سے کچل دیا۔

[illegible] حریف بیگ ارغون سے قندھار بھی [illegible] لیا تھا۔ ارغون جنوب کی طرف سندھ کی گرم [illegible] کی طرف چلا گیا تھا۔ شاہ اسمٰعیل صفوی کو عثمانی ترک [illegible] اب وہ مشرقی علاقوں کو پریشان [illegible] نہیں کرسکتا تھا۔ ہر طرف امن ہی امن تھا۔ [illegible] کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ تقریباً ملتوی [illegible]

[illegible] کی طرف سے ایک چھوٹی سی جھڑپ کے [illegible] ہندو بیگ بھیرہ سے کابل واپس آگیا۔ [illegible] معلوم ہوا کہ بابر کے پلٹتے ہی بھیرہ کے لوگ [illegible] کے ساتھ مل کر اس پر حملہ آور [illegible] وہ بھیرہ میں رکنے کے بجائے خوشاب چلا گیا [illegible] پہنچا اور اب وہ بابر کے حضور [illegible]

[illegible] ''ظفر نامہ'' پڑھتا رہتا تھا جس میں امیر [illegible] کی تصویر کشی وضاحت سے کی گئی تھی۔ [illegible] کی موت اس کے دل میں کچھ زیادہ ہی گھر کر [illegible] سنا کہ امیر کے مفتوحہ علاقے سے پہلے اس کی اولاد سے حکمرانی چھینی گئی اور اب اس (بابر) کے مقرر کردہ حاکم کو بے دخل کردیا گیا تو ایک مرتبہ پھر اس کے دل میں کم ازکم بھیرہ تک جانے کی خواہش جاگ اٹھی۔

اس چنگاری کو شاید ابھی اور ہوا درکار تھی۔

موسم بہار کی آمد آمد تھی۔ مرغزاروں پر جوانی آئی ہوئی تھی۔ وہ دوستوں کے ساتھ ''چار باغ'' میں بیٹھا موسم سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ایک سوداگر عالم خاں کابل میں داخل ہوا۔ ایسے بہت سے تاجر ہندوستان کے توادرات لے کر آتے رہتے تھے۔ ان سوداگروں کا سب سے اہم گاہک خود بادشاہ کابل (بابر) تھا۔ ان سوداگروں سے چونکہ ہندوستان کے حالات کا بھی علم ہوتا رہتا تھا اس لیے بابر ان کا بڑا قدردان تھا اور انہیں اجازت تھی کہ وہ بلا روک ٹوک بابر کے پاس آسکتے ہیں۔ سوداگر عالم خاں کو بھی کسی نے نہیں روکا۔ اس سوداگر نے کپڑوں کے تھان پھیلانے کے بہانے ایک رقعہ بابر کے ہاتھ میں تھما دیا۔

یہ رقعہ تاتار خاں کے بیٹے دولت خاں لودھی حاکم لاہور اور اس کے بیٹے غازی خاں کی طرف سے لکھا گیا تھا اور اس پر سلطان ابراہیم لودھی سلطانِ دہلی کے بڑے بڑے امرا کے دستخط تھے۔ ان سب نے متفق ہوکر بابر سے ہندوستان تشریف لانے کی درخواست کی تھی۔

بابر نے اس وقت تو اسے جانے دیا لیکن محل میں پہنچ کر اسے دوبارہ طلب کیا۔ اس وقت اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کافوری شمعوں کی روشنی کے سامنے دونوں بیٹھے ہندوستان کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

''سلطان ابراہیم کے نامور امرا اس کے خلاف ہوچکے ہیں۔ یہی حال رعایا کا بھی ہے۔ سب بھوکے مر رہے ہیں۔ وہ صرف اپنے خزانے بھر رہا ہے۔ اس کے باپ نے اسے عظیم سلطنت دی تھی لیکن اس نے سب کچھ تباہ کردیا ہے۔ اب ایک ایسی طاقت، ایک ایسے نام کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے جس کے گرد سارا ملک متحد ہوسکے۔ یہ نام آپ کا ہے۔''

''کیا تو اور وہ جس نے تجھے بھیجا ہے یہی سمجھتے ہیں جو تو نے کہا۔''

''دولت خاں کا بیٹا دلاور خاں اسی یقین دہانی کے لیے میرے پیچھے چلا آرہا ہے۔ اس سے مل کر یقیناً آپ کو یقین آجائے گا۔ میں چونکہ یہاں جلدی پہنچنے والا تھا اس لیے یہ رقعہ میرے ہاتھ بھیج دیا گیا۔''

عالم خاں سوداگر اٹھ کر گیا تو بابر کے اردگرد بہت سے

اندیشے آکر کھڑے ہو گئے۔ وہی اندیشے جو بہت بڑی ذمے داری ملتے وقت آدمی کو پریشان کرتے ہیں۔ اب تک وہ جتنی مرتبہ سندھ کے دروازے تک گیا تھا لوٹ کر کابل آ گیا تھا لیکن اب جو صورت حال بن رہی تھی اس سے لگتا تھا وہ کابل کبھی نہ آنے کے لیے جائے گا۔

وہ اس وقت محل کے اس حصے میں تھا جہاں سے ہمایوں کی ماں ماہم انگہ کا مکان نزدیک تھا۔ یوں بھی جب وہ امور مملکت کی طرف سے پریشان ہوتا تھا تو ماہم بیگم کے پاس جا کر ہی اسے قرار ملتا تھا۔ ماہم بیگم نہایت اچھی سمجھ بوجھ کی خاتون تھی۔

خدام نے پہلے ہی اطلاع کر دی تھی کہ بادشاہ کی آمد آمد ہے۔ ماہم بیگم نے جلدی جلدی سنگار کیا اور سراپا انتظار بن کر کھڑی ہو گئی۔

بادشاہ یہاں اس لیے آیا تھا کہ عالم خاں سوداگر کی باتوں سے کچھ دیر کے لیے نجات پا کر ماہم میں گم ہو جائے گا۔

ماہم بیگم اس وقت 37 سال کی عورت نہیں بلکہ دوشیزہ لگ رہی تھی۔ بابر بھی اس سج دھج کو نظر انداز نہ کر سکا، اپنے ہاتھوں سے اس کی کمر کے گرد حلقہ بنا دیا۔

”میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ مجھے آپ میسر ہیں۔“

”میں صرف اس لیے اہم ہوں کہ آپ کے پہلے بیٹے کی ماں ہوں ورنہ بادشاہ اور کنیز کا کیا جوڑ۔“

”میں بادشاہ ضرور ہوں لیکن دوسروں کے لیے۔ آپ کے سامنے تو محض غلام ہوں اور وہ بھی بے دام۔“

”آپ اور غلام۔“ ماہم بیگم کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہماری ہر خواہش کی تکمیل کے لیے آپ حاضر ہیں۔“

”میں شاید بنایا ہی اس لیے گیا ہوں کہ آپ کی ہر خواہش پوری کرتا رہوں۔“

”تو پھر آپ سے ایک درخواست ہے۔“ ماہم بیگم سنجیدہ ہو گئی۔ ”ہم نے اپنے بیٹے کو دو سال سے نہیں دیکھا۔ آپ میرے ہمایوں کو کابل سے واپس بلا لیجیے۔“

”وہ ہمارا بڑا بیٹا ہے۔ بازو ہے ہمارا۔ وہ ہماری شمالی سرحدوں کی حفاظت پر تعینات ہے، کیسے بلا لوں اسے۔ اس کی جگہ کون ہے جو جائے گا؟“

”کیا مرزا کامران نہیں جا سکتے؟ وہ بھی اب خیر سے سولہ سال کے ہو چکے ہیں۔ گل رخ بیگم کو بھی تو معلوم ہو کہ بیٹے کی جدائی کسے کہتے ہیں۔“

”مرزا ہمایوں ولی عہد ہیں۔“

”تو کیا یہی میرا قصور ہے کہ میں ولی عہد کی ماں ہوں۔ سب کے بیٹے ان کے پاس ہیں، ایک میں ہی......“ ماہم بیگم کی آواز گلے ہی میں پھنس گئی اور بابر کے منہ سے جوشِ جذبات میں ایک جملہ نکل گیا۔

”وہ ہندوستان جانے سے پہلے کابل ضرور آئیں گے۔ خوب جی بھر کے دیکھ لیجیے گا۔“

”تو کیا آپ......؟“

”ہاں۔ اگر ہم ہندوستان گئے تو وہ ہمارے ساتھ ضرور جائیں گے۔“ اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے نادانستگی میں کیا کہہ دیا۔ اپنی خفت مٹانے کے لیے اسے طویل تمہید باندھنی پڑی۔ ”مجھے مال و زر کی ہوس نہیں۔ میں تو ہندوستان کو سمرقند بنانے جا رہا ہوں۔ میں مرزا کامران کو قندھار بھیج دوں گا۔ مرزا عسکری بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ آپ ہندوستان میں ولی عہد کی ماں بن کر حکومت کریں گی۔“

اب بابر بات کو آگے بڑھنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ ”بیگم کسی سے کہو تلخ یادیں مٹانے والی دوا لے کر آئے۔“

”اگر آج یہ فریضہ ہم انجام دیں؟“

”تو ہمیں شراب کو دو آتشہ کرنے کے لیے عرق ملانے کی حاجت نہیں رہے گی۔“

ماہم بیگم نے پردہ ہٹا کر شراب کی طلائی صراحی نکالی۔ چاندی کے ساغر میں سنہری شراب نے جگہ بنائی اور ماہم بیگم کے ہاتھوں کے ذریعے بابر کے ہونٹوں تک پہنچ گئی۔

”آپ کو معلوم ہے ہم کبھی اکیلے شراب نہیں پیتے۔ اس وقت اس لیے پی رہے ہیں کہ ہم اکیلے نہیں۔ اس وقت ہمارا لشکر بھی ہمارے ساتھ شراب پی رہا ہے جسے لے کر ہم ہندوستان جانے والے ہیں۔ سمرقند نے ہم سے بے وفائی کی لیکن ہندوستان کبھی نہیں کرے گا۔“

☆☆☆

دولت خاں کا بیٹا دلاور خاں سوار ہوا اور اس تیز رفتاری سے چلا کہ دس دن کے اندر اندر کابل پہنچ گیا۔ ملا زمانِ شاہی نے عرض کیا کہ ایک افغان، ہندوستان کے بادشاہ سے رنجیدہ خاطر ہو کر آیا ہے اور چاہتا ہے عرضِ احوال کرے۔ حکم ہوا کہ حاضر کریں۔

دلاور خاں حاضر ہو کے کورنش بجا لایا اور ایک ایک کر کے ہندوستان کی خرابیِ احوال بیان کی۔ بیشتر وہی باتیں تھیں جو عالم خاں سوداگر بابر کو بتا چکا تھا۔

بابر نے کہا۔ ”تم تیس سال سے سلطان ابراہیم اور اس کے باپ دادا کا نمک کھا رہے ہو اور بیس سال سے ملک

پنجاب میں صاحبِ اختیار چلے آ رہے ہو۔ اب یکبارگی کیا ہو گیا کہ اس سے ناراض ہو کر میری طرف متوجہ ہوئے ہو؟“

دلاور خاں نے عرض کیا۔ ”میرے باپ دادا اس کے اور اس کے باپ کے لیے جاں نثاری کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے اس کی سلطنت کی بنیاد مضبوط کر دی ہے۔ اب سلطان ابراہیم اپنے باپ کے امرا سے بدسلوکی کر رہا ہے۔ اب تک وہ تیس امرا کو جو ستونِ دولت اور بنیادِ سلطنت تھے، انہیں بے گناہ قتل کرا چکا ہے۔ بقیۃ السیف امرا کو اس کے قہر سے نجات کی امید نہیں۔ اسی لیے انہوں نے مجھے اس بارگاہ میں بھیجا ہے۔ وہ سب امرا آپ کے لیے آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں۔“

دلاور خاں واپسی کے لیے سامان باندھ چکا تھا لیکن بابر نے اسے ضد کر کے روک لیا۔ ان دنوں چونکہ مرزا کامران کی شادی تھی اس لیے باغ شہر آرا شاہ لالہ میں بہت بڑا جشن منایا گیا جس میں عشوہ طراز، شیریں کار، گل اندام ناچ گانے والیاں موجود تھیں اور ایک ابرِ نوبہار جیسا سائبان زرنگار رکھا تھا۔ دلاور خاں بھی اس جشنِ مسرت میں شریک تھا۔

بابر نے یہ رات اسی باغ میں بسر کی۔ رات کے پچھلے پہر دو رکعت نماز درگاہِ کارساز میں ادا کرنے کے بعد دستِ نیاز اٹھائے اور دعا کی۔

”اے خدائے کارساز! اگر ہندوستان کی حکومت میرے اور میری اولاد کے نصیب میں ہے تو ہندوستان سے پان اور آم دولت خاں کی طرف سے بہ طور سوغات آئیں۔“

مقبولیت کا کوئی ایسا وقت تھا کہ جشنِ مسرت کی گھڑیاں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ دلاور خاں نے بارگاہِ شاہی میں حاضر ہو کر ہندوستان سے ایلچی کی آمد کی خبر سنائی۔

”دولت خاں کا ایلچی احمد خاں حاضرِ خدمت ہے۔“

دولت خاں نے پان اور نیم پختہ آم شہد کے کوزوں میں رکھ کر ایلچی کے ہاتھ بھیجے تھے۔

بابر کی نظر جیسے ہی اس سوغات پر پڑی وہ فوراً تخت سے نیچے اترا۔ اس نے اپنا روئے نیاز درگاہِ بے نیاز زمین پر رکھ دیا۔

”بس میرے مالک مجھے یقین آ گیا۔ ہندوستان کی بادشاہی مجھے بخش دی گئی ہے۔ یہ انتظام اور کر دے کہ یہ بادشاہی میری اولاد میں دیر تک برقرار رہے۔“

دلاور خاں اور احمد خاں کو گھوڑا اور خلعت عطا کی۔ دس عراقی گھوڑے اور تیس پارچہ جات دولت خاں کے لیے دے کر احمد خاں (ایلچی) کو آگے روانہ کر دیا۔

اسی دن سے ہندوستان پر یورش کی تیاری شروع کر دی۔

ہندوستان کا نقشہ اس کے سامنے کھلا رکھا تھا۔ اس کے امرا اس کے اردگرد بیٹھے تھے۔ وہ اس نقشے پر اپنی انگلیاں پھیرتا ہوا کابل ندی کے کنارے خیبر کی سرخی مائل پہاڑیوں کے درے سے نکل کر آیا تو وہ کسی جداگانہ معاشرے کو چھوڑ کر کسی دوسری نئی قوم پر حملہ نہیں کر رہا تھا۔ اسے یاد آیا وہ کئی سال پہلے اسی جگہ پنجاب کے دریا (چناب) تک سرزمین کا جائزہ لے کر جا چکا تھا۔

وہ مانوس، سایہ دار پشاور سے چل کر بالائی سندھ کو قلعۂ اٹک پر عبور کرنا، پھر نمک کے پہاڑوں سے گزر کر ملک پنجاب پر چھا جانا چاہتا تھا۔ دلکش راوی کے کنارے لاہور پر قبضہ کر کے پنجاب پر اپنا تسلط مضبوطی سے قائم کرنا اور اسے سلطنت کابل میں شامل کرنا مقصود تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ دہلی کی طرف سے بے خبر تھا۔ نقشے میں اسے جنوب میں تھر اور شمال میں ہمالیہ، ہندوکش کے کوہستان نظر آ رہے تھے۔ ان قدرتی سرحدوں کو دیکھ کر ایک مرتبہ پھر سمرقند کی یاد آ گئی تھی۔ جب تک سمرقند پر قبضہ نہ ہو، فرغانہ کی چوڑی پٹی ہاتھ میں نہیں رہ سکتی۔

”پنجاب کو زیرِ نگیں لانے کے لیے دہلی کے طاقتور بادشاہ سے دو دو ہاتھ ضرور کرنے ہوں گے۔“ اس نے اپنے امرا سے کہا اور تھوڑی دیر کے لیے نقشے سے نظریں ہٹا لیں۔

”آپ کے سامنے اس کی طاقت کیا حقیقت رکھتی ہے۔“ خوشامدی امرا نے کہا۔

”دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے ہمیں اس سے مصالحت کرنی پڑ جائے۔ اس صورت میں ہم لاہور تک محدود رہیں گے۔ مجھے یہ بھی منظور ہوگا۔ میں پنجاب کا خطہ اپنا کر لاہور کو دوسرا کابل بناؤں گا۔ گنگا کی بالائی وادی سے آمو کی بالائی وادی بدخشاں تک میرا حکم چلے گا۔“

امرا کے رخصت ہونے پر وہ خوابوں سے حقیقت کی دنیا میں آیا تو اس نے لڑنے والے سپاہیوں کی گنتی کرائی۔ یہ شمار سات ہزار قلم بند ہوا جبکہ خدمت گار، بار برداری جیسے کاموں کے لیے پانچ ہزار نکلے۔ اس برائے نام لشکر کے ساتھ ہندوستان فتح کرنے کا خیال دیوانے کا خواب ہی تو تھا لیکن وہ دیوانہ ہی تو تھا۔ کابل میں پڑنے والی سردی بھی اسے نہیں روک سکی اور اس نے رخصت کا بگل بجا دیا۔ اسے کابل میں رہ کر یہ انتظار بھی شاق گزر رہا تھا کہ ہمایوں کو آنے دیتا۔

اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ آہستہ سفر طے کرے گا

اور ہمایوں کو لکھ دیا تھا کہ وہ تیز رفتاری کے ساتھ اس سے آکر مل جائے۔

دن بھر کا سفر طے کر کے درۂ یعقوب کے قریب ایک مرغزار میں قیام کیا۔ اسے شدت سے ہمایوں کا انتظار تھا جسے بدخشاں سے کابل ہوتے ہوئے اس سے آکر ملنا تھا۔

جب دو دن گزر گئے اور ہمایوں نہیں آیا تو اسے ماہم بیگم کی گفتگو یاد آنے لگی۔ وہ ہمایوں کو ہندوستان بھیجنے پر رضامند نہیں تھی۔ کہیں کابل ایک اور بغاوت سے ہم کنار تو نہیں ہو جائے گا۔ اسے وہ زمانہ یاد آگیا جب وہ سمرقند سے نکل آیا تھا اور اس کا دارالخلافہ اندجان بھی اس کے ہاتھ سے چلا گیا تھا۔ پھر اس نے اپنی زندگی کے پورے پانچ سال کسی مستقل ٹھکانے کی تلاش میں لگا دیے تھے۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں آیا ہے۔ اب بھی کابل کی طرف پلٹ سکتا ہے لیکن پھر اس نے اسے اپنا وہم کہہ کر جھٹک دیا۔ ایک آدمی کابل کی طرف دوڑایا کہ ہمایوں کی خبر لائے اور خود آگے بڑھ کر ایک اور باغ ''باغ وفا'' میں خیمہ زن ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر بھی اسے ہمایوں کا تکلیف دہ انتظار کرنا پڑا۔ بالآخر چوتھے دن ہمایوں ایک آراستہ لشکر کے ساتھ نمودار ہوا۔

سفر پھر شروع ہوا لیکن... اب کسی کا انتظار نہیں رہا تھا لہٰذا سفر عجلت میں طے ہو رہا تھا۔ اس کا لشکر منزلیں مارتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے پہنچ گیا۔

ابھی اس نے دریا پار نہیں کیا تھا کہ ایک اونٹنی سوار کہیں سے نمودار ہوا۔ یہ ان جاسوسوں میں سے ایک تھا جنہیں وہ کابل روانہ ہونے سے پہلے ہندوستان کی طرف بھیج چکا تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ دولت خاں اور اس کا بیٹا غازی خاں اس سے منحرف ہو گئے ہیں۔ انہوں نے افغانوں اور پہاڑی لوگوں کو جمع کر کے چالیس ہزار کا لشکر تیار کر لیا ہے اور لاہور پر قبضے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ایک سال قبل جب بابر پنجاب تک آکر واپس چلا گیا تھا تو اپنے محافظ دستے پنجاب کے دوآبوں میں واقع قلعوں میں چھوڑ گیا تھا۔ یہ معمولی سی تعداد کسی طرح بھی دولت خاں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں اس گھیرے سے نکالنا لازمی تھا۔ بھاری لشکر کے ساتھ برق رفتاری سے ان قلعوں تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ بابر نے اپنے لشکر کے ایک بہادر مومن علی تواچی کو تاکید کے ساتھ حکم دیا کہ ان محافظ دستوں کے امرا کو خبر کر دے کہ بابر پہنچ چکا ہے۔ جب تک وہ وہاں پہنچ نہ پائے، قلعے سے باہر نہ آئیں اور نہ جنگ و پیکار کا اقدام کریں۔

مومن علی تواچی سرپٹ دوڑ گیا۔

بابر نے بہ عجلت دریائے سندھ عبور کیا۔ ایک مرتبہ پھر حکم ہوا کہ فوج کی مردم شماری کی جائے۔ جن امرا کے ذمے کشتیوں کا انتظام تھا انہوں نے خبر دی کہ فوج میں سپاہی اور نوکر ملا کر بارہ ہزار ہیں۔

اس سال عام میدانوں میں بارش کم ہوئی تھی اس لیے پہاڑ کے دامن کے ساتھ ساتھ بڑھنا شروع کیا اور سیالکوٹ کا راستہ اختیار کیا تاکہ غلے کی تکلیف نہ ہو۔

اب وہ گکھڑوں کا علاقہ طے کر رہا تھا۔ راستے میں ایک ندی ملی۔ یہ دیکھ کر اس کے قدم رک گئے کہ ندی کے کناروں پر برف جمی ہوئی ہے۔ یہ برف کچھ زیادہ گہری نہیں تھی تاہم ہندوستان کے گرم علاقے میں اتنی برف جمے یہ بڑی عجیب بات تھی۔ اسے یہ سوچ کر ہنسی آگئی کہ وہ لاہور کو کابل بنانے چلا تھا، یہ برف بھی اس کے ساتھ چلی آئی ہے۔

پانچ منزلیں رکے بغیر طے کی جا چکی تھیں۔ تھکن سے برا حال تھا۔ کوہ جودہ سے ملحق بال ناتھ جوگی نامی پہاڑی سامنے تھی اور اس کے دامن میں ندی بہہ رہی تھی۔ اس ندی کے قریب پڑاؤ ڈالا اور فوج کو حکم دیا کہ آئندہ کے لیے اس علاقے سے غلہ جمع کر لیں۔ فوج غلہ جمع کرنے کے لیے ادھر ادھر ہو گئی۔ ندی کا بہاؤ دیکھ کر بابر سے رہا نہیں گیا۔ ہم پیالہ امیروں کے ساتھ بیٹھ کر شغل مے نوشی کیا۔

اسی پڑاؤ پر یہ دل شکن خبر ملی کہ سیالکوٹ ہاتھ سے چلا گیا۔ پچھلے سال ولی زلی نامی امیر کی تحویل میں دیا گیا تھا اور وہ غازی خاں کے خوف سے بھاگ آیا تھا۔ اس وقت بابر کے سامنے کھڑا تھا لیکن فوج کشی کا موقع تھا، نقصان بہت بڑا تھا لیکن اس کا عذر بھی معقول تھا۔ بابر نے صرف اتنا کیا کہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا۔

''تم سیالکوٹ میں نہ رہ سکے تھے تو دوسرے امرا کے پاس لاہور کیوں نہ چلے گئے؟''

ولی زلی کے پاس اس سوال کا بھی جواب نہیں تھا۔

خبریں آرہی تھیں کہ غازی خاں نے چالیس ہزار فوج جمع کر لی ہے اور دولت خاں نے دو تلواریں کمر سے باندھی ہیں اور جنگ پر تلے ہوئے ہیں۔

اگلے روز جہلم پار کیا۔

سید طوفان اور سید لاچین کو ایک ایک کوتل گھوڑا دے کر روانہ کیا کہ سرعت سے لاہور جا کر سرداروں سے کہیں کہ ہم سے سیالکوٹ آکر ملیں۔

اب وہ چناب کی طرف چلا اور دریا کے کنارے کنارے پڑاؤ لگایا۔ اس کا لشکر سیالکوٹ کے مضافات

میں پہنچا ہی تھا کہ سیالکوٹ کے بھوکے ننگے، لٹے پٹے لوگوں نے اس کے نام کی دہائی دی اور لشکر میں چلے آئے۔ وہ جاٹوں اور گجروں کی شکایت لے کر آئے تھے جو پہاڑوں سے اتر آتے ہیں اور باشندوں کی گائے بھینسیں لوٹ کر لے جاتے ہیں۔

"تمہارے سرداروں نے انہیں کبھی سزا نہیں دی۔ اسی لیے ان کی اتنی ہمت ہوگئی ہے۔" وہ انہیں تسلی دیتا۔

"اب ہم دوبارہ آگئے ہیں اور ہمیشہ کے لیے آئے ہیں۔ اب تمہیں کوئی تنگ نہیں کرے گا۔"

یہ لوگ بابر کے نام کی جے پکارتے ہوئے واپس چلے گئے۔

پچھلی دفعہ جب بابر یہاں تک آیا تھا تو اپنا محافظ دستہ یہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ان کا سردار ولی زلی تھا۔ بابر کو ایک مرتبہ پھر اس پر غصہ آیا۔ اس نے اسی کے ساتھ ایک فوج بھیجی کہ جائے اور ڈاکوؤں کو پکڑ کر لائے۔ یہ فوج پہاڑوں پر گئی اور کچھ لوگوں کو پکڑ کر لے آئی اور دو تین چوروں کے ٹکڑے کرا دیے تاکہ باقیوں کو عبرت ہو۔

بابر سیالکوٹ میں پڑاؤ ڈالے بیٹھا رہا۔ اسے ان قاصدوں کا انتظار تھا جو شاہی حکم لے کر امرائے شاہی کے پاس گئے ہوئے تھے۔ وہ جب واپس آئے تو یہ خبریں بھی لائے کہ غازی خاں لاہور کی طرف دریائے راوی کے کنارے قیام پذیر ہے۔

اس نے ایک جماعت کو پھر روانہ کیا کہ غازی خاں کا صحیح محل وقوع معلوم کرکے آئے اور یہ دیکھے کہ اس کے پاس کتنی فوج ہے۔

یہ جماعت تیسرے دن واپس آئی اور یہ خبر لے آئی کہ دشمن بادشاہی لشکر کے آنے کی اطلاع پا کر فرار ہوگیا، وہ یہاں تک اس لیے آگئے تھے کہ انہیں حضور کے آنے کی اطلاع نہیں تھی۔

غیر منظم دشمنوں کا الگ الگ منتشر ہونا عین بابر کے حسب مراد تھا۔ اس وقت تک لاہوری سردار بھی آگئے تھے۔ اس نے ان سرداروں کے ماتحت جو علاقے سے واقف تھے، تعاقب میں ایک فوج روانہ کی اور خود بھی یلغار کرتا ہوا کلانور کے نواح میں قیام پذیر ہوگیا۔

افواہوں کا ایک بازار سا گرم تھا۔ ایک افواہ یہ بھی اڑی ہوئی تھی کہ دولت خاں قلعہ ملوت میں چھپا ہوا ہے۔ یہ قلعہ کلانور سے آگے شیبی پہاڑوں میں واقع تھا۔ بابر نے ان افواہوں پر یقین کیا اور یہ سوچ کر کلانور سے کوچ کر گیا کہ اگر وہاں دولت خاں نہیں بھی ہوا تو بھی قلعہ تو ہاتھ آ ہی جائے گا۔

دولت خاں نے پہلے تو خطوط لکھ لکھ کر بابر کو حملہ آور ہونے کی دعوت دی اور پھر اس کی نیت خراب ہوگئی اور سارا پنجاب خود لینے کے لیے سازشیں کرنے لگا اور اس کے خلاف فوج جمع کرلی۔ اس کا بیٹا غازی خاں اس کے ساتھ تھا البتہ دوسرا بیٹا دلاور خاں ان سازشوں کے خلاف تھا۔ سازش یہ تھی کہ مختلف طاقتوں کو ساتھ ملا کر ابراہیم سے دہلی چھین لیں، ادھر بابر کے لاہوری دستے کا قلع قمع کرکے اسے بڑھنے سے روکے رکھیں کیونکہ انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ بابر کے پاس جنگ آزما سپاہیوں کی تعداد بہت قلیل ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ بابر کی فوج تعداد میں کم ہے لیکن نہایت منظم ہے اور ایک خاص مقصد کے لیے ملک میں داخل ہوئی ہے۔ اسی لیے ہر مزاحمت کو عبور کرتے ہوئے دریائے راوی کے کناروں تک پہنچ گئی۔

بابر کے پورے لشکر نے قلعے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

"کوئی شخص قلعے کے اندر سے باہر نہ نکل سکے اور اس کے خزانے تلف نہ ہونے پائیں۔"

بابر کا یہ حکم اس کے لشکر کے ایک ایک سپاہی کو یاد تھا۔ اسی لیے ہر ایک اپنی جان پر کھیلنے کے لیے تیار تھا۔ اب کوئی پرندہ بھی قلعے سے باہر نہیں آسکتا تھا لیکن دوسرے دن دولت خاں لودھی کا پوتا اپنے دادا کے لیے امان طلب کرنے قلعے سے باہر نکلا۔ باہر نکلتے ہی اسے گرفتار کرکے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

بابر کے خیمے میں وہ نوجوان اپنے دادا کی سفارش کے لیے حاضر ہوا تھا اور اس خیمے کی سادگی دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ دل میں سوچ رہا ہوگا کہ اس کے دادا اس معمولی سے آدمی سے اتنے خوفزدہ کیوں ہیں لیکن جلد ہی اسے معلوم ہوگیا کہ وہ کس کے سامنے کھڑا ہے۔

"نوجوان! کیا تم جواب دے سکتے ہو کہ تمہارے بوڑھے دادا نے اس عمر میں اپنے چہرے پر وعدہ خلافی کی سیاہی کیوں ملی۔ ہمارے حلیف بنے اور پھر حریف؟"

"وہ غازی خاں کے بہکاوے میں آگئے تھے۔"

"پھر سزا بھی دونوں کو ملے گی۔"

"ان کے بڑھاپے کا خیال کرکے انہیں امان دی جائے۔"

"غازی خاں کا تم نے ابھی تک ذکر نہیں کیا۔ کیا صرف دادا کی سفارش کے لیے آئے ہو؟"

"غازی قلعے میں موجود نہیں۔ وہ قلعے سے نکل کر پہاڑوں میں چلے گئے ہیں۔"

"اور تمہارے والد، اسمٰعیل خاں؟"

"وہ قلعے میں ہیں۔"

"سنا ہے تمہارے دادا کچھ دنوں سے دو تلواریں باندھنے لگے ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"ان سے کہنا وہی دو تلواریں گلے میں لٹکا کر کسی مجرم کی طرح ہمارے سامنے پیش ہوں تو انہیں معافی دی جاسکتی ہے۔ ہم آج ان کے جواب کا انتظار کریں گے۔ کل صبح قلعے پر حملہ کر دیا جائے گا۔ پھر انہیں امان دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔"

دولت خاں کے پوتے نے وعدہ کیا۔ اسے قلعے میں بھیج دیا گیا۔ دن کا کچھ حصہ رہ گیا تھا وہ گزر گیا رات آئی اور وہ بھی گئی۔

دوسرے دن بابر نے حکم دیا کہ فوج قلعے کے بالکل نزدیک چلی جائے اور مورچے بنا لیے جائیں۔ وہ خود بھی سوار ہوا اور قلعے کے قریب پہنچ گیا تاکہ محصورین بھی اسے اچھی طرح دیکھ لیں۔

اب دولت خاں کو یقین ہوگیا کہ بابر حملہ کرنے کو تیار ہے۔ اس نے اپنی حالت پر غور کیا۔ غازی خاں اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ خود اس میں لڑنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے پوتے کو ایک مرتبہ پھر باہر بھیجا۔ وہ اپنے دادا کا پیغام لے کر آیا۔

"غازی خاں پہاڑوں میں نکل گیا ہے۔ مجھے معافی مل جائے تو قلعہ حوالے کرکے خود خدمت کرنے کو حاضر [illegible]

بابر نے پھر وہی شرط رکھی اور اپنے ایک امیر کو اندر بھیجا [illegible] اپنے امراہ اس حالت میں باہر لائے کہ جو دو [illegible] وہ باندھتا رہا ہے، اس کے گلے میں ہوں۔

حکم دے کر بابر کچھ فاصلے پر لگے اپنے خیمے میں چلا [illegible] شاہانہ انداز میں تخت پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں خیمے [illegible] دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کے دل میں بوڑھے دولت خاں کی اب بھی عزت تھی لیکن وہ اسے دو مرتبہ عہد شکنی [illegible] مزہ چکھانا چاہتا تھا۔ اسے جان کی امان دے چکا [illegible] اس کی حیثیت تو یاد دلا سکتا تھا۔ پھر اس نے یہ [illegible] دیکھا کہ دولت خاں کے گلے میں دو تلواریں لٹکی ہوئی [illegible] نوعمند سپاہی اسے گھسیٹتے ہوئے لا رہے ہیں، وہ سپاہیوں کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں تلواریں اس دھینگا مشتی میں آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ وہ زور زور سے چلا رہا تھا۔ بابر پر نظر پڑتے ہی وہ بے قابو ہوگیا۔ "میں قیدی نہیں ہوں جو مجھے اس طرح لایا جا رہا ہے۔ میں اپنی مرضی سے آیا ہوں، کیا انصاف پسند بادشاہوں کا یہی وتیرا ہوتا ہے؟"

بابر نے اس کی بڑبڑاہٹ پر ذرا توجہ نہیں دی بلکہ اپنے نوکروں سے کہا۔ "اس کی گردن جھکا کر میری تعظیم کراؤ اور پاؤں کھینچ کر اسے میرے سامنے بٹھا دو۔"

ایک ہندوستانی زبان جاننے والے سے کہا "میں جو کچھ کہوں لفظ بہ لفظ ترجمہ کرکے اسے سناؤ۔"

"اس سے کہو کہ میں تجھے باپ کے لفظ سے یاد کرتا تھا اور تیری توقع سے بڑھ کر تیری عزت و تکریم کرتا رہا۔ تجھے اور تیرے لڑکوں کو در بدر پناہ لیتے پھرنے سے بچایا۔ تیری حرم اور اہل و عیال کو ابراہیم کی قید میں نہیں جانے دیا۔ تیرے باپ کا تین کروڑ کا ملک تجھے دیا۔ بتا تو سہی میں نے تیرے ساتھ کون سی برائی کی تھی کہ تو نے مجھ سے لڑنے کے لیے دو تلواریں کمر سے باندھیں اور فوج لے کر میرے مفتوحہ علاقوں میں آیا کہ فتنہ و فساد برپا کرے۔"

بوڑھے دولت خاں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش تھا لیکن چہرے پر ایسا غصہ تھا کہ اگر موقع مل جائے تو ابھی بابر پر چڑھ دوڑے۔

"اس سے پوچھو غازی خاں کو اس نے کہاں چھپایا ہے؟"

"غازی خاں کا مجھے کچھ علم نہیں۔ وہ کہیں پہاڑوں میں نکل گیا ہے۔"

بابر نے جواب میں سعدیؒ کا شعر پڑھا۔

"اس بے حمیت کو دیکھو جس نے اپنی تن آسانی کے لیے اپنی بیوی اور بچوں کو مصیبت میں چھوڑ دیا۔"

اگرچہ غازی خاں کے لیے گمان تھا کہ وہ جا چکا ہے لیکن بعض لوگ کہتے تھے ہم نے اسے قلعے میں دیکھا ہے۔ بابر نے اسی شک کو رفع کرنے کے لیے معتمد افراد دروازے کی پاسبانی کے لیے مقرر کر دیے۔ وہ خود بھی رات بھر قلعے کے قریب ایک ٹیکرے پر قیام کیے رہا۔ پھر قلعے کے اندر گیا۔

دوسرے دن تحقیق ہوگئی کہ وہ بیوی بچوں اور بہن بھائیوں کو چھوڑ کر یہاں سے غائب ہو چکا ہے۔

دولت خاں اور اس کی ساتھی جماعت، کتہ بیگ کے

ہمراہ بھیرہ کی جانب روانہ کیا کہ وہاں ایک قلعہ طوفی ہے ان قیدیوں کو دوبارہ پہنچا دیا جائے۔

ابھی یہ قافلہ سلطان پور پہنچا تھا کہ دولت خاں کے دروازۂ جسم پر موت نے دستک دی۔ وہ بوڑھا شاید اس ذلت کو برداشت نہیں کرسکا تھا۔ غازی خاں بھی ایسا غائب ہوا تھا کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں دور تک نکل گیا اور کسی کے ہاتھ نہ آسکا۔

بابر نے قلعۂ بلوت کے انتظام کے لیے محافظ دستہ متعین کیا اور خود لشکر کو لے کر بلوت کے پہاڑوں میں داخل ہوگیا۔ ان پہاڑوں میں چاروں اطراف قلعے بنے ہوئے تھے۔ یہ سب بابر کے آنے سے پہلے غازی خاں کی تحویل میں تھے۔ ان قلعوں میں حفاظتی دستے ابھی تک متعین تھے۔ بابر کی فوج نے معمولی جھڑپوں کے بعد ان قلعوں پر قبضہ کرلیا۔

اسی دوران بابر کی وہ فوج جو بلوت میں متعین کی گئی تھی، ہندور اور کملور کے قلعوں تک جا پہنچی۔ یہ قلعے بہت مضبوط و مستحکم تھے اور آج تک کسی مسلمان بادشاہ نے فتح نہیں کیے تھے۔

بابر اپنے بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ ایسی ایسی کامیابیاں حاصل کرتا پھر رہا تھا کہ سننے والوں کو حیرت بھی ہوتی تھی اور اس کا رعب بھی طاری ہوتا تھا۔

بابر ان فتوحات کو دامن میں سمیٹتا ہوا سرہند پہنچ گیا۔

اب ہندوستان کی زمین بابر کے قدموں سے گونجنا شروع ہوگئی۔ سپاہی پیشہ افراد اور عمائدین سلطنت یہ مشاہدہ کیے بغیر نہ رہ سکے کہ بابر اجنبی ضرور ہے اور غارت گروں کی فوج لے کر چڑھ آیا لیکن اس کی فوج شہروں میں لوٹ مار سے گریز کررہی ہے۔ قلعوں سے جو دولت مل رہی ہے وہ اس کی اپنی ہے اور یہ اس کا حق ہے۔ اس وقت بھی وہ سرہند کے نواح میں ہے لیکن سرہند کے لوگ بے خوف ہیں ورنہ تو شہر کے شہر جلا دینا غارت گروں کا شیوہ رہا ہے۔ اس کے پاس ہندوستان کے عمائدین و رؤسا کے دوستانہ خطوط آنے لگے۔ بابر کی طرف لوگوں کا یہ میلان اس کی اقبال مندی تھی۔ ان خطوط بھیجنے والوں میں سلطان ابراہیم کے لشکر کے امرا و فضلا بھی شامل تھے۔ ان خطوط میں غائبانہ طور پر اپنی خیر خواہی کا اظہار کیا گیا تھا۔

موسم بہار کی ابتدائی گرمی میں برف پوش ہمالیہ کے دامن میں سفر کرنا پرلطف تھا۔ اسی میں بڑے بڑے زرخیز علاقے جو لڑنے والے دشمنوں سے چھینے گئے تھے جاں نثار سرداروں کو عطا کیے گئے۔ ہندوستان کے رؤسا کو بھی نظر آگیا کہ اس کے خلاف لڑنے کے بجائے اس کی ملازمت میں آجانا زیادہ مفید ہے۔ غیر محسوس طریقے سے ماحول اس کے حق میں سازگار ہوتا جارہا تھا۔ وہ اب تک لاہور کی فتح کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اب دہلی اس کے سامنے تھی۔

اس نے ہمت کی رکاب میں پاؤں رکھا۔ باگ ہاتھ میں لی اور ابراہیم لودھی سے لڑنے چلا جو ممالکِ ہند کا حاکم اور پایۂ تخت دہلی میں متیم تھا۔ اس کا لشکر شمار ایک لاکھ اور ہاتھیوں کی تعداد ایک ہزار بتائی جاتی تھی۔ بابر دس بارہ ہزار لشکر کے ساتھ اس سے لڑنے چلا تھا۔ اس کے سپاہیوں نے کبھی کسی ایسی جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا جس میں ہاتھیوں سے پالا پڑا ہو۔

چند کوس چلنے کے بعد ایک آب رواں ندی ملی۔ یہ مقام ایسا خوش منظر تھا کہ بابر یہاں قیام کرنے پر مجبور ہوگیا۔ پہاڑیوں سے پانی نیچے آرہا تھا اور ندی کے دامن میں سما جاتا تھا۔ ہوا نہایت لطیف و خوشگوار تھی۔ اسے کابل کی یاد آگئی۔ اس نے اعلان کیا کہ اس علاقے کے محل وقوع کو یاد کرلیا جائے۔ کبھی موقع ملا تو وہ یہاں کابل کی طرز پر "چارباغ" بنائے گا۔

وہ یہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ ایک ہندوستانی امیر لشکر میں آیا اور بابر سے ملاقات کا خواہاں ہوا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ سلطان ابراہیم نے اسے سفیر بنا کر بھیجا ہے۔ اس کے پاس کوئی مراسلہ نہیں تھا۔ ساری باتیں زبانی کررہا تھا۔ بابر کے حضور پہنچ کر بھی اس نے یہی کہا اور عرض کیا کہ بابر بھی اپنا سفیر شہنشاہ دہلی کے پاس بھیجے۔ ممکن ہے صلح کی شرائط طے ہوں۔ بابر سمجھ گیا تھا کہ یہ ایک مذاق کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے اپنے دو پہرے داروں کو سفیر بنا کر بھیج دیا۔ (ابراہیم نے ان دونوں کو گرفتار کرلیا)

ان کے جاتے ہی بابر نے اپنے امیروں کو جمع کیا۔ "یہ شخص سفیر نہیں ابراہیم کی طرف سے بھیجا گیا جاسوس تھا۔ ابراہیم کو ہمارے کوچ کرنے کی خبر مل چکی ہے۔ اسی کی تصدیق کے لیے یہ سفیر آیا تھا۔ اب ابراہیم بھی اپنی فوج لے کر نکلے گا۔" اس نے اپنے ایک امیر کو تیزی سے آگے روانہ کیا کہ وہ یہ خبر لے کر لوٹے کہ ابراہیم کس طرف سے آگے بڑھ رہا ہے اور اس کے ساتھ کتنا لشکر ہے۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ ایک منزل پر بابر کے امیر نے اس سے ملاقات کی۔ وہ خبر لایا کہ ابراہیم دہلی سے ایک کوس آگے بڑھ آیا ہے۔ اسی طرح حمید خاں حاکم حصار (شمال مغرب دہلی) سے دس پندرہ کوس آگے بڑھ آیا ہے۔

وہ اس وقت انبالہ کے قریب ایک تالاب پر اتر گیا تھا۔ یہ خبر سن کر ایک جمعیت اس نے ہمایوں کی سپہ سالاری میں حمید خاں کے خلاف روانہ کی اور حکم دیا کہ آگے بڑھ کر حصار فیروزہ پر حملہ آور ہوجائیں۔

حصار کے لشکر سے ہراول دستے کی مڈبھیڑ ہوئی۔ مغل سوار بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے ہوئے دشمن پر جا پڑے۔ جب انہوں نے ہر طرف سے سمٹ کر انہیں گھیرنا چاہا تو افق سے اصل فوج ابھرتی ہوئی دکھائی دی۔ درا صل یہ ایک چال تھی۔ اول ہراول کو بڑھا کے لڑنا حصار کے سارے لشکر کو سامنے لے آنے کی چال تھی۔

آنے والے مغل حملہ آوروں کو دیکھنے کے لیے حصار والوں نے منہ پھیرا اور بس یہی غضب ہوگیا۔ پھر ان کے قدم نہ ٹکے۔ ہمایوں کے منتخب سرداروں نے ایسا دبایا کہ حصار کی فوج پیچھے ہٹتی چلی گئی اور پھر بھاگ کھڑی ہوئی، کئی سو جنگی قیدی، ہاتھی اور مال غنیمت ہاتھ لگا۔

ہمایوں کو یہاں خود کچھ بھی کرنا نہیں پڑا تھا لیکن بہرحال وہ وہاں تھا۔ یہ فتح اسی کے نام لکھی گئی۔ ہمایوں نے پہلی لڑائی لڑی تھی اور فتح نصیب ہوئی تھی۔ اس فتح کو نیک شگون سمجھا گیا اور حصار فیروزہ کی حکومت اسے بخش دی گئی۔

ہمایوں اٹھارہ سال کا ہوچکا تھا۔ بابر نے جشن منایا اور ڈاڑھی منڈوانے کی رسم ادا کی گئی۔ جھولیاں بھر بھر کر ٹکے نچھاور کیے۔

اسی منزل پر اس کے مخبر خبر لے آئے کہ ابراہیم لودھی پیش قدمی جاری رکھے ہوئے ہے۔ وہ دو کوس بڑھ کر رک جاتا ہے اور دو تین دن ایک منزل میں گزار کر پھر آگے بڑھتا ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زیادہ آگے بڑھنا نہیں چاہتا۔ لڑائی وہ دہلی کے قرب و جوار میں لڑنا چاہتا ہے۔ اس طرح وہ بابر کو آگے بڑھنے کے لیے موقع دے رہا تھا۔

بابر کے کوہستانی سپاہی اور سردار پہاڑوں کے موسم کے عادی اور مانوس تھے۔ انہیں دامن کوہ سے میدان میں آنا پسند نہیں تھا۔ بابر بھی پہاڑوں اور گھاٹیوں کا سہارا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بہت سست روی سے سفر طے کررہا تھا۔ اس کی امید تھی کہ ابراہیم سفر کرتا ہوا ناہموار زمین تک آجائے گا اور بابر کو دامن کوہ سے میدان میں آنا نہیں پڑے گا لیکن ابراہیم اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا بابر پانی پت کے میدان تک آجائے۔

بابر گنگا کے مشہور معاون دریائے جمنا کے کنارے تک بڑھ کر دشمن کا انتظار کرتا پڑا، پھر وہ کشتی میں سوار ہوکر موضع سرسادہ کی سیر کو نکل گیا۔ اس سفر کا مقصد گرد و نواح کا جائزہ لینا بھی تھا اور لشکر پر یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ اسے اس جنگ کی زیادہ پروا نہیں۔ وہ اب بھی سیر و تفریح میں مشغول ہے حالانکہ اسے پورا احساس تھا کہ اس کا مقابلہ ایک لاکھ کے لشکر کے ساتھ ہے۔ ایک ہزار جنگی ہاتھی دشمن کے ساتھ ہیں۔ ابراہیم اپنے گھر کے قریب ہے۔ ہر طرح کی رسد اسے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کے سپاہی تین مہینے سے سفر کی اذیتیں اٹھا رہے تھے۔

اپنی فوج کی کمی کو پیش نظر رکھ کر اس نے حکم دیا کہ سات سو چھکڑے تعمیر کیے جائیں۔ جب یہ چھکڑے تیار ہوگئے تو استاد علی قلی (میر توپ خانہ) کو ہدایت کی کہ سارے کے سارے چھکڑے رسیوں سے باہم باندھ دیے جائیں۔ دو چھکڑوں کے درمیان رسیوں کا اس قسم کا جال بنا جائے کہ اس جالے کے اندر سات سوراخ ہوں۔ ان سوراخوں کے اندر سے ہمارے سپاہی دشمن پر گولا باری کریں۔ گویا اس نے ایک قسم کی بکتر بند گاڑی یا ٹینک تیار کرلیا۔

مشورے کے بعد یہ بات طے ہوگئی تھی کہ دشمن سے بڑی لڑائی پانی پت پر لڑی جائے اور صف بندی اس طرح کی جائے کہ پانی پت کے مکانات ایک طرف ہوں اور دوسری طرف چھکڑے اور ارابے ٹھہرا دیے جائیں۔

وہ اپنے لشکر کے ساتھ دریائے جمنا کے کنارے دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا اور پانی پت پہنچ کر سیدھے ہاتھ پر شہر اور سات سو چھکڑوں کو رکھ کر اتر پڑا۔

دوسری طرف خندق کھدوائی گئی لیکن اس میں یہ اہتمام رکھا کہ کچھ کچھ فاصلے پر اتنی جگہ چھوڑ دی گئی کہ سو آدمی گزر جائیں۔

بابر نے کچھ اس چابکدستی سے انتظام کیا تھا کہ دشمن کے سامنے صرف ایک ہی راستہ کھلا رہ گیا تھا کہ وہ سامنے سے حملہ کرے۔

دشمن کی تعداد دیکھ کر اتنے انتظامات کے باوجود بابر کی فوج سخت خوفزدہ تھی۔ اس کے بیگ ایک دوسرے سے کہتے پھر رہے تھے کہ اس جنگ میں شاید ہی کوئی زندہ بچ کر جائے۔ انہیں اپنے گھر اور اہل و عیال یاد آرہے تھے جنہیں وہ کابل اور بدخشاں میں چھوڑ کر آئے تھے۔ مرعوبیت اتنی تھی کہ وہ سارے لوگ جنہیں بابر نے ہندوستان کی زمین پر قدم رکھنے کے بعد بھرتی کیا تھا اور وہ مال غنیمت کے لالچ میں اس کے ساتھ لگے چلے آئے تھے، دشمن کی تعداد دیکھ کر بھاگ

کھڑے ہوئے تھے۔

بیگوں پر خوف طاری تھا لیکن لڑنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ طبلِ جنگ جب بھی بجتا انہیں گھوڑوں پر سوار ہونا تھا۔ ایسے میں بابر کی آواز گونجی۔

”میرے رفیقو! آج تک تمہیں جتنی فتوحات حاصل ہوئی ہیں اور جتنی بار شکست ہوئی ہے ان سب کے تجربات آزمانے کا وقت ہے۔ بے شک! سلطان دہلی کے ساتھ نیم ویران کابل سے چار گنا زیادہ فوج ہے لیکن اس کے پاس تم جیسے بہادر نہیں ہیں۔ اگر ہم فتح یاب ہوئے اور یقیناً ہوں گے تو میں تمہیں اتنا دوں گا کہ تمہاری نسلیں کھائیں گی۔ دہلی اور آگرہ کے خزانے تم پر نچھاور کردوں گا اور اگر شکست ہوئی تو میرا وعدہ ہے کہ تمہارا بادشاہ بابر اس میدان سے زندہ نہیں جائے گا۔ تمہارے ساتھ میں بھی اپنی جان دے دوں گا۔

خدا پر بھروسا کرو اور یاد رکھو خدا کی مرضی کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہلتا۔ وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔“

ایسی ہی ایک تقریر اس نے سمرقند کی فتح کے موقعے پر کی تھی اور اپنے سپاہیوں میں حوصلے کی روح پھونک دی تھی۔ اس موقعے پر بھی یہی ہوا۔ اس کے سرداروں اور سپاہیوں میں ایک نیا جذبہ جاگ اٹھا۔

ایک ہفتے سے بابر کی فوج لشکرگاہ کی پتلی پٹی کے گرد قصبہ پانی پت سے بائیں جانب باڑھ تیار کررہی تھی۔ اس کے کنارے کنارے سات سو چھکڑے چرمی رسوں سے باندھے تھے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چوڑے فصل چھوڑے تھے جن میں عثمانی ترک ماہروں کی توپیں زنجیروں کے پیچھے لگائی گئی تھیں۔ بعض کھلے فصل وہ تھے جن میں چرمی جالیاں بندوقچیوں کی حفاظت کے لیے تھیں اور قطار کے بائیں سرے پر زیادہ چوڑی جگہ چھوڑی تھی کہ یہاں سے دو دو سو سواروں کا پرا جھپٹ کر دشمن پر جا گرے۔ اب اسے حملے کا انتظار تھا لیکن سپاہ دہلی نے کوئی جارحانہ پیش قدمی نہیں کی۔ یہی سلطانِ دہلی کی غلطی تھی۔ اس نے بابر کی فوج کو تھکن اتارنے کا پورا موقع دے دیا۔ بابر کو خندق کھودنے کا موقع بھی مل گیا۔

ابراہیم تو جیسے یہاں آکر سو گیا تھا۔ بعض شرارتی بیگ اس کی بے حسی کو دیکھ کر دشمن کی چھاؤنی تک پہنچ گئے۔ خوب ہلڑ مچایا اور تنگ کرکے واپس چلے آئے۔ اس چھیڑ چھاڑ کو بھی دشمن نے بڑے تحمل سے برداشت کیا۔ ایک بڑی فوج بھی جو چار پانچ ہزار سواروں پر مشتمل تھی یعنی بابر کی آدھی فوج دشمن چھاؤنی کو چھو آئی۔ دشمن نے اس کا پیچھا بھی نہیں کیا۔

سپاہیوں کا ضبط جواب دیتا جارہا تھا۔ طیش میں اضافہ ہورہا تھا۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد جنگ چھڑ جائے۔ آخر یہ طے ہوا کہ دشمن پر شب خون مارا جائے۔

شب خون مارنے والے راستہ بھول گئے۔ جب پہنچے تو سورج طلوع ہوچکا تھا۔ ابراہیم کے لشکر میں لوگ جاگ گئے تھے۔ رسالے جنگی ہاتھی لیے مقابلے پر نکل آئے۔ باہم جھڑپ ہوئی لیکن حملہ آوروں کو واپس ہونا پڑا۔ پھر ابراہیم کے سپاہیوں نے پیچھا نہیں کیا البتہ اتنا ہوا کہ ان کا حوصلہ بڑھ گیا اور انہوں نے اگلے دن حملہ کرنے کی ٹھان لی۔

اگلے دن کے سورج نے پانی پت کے میدان کو دھوپ میں نہلایا تو ابراہیم کے لشکرِ جرار کی صفیں دھوپ کی سفیدی کو سیاہی میں بدلنے میدان میں چلی آئیں۔ جنگی ہاتھیوں کے بھاری بھرکم جسم اس اندھیرے کو افق تک پھیلانے کے لیے موجود تھے۔ ان کی تعداد کو دیکھ کر روح لرز اٹھتی تھی۔ انہی ہاتھیوں میں سب سے اونچے ہاتھی پر ابراہیم لودھی بیٹھا ہوا تھا۔ اتنی بلندی سے اس کی نظر یقیناً پورے میدان پر ہوگی۔

بابر اس وقت اپنے محافظین کے دستے کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔ دشمن کی تعداد بہت تھی لیکن اسے اپنے دفاعی انتظامات پر اعتماد تھا۔ سات سو چھکڑے اور پھر گہری خندق جسے دشمن عبور نہیں کرسکتا تھا۔ میمنہ کی کمان ہمایوں کے ہاتھ میں تھی جس کے ساتھ تجربہ کار سپہ سالار موجود تھے۔ قلب توپچیوں، بندوقچیوں اور تیراندازوں پر مشتمل تھا۔ میمنہ اور میسرہ کے سوار دستے جھپٹنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

سیاہ آندھی آگے بڑھتی چلی آرہی تھی۔ بابر نے ابھی کسی حملے کے لیے آگے بڑھنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ جب دشمن کی بپھری ہوئی صفیں بالکل قریب پہنچ گئیں تو بابر نے تیراندازوں کو ہدایت کی کہ دشمن کے میمنہ اور میسرہ کے رخ ہوکر تیر برسائیں۔ بابر کو تھوڑی دیر میں میمنہ سنبھالنے کے لیے عقبی فوج سے کام لینا پڑا۔ دوسرے حصوں میں بھی تیز رفتار دستے جنہیں جوابی حملے کے لیے لگا رکھا تھا، صفیں سلامت رکھنے کے کام میں لائے گئے۔

تیروں کی باڑوں نے بڑھتے ہوئے ہاتھیوں کا منہ پھیر دیا۔

میمنہ سے ہمایوں کے گھڑسوار اپنی جانب مڑتے ہوئے دشمن کے سپاہیوں کی طرف بڑھے تاکہ انہیں دوبارہ صف بندی کا موقع دیے بغیر ہی ان پر ٹوٹ پڑیں۔ ٹھیک اسی لمحے ارابوں کے درمیان سے توپیں گرجنے لگیں جو وہاں

پہلے ہی نصب کردی گئی تھیں۔ یہ غیر منظم انبوہ توپ و تفنگ کی مار اور ترکوں کی چھوٹی طاقتور کمانوں کی تباہ کن باڑوں کی عین زد میں آگیا۔ تیراندازوں نے الگ دشمن کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا اور دونوں طرف کی صفیں ایک دوسرے پر چڑھ آئیں اور دست بدست لڑائی چھڑ گئی۔

سورج نیزا بھر بلند ہوا تھا کہ بابر کی فوج نے دشمن کی فوج کو دبا لیا۔ غول کے غول پلٹنے اور واپس دہلی کو بھاگنے لگے۔

ابھی دم باقی تھا کہ دشمن پیچھے ہٹتا تھا اور پھر آگے بڑھ آتا تھا۔ مگر دوپہر کے بعد جو پیچھے ہٹا تو ہٹتا ہی گیا۔ اپنے پیچھے ہزاروں لاشیں چھوڑتا چلا گیا۔ ابراہیم لودھی کی شکست ناقابلِ یقین تھی۔ دشمن کی تعداد بے حد و حساب تھی اور بابر کا معمولی سا لشکر اسے گاجر مولی کی طرح کاٹ رہا تھا۔ بابر کے سپاہیوں نے صرف ایک جگہ چھ ہزار لودھی نعشیں ڈھیر کردی تھیں۔ جدھر نظر اٹھتی تھی نعشیں پھیلی نظر آتی تھیں۔

جنگ کے بعد اندازہ لگایا گیا کہ پچاس سے لے کر ساٹھ ہزار لودھی فوجی ہلاک ہوئے۔ جو بچے انہوں نے راہ فرار اختیار کی۔

بھاگی ہوئی فوج کا تعاقب کیا جارہا تھا۔ سلطان ابراہیم کو کسی نے فرار ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا اور وہ میدان میں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی تلاش میں بھی آدمی دوڑا دیے گئے۔ ظہر کا وقت تھا کہ طاہر تبریزی کی نظر ایک نعش پر پڑی۔ وہ قریب گیا اور اس نے نعش پہچان لی۔ یہ سلطان ابراہیم کی نعش تھی۔ وہ آگے بڑھا اور اس کا سر کاٹ لیا اور بابر کے قدموں میں لاکر ڈال دیا۔ یہ محض ایک سر نہیں تھا سلطنتِ دہلی کا تخت تھا جو اس کے قدموں میں بچھا ہوا تھا۔

اسی روز ہمایوں کو حکم ہوا کہ وہ اپنے لشکر کو لے کر آگرہ کی طرف روانہ ہوجائے۔ شہر پر قبضہ کرے اور خزانوں پر پہرے بٹھا دے۔ دہلی کا نظم و نسق سنبھال کر ہم بھی آگرہ پہنچتے ہیں۔

ہمایوں اپنا دستہ لے کر آگرہ پہنچا تو اب کون بچا تھا جو اس کا راستہ روکتا۔ شہر کے حکام نے باضابطہ اطاعت قبول کی اور طے کیا کہ قلعے کے ان مقامات میں داخل نہ ہوا جائے جہاں دوسرے قیمتی اسباب کے گودام اور یرغمال میں آئے ہوئے لوگ رہتے ہیں۔ ہمایوں کو نہ تو جلدی تھی نہ وہ خون خرابا چاہتا تھا۔ اس نے کوئی زبردستی نہیں کی۔ اپنے سپاہی قلعے کے باہر بٹھا دیے اور دروازوں پر باپ کے آنے تک پہرا لگا دیا۔

قلعے کے لوگوں میں گوالیار کے راجا کے بیوی بچے بھی تھے۔ یہ راجا پانی پت کے میدان میں مارا گیا اور اس کے اہل و عیال نے قلعے سے نکل کر اپنے وطن جانے کی کوشش کی۔ ہمایوں کے پہرے داروں نے انہیں حراست میں لے لیا۔

ان عورتوں نے گھبرا کر کہا کہ وہ شہزادے کے حضور کچھ نذریں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ان عورتوں نے غالباً شہزادے کو خوش کرنے کے لیے بیش قیمت جواہرات نذر کیے۔ انہی میں کوہِ نور ہیرا تھا۔ یہ گلابی رنگ کا بھاری ہیرا 80 مثقال تلا تھا (ایک مثقال 25 تولے کے برابر ہوتا ہے)

بابر دہلی سے آگرہ پہنچا تو ہمایوں شہر پر قبضہ کرچکا تھا لیکن قلعے والے حیل و حجت سے کام لے رہے تھے۔ ہمایوں نے مذکورہ ہیرا باپ کی نذر کیا۔ قلندر باپ کی سخاوت دیکھو، یہ بیش قیمت ہیرا اسی وقت بیٹے کو بخش دیا۔ یہ بخشش یہیں تک محدود نہیں رہی۔ بابر کے ہاتھ پانچ بادشاہوں کی دولت آگئی تھی۔ اس نے سب بانٹ دی۔ اس نے خواجہ کلاں کے ہاتھوں میں ایک فہرست دی اور خزانوں کو اونٹوں پر لاد دیا اور ہدایت کی کہ ابھی کابل جاؤ اور دربار کے باغ میں ہر بیگم کا شامیانہ لگا کر نام بہ نام یہ تحفے تقسیم کرو۔ بہنوں اور بچوں اور دیگر عزیز و اقارب، کنیزوں، دردا اور مغلانیوں کے لیے الگ فہرست تھی۔

ہر بیگم کو ایک کنیز، یاقوت و جواہر اور موتیوں کی بھری ہوئی کشتی، سکوں اور صدف سے بھرے ہوئے دو خوان نو پارچے کے قیمتی خلعت دیے گئے۔ ملازموں تک کو زرِ نقد اور خلعت دیے گئے۔ خزانوں کے یہ نذرانے تین دن تک تقسیم ہوتے رہے۔

بابر کی فیاضی اپنے خاندان یا کابل تک محدود نہیں رہی بلکہ قندوز و غزنی تک تحائف کے انبار گئے اور دور دراز بدخشاں کے کاشت کاروں اور ان کے بیوی بچوں نے چاندی کے سکے پائے۔ یہی نہیں بلکہ اعلان ہوا کہ امیر تیمور یا چنگیز خاں کی نسل کے ہر شخص کو دعوت ہے کہ ہمارے دربار میں آئے اور حسبِ ہمت و خدمت فائدہ اٹھائے۔

☆☆☆

قلعہ آگرہ میں ابھی تک لودھی فوج موجود تھی۔ کچھ لودھی امرا بھی موجود تھے۔ ان لوگوں نے قلعہ سپرد کرنے سے پہلے کئی شرائط منوائیں۔ سلطان ابراہیم کی ماں کے لیے سات لاکھ روپے نقد مانگے۔ رہنے کے لیے آگرہ سے ایک کوس کے فاصلے پر ایک محل بنا ہوا تھا، وہ مانگا۔ امرا نے جاگیریں طلب کیں۔ بابر نے یہ سب مطالبات مان لیے۔ ابراہیم لودھی کی ماں کو سات لاکھ روپے نقد پیش کیے۔ رہنے کو وہی مکان دیا جو

انہوں نے مانگا تھا۔ امرا کو جاگیریں بخشیں اور قلعے میں داخل ہو کر ابراہیم لودھی کے محل میں نزول کیا۔

بابر نے آگرہ میں قدم رکھا تو گرمی کا موسم تھا اور اس سال گرمی کچھ زیادہ ہی پڑی تھی۔ لشکر میں کئی لوگ لو لگنے سے بیمار پڑے اور مر گئے۔ ادھر لوگوں میں یہ بات مشہور ہونے لگی کہ بابر ہندوستان میں مستقل رہنے کا اعلان کرنے والا ہے۔ وہ اہل و عیال کو بھی یہیں بلا لے گا۔ کابل واپسی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اکثر آزمودہ کار سردار اور بیگ بددل ہو گئے اور وطن واپس جانے کے لیے پر تولنے لگے۔

فوج کی جان وہ لوگ تھے جو سرد کوہستانی علاقوں میں پلے اور اب اپنے وطن کی ٹھنڈی ہواؤں کی یاد ستا رہی تھی، کثیر دولت انعام کی صورت میں مل چکی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ اسے لے کر وطن جائیں، اس سے پہلے کہ کوئی ناخوشگوار صورت حال سامنے آئے اور یہ سب چھن جائے۔ بابر نے ابھی صرف دلی اور آگرہ فتح کیا تھا۔ اس ملک کے راجپوت ابھی باقی تھے جن سے مقابلہ تھا۔ ضروری تو نہیں کہ ہر لڑائی میں فتح نصیب ہو۔

بابر ان کی بددلی سے بہت پریشان تھا۔ اسے ابھی بہت سے معرکے طے کرنے تھے۔ ان سرداروں اور بیگوں کی ابھی اسے ضرورت تھی۔ اسے غصہ بھی تھا کہ ان لوگوں کو میں نے ان کی ضرورت سے زیادہ دیا اور یہ میرے ارادوں کے خلاف سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ اس نے شوریٰ طلب کی اور تمام سرداروں کو طلب کیا۔ اس نے پھر وہی حربہ استعمال کیا۔ ایسے مواقع پر اپنی موثر تقریر سے لوگوں کے دل جیت لیا کرتا تھا۔

اس نے کہا۔ ”دنیا میں کوئی اقتدار ضروری وسائل کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، نہ کسی بادشاہ کی حکومت ملک و رعایا کے بغیر ہوا کرتی ہے۔ کئی سال کی محنت و مشقت، طولانی سفر کی صعوبتیں، مارے جانے کے خطرات، یہ سب برداشت کر کے ہم نے خدا کی رحمت سے دشمن کے انبوہ عظیم کو زیر کیا اور اس کی وسیع مملکت حاصل کی۔ اب وہ کون سی طاقت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اتنے جوکھوں سے لیا ہوا ملک چھوڑ دیں اور تنگ دستی کی بلا میں واپس کابل چلے جائیں۔ کوئی شخص جو مجھے عزیز رکھتا ہے آئندہ اس کے منہ سے میں ایسی باتیں نہ سنوں لیکن جسے ٹھہرنے کی تاب نہیں وہ شوق سے واپس چلا جائے۔“

اس کی تقریر نے اثر دکھایا۔ سرداروں نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ کابل کے بجائے ہندوستان کو اپنا وطن بنائیں گے لیکن اس کا عزیز از جان امیر، اس کا نائب اول خواجہ کلاں اپنے خیال پر جما رہا۔ بابر نے آخر اسے کابل واپس جانے کی اجازت دے دی۔ وہ گیا لیکن ساتھ ہی دیوار پر یہ شعر گھسیٹ گیا۔

”اگر میں سندھ سے بخیر و عافیت گزر گیا تو دوبارہ ہندوستان آنے کی خواہش پر لعنت بھیجوں گا۔“ اس کے جانے کی کدورت کم نہیں ہوئی تھی کہ بابر کی نظر اس شعر پر پڑ گئی۔ اس نے اس کے جواب میں ایک شعر خواجہ کلاں کو کابل بھیجا۔

”بابر کے خدا کا شکر کہ ہندو سندھ کی بادشاہی اس نے عطا کی۔ خواجہ تیری ہمت گرمی کی تاب نہیں لاتی تو جا غزنی کے جاڑے کھا۔“

☆☆☆

ابراہیم لودھی کی ماں نے جس کا نام بیدہ بتایا جاتا ہے ایک دن کے لیے بھی سیاہ ماتمی لباس نہیں اتارا تھا۔ دکھ تو اسے ہونا ہی چاہیے تھا۔ وہ بیٹے کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکی تھی اور اب بیٹے کے قاتل کے رحم و کرم پر تھی۔ یہ محل اس نے خود مانگا تھا کہ اس کے بیٹے کی یادگار تھا لیکن یہاں آ کر وہ ایک دن بھی چین سے نہیں رہ سکی تھی۔ ابراہیم کی روح اس کا پیچھا کرتی رہتی تھی۔ یہ روح اسے طعنے دیتی رہتی تھی کہ تیرے ہوتے ہوئے ابراہیم کا قاتل ابھی زندہ ہے۔ وہ اپنا غصہ بابر کو بددعائیں دے کر اتار لیا کرتی تھی۔ اس کی پانچوں وقت کی نمازیں انہی بددعاؤں میں گزر رہی تھیں۔ اسے جو دو کنیزیں ملی تھیں، ان سے بھی وہ یہی باتیں کرتی رہتی تھی۔ یہ دونوں ہندوستانی تھیں۔ وہی اسے یہ بھی بتاتی رہتی تھیں کہ بابر کی فوج میں بغاوت ہو گئی ہے۔ بابر خود بھی مجبور ہو کر کابل واپس چلا جائے گا۔ ایسی مثالیں موجود تھیں کہ بیرونی حملہ آور یہاں آئے اور لوٹ مار کر کے چلے گئے۔ بڑھیا کو ذرا اطمینان ہو گیا لیکن جب ایک سال ہو گیا اور پھر یہ بھی سننے میں آیا کہ بابر نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنا لیا ہے اور مقامی مزاحمتوں سے نمٹنے کے بعد اپنی تمام بیویوں کو بھی یہیں بلوا لے گا تو اس کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ اب اس کی بیویاں بھی میرے بیٹے کے ملک پر راج کریں گی۔ مجھے اس سے پہلے ہی بابر کا خاتمہ کر دینا چاہیے۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی تھی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے محل پر پہرا رہتا تھا۔ کنیزوں پر بھی ایک حد تک ہی بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ کیا خبر ادھر کی بات ادھر پہنچا دیں۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اسے اطمینان ہو گیا۔ اس نے پھر سوچنا شروع کیا۔ بابر کو راستے سے ہٹانا کوئی آسان بات ہے۔ لیکن میرا انتقام؟ میرا بس چلے تو اپنے ہاتھوں سے بابر کا گلا گھونٹ دوں۔ پھر وہ ان ہندوستانیوں کو برا بھلا کہنے لگی جو اسے ناپسند بھی کرتے تھے اور اس کی ملازمت میں بھی تھے۔ اسے اپنی کنیزوں میں سے ایک کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔ ان میں سے ایک نے ہنستے ہوئے اسے بتایا تھا کہ بابر بادشاہ کو ہندوستانی کھانا کھانے کی لت پڑ گئی ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے چار باورچیوں کو ملازم رکھا ہے۔

”اگر ان میں سے کسی ایک کو خرید لیا جائے تو کام بن سکتا ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا لیکن خود ہی اپنا فیصلہ کمزور بھی نظر آنے لگا۔ ”یہ ہندوستانی لوگ وفادار بہت ہوتے ہیں۔ اگر بات کھل گئی تو بابر کسی لودھی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ کام براہ راست نہیں کسی اور کے ذریعے ہونا چاہیے۔“

اس نے تحقیق کرنی شروع کر دی کہ جو چار باورچی ملازم رکھے گئے ہیں وہ کون ہیں۔ کئی دن کی تگ و دو کے بعد اسے معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک کا بھائی پانی پت کی جنگ میں مارا گیا تھا۔ ”تف ہے چاشنی گیر تجھ پر کہ اپنے بھائی کے قاتل کے لیے کھانا پکاتا ہے۔ میں تیری جگہ ہوتی تو کھانے میں زہر ملا کر بادشاہ کو دے دیتی۔“ کہتے کہتے رک گئی اور پھر خوشی سے اچھل پڑی۔ منصوبہ خود بخود تیار ہو گیا تھا۔ اگر کوئی اس باورچی کو غیرت دلائے تو وہ اس کام کے لیے آمادہ ہو سکتا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ اسے پھر [illegible] کی یاد آ گئی لیکن اس سے کچھ کہتے ہوئے ڈرتی بھی تھی۔

کئی دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گئے۔ کچھ کہنے کے لیے لب کھولتی اور پھر ڈر کے مارے چپ ہو جاتی۔ پھر ایک دن اس نے ترکیب نکال ہی لی۔ وہ اپنے زیورات کی صندوقچی نکال کر بیٹھ گئی اور پھر اپنی دونوں کنیزوں کو صدا لگائی۔ وہ دونوں دوڑی دوڑی آئیں تو جگمگ کرتے زیورات دیکھ کر ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”اماں آپ کے پاس اتنے زیور ہیں۔ ہم نے تو آج تک دیکھے ہی نہیں تھے۔“

”یہ کیا ہیں۔ ابھی اتنے ہی اور ہیں۔ یہ نگوڑا بابر نہ ہوتا [illegible] بھی ہیرے جواہرات پہناتی۔ اب تو یہی میرے [illegible] سہارا ہیں۔“

”آپ نے ہمیں کیوں بلایا تھا۔ کوئی کام ہے؟“

”میں تو تمہاری باتوں میں بھول ہی گئی کہ میں نے [illegible] اب تم جاؤ۔“

ان میں سے ایک کنیز جب رات کے وقت بیدہ کے پاؤں دبانے لگی تو اس کنیز نے ایک مرتبہ پھر ان زیورات کا

قصہ چھیڑ دیا۔ بیدہ نے اس کے دل میں جو لالچ کا بیج بو دیا تھا اس کی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔

"اب تو میرے دل میں ایک ہی ارمان ہے۔" بیدہ نے کہا۔ "بابر کو مرتا ہوا دیکھوں۔ پھر مجھے اس زیور کا کیا کرنا۔ جو بابر کو مارے گا اسی کو دے دوں گی۔"

"اماں، آپ نے یہ خوب کہی۔ بابر آخر بادشاہ ہے۔ اس کے محافظ ہر وقت اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ اسے مارنا کوئی اتنا آسان ہے۔ مجھے بھی وہ اچھا نہیں لگتا لیکن جسے پانی پت کی فوجیں نہ مار سکیں اسے ہم بھلا کیا مار سکیں گے۔"

"ہاں شاید یہ ارمان لے کر میں قبر تک چلی جاؤں۔"

باتوں میں پڑ کر کنیز کے چلتے ہوئے ہاتھ رک گئے تھے۔ اس نے پھر پاؤں دبانے شروع کر دیے لیکن اس کا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد بیدہ نے پھر اسے ٹٹولا۔ "وہ جو چار باورچی اس وقت محل میں ہیں۔ کوئی ان میں سے تیرا جاننے والا بھی ہے؟"

"اگر کچھ دن پہلے یہ ذکر آیا ہوتا تو احمد چاشنی گیر میرا واقف تھا۔ یہ اس وقت بھی تھا جب سلطان ابراہیم اس ملک پر حکومت کر رہے تھے۔"

"تو کیا اب وہ محل میں نہیں ہے؟" بیدہ یہ نام سن کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"وہ نوکری چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ سنا ہے اس وقت اٹاوہ میں ہے۔"

بیدہ کو سب کچھ یاد آ گیا۔ جب وہ ابراہیم کے زمانۂ حکومت میں قلعے میں تھی تو اس نے یہ نام سنا تھا۔ وہ پرانا نمک خوار ہے شاید کام آ جائے۔

"تو اسے اٹاوہ سے بلوا سکتی ہے؟"

"اتنا تو میں اس کے بارے میں نہیں جانتی۔"

"اگر کوئی یہ کام کر دے تو میں اسے وہ ہار دے سکتی ہوں جسے تو کل بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔"

کنیز کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ وہ ہار اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا جسے وہ دیکھ چکی تھی۔

"میرا ایک بھائی ہے جو احمد کو آپ کے پاس لا سکتا ہے لیکن؟"

"لیکن کیا؟ جلدی بول۔"

"میں بھائی کے پاس جاؤں گی کیسے۔ پہرے دار تو مجھے جانے نہیں دیں گے۔"

"اس کا انتظام میں کر دوں گی۔ تو اس کی فکر مت کر۔"

"اور وہ ہار؟"

"مری کیوں جا رہی ہے۔ جیسے ہی احمد یہاں پہنچے گا، ہار تجھے مل جائے گا۔"

اس کے بعد سرگوشیوں میں اسے سب بتا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے اور احمد کو یہاں تک کیسے پہنچانا ہے۔

بیدہ نے پہرے داروں سے کہا کہ کنیز کے بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ کچھ دیر کے لیے گھر جائے گی اور شام سے پہلے واپس آ جائے گی۔

بیدہ نظر بند ضرور تھی لیکن بابر نے سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ اسے ماں کا رتبہ دیتا ہے۔ ان کا اسی طرح احترام کیا جائے اور اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔

پہرے داروں نے اس کی بات ٹالنا مناسب نہ سمجھا اور اس کے کہنے سے کنیز کو محل سے جانے دیا۔ وہ کنیز اپنے گھر گئی اور تمام انتظامات مکمل کر کے شام سے پہلے واپس آ گئی۔

اب بیدہ کو اپنا کام کرنا تھا۔ اس نے مشہور کرا دیا کہ بیدہ بہت سخت بیمار ہے۔ اس کے سر میں ایسا درد اٹھتا ہے کہ دیواروں سے سر ٹکراتی ہے اور بے ہوش بھی ہو جاتی ہے۔ پہرے داروں کو معلوم ہوا تو وہ اس امیر کے پاس گئے جسے ابراہیم کی والدہ کی دیکھ بھال کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ اس نے ایک طبیب بھیج دیا۔ وہ کچھ دوائیں تجویز کر کے چلا گیا لیکن اس خود ساختہ درد میں کمی نہیں آئی۔ وہ اسی طرح چیختی چلاتی رہی۔ طبیب پھر آیا۔ بڑا پریشان ہوا کہ درد میں کمی کیوں نہیں آئی۔ دوائیں تبدیل کر دیں۔ افاقہ پھر بھی نہیں ہوا۔ اب بیدہ نے اس امیر سے اجازت لے لی کہ وہ اپنے طبیب سے علاج کرانا چاہتی ہے جو بابر کے خوف سے آگرہ چھوڑ کر چلا گیا ہے لیکن وہ اسے بلوا لے گی۔ امیر نے اجازت دے دی۔

دوسرے ہی دن منصوبے کے مطابق احمد چاشنی گیر طبیب کے روپ میں محل کے اندر آ گیا۔ اس کے بعد بیدہ نے یہ اجازت لے لی کہ جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتی طبیب اسی محل میں رہے گا۔

احمد چاشنی گیر آیا تو غیر ملکی بادشاہ کی طرف سے سخت برہم تھا۔ اسی برہمی نے اسے نوکری چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ابھی تک مرحوم سلطان ابراہیم کے گن گا رہا تھا البتہ ابھی تک وہ صرف یہ سمجھ رہا تھا کہ بیدہ نے اسے اپنے پاس ملازمت کے لیے بلایا ہے۔ منصوبے کا اسے علم نہیں تھا اور جب علم ہوا تو وہ گھبرا گیا۔ کسی قیمت پر تیار نہیں تھا۔ اسے بیدہ نے بہت بڑی جاگیر دینے کا لالچ دیا تو وہ تیار ہو گیا۔

"تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ اس ہندوستانی باورچی کو راضی کرنا ہے جس کا بھائی پانی پت میں مارا جا چکا ہے۔ وہ اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے فوراً تیار ہو جائے گا۔ اسے زہر پہنچانا ہے اور بس۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں محل کے اندر پہنچوں گا کیسے؟"

"وہاں اب سب نئے ملازمین آ گئے ہیں۔ کوئی بھی تمہیں نہیں پہچانے گا۔ پہلے دن میری کنیز تمہیں وہاں لے جائے گی۔ پھر تم اس باورچی سے دوستی کر لینا اور اس سے ملنے چلے جایا کرنا۔ جس دن وہ کہے گا میں زہر کی پڑیا تمہیں بھجوا دوں گی، اسے پہنچا دینا۔"

احمد ڈرتے ڈرتے تیار ہو گیا اور اس کنیز کے ساتھ قلعے میں چلا گیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ وہ باورچی اس کا واقف کار نکلا۔ دوستی کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ دو چار ملاقاتوں میں اس نے اس ہندوستانی باورچی کو شیشے میں اتار لیا۔

بیدہ نے کوئی تولہ بھر زہر اپنی کنیز کے ذریعے باورچی کے پاس پہنچا دیا۔ احمد بھی یہ دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھا کہ باورچی کھانے میں زہر ملاتا ہے یا نہیں۔ بیدہ نے اپنی دوسری کنیز کو یہ دیکھنے کے لیے بھیج دیا کہ پہلی کنیز نے احمد تک زہر پہنچایا یا نہیں۔

سالن پتیلی سے نکال کر رکابی میں ڈالا گیا تو باقی تین باورچیوں نے حسب رواج باری باری اس سالن کو چکھا، جو باورچی اس سازش میں شریک تھا چکھنے کے بہانے تھوڑا سا زہر [illegible] کی رکابی میں پھلکے رکھے تھے ان پر چھڑک دیا۔ پھر وہ [illegible] گیا اور آدھا زہر چولہے میں پھینک دیا۔

اس دن جمعہ تھا۔ نماز کے بعد جب دسترخوان بچھا۔ [illegible] انڈوں کا قلیہ اور قاق پکایا گیا تھا۔ خرگوش بھی کھایا، انڈوں کا قلیہ اور قاق کی بوٹیاں بھی کھائیں مگر ہر چیز بے مزہ معلوم ہوئی۔ کھاتے ہی جی متلانے لگا۔ آبدار خانے تک جانے کی فرصت بھی نہیں ملی۔ زور کی قے ہوئی۔ یہ اس کے لیے [illegible] بات تھی کیونکہ اسے تو کثرت سے شراب پینے کے [illegible] قے نہیں ہوئی تھی جو کہ اکثر ہو جاتی ہے۔ ایسی نوبت [illegible] آئی تھی۔ اب جو قے ہوئی تو شبہات پیدا ہوئے۔ [illegible] دیا کہ باورچیوں کو حراست میں لے لیا جائے۔

[illegible] اس سالن میں سے کسی میں زہر ملا ہوا تھا۔ ذرا تحقیق

[illegible] کا بچا ہوا سالن کتے کے آگے ڈال دیا اور اس [illegible] دوسری صبح اس کا پیٹ پھول گیا اور ایسا بے سدھ ہوا کہ پتھر مارتے تو بھی اپنی جگہ سے نہ اٹھتا تھا البتہ دوپہر تک اٹھ بیٹھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ زہر یا تو مہلک نہیں تھا یا مقدار میں کم تھا۔

بابر کو ایک پیالے میں تریاق پلایا گیا۔ تب اس کی طبیعت بحال ہوئی۔

باورچیوں کو حراست میں لیا جا چکا تھا۔ سلطان محمد بخشی کو تفتیش کا حکم دیا گیا۔ اس نے چاروں باورچیوں سے پوچھ گچھ کی اور ذرا سختی کی تو ان میں سے ایک نے سارا حال بیان کر دیا۔ احمد چاشنی گیر آگرہ سے نکلنے کی فکر کر رہا تھا کہ پکڑا گیا۔ بیدہ کی دو کنیزوں کا بھی ذکر آیا اور وہ بھی پکڑی گئیں۔ سب نے اپنے اپنے جرم قبول کر لیے تو بابر کے حکم سے انہیں سزا سنا دی گئی۔ چاشنی گیر احمد کے ٹکڑے کر دیے گئے۔ باورچی کی کھال کھنچوا دی گئی۔ ایک کنیز کو ہاتھی کے پاؤں سے کچلوا دیا۔ دوسری کا جرم ہلکا تھا اس لیے اس کو گولی ماری گئی۔

اب باری تھی اس سازش کی سرغنہ ابراہیم لودھی کی ماں بیدہ کی۔ اس وقت تک بابر کی حالت خطرے سے باہر ہو چکی تھی اور اب وہ دربار لگا سکتا تھا۔ ملزمہ اہم تھی لہٰذا اس کا فیصلہ وہ سب کے سامنے کرنا چاہتا تھا تاکہ اس پر یہ الزام نہ آئے کہ اس نے اپنے حریف کی بوڑھی ماں پر کسی قصور کے بغیر ظلم کیا۔

اس کے حکم پر بیگ، اعلیٰ عہدے دار اور سلطنت کے مختلف علاقوں کے حاکم دربار میں جمع ہوئے۔ بابر تخت پر بیٹھا اور عہدے دار اپنے منصب کے اعتبار سے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے۔

دو سپاہیوں کی حراست میں بیدہ کو دربار میں لایا گیا۔ اس کا سر بلند تھا۔ چہرے پر ذرا بھی پشیمانی نہیں تھی۔ اس نے سیاہ ماتمی لباس پہنا ہوا تھا۔ بیدہ کو لانے والے عہدے دار نے حکم دیا کہ وہ بابر بادشاہ کی تعظیم کے لیے اپنا سر خم کرے۔

"یہ بادشاہ نہیں میرے بیٹے کا قاتل ہے۔ میں اس کی تعظیم کے لیے کیسے سر جھکا سکتی ہوں۔" ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کی گردن جھکا دی۔

"بادشاہ نے ہر کام زبردستی کیا ہے۔ یہ بھی سہی۔" بیدہ نے دوبارہ گردن بلند کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے ہماری جان لینے کی سازش کیوں کی؟" اس مرتبہ بابر کی آواز گونجی۔

"جسے تم سازش کہہ رہے ہو وہ ہمارا انتقام تھا جو افسوس کہ پورا نہیں ہوا۔"

"کس چیز کا انتقام؟"

"اپنے بیٹے کے خون کا انتقام۔"

”کیا تم نہیں جانتیں کہ وہ جنگ تھی۔ جنگوں میں یہی ہوتا ہے اور پھر تمہارے بیٹے کو ہم نے نہیں مارا کسی سپاہی نے مارا ہوگا۔“

”تمہیں زہر میں نے نہیں دیا۔ میرے کسی آدمی نے دیا ہوگا۔“

دلیل ایسی تھی کہ بابر پہلو بدل کر رہ گیا لیکن فوراً سنبھل بھی گیا۔ ”وہ آدمی تمہارے بھیجے ہوئے تھے۔ تم نے انہیں دولت کا لالچ دیا تھا۔“

”وہ سپاہی جس نے میرے بیٹے کو قتل کیا اسے تم ہی تو کابل سے لائے تھے۔ اسے مالِ غنیمت کا لالچ بھی دیا ہوگا۔ تم صرف قاتل نہیں، تم نے تو میرا خزانہ بھی کابل والوں پر لٹا دیا۔“

”ہر فاتح یہی کرتا ہے۔ تمہارے بیٹے نے جو ہزاروں عورتوں کو بیوہ کر دیا۔ کبھی تم نے ان عورتوں کا ماتم کیا۔ کبھی بیٹے کا ہاتھ روکا۔ کبھی اسے قاتل سمجھا؟“

”وہ اس وقت بادشاہ تھا۔ میں بادشاہ کو نہیں روک سکتی تھی لیکن اپنے بیٹے کے قاتل سے انتقام لے سکتی ہوں۔“

تفتیشی عہدے دار نے پھر دخل اندازی کی۔ ”تمہیں اگر انتقام لینا تھا تو تلوار اٹھاتیں۔“

”میں عورت ہوں۔ یہی طریقہ اختیار کرسکتی تھی جو میں نے کیا۔“

”بادشاہ سلامت تمہیں ماں کا درجہ دیتے رہے اور تم نے یہ گھٹیا طریقہ اختیار کیا۔“

”یہ مجھے کوئی بھی درجہ دیں۔ میں ابراہیم کی ماں ہوں اور مجھے انتقام لینا تھا۔ میں موت کے لیے تیار ہو کر آئی ہوں۔ بادشاہ زیادہ سے زیادہ کیا کرسکتا ہے۔ موت دے سکتا ہے، دیدے۔“

یہ بحث ہو رہی تھی مگر بابر کچھ اور سوچ رہا تھا۔ یہ بوڑھی عورت آج نہیں تو کل مرجائے گی۔ اسے موت کی سزا سنانے کا کیا فائدہ۔ اس وقت پوری لودھی قوم تو یہاں موجود نہیں ہے۔ وہ اپنی قوم کے نزدیک شہید بن جائے گی۔ لودھی قوم مجھے اس کا قاتل ٹھہرائے گی۔ تاریخ میں بھی نہ جانے کیا کیا لکھا جائے گا۔ اس کی سزا یہ ہونی چاہیے کہ زندہ رہے اور اس خیال سے کڑھتی رہے، اندر اندر سلگتی رہے کہ اس کے بیٹے کے تخت پر ظہیرالدین بابر بیٹھا ہے۔ کل تک جو ملکہ تھی وہ اس کی قیدی ہے۔

”اس کی تمام دولت اس سے چھین لی جائے اور اسے کسی دور دراز کے قلعے میں عام قیدیوں کی طرح معصوبت میں رکھا جائے اور اس سے کہا جائے کہ جب کوئی فاتح، بابر اور اس کی اولاد کے ادوارِ حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیے آیا تو اسے رہائی مل جائے گی۔ اگر وہ اس وقت تک زندہ رہی۔“

بیدہ کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ وہ سزائے موت سے بچ گئی لیکن وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ سزا کتنی کڑی ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ (بعد میں یہ کابل بھیجی گئی تو اس نے دریائے سندھ میں خود کو گرا دیا)

اس وقت تک بابر اتنا طاقتور ہوا بھی نہیں تھا کہ بیدہ کو قتل کرا کے اسے مظلوم بناتا اور لودھیوں کو بدلے کا موقع دیتا۔ وہ صرف اس تنگ سے راستے کا مالک تھا جو درۂ خیبر سے بھیرہ، لاہور، سرہند، پانی پت، دہلی اور آگرہ تک پھیلا ہوا تھا۔ دہلی اور آگرہ کے سوا باقی قلعہ بند شہروں نے اپنے مورچے مضبوط کر لیے تھے اور اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ ان میں سنبھل میں قاسم سنبھلی، میوات میں حسن خاں میواتی، بیانہ میں نظام خاں، گوالیار میں تاتار خاں، زایری میں حسن خاں توانی، اٹاوہ میں قطب خاں، کالپی میں عالم خاں، مہابن میں مرغوب خاں اور قنوج میں نصرت خاں اور بہار خاں۔ مشرق میں گنگا کے کنارے ان طاقتور باغیوں کے اور مغرب میں راجپوت راجاؤں کے جتھے تیار کھڑے تھے جن سے اسے نبرد آزما ہونا تھا۔ اس نے ان باغی علاقوں کی طرف فوجیں روانہ کیں۔ کسی مہم کی سربراہی ہمایوں کے حوالے کی۔ کسی کی ذمے داری اپنے معتبر سپہ سالاروں کو سونپی۔ شاہانِ شرقی اور دوسرے دور دراز ملکوں کے استحصال کے لیے فوجیں روانہ کیں۔

ماضی میں تمام مسلمان سلاطین کا یہ شیوہ رہا تھا کہ اکثر پہاڑوں سے یورشیں کیں اور واپس چلے گئے۔ اس دفعہ بھی ہندوستان کے دور افتادہ جاگیردار رئیس اپنے اپنے قلعوں میں مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے تھے کہ بابر بھی لوٹ کا سامان لے کر چلتا بنے گا لیکن جب ایک سال گزر گیا اور بابر جما بیٹھا رہا اور اب اس نے دیگر علاقوں میں بھی فوجیں بھیجنا شروع کر دیں تو واضح ہو گیا کہ وہ مستقل سکونت کا ارادہ رکھتا ہے۔

ہندوستان والے گھبرائے کہ یہ سرزمین چغتائی خاندان کے زیرِ اقتدار آگئی تو تمام افغان سرداروں اور ہندو راجاؤں پر زندگی تنگ ہو جائے گی۔ رؤسائے ہند سوچ میں پڑ گئے کہ بابر کے خلاف کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔

مشرقی پنجاب میں برسرِ اقتدار لودھی سرداروں، میواتیوں اور دوسرے سرکش زمینداروں نے آپس میں

مراسلت شروع کر دی اور راجپوتوں کے سرخیل رانا سانگا سے فریاد کی۔

”یہ ملک امیر تیمور کی اولاد کے قبضے میں آگیا تو وہ پھر یہاں سے نہیں نکلے گا۔ اسی ملک کو ٹھکانا بنا لے گا اور سب سے پہلے وہ ہندوستان کے بتوں کو توڑ کر ہماری قومی بنیادوں کو ڈھا دے گا۔ بھوکے مغل اپنے وطن والوں کے پاس جو تحفہ روانہ کریں گے، وہ ہماری بہو بیٹیاں اور ہمارے بیوی بچے ہوں گے۔

ہماری قومی غیرت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے نفاق کو اتفاق میں تبدیل کرلیں اور کمرِ ہمت باندھ کر پہلے اپنا مال پھر اپنی جان نثار کر دیں۔“

راجستھان کے رئیس اور راجا آپس میں برابر لڑتے رہتے تھے لیکن ایک بیرونی دشمن کے مقابلے میں پوری طرح متحد ہونے کی قابلیت سے عاری نہیں تھے۔ انہوں نے بابر کے خلاف گٹھ جوڑ کیا اور رانا سانگا کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ ان میں سات بڑے راجا اور سو کے قریب چھوٹے راجا اسی ہزار سواروں کا لشکر اور کئی سو جنگی ہاتھی لے کر آگئے۔ جھنڈوں کے رنگ ایسے بکھرے کہ چتوڑ، رن تھمبور، چندیری کے جنگجو میواڑ کے رانا سانگا کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی وحشی صورتیں، تپے ہوئے تانبے کی طرح رنگتوں سے دشمن کا کلیجا کانپ جاتا تھا۔ ان کی اس بہادری میں اس مرتبہ یہ جذبہ بھی شامل ہو گیا تھا کہ وہ اپنے وطن کی حفاظت کر رہے ہیں۔

دوسری طرف سے پٹھانوں کے لشکر طبلِ جنگ بجاتے ہوئے دوڑ پڑے۔ ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ بابر کا سنگھاسن ڈانواڈول ہونے لگا۔ رانا سانگا کے گرد دو لاکھ راجپوت اور پٹھان سوار جمع ہو گئے۔ اس نے دو ہزار جنگی ہاتھی اور توپ خانہ لے کر کوچ کیا۔ آگرہ میں مخبروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ ان خبروں میں افواہوں کی گرمی بھی شامل ہو گئی تھی۔

ان افواہوں اور خبروں کے غبار نے ایسا اثر کیا کہ لشکر کے حوصلے پست ہونے لگے۔ اختلافِ آب و ہوا نے بہت سے مغلوں کو بیمار ڈال دیا تھا۔ فوجیں بھی باغیوں کی سرکوبی کے لیے ادھر ادھر منتشر تھیں۔ سیلاب تھا کہ بڑھتا چلا آرہا [illegible]۔ بڑھے امیر یہ صورتِ حال دیکھ کر بادشاہ کو آمادہ کر رہے تھے کہ وہ کابل لوٹ چلے۔

ان امیروں کا کہنا بھی کچھ ایسا بے جا نہیں تھا۔ فتنے تھے کہ ہر طرف سر اٹھا رہے تھے۔ دشمنوں میں سے حسین خاں نے راپری کو دبوچ لیا تھا۔ قطب خاں نے چندلور پر قبضہ جما لیا۔ خواجہ زاہد سنبھل چھوڑ کر چلا آیا۔ گوالیا کا قلعہ اس نواح کے ہندوؤں نے آگھیرا اور عالم خاں جسے کمک دینے بھیجا تھا سراسیمہ ہو کر اپنی جاگیر کو چل دیا۔ غرض شکست کے سب سامان جمع ہو گئے تھے۔ ایسے میں امیروں کا بددل ہونا فطری تھا لیکن خود بابر فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ رانا سانگا سے لڑے گا۔ بابر نے اپنے امرا اور سرداروں کو جمع کر کے دو ٹوک تقریر کرنے کا فیصلہ کیا۔

”کیا تم نہیں سمجھتے کہ ہمارے اور ہمارے وطن کے درمیان کئی مہینے کا سفر حائل ہے۔ اگر ہمیں خدانخواستہ یہاں شکست ہوئی تو ہمارا ٹھکانا کہاں رہے گا۔ ہمارا مادری وطن کہاں، ہمارا شہر کہاں ہے۔ ہم اس وقت غیروں اور اجنبیوں کے درمیان ہیں۔ ہر اعتبار سے ضروری اور لازمی ہے کہ تم خوب سمجھ لو کہ تمہارے سامنے صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ اگر فتح ہوئی تو ہم خدا کی راہ میں غازی ہوں گے۔ اگر فتح نہ ہوئی تو جان دے کر شہادت کا درجہ پائیں گے۔ ان دونوں صورتوں میں نجات و فلاح ہماری ہے۔ پسپائی کی گنجائش نہیں۔ ہمارا قدم آگے ہی بڑھے گا۔ ہمارا نام نیک اور ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یاد رکھو نیک نامی کی موت بدنامی کی زندگی سے زیادہ بہتر ہے۔“

اس کی اس تقریر نے وہی اثر کیا جو ایسے مواقع پر اس کی تقریریں اکثر کیا کرتی تھیں۔ اس کے ایقان کی تاثیر سارے لشکر میں دوڑ گئی۔ انہوں نے قرآن ہاتھ پر رکھ کر بطیب خاطر قسمیں کھائیں کہ مرجائیں گے، میدان سے منہ نہیں پھیریں گے۔

ہر جگہ اسی قول و قسم کا ہنگامہ سا برپا تھا۔ نجومی کے شگون اور فالیں آن کی آن میں ہوا ہو گئیں، پھر بابر نے اپنے آدمیوں سے وعدہ کیا کہ رانا سانگا سے جنگ کے بعد جو شخص بھی وطن کو واپس جانا چاہے گا اسے جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔

اس اعلان کا سبب شہزادہ ہمایوں کی سرکشی تھی۔ ہمایوں کی بدخشانی جمعیت 14 مہینے سے وطن چھوڑے ہندوستان میں مصروفِ جنگ تھی۔ یہ لوگ یقیناً چاہتے ہوں گے کہ اس نفرت انگیز ملک میں مزید لڑائیاں لڑنے سے قبل جو کچھ مال و متاع حاصل کیا تھا، اسے لے کر خیریت سے واپس چلے جائیں۔ ہمایوں خود بھی اپنی والدہ ماہم بیگم سے کئی دن کے مشورے کے بعد بادلِ ناخواستہ ہندوستان آیا تھا اور اب چاہتا تھا اپنی جمعیت کو لے کر واپس چلا جائے۔ اسی لیے بابر یہ اعلان کر رہا تھا کہ رانا سانگا سے جنگ کے بعد جس کا جہاں

جی چاہے چلا جائے۔

رانا سانگا کے ساتھ لشکرِ عظیم دیکھ کر وہ جمنا کے کنارے آگرہ کے گرد خندقیں کھود کر مدافعانہ جنگ کو ترجیح دے سکتا تھا لیکن وہ اس قسم کی ذرا سی بھی کمزوری دکھاتا تو دوآبہ کے میدان اور قلعے ہاتھ سے نکل جاتے۔ محض تاخیر کی وجہ سے بیانہ نکل ہی چکا تھا۔ پیش قدمی کے بغیر چارہ نہ تھا۔ شہر سے نکل کر میدان میں پڑاؤ ڈالا۔ تین چار دن یہیں خیمہ زن رہا تاکہ وہ فوج جو ادھر ادھر منتشر تھی، آجائے۔

یہاں سے کئی کوس چلنے کے بعد اس نے ایک تالاب کے کنارے توپوں کے سامنے خندق کھدوائی اور حسبِ سابق گاڑیاں (ارابے) رسیوں سے بندھوا کر دفاعی خط تیار کیا کہ لوگوں کے حوصلے پست نہ ہوں۔

اس کام میں پچیس دن لگ گئے تھے کہ کابل سے کمک آنے کی نوید ملی۔ سلطان حسین مرزا کا نواسہ قاسم حسین، سلطان احمد یوسف اور سید یوسف اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ پہنچے۔ بابر نے لوگوں کے حوصلے بڑھانے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اطلاع ملتے ہی پیشوائی کے لیے کئی رسالے بھیجے کہ پرچم لہراتے ہوئے دھوم دھام سے ساتھ لائیں تاکہ دشمنوں کو خیال ہو کہ کوئی بڑی کمک آئی ہے۔

اسی قافلے کے ساتھ اونٹوں کی قطار بھی غزنی سے آئی اور وہاں کی شرابوں کے علاوہ ایک ایک جہاں گرد نجومی بھی ان کے ساتھ تھا۔

یہ نجومی رات کے وقت بابر کے پاس آیا۔ اس نے ایک کاغذ بابر کے سامنے رکھ دیا جس پر آڑھی ترچھی لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔

اس نے کہنا شروع کیا۔ ”آج کل مغرب میں آٹھ ستارے ہمارے مقابل آگئے ہیں۔ جو کوئی مشرق سے لڑنے جائے گا شکست کھائے گا۔ بھاری نقصان اٹھائے گا۔ اس لیے بہتر ہے یہ مہم آپ اس وقت ملتوی فرما دیں۔“

اس نجومی کو دیکھ کر اسے اپنے لڑکپن کی وہ شکست یاد آگئی جو نجومی کی جھوٹی پیش گوئی کی بدولت اس نے فرغانہ میں اندجان کے پل پر کھائی تھی۔ اب وہ لڑکپن کی منزلوں سے بہت آگے نکل آیا تھا۔ اس قسم کی یاوہ گوئی پر یقین نہیں کرسکتا تھا۔

”مردود، اس سے پہلے کہ تیری باتیں لشکر تک پہنچیں یہاں سے دفع ہوجا۔“

اس نے اس نجومی کو راتوں رات کابل کی طرف واپس بھجوا دیا۔

اگلے دن وہ سوار ہوکر گشت کرنے اور ماحول کا جائزہ لینے نکلا۔ نجومی کی پیش گوئی ابھی تک اسے الجھن میں ڈالے ہوئے تھی۔ رانا سانگا کی فوجوں کا سمندر سر پر تھا۔ نہ جانے جنگ کا نتیجہ کیا ہونے والا تھا۔ بیابان میں دور دور تک خاموشی تھی۔ وہ تھا یا اس کے ساتھ اس کا خدا تھا۔ دل میں ایک خیال سا آیا کہ اگر اس جنگ میں اسے شکست ہوگئی اور وہ شہید ہوگیا تو اس حال میں خدا کے سامنے جائے گا کہ شراب کی بو منہ سے آرہی ہوگی۔ کیا خبر ایک شراب پینے والے کو شہادت کا رتبہ ملتا بھی ہے یا نہیں؟ مجھ پر صرف یہ گناہ نہیں کہ میں شراب پیتا ہوں۔ میری خوشنودی کے لیے میرے امرا بھی اس فعل میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ ان کا گناہ بھی میرے ہی سر ہوگا۔ اگر میں شراب سے توبہ کرلوں تو خدا مجھے یقیناً رانا سانگا کے مقابلے پر فتح نصیب کرے گا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے سناٹا اس کی تائید کررہا ہے۔ جیسے یہ خاموشی چیخ چیخ کر اسے مبارکباد دے رہی ہے۔ اس نے اسی خاک پر دو نفل نماز ادا کی اور اپنے رب سے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔

اسی عالم میں پڑاؤ پر واپس آیا اور اعلان کیا کہ آج سے میں نے تاحیات شراب ترک کی۔

”سونے چاندی کے شاہی ساغر وسبو توڑ کر فقرا ومساکین میں تقسیم کردیے جائیں۔“

اس اعلان کا ہونا تھا کہ دوسروں کو بھی توفیق ہوئی۔ کئی سو امرا، سردار اور سپاہیوں نے اس کی تقلید میں شراب نوشی سے توبہ کرلی۔ شراب کے مٹکے اور صراحیاں زمین میں لنڈھا دیے۔ غزنی سے جو شراب آئی تھی وہ بہت زیادہ تھی اس لیے اسے پھنکوانے کے بجائے اس میں نمک شامل کردیا تاکہ وہ سرکہ بن جائے۔

جس جگہ اس نے توبہ کی تھی وہاں ایک پتھر نصب کرایا اور بعد میں یادگار کے طور پر یہاں ایک عمارت تعمیر کرائی۔

اس یادگار پتھر کے سامنے کھڑے ہوکر اس نے یہ عہد بھی کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے رانا سانگا پر فتح بخشی تو میں اپنی قلمرو کے مسلمانوں پر ہر قسم کے محصول معاف کردوں گا۔ اسی توبہ کی یادگار میں اس نے ڈاڑھی بھی رکھ لی۔

اس کے ان اعلانات نے لشکرگاہ میں عجیب پاکیزہ ماحول طاری کردیا۔ حوصلے کی لکیر تھی جو اس سرے سے اس سرے تک کھنچی ہوئی تھی۔ جہاد کا جوش وخروش تھا جو ہر سپاہی پر طاری تھا۔

ہندو پڑاؤ میں بھی ایسے ہی جذبات موجزن تھے۔

یہاں اسلام کا جذبہ تھا تو وہاں وطن کی حفاظت کے لیے کٹ مرنے کی قسمیں۔

فارسی نوروز، 13 مارچ 1527ء (933ھ) بابر نے فوج کو میدانِ جنگ میں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ توپ اور ارابوں کی قطاریں جو رسوں اور زنجیروں سے آپس میں جکڑی ہوئی تھیں، حرکت میں آئیں۔ نئی خندقیں کھودنے والے آگے آگے، بندوقچی، شاپے جلانے والے عقب میں چلے آتے تھے۔

راجپوتوں کا پڑاؤ قریب آتا جارہا تھا۔

بابر کو پانی پت کی جنگ سے بہت سا سبق حاصل ہوا تھا۔ یہ پانی پت سے بڑی لڑائی تھی۔ اس لیے بابر کو مزید پھونک پھونک کر قدم رکھنا تھا۔ یہ جنگ فیصلہ کرنے والی تھی کہ اسے ہندوستان میں رہنا ہے یا کابل واپس چلے جانا ہے۔

عین کارزار کے دن بڑی بڑی چوبی تپائیاں پہیوں پر چلائی جارہی تھیں۔ ان سب کو خندقوں کے پیچھے رکھا گیا تھا جو فوری طور پر کھودی گئی تھیں۔ انہیں ایک زنجیر میں منسلک کردیا گیا تھا۔ حکم تھا کہ کوئی سپاہی اس حد سے آگے نہ بڑھے۔ یہی حکمت عملی اس نے پانی پت میں اپنائی تھی۔

پانی پت کے مقابلے میں یہاں فوج کو بہت گہری صفوں میں مجتمع کیا گیا تھا لہٰذا پورا لشکر طویل پتلی قطار کے بجائے دشمن کو چوکور اور گھنا نظر آرہا تھا۔

سامنا ہوتے ہی دشمن کے ہاتھی آگے بڑھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بڑے بڑے پہاڑ ہیں جو اپنی جگہ سے کھسک رہے تھا۔ ایسے مہیب ہاتھی کہ دیکھنے والوں کا کلیجا منہ کو آتا تھا۔ ادھر سے بڑھتے ہوئے ہاتھیوں پر بابر کی توپوں نے گولہ باری کی۔

راجپوتی رسالوں نے یورش کی، ادھر تیروں کی بوچھاڑ نے ان کا منہ پھیر دیا۔

دوپہر کی گرمی میں بھی گھمسان کی جنگ میں کمی نہیں آئی۔ دلاوری میں راجپوت بھی کم نہیں تھے۔ یکے بعد دیگرے حملے کررہے تھے۔ ایک رسالہ ہٹتا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا۔ عصر کے وقت تک بابر اپنی فوج کے تمام دستے جھونک چکا تھا لیکن اتنی مہلت نہیں مل سکی تھی کہ چکر کاٹ کر دشمن کی پشت پر پہنچ جائیں۔ جنگ طول پکڑنے لگی تھی لہٰذا [illegible] اپنی محفوظ سپاہ کو دائیں بائیں رکھے میدان میں اتر آیا۔ بادشاہ کی شرکت سے پوری فوج میں جوش [illegible]۔ پھر اس نے یہ غیر متوقع حکم دے دیا کہ پورا لشکر بہ یک وقت راجپوتوں پر حملہ کردے۔ زنجیر بند ارابوں کے درمیان کے کھلے حصوں سے سوار نکل آئے۔ توپوں کو آگے کھینچا گیا۔ بندوقچیوں نے سرعت سے پیش قدمی کی۔

دشمن کی صفوں میں انتشار نمودار ہوا اور جنگ مغلوبہ شروع ہوگئی۔ دشمن صفیں کبھی پیچھے ہٹتیں کبھی آگے بڑھ آتیں۔ اس افراتفری میں مغلوں کا داؤ خوب چلا۔ حسن خاں میواتی مارا گیا۔ راول اودے سنگھ قتل ہوا۔ رائے چند بھان چوہان پرلوک سدھارا۔ دلیپ راؤ مارے گئے۔ کنور کرم سنگھ ڈوگر بھی کام آگیا۔ عام سپاہیوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔

مغلوں کے پہلو پوری قوت سے چلے اور دشمن کو تین طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ اب ان کے حملے رک گئے تھے۔ وہ صرف اس کوشش میں تھے کہ گھیرا توڑ کر نکلیں یہاں کوشش میں خود رانا سانگا زخمی ہوگیا۔ سورج چھپتے چھپتے راجپوتوں نے زخمی رانا کو میدان سے نکالا اور میواڑ کے پہاڑوں کے رخ بھاگنا شروع کیا۔

بابر دشمن کو بھگاتا ہوا اس کی لشکرگاہ میں پہنچ گیا جو ڈیڑھ دو میل دور تھی۔ رات ہوگئی تھی اس لیے مزید تعاقب کیے بغیر واپس آگیا۔ اس جنگ میں راجپوتوں کے جتنے بڑے سردار تھے، سب مارے گئے۔ خود رانا سانگا اپنے زخموں سے جانبر نہ ہوسکا۔ اس کی اولاد میں بھی پھر کسی کو مغلوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بابر نے شمالی ہند کے مسلمان بادشاہ کی طاقت پانی پت میں توڑی تھی کنواہہ میں اس نے راجپوت جتھے کا دم خم نکال دیا۔

اس عجیب وغریب کامیابی کی وجہ اس کی سمجھ میں یہی آئی تھی کہ اس نے شراب سے توبہ کی تھی اور یہ توبہ قبول ہوگئی۔ اس کے اعتقاد اور ایمان میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

رانا سانگا سے جہاد کے وقت اس نے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد جو کوئی ہندوستان سے جانا چاہے گا اسے رخصت دی جائے گی۔

ہمایوں کے سارے لشکری بدخشاں یا کوہستان پار کے تھے۔ وہ اتنا عرصہ کبھی اپنے علاقوں سے دور نہیں رہے تھے۔ کابل میں سپاہ بھی بہت کم رہ گئی تھی۔ اب ہندوستان میں کسی بڑی جمعیت کی ضرورت بھی نہیں رہ گئی تھی۔ ہمایوں خود بھی کابل جانے کا خواہش مند تھا لہٰذا اسے اجازت دے دی۔ وہ اپنی بدخشانی جمعیت کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ کچھ اور بھی امیر تھے جو جانا چاہتے تھے۔ انہیں بھی اجازت دی۔

بابر کو جوانی سے اب تک کے عرصے میں پہلی مرتبہ سکون کی نیند آئی تھی۔ دائیں بائیں کسی نئے خطرے کے سر پر

آجانے کی تشویش نہیں تھی لیکن تشویش کی لہر اس وقت دوڑ گئی جب ایلچی یہ انہونی خبر لایا کہ شہزادہ ہمایوں نے دہلی کے راستے جاتے ہوئے خزانوں کا قفل تڑوایا اور ان میں رکھے ہوئے زروجواہر اپنے ساتھ کابل لے گیا۔ اس کا مطلب تو یہی ہوسکتا تھا کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ تو کیا میرا یہ خواب پورا نہیں ہوگا کہ میں ہندوستان سے بدخشاں تک ایک سلطنت بنادوں گا۔ تو کیا میرا ہی بیٹا اپنی سلطنت الگ قائم کرے گا؟ تو کیا کابل بھی میرے ہاتھ سے گیا؟ کیا میری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ایک ٹھکانا ملتا ہے تو دوسرا چلا جاتا ہے۔ میں نے اسے کتنا نوازا۔ کوہ نور ہیرا تک اسے نواز دیا اور اس نے خزانوں کے قفل توڑنا ضروری سمجھا۔ اس نے ہمایوں کے نام بڑا سخت مراسلہ لکھا اور اسے سخت سست سنا کر دل ہلکا کیا۔

وہ ہمایوں سے اتنی محبت کرتا تھا کہ دو مہینے بعد ہی اس نے اس صدمے کو فراموش کردیا۔ بدخشاں میں خلعتِ خاص اور گھوڑا بھیجا اور یوں قفل شکنی کا قصہ فراموش کردیا۔

ایسا نہیں تھا کہ اس کے دل سے کابل فراموش ہوگیا ہو۔ کابل کا قلعہ، برف پوش پہاڑوں کے زیر سایہ مرغزار، بگنال کے سرخ سرخ پھولوں کا کھلنا خاص طور پر یاد آتا تھا۔ وہاں کے لذیذ انگور اور خربوزے تو اسے ایسے یاد آتے تھے کہ اگر کوئی وہاں سے سوغات لے آتا تھا تو غریب الوطنی کا رنج تازہ ہوجاتا تھا اور آنسو بہائے بغیر نہیں رہ پاتا تھا۔

ہندوستان میں رہ کر بھی کابل کی فکر میں رہتا تھا۔ وہاں کے عمال کو برابر ہدایات لکھتا رہتا تھا۔ کابل کی جامع مسجد کا اسے ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ کبھی چیش دالان کی نگہداشت پر توجہ دلاتا تھا۔ کبھی باغوں کی درستی کی ہدایت دیتا تھا۔ وہاں کے باغوں میں نئے پودے لگانے کے لیے خطوط لکھتا تھا۔

جب ذرا فرصت ملی تو اپنے وطن کی معروف چیزوں کی یہاں نقل تیار کرائی۔ آگرہ میں باغ بنوایا جس کا نام کابل کی نقل میں ''باغ زرافشاں'' رکھا۔ جمنا کے پار جاکر باغ بنایا۔ اس کا نام بھی کابل کے ایک باغ کے نام پر ''چار باغ'' رکھا۔ ہندوستان کے لوگوں نے اس وضع کا باغ اور عمارتیں نہیں دیکھی تھیں۔ انہوں نے جمنا کے اس کنارے کو جہاں یہ باغ تھا ''کابل'' کے نام سے موسوم کردیا۔

ایسے ایسے مقامات پر جہاں کسی کا خیال بھی نہ جاتا تھا اس نے بیسیوں باغ تیار کرائے۔ اسی شغف کی بدولت ''باغ ساز بادشاہ'' کے خطاب کا مستحق ہوا۔

سیکری میں ایک بڑا تالاب بنوایا۔ اس کے بیچ میں چبوترا تھا۔ وہ اس پر بیٹھتا یا اس کے گرد کشتی رانی کا لطف اٹھاتا۔ سیکری کے باغ میں ایک شاندار (دو منزلہ) بارہ دری بنوائی جہاں بیٹھ کر وہ ''تزک بابری'' لکھنے میں مشغول رہتا۔

آگرہ میں دریا کے دوسری جانب محل سرا اور باغ کے درمیان ایک سنگین محل خود اپنے لیے تعمیر کرایا۔ دھولپور کے پہاڑوں کی چٹانوں میں ساٹھ قدم عرض کا حوض ترشوایا۔

رانا سانگا کو شکست دینے کے بعد وہ چھوٹی چھوٹی جنگیں لڑتا رہا لیکن اب کوئی بڑی مہم اس کے سامنے نہیں تھی۔ مشرقی ندیوں پر مقابلہ کرنے والے مغلوب کرلیے گئے تھے۔ ایک سال کے اندر اندر اس کی سلطنت بدخشاں کے پہاڑوں سے گنگا گھاگرا کے سنگم تک پھیل گئی۔

ہمایوں اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا لیکن بابر کو اب اس کی طرف سے اطمینان تھا کیونکہ کابل پر اس نے بری نظر نہیں ڈالی تھی۔ وہ بدخشاں میں تھا اور اب سمرقند لینے کی کوشش کررہا تھا۔ بابر کو پھر بھی کابل کا دھڑکا لگا رہتا تھا چنانچہ ہمایوں کو خط لکھا جس میں سمرقند کے بارے میں مشورہ دینے کے بعد یہ بھی لکھا۔

''ایک اور بات یہ کہ تسخیر کابل کے بعد سے ہمیں فتوحات پر فتوحات نصیب ہوئیں۔ اس لیے کابل کو میں بہت مسعود خیال کرتا ہوں۔ اسے اپنے خاصہ (ملک شاہی) میں داخل کرلیا ہے۔ تم میں سے کوئی اس کی طمع (لالچ) نہ کرے۔''

مقامی مزاحمت ختم ہوچکی تھی۔ دور دراز کے معاملات تھے، وہ اس نے آئندہ کے لیے اٹھا رکھے تھے۔ کابل کی بہت سی یادگاریں یہاں قائم ہوچکی تھیں لیکن کچھ یادگاریں ایسی تھیں جو یہاں نہیں بنائی جاسکتی تھیں۔ انہیں کابل سے لانا ہی پڑتا، یہ تھے اس کے اہل وعیال۔ بڑے بیٹے تو اپنی اپنی ریاستوں میں مقیم تھے۔ بیویاں، خالائیں، ننھی گلبدن اور بہن خانزادہ کابل ہی میں تھے۔ اس نے انہیں بلوا بھیجا۔

سب سے پہلے ہمایوں کی ماں ماہم بیگم پہنچی۔ اس کے ساتھ گلبدن آئی جو اپنی اصلی ماں کے بجائے ماہم کے ساتھ آئی تھی۔ خانزادہ بیگم، بی بی مبارکہ وغیرہ اور دوسری بیگمات کچھ روز بعد چلیں۔

ماہم بیگم کی سواری جب آگرہ سے دو کوس رہ گئی تو بابر نے گھوڑا لانے کا انتظار بھی نہیں کیا اور پیدل ہی چل پڑا اور اس محل کے قریب پہنچا جو اس نے ماہم کے لیے تیار کرایا تھا۔ ماہم اس کے احترام میں پالکی سے اترنا چاہتی تھی لیکن اس نے اترنے نہ دیا، خدام کے ساتھ چلتے

ہوئے اسے محل تک لایا۔

چند روز بعد دوسری بیگمات بھی آگئیں۔ اس نے سب کو الگ الگ محلات میں ٹھہرایا۔ اس کا خاندان پھر ایک جگہ جمع ہوا اور اس حال میں کہ اب خوش حالی کے دروازے اس پر کھلے ہوئے تھے۔

خاندان کے دوبارہ ایک جگہ جمع ہونے کی خوشی میں جشن منایا۔ زرافشاں باغ تعمیر ہوچکا تھا۔ اس میں جتنے درخت اور پھول تھے سب کی قلمیں کابل سے منگوا کر لگائی گئی تھیں۔ یہی اس کا پہلا دربار عام تھا جو بادشاہ کی حیثیت سے منایا گیا۔

''خس پوش بنگلے میں میری نشست تھی۔ دائیں جانب محترم علما اور سمرقند سے آئے ہوئے ملا اور حفاظ بیٹھے۔ اسی جانب کچھ فاصلے پر شامیانہ تان کر قزلباش سفیروں کو جگہ دی گئی تھی۔ بائیں جانب ازبک سفیر اور راجستھان و بنگالہ کے ہندو وکلا تھے۔

دسترخوان بچھائے جانے سے پہلے تمام سلاطین، عمائد وامرا نے نذریں گزاریں۔ سامنے دریا کنارے مست اونٹوں، ہاتھیوں اور مینڈھوں کو لڑایا گیا اور پہلوانوں کی کشتیاں کرائی گئیں۔''

کھانے سے فراغت کے بعد بادشاہ کی طرف سے انعامات تقسیم ہوئے۔ اس کے بعد تماشاگروں نے طرح طرح کے کرتب دکھائے اور رقاصاؤں نے رقص پیش کیا۔

اس جشن میں وہ سپہ سالار نظر نہیں آرہے تھے جو دریائے سندھ کے کنارے قیادت سے محروم دیہاتیوں کو بلوچوں سے تحفظ دینے کے لیے نبرد آزما تھے۔

☆☆☆

بارش ذرا دیر کو تھم گئی تھی مگر آسمان پر کالے بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ موسم کی خوشگواری نے اس کے قدم ماہم بیگم کے محل کی طرف اٹھا دیے۔ ماہم بیگم محل کے [illegible] میں چوکی کے پاس بیٹھی تھی کہ بادشاہ کی آمد کا غلغلہ ہوا اور پھر وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ ماہم اٹھی اور کورنش بجا لائی۔ بابر نے دیکھا کہ موسم کی خوشگواری کے [illegible] اس نظر آرہی ہے۔

''بیگم اس موسم میں بھی آپ اداس ہیں؟''

''آپ کو ہماری اداسی سے کیا واسطہ۔ آپ بادشاہ [illegible] کے باپ تھوڑی ہیں ہماری طرح۔''

''ہم کچھ سمجھے نہیں۔ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟''

''میں ہمایوں کی یاد میں تڑپتی رہتی ہوں۔ جب میں کابل میں تھی تو مرزا ہمایوں یہاں کی دل دہلا دینے والی جنگوں میں مشغول رہے۔ پھر آپ نے انہیں بدخشاں بھیج دیا۔ پھر بھی میں سمجھتی تھی کہ وہ میرے قریب ہے۔ اب آپ نے مجھے یہاں بلالیا۔ وہ پھر مجھ سے دور ہوگیا۔ شیبانی خاں کی اولادوں سے مجھے ڈر لگتا رہتا ہے۔''

''بیگم ہم نے انہیں نہیں بھیجا۔ وہ خود جانے کے لیے بے قرار تھے ورنہ ان کے بغیر تو خود ہمارا دل نہیں لگتا۔''

''آپ کے تو اور بھی بیٹے ہیں۔ میرا تو صرف ہمایوں ہے۔''

''آپ نے ٹھیک کہا۔ میرے اور بھی بیٹے ہیں لیکن ان میں ہمایوں کوئی نہیں ہے۔ تمہاری طرح میرا بھی اکلوتا فرزند وہی ہے۔''

''تو پھر اسے یہاں کیوں نہیں بلالیتے۔ میری آنکھیں

سنہری باتیں

☆ اتنے زیادہ امیر بن جاؤ کہ تم اپنی مرضی اور خواہش کی ہر چیز خرید سکو، مگر خود اتنے مہنگے بن جاؤ کہ دنیا کی کوئی بھی دولت تم کو نہ خرید سکے۔

☆ جب ہم مکمل طور پر بغیر کسی شک وشبہ کے کسی پر بھروسا کرتے ہیں تو آخرکار ہمیں دونوں میں سے ایک نتیجہ ملتا ہے یا تو ہم کسی شخص کو زندگی بھر کے لیے پالیتے ہیں یا زندگی بھر کا سبق سیکھ لیتے ہیں۔

☆ زندگی اور وقت دنیا کے بہترین استاد ہیں، زندگی ہمیں وقت کا استعمال سکھاتی ہے اور وقت ہمیں زندگی کی قدر وقیمت سکھاتا ہے۔

☆ گفتگو ایسی چیز ہے، جس کی وجہ سے انسان یا تو دل میں اتر جاتا ہے یا پھر دل سے اتر جاتا ہے۔

☆ ہر حالت میں مضبوط اور ثابت قدم رہنے کے لیے دو بہترین نکات۔

(1) کبھی اپنے جذبات کی عکاسی کے لیے آنسوؤں کی مدد نہ لیں۔

(2) اپنے غصے کے اظہار کے لیے کبھی الفاظ کی مدد نہ لیں۔

مرسلہ: اختر شاہ عارف، جہلم

کیوں ٹھنڈی نہیں کرتے؟"

"ہم کوشش کریں گے کہ وہ ہندوستان واپس آجائے۔"

☆☆☆

ہمایوں بدخشاں اور کابل کی فوجیں جمع کر کے ازبکوں کے خلاف بڑھا جو اس کی سرحدوں پر برابر فتنہ وفساد اٹھاتے رہتے تھے لیکن افسوس کہ ہمایوں اور اس کا بھائی ازبک کے ہم پلہ نہ نکلے۔ ہمایوں نے سرحدی قلعہ حصار کو جھپٹ لینے میں تو مہارت دکھائی لیکن سمرقند کے قریب تر مقامات پر کامیاب نہ ہوسکا اور احساس ناکامی لیے واپس چلا آیا۔ ادھر ماہم بیگم کے خطوط برابر آرہے تھے۔ وہ اسے ہندوستان واپس بلا رہی تھی۔ پھر حسب عادت مہینوں گومگوں کی کیفیت میں رہ کر اپنے کم عمر بھائی ہندال کو اپنا قائم مقام بنا کر بدخشاں سے چل پڑا۔ کابل آیا اور یہاں سے اس نے آگرہ کی راہ لی۔

بادشاہ اتفاق سے اس وقت بھی ماہم بیگم کے پاس بیٹھا تھا کہ ہمایوں آگیا۔ وہ اپنی ولایت چھوڑ کر بلا اجازت چلا آیا تھا۔ بادشاہ کو برہم ہونا چاہیے تھا لیکن وہ صرف اتنا کہہ سکا کہ تم نے آنے میں جلدی کردی ورنہ ہم نے تو یہ سوچا تھا کہ اس مہم میں ہم بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔ وہ علاقہ پھر سے حاصل کرلیں گے جو کبھی ہمارے پاس تھا۔ وہ زمین کتنے عزیز نہیں ہوتی جہاں اس کا بچپن گزرا ہو۔

اس خیال سے اسے تشفی بھی ہوگئی تھی کہ ماہم اسے بلانا چاہتی تھی چلو وہ خود ہی آگیا۔ سمرقند کو حاصل کرنا ہے پھر کسی وقت دیکھا جائے گا مگر یہ وقت پھر کبھی نہ آسکا۔ اس کی صحت روز بروز گرتی جارہی تھی۔ جب سے اسے ابراہیم لودھی کی ماں نے زہر دیا تھا وہ بیمار رہنے لگا تھا اور پھر دن رات کی مشقت نے اسے نڈھال کردیا تھا۔

بابر نے یہ سوچ کر کہ ہمایوں اپنی ولایت چھوڑ کر آیا ہے، اسے دوآبے کا نہایت زرخیز پرگنہ سنبھل دے دیا جہاں سے ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ ہمایوں اپنی جاگیر سنبھل چلا گیا۔

ماہم ایک مرتبہ پھر اداس رہنے لگی بلکہ اس مرتبہ تو اسے یہ یقین ہوگیا کہ بابر جان بوجھ کر اس کے بیٹے کو اس کے پاس نہیں رہنے دینا چاہتا۔

آخر اس کے دل کی بات زبان پر آگئی۔

"جہاں بھی خطرہ ہوتا ہے آپ مرزا ہمایوں کو وہاں بھیج دیتے ہیں۔ مرزا کامران بھی تو ہیں، انہیں تو آپ نے لاہور میں رکھا ہوا ہے جہاں کوئی گڑبڑ نہیں۔"

"اس لیے کہ وہ ولی عہد ہے میرے بعد اسے تخت نشیں ہونا ہے۔ اسے خطرات سے کھیلنے کا عادی ہوتے دیجیے۔ شہزادے ماؤں کی گود میں نہیں پلتے۔" بابر نے جھنجلا کر کہا لیکن پھر خود ہی احساس ہوا کہ اس نے کیا کہہ دیا۔ "آپ کہتی ہیں تو ہم اسے سنبھل سے بلالیں گے۔ ویسے آپ فکر نہ کریں۔ وہ اتنا شجاع ہے کہ اپنی حفاظت خود کرسکتا ہے۔"

بابر دھیان بٹانے کے لیے ماہم کے ساتھ دوسری بیگمات کو لے کر... گوالیار چلا گیا۔ یہاں کے مندر انہیں دکھائے۔ آبشار دیکھنے گئے، یہاں پہلی مرتبہ ماہم نے آبنوس کے درخت دیکھے۔ پھر دھولپور گیا۔ غرض کئی مہینوں کی سیر وتفریح کے بعد آگرہ واپس آگیا۔

ماہم کو خوش دیکھنے کے لیے اس نے ماہم سے کہا۔ "ہم ہمایوں کو خط لکھ رہے ہیں کہ وہ واپس آجائے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ ہم اپنی زندگی ہی میں اسے اپنی جگہ تخت نشیں کردیں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا عالی جاہ۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں وہ میری نظروں کے سامنے رہے۔"

"آپ نہ چاہیں مگر میں چاہتا ہوں۔ وہ امورِ سلطنت سنبھالے۔ میں آپ کے پاس رہوں۔ باقی عمر شاعری اور مطالعے میں گزار دوں۔"

"آپ کو اللہ سلامت رکھے۔"

"بیگم ایسا شہنشاہ آپ نے نہیں دیکھا ہوگا جو اپنے بیٹے کو اپنی زندگی میں اپنا وارث بنادے۔ آپ دیکھیں گی کہ ہمیں یہی کرنا پڑے گا۔"

دونوں طرف خاموشی تھی کہ بابر نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ہماری آنکھیں بند ہوجائیں تو ہماری خاک کابل لے جاکر سپرد خاک کیجیے گا۔ کابل ہمارا پہلا عشق ہے بلکہ محسن ہے۔ جب ہمارے پاس کچھ نہیں تھا تو کابل نے ہمیں گلے سے لگایا تھا۔ اب ہم نے مغلیہ سلطنت کی بنیادیں اتنی مستحکم کردی ہیں کہ ہماری اولاد صدیوں اسے قائم رکھ سکے گی۔"

ماہم کو اب افسوس ہورہا تھا کہ بات کہاں سے نکلی تھی اور کہاں پہنچ گئی۔ شہنشاہ یہ نہ سمجھ رہے ہوں کہ ہم اپنے بیٹے کے لیے تاج وتخت کا مطالبہ کررہے ہیں۔

ابھی وہ ہمایوں کو خط لکھ نہیں سکا تھا کہ سنبھل سے قاصد آگیا۔ "شہزادہ ہمایوں سخت علیل ہیں۔ مشیر وندیم انہیں دہلی لے جارہے ہیں۔ بیگم حضرت فوراً دہلی تشریف لے آئیں۔"

خط کا پہنچنا تھا کہ ماہم پر تو جیسے قیامت ہی گزر گئی۔ فوراً دہلی کی راہ لی۔ ابھی راستے میں تھیں کہ متھرا پر شہزادے سے ملاقات ہوگئی۔ بیٹے پر نظر پڑی تو ہوش ہی تو اڑ گئے۔ وہ اس سے زیادہ علیل تھا جتنا خط میں لکھا گیا تھا۔

"ہمایوں دہلی نہیں آگرہ جائیں گے۔"

ہمایوں کو آگرہ پہنچا دیا گیا۔

سرد کوہستانی علاقے سے ہندوستان کے گرم مرطوب میدانوں میں آنے والوں میں بیماری پھیلنی ناگزیر تھی۔ بہت سے لوگ اسی خوف سے بابر کا ساتھ چھوڑ کر جاچکے تھے۔ لشکر میں بخار کی وبا عام ہوگئی تھی۔ بابر کی بیگم دلدار بیگم کا ایک کمسن بچہ ہندوستان آتے ہی بیمار پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے چٹ پٹ ہوگیا۔ خود بابر کو کئی مرتبہ کھانسی میں خون آچکا تھا۔ ماہم بیگم شکایت کررہی تھیں کہ انہیں سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے۔ یہ سب چلتا ہی رہتا تھا لیکن ہمایوں کی حالت دیکھ کر سب ہی فکرمند ہوگئے۔ بابر اسے دیکھنے آیا تو ناامیدی نے گھیر لیا۔ ہمایوں نے باپ کو دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ کچھ دن پہلے تک وہ جوان رعنا تھا اور اب بستر پر ہڈیاں رکھی تھیں۔ نقاہت ایسی تھی کہ صرف اٹھنے کی کوشش ہی نے اس پر غشی طاری کردی تھی۔

ماہم نے پھر وہی جملہ دہرایا جو وہ پہلے بھی کہہ چکی تھی۔ "آپ کیوں غم کرتے ہیں۔ خدا نے آپ کو اور بیٹے دیے ہیں۔ ہاں میں غمگین ہوں کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔"

بابر نے بھی وہی جواب دیا جو وہ اس سے پہلے کہہ چکا تھا۔ "ہاں ماہم میرے اور بیٹے ہیں مگر وہ ہمایوں نہیں ہیں۔" وہ کہہ کر وہ بادشاہ ہوتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

جب کوئی خطرے میں گھرتا تھا، بابر اس کی کمک کے لیے پہنچتا تھا لیکن اب وہ خود خطرے میں تھا اور کوئی اس کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

"ماہم، میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ کاش میں شہزادے کو سنبھل نہ بھیجتا۔ شہزادے کے صحت یاب ہوجانے کے بعد ہم خود بھی اس سے معافی طلب کریں گے۔"

"... اپنا بیٹا مجھے مل جائے پھر آپ مجھے نہیں روک سکیں گے، میں کابل چلی جاؤں گی۔"

"پھر ہم روکنے والے کون ہوں گے۔ آپ کا بیٹا جو کہے گا آپ وہی کیجیے گا۔"

اطبا اپنی سی کوشش کرتے رہے لیکن ہمایوں کو افاقہ نہیں ہوا۔ اطبا کچھ کہتے نہیں تھے لیکن بابر نے ان کی آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔ وہ مایوس نظر آتے تھے۔ ہمایوں کے بچنے کی اب کوئی امید نہیں تھی۔ محل کی خواتین بیمار کے نیم تاریک کمرے میں چپ چاپ دعائیں کرتی رہتی تھیں۔

میر ابوالبقا تشریف لائے۔ یہ اس زمانے کے نہایت متقی اور عالم فاضل شخص تھے۔ بادشاہ کو اکثر اپنے مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے شہزادے کی زندگی کسی صدقے کی طالب ہے۔ ایسی قیمتی چیز کہ اس سے زیادہ عزیز کوئی اور چیز نہ ہو، بیٹے پر سے قربان کردیں تو امید ہے اللہ تعالیٰ شفا دے۔"

ایک بزرگ قریب بیٹھے تھے انہوں نے مشورہ دیا۔ "آگرہ سے ملنے والا بیش قیمت ہیرا قربان کردینا چاہیے۔"

"اس ہیرے کی ہمایوں کے سامنے کیا وقعت ہے۔ میرے نزدیک تو سب سے قیمتی شے میری زندگی ہے۔ میں مرزا پر اپنی جان فدا کروں گا۔"

حاضرین سہم گئے لیکن بابر فیصلہ کرچکا تھا۔ اس نے اطبا کو رخصت کیا اور اس علاج کی تیاری کی جس کا تعلق دوا کے بجائے صرف قادر مطلق سے تھا۔

دیوان خانے میں بیٹھے مشائخ یہ بحث کررہے تھے کہ جان کے بدلے جان دینے کا جو طریقہ بابر کی قوم میں رائج ہے سراسر غیر اسلامی ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بادشاہ کو بات مان لینی چاہیے تھی۔ کوہ نور ہیرا صدقہ کرنا چاہیے تھا۔

باہر یہ بحث ہورہی تھی اور اندر ہمایوں کے چھپر کھٹ کے اطراف بابر چکر لگا رہا تھا۔ زبان سے کہتا جاتا تھا "یا اللہ! اگر جان کے بدلے جان قبول ہو تو میں ظہیر الدین بابر اپنی جان اور زندگی اپنے فرزند ہمایوں کی جان کے عوض پیش کرتا ہوں۔"

بابر نے تین مرتبہ یہ کلمات ادا کیے۔ "برداشتم، برداشتم، برداشتم۔" (میں نے اس کی بیماری اپنے سر لے لی) یہ آواز باہر تک سنی گئی۔

بابر کی بیٹی گلبدن کا بیان ہے۔

"اسی شام سے بادشاہ کمزور اور بیمار ہوگیا۔ اس کے برعکس ہمایوں کے سر پر پانی رکھا تو وہ اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہوگیا۔"

گرمی کی عفونت اور بیمار کے کمرے کی تاریکی میں عورتیں خاموش بیٹھی دعا کررہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ بابر کی قربانی پیش کرنے کا کیا انجام ہوگا۔

ہمایوں شفایاب ہوگیا اور چند روز بعد باپ کے حکم

سے اپنی جاگیر پر سنبھل چلا گیا لیکن بابر کو پھر آگرہ سے باہر جانا نصیب نہ ہوا۔

امرا انتظار میں تھے کہ شاید بابر کے افاقے کی خبر سنیں لیکن گلبدن لکھتی ہے۔

''جب اس کی حالت ابتر ہوتی گئی تو ہمایوں کو بلانے کے لیے قاصد بھیجا گیا۔''

تمام اہم امرا بادشاہ کے گرد جمع تھے۔ ہمایوں بھی تشریف فرما تھا۔ بابر نے نحیف آواز میں کہنا شروع کیا۔

''میرے دل میں تھا کہ سلطنت ہمایوں مرزا کے حوالے کر کے خود باغ زرافشاں میں گوشہ نشیں رہوں۔ مجھے لگتا ہے میری یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں۔ مجھے مرض نے دبا لیا ہے۔ میں تم سب کو وصیت کرتا ہوں کہ ہمایوں کو بادشاہ تسلیم کرو۔ اس کے وفادار اور آپس میں متحد رہو۔ مجھے امید ہے کہ ہمایوں بھی حسبِ منشا کام کرے گا۔''

اس آخری وقت میں مردوں کے اٹھ جانے کے بعد اس نے ماہم بیگم کو طلب کیا۔ ''ماہم، ہم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اپنی زندگی میں تمہارے بیٹے کو تخت کا وارث بنا دیا۔ میرے دوسرے بیٹے تمہاری حفاظت میں ہیں۔ ہمایوں کو بھی یہی نصیحت کرنا کہ اپنے بھائیوں سے اخلاص و محبت سے پیش آئے۔''

اس کے تیسرے دن 25 دسمبر 1530ء کو بابر نے ملک بقا کی راہ لی۔

بابر کی وفات کو مخفی رکھا گیا کیونکہ امرا کو اندیشہ تھا کہ اس خبر کو سن کر عوام فساد برپا نہ کر دیں۔ اس کے برعکس یہ اعلان کر دیا گیا کہ بادشاہ نے ترکِ دنیا کر کے خلوت اختیار کی اور بادشاہی ہمایوں کے حوالے کر دی ہے۔

تیسرے دن ہمایوں نے زرافشاں باغ میں دربار عام منعقد کیا اور بے شمار سکے لوگوں پر نچھاور کیے۔ وراثت کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس قضیے کو بابر نے اپنی زندگی ہی میں طے کر دیا تھا۔ امرائے شاہی کو بابر کے آخری وقت کے کلمات یاد تھے۔ امرائے ہند نے بھی اسے تسلیم کیا۔

بابر کو آگرہ کے ایک باغ میں دفن کیا گیا۔ یہ باغ اس جگہ کے عین مقابل تھا جہاں بعد میں شہرۂ آفاق تاج محل تعمیر کیا گیا۔

ہندال جس کو بابر کا اتنا سخت انتظار تھا آخر آگرہ پہنچ گیا۔ قندھار کو کامران اور کابل کو خواجہ کلاں نے پوری طرح قابو میں رکھا۔

ہمایوں نے باپ کی خواہش پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ بھائیوں پر اعتماد کیا اور ان کی شایان شان کفالت کی، اخلاص و محبت کا برتاؤ کرتا رہا جیسا کہ بابر نے کہا تھا۔

چند سال بعد کامران کا ہمایوں سے تنازع ہوا۔ دوسرے بھائیوں نے بھی بے وفائی کی۔ یہ اتحاد ختم ہوتے ہی شیر شاہ سوری نے بغاوت کر کے ہمایوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا اور اسے ایران کے شاہ طہماسپ صفوی کی پناہ لینی پڑی۔

گلبدن کا کردار اس وقت وہی تھا جو خانزادہ کا بابر کے ساتھ رہا۔ وہ بھائی کے ساتھ ساتھ ماری ماری پھرتی رہی۔ اس کے ساتھ ہی دوبارہ ہندوستان آگئی جہاں واپس آ کر ہمایوں کا انتقال ہوا۔ گلبدن بیگم نے اس کا اور اپنے باپ کا تذکرہ ''ہمایوں نامہ'' تحریر کیا۔

جب شیر شاہ سوری نے مغلوں پر غلبہ پالیا۔ ہمایوں کو فرار ہونا پڑا۔ مغل دربار ہندوستان سے دھکیل دیا گیا اور بہ ظاہر یہ نظر آنے لگا کہ اب مغلوں کا اقتدار دوبارہ قائم نہیں ہو سکے گا۔ بابر کی قبر دیارِ غیر میں رہ جائے گی تو ہمایوں کی افغانی بیگم بی بی مبارکہ آگرہ آگئی اور اپنے شوہر کی باقیات کو دروں کے راستے کابل منتقل کیے جانے کا مطالبہ کیا۔

وہ افغان تھی۔ افغانوں کی حکومت تھی۔ درۂ خیبر تک اس کے قبیلے آباد تھے۔ وہ بابر کی باقیات کو بہ حفاظت کابل لے گئی۔ بابر کی پسندیدہ تفریح گاہ میں قبر بنا دی گئی۔ یہاں چنار کے جھنڈ سے بالا حصار اور دوسری طرف میدانوں کے پار پغمان کی برف پوش چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ قبر کے چھپے تعویذ کے قریب ایک چشمہ بہتا ہوا کابل ندی تک جاتا ہے۔

موجودہ کابل شہر سے درختوں اور بالا حصار کی پہاڑی نے اس مقام کو اوجھل کر دیا ہے۔

قبر کے باغ کو ''آرام گاہِ بابر'' کے سادہ نام سے پکارتے ہیں۔

ماخذات

ظہیر الدین بابر، ہیرلڈ لیم۔ تزکِ بابری، رشید اختر ندوی۔ ہمایوں نامہ، گلبدن بیگم۔ طبقات اکبری (جلد دوم)، نظام الدین احمد

ماضی کے ایک گم شدہ تعلق کی خوفناک نوعیت کا ماجرا

تجدید تعلق

تنویر ریاض

کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی ماضی کی طرف پلٹنا پڑتا ہے۔ جب کوئی بھولا بسرا چہرہ اچانک سامنے آجائے تو اس سے تعلقات کی نوعیت کو ذہن میں دُہرانا پڑتا ہے... وہ بھی جب اس عمل سے گزری تو سوائے تلخیوں کے اس کے پاس کوئی خوشگوار یاد نہ تھی مگر اس کے باوجود... اسے اس تعلق کی تجدید تو کرنا ہی تھی۔

ہمارے اسکول کی سالانہ تقریب ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے لیکن اس سے پہلے ہی کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ مجھے اپنے ایک سابق کلاس فیلو سے ملنے کے لیے [illegible]ن کے اس جدید بار میں خفیہ طور پر آنا پڑا۔ میں ہچکچاتے ہوئے بار کے مرکزی دروازہ سے اندر داخل ہوئی۔ شاید میں کبھی اس ملاقات کے لیے تیار نہ ہوتی لیکن اس نے ای میل [illegible] مجھے کچھ اس طرح جذباتی طور پر بلیک میل کیا کہ مجھے ملاقات کے لیے آمادہ ہونا پڑ گیا۔ میں نے ہامی تو بھر لی لیکن گزشتہ ایک ہفتے سے شدید ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھی اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مشکل وقت کو کیسے ٹالوں۔

آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور کچھ یہی کیفیت میری بھی تھی۔ میرے عقب میں مصروف سڑک پر گاڑیوں کی لمبی قطار تھی اور فٹ پاتھ پر لوگ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان میں اکثریت ان کارکنوں کی تھی جو دوپہر کے کھانے کے لیے اپنے دفتروں سے باہر نکل آئے تھے۔ میں نے بار میں قدم رکھنے سے پہلے قدِ آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میں نے اسکرٹ کے اوپر جیکٹ پہن رکھی تھی اور میرے ہاتھ میں سیاہ چرمی بیگ تھا۔ اس حلیہ میں دیکھ کر سب یہی سمجھتے کہ

میں کسی دفتر میں کام کرتی ہوں۔

میں مائیک سے ملنے آئی تھی۔ وہ بار کاؤنٹر کے پاس کھڑا بے چینی سے میرا منتظر تھا۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی اس میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ سوائے اس کے کہ اسکول بلیزر کوٹ کی جگہ قیمتی سوٹ نے لے لی تھی جس میں اس کے مضبوط اور چوڑے کندھے نمایاں نظر آرہے تھے۔ آج بھی اس کے چہرے پر وہی تختی اور تناؤ نظر آرہا تھا جو اس کے اندر کے بے رحم اور ظالم انسان کی عکاسی کرتا تھا۔ وہ کسی کی پروا کیے بغیر ہمیشہ لوگوں سے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ناشائستہ رویہ اختیار کرتا تھا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھی اور میزوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئی۔ جیسے ہی میں نے اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے اس کے بازو کو چھوا۔ وہ تیزی سے مڑا اور مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال تھا کہ تم نہیں آؤ گی۔“

میں نے پُرسکون رہنے کی کوشش کی لیکن جانتی تھی کہ اپنے اندر سے ابھرنے والی چیخوں کو مسکراہٹ کے پردے میں نہیں چھپا سکوں گی۔ میں بڑی مشکل سے وہ جملہ ادا کرنے کے قابل ہوئی جس کی میں نے اس موقعے کے لیے ریہرسل کی تھی۔

”میرے خیال میں یہی بہتر تھا کیونکہ اسکول کی تقریب میں شاید ہمیں کھل کر باتیں کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔“

”میرے لیے یہ ایک اور حیرت انگیز انکشاف ہے۔ اس سے پہلے میں اس وقت حیران ہوا تھا جب تم نے میری ای میل کا جواب دیا؟“

”اگر تمہیں جواب کی اُمید نہیں تھی تو تم نے مجھے ای میل کیوں بھیجی؟“

”پہلے تم بتاؤ۔“ اس نے جارحانہ انداز میں مطالبہ کیا۔ ”تم نے میری ای میل کا جواب کیوں دیا۔“

”کچھ باتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت ضروری تھی۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”ڈرتی تھی کہ اگر جواب نہ دیا تو میرا جینا دوبھر کردو گے ماضی میں بھی تم نے مجھے بہت ستایا ہے۔“

”اس لیے کہ تمہیں یہ سب اچھا لگتا تھا اور تم اسی لیے باقاعدگی سے اسکول آتی تھیں تاکہ میں تمہیں مزید تنگ کرتا رہوں۔“

”میں اسکول اس لیے آتی تھی کہ اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا ورنہ تم نے تو اسے میرے لیے جہنم بنا دیا تھا۔“

وہ تھوڑا سا آگے کی طرف جھکا اور میرے بازو میں اپنی انگلیاں پیوست کرتے ہوئے بولا۔ ”تم آج بھی پہلے کی طرح مغرور اور دلکش ہو۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ سوائے اس کے کہ پہلے تمہارے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوتے تھے اور اب تم نے انہیں اپنے کندھوں پر کھلا چھوڑ دیا ہے۔ تم ہمیشہ یہی سمجھتی تھیں کہ یہ دنیا تمہارے لیے بنی ہے۔ تم اپنی ذات سے پیار کرتی تھیں اور تمہیں میری توجہ اچھی لگتی تھی۔ تمہیں ہمیشہ انتظار رہتا تھا کہ کب تمہیں چھیڑوں، ستاؤں، تنگ کروں۔ کچھ بھی نہیں بدلا، تم آج بھی ویسی ہو۔ میں نے تمہارے ساتھ ہلکی سی چھیڑخانی کی اور تمہیں یہ اچھا لگا۔ اسی لیے تم نے میری ای میل کا جواب دیا اور اسی لیے تم یہاں چلی آئیں جس طرح ایک پروانہ شمع کے گرد منڈلاتا ہے۔ تم اعتراف کیوں نہیں کرلیتیں کہ مجھ سے اس لیے ملنے آئی ہو کہ ابھی ہمارا تعلق ختم نہیں ہوا۔“

اس کی میل بڑی واضح تھی اور اس میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ ”ہے بے بی۔ کیوں نہ ہم اکٹھے ہو جائیں۔ اس کی ابتدا لنچ سے کرتے ہیں۔“

میں نے وہ ای میل فوراً ہی صاف کردی لیکن اس نے دوسری ای میل بھیجی، پھر تیسری۔ ان سب میں ایک ہی پیغام تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کا منہ بند کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس سے ایک بار مل لوں ورنہ وہ مجھے مسلسل تنگ کرتا رہے گا۔

میں اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی پھر میں نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف اس امید پر چلی آئی کہ شاید اتنے سالوں بعد تم تھوڑے بہت مہذب ہوگئے ہوگے لیکن لگتا یہی ہے کہ تم بالکل نہیں بدلے۔ میں حیران ہوں کہ تم جیسا گھٹیا شخص ابھی تک جیل کی سلاخوں سے باہر کیوں ہے اور مجھے اس بات کی بھی حیرانی ہے کہ تم یہاں اکیلے کیوں نظر آرہے ہو۔ تم تو کہیں بھی گروپ کے بغیر نہیں جاتے۔“

اس نے اپنی کرسی اتنے قریب کرلی کہ اس کی ٹانگیں میری رانوں کو چھونے لگیں۔ میرا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ وہ مخمور لہجے میں بولا۔ ”شاید تم اس سے زیادہ کی توقع کررہی ہو جو میں تمہارے ساتھ کلاس روم میں کیا کرتا تھا۔ اس وقت ہم بچے تھے، اب جوان ہوگئے ہیں۔ اس لیے تم ایسا سوچنے میں حق بجانب ہو۔“

میرے چہرے کی سرخی اور گہری ہوگئی۔ میں ان دنوں کو کیسے بھول سکتی تھی۔ پلک جھپکتے ہی میں بارہ سال کی بچی بن گئی، جس کی چیخیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ اور اس کے گروپ کے لڑکے وحشیانہ انداز میں اس لڑکی کے گرد رقص کر رہے تھے۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں میں انگلیاں چبھو کر اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کررہے تھے۔ میں آج بھی اس درد اور بے عزتی کو محسوس کرسکتی تھی۔ یہ ایک ایسی وحشت ناک یاد تھی جو کئی برس گزر جانے کے باوجود میرے ذہن سے چمٹی

ہوئی تھی۔

”تم نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اس سے تو انکار نہیں کرسکتے۔ تم نے ایک جرم کا ارتکاب کیا لیکن میں تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکی جبکہ تمہارے پاس اس گھناؤنے فعل کا کوئی جواز یا حق نہیں تھا۔ جو کچھ تم نے کیا، اب تمہیں اس کی تلافی کرنی چاہیے۔“

اس نے اپنے ہاتھوں سے میری تھوڑی پکڑی اور اسے بھینچتے ہوئے بولا۔ ”تم نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ اگر تمہیں میری چھیڑ چھاڑ پسند نہیں تھی تو تم نے میری شکایت کیوں نہیں کی۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں یہ سب کچھ اچھا لگتا تھا۔“

”میں نے تمہاری شکایت اس لیے نہیں کی کیونکہ تم اور تمہارے دوست صاف مکر جاتے پھر میں کسے اپنا گواہ بناتی اور سوائے شرمندگی اور بدنامی کے مجھے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تم پڑھائی میں کمزور تھے اور مجھ سے صرف اس لیے نفرت کرتے تھے کہ میں ہمیشہ اچھے نمبر لے کر آتی تھی۔“

اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا گلاس اٹھایا اور آہستہ آہستہ مشروب اپنے حلق میں انڈیلنے لگا، اس نے ابھی تک مجھے مشروب کی پیشکش نہیں کی تھی۔

”تم نے یقیناً اچھے نمبر حاصل کیے ہوں گے۔“ وہ حقارت سے مسکرایا۔ ”لیکن اس کے باوجود زندگی کی دوڑ میں آگے نہیں بڑھ سکیں...... جہاں تک جانا چاہتی تھیں۔“

میرا تیر نشانے پر لگا تھا۔ میں نے اس پر اپنی برتری ثابت کردی تھی اور اسے جتا دیا تھا کہ وہ پڑھائی میں مجھ سے بہت پیچھے تھا۔ اب میں اس کی تلملاہٹ سے لطف اندوز ہورہی تھی لیکن وہ بھی ایک ہی ڈھیٹ تھا۔ پینترا بدلتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں اندازہ نہیں کہ میں کتنا کامیاب ہوں۔ میں نے تمہارے شوہر کے کام کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ وہ کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہے۔“

”کم از کم تمہارے مقابلے میں تو بہتر ہے۔“ میں نے اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بھی تمہارے کاروبار کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ تم جس کمپنی پر ناز کرتے ہو، اس کا صرف ایک گودام ہے اور وہ بھی لندن کے مضافات میں ایک ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں کوئی بھی جانا پسند نہیں کرتا۔“

اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے ابھی تک ایک بھولی بھالی اسکول گرل سمجھ رہا ہے لیکن وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا لہٰذا وہ ایک بار پھر میری جانب جھکا اور اپنا چہرہ میرے قریب لاتے ہوئے بولا۔ ”میں محض ایک کاروباری شخص ہی سہی اور مجھے اعتراف ہے کہ اپنے آپ کو اپنے تک ہی محدود رکھتا ہوں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہر کام ڈھنگ سے کرتا ہوں۔ اسی لیے کامیاب ہوں اور اپنے کام سے لطف اندوز ہورہا ہوں۔ تم نے صرف میری کامیابی کا ایک ہی رخ دیکھا ہے اور وہی کچھ جانتی ہو جتنا کہ دوسرے لوگوں کو معلوم ہے لیکن تم نے بہت کچھ نظر انداز کردیا۔“

اس جملے پر میرے کان کھڑے ہوگئے گویا اس کے پاس اور بھی بہت کچھ تھا جو کسی کو نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ ابھی میں اس بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ اس نے ایک اور حملہ کردیا۔

”تمہارا شوہر کیسا ہے؟ کیا تم اس کے ساتھ خوش ہو، میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے گھر کی صفائی کرتے ہوئے تمہارا ذہن بلاوجہ اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتا ہوگا۔“

”وہ اس کا نہیں بلکہ ہمارا گھر ہے۔ وہ مجھ سے اور میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اب ہم جلد ہی اپنی فیملی بڑھانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ اسی لیے میں کوئی کام نہیں کررہی۔ بہرحال وہ اتنا کما لیتا ہے جو ہم دونوں کے لیے کافی ہے۔“

”اگر تم اس سے اتنی زیادہ محبت کرتی ہو تو یہاں میرے ساتھ کیوں بیٹھی ہو؟“

”میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں اور اس بار میں صرف اس لیے تم سے ملنے آئی ہوں کہ شاید تمہارے اندر اتنی اخلاقی جرأت ہو کہ تم کئی سال پہلے مجھ سے کی جانے والی زیادتیوں پر معافی مانگ سکو۔ میں اس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کردینا چاہ رہی تھی لیکن میری توقع غلط نکلی۔“

قریب بیٹھے ہوئے لوگ ہماری طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ اس نے یہ بات نوٹ کرلی اور اپنی کرسی کو تھوڑا سا پیچھے کرلیا۔ اس طرح مجھے بھی اپنی ٹانگیں پھیلانے کا موقع مل گیا اور میں قدرے سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ایسی کئی باتیں ہیں جو تم نہیں جانتیں اور جو تمہیں حیران کردیں گی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے شک آمیز انداز میں پوچھا۔

”سچ تو یہ ہے۔“ اس کی آنکھوں میں التجا تھی یا پھر وہ اس کی ایکٹنگ کررہا تھا۔ ”میری ہمیشہ سے ہی تم پر نظر تھی۔ میں تمہاری پوجا کرتا تھا لیکن تم نے مجھے حقیر اور ذلیل سمجھا۔ لہٰذا میں نے بھی تمہیں تنگ کرنا شروع کردیا۔ پھر یہ سلسلہ اتنا بڑھ گیا کہ مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ تم سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ یوں سمجھ لو کہ تمہیں تنگ کرکے تم سے اپنی توہین کا بدلہ لے

رہا تھا پھر جب میں نے اسکول کی ویب سائٹ پر تمہاری تصویر دیکھی تو پرانی یادیں تازہ ہو گئیں اور مجھے احساس ہوا کہ تم میرے لیے کتنی اہم تھیں۔ تم سوچ رہی ہو گی کہ میں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی تو اس کی ایک وجہ تم بھی ہو۔ لہٰذا میں نے تمہیں ایک موقع دینے کا فیصلہ کیا تا کہ جان سکو کہ اب میں کیا ہوں۔ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والا لڑکا اب کامیاب بزنس مین کے روپ میں تمہارے سامنے ہے اور اپنی بچپن کی گم شدہ محبت کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں دباتے ہوئے بولا۔ "صرف تم ہی نہیں بلکہ میں بھی تمہاری قربت کا خواہاں ہوں۔"

میں نے اپنی کرسی پیچھے کر لی اور غصے سے اسے گھورنے لگی۔ یقیناً وہ سنجیدہ نہیں تھا لیکن میں اسے کس طرح بتاتی کہ جو کچھ وہ میرے ساتھ ماضی میں کرتا رہا ہے۔ کیا اسے محبت کہتے ہیں۔ مجھے تنگ کرنا، چٹکیاں لینا، ٹکے مارنا، بال کھینچنا، آوازیں کسنا اور کتابیں چرانا، کیا یہ سب محبت کی نشانیاں تھیں۔ میں کئی سال تک اس بے عزتی کو بھلانے کی کوشش کرتی رہی جب اس نے اپنے دوستوں کی مدد سے کلاس روم میں مجھ سے زیادتی کی کوشش کی تھی کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ بھی اس کی محبت کے اظہار کا طریقہ ہے۔

میں اس کے جھوٹ پر ناراض ہونے کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی بلکہ مجھے تو اس کی ذہنی حالت پر بھی شبہ ہونے لگا تھا۔ تاہم میں اس کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش مند تھی لہٰذا اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے تحمل سے بولی۔ "مجھے تمہارے کہے ہوئے کسی ایک لفظ پر بھی یقین نہیں آرہا۔ تم جانتے ہو کہ میں شادی شدہ ہوں لہٰذا اب ایسی باتیں کرنے کا کیا جواز ہے۔ تم یقیناً یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ تمہارے بارے میں جو کچھ سوچتی رہی ہوں، وہ سب غلط تھا۔"

"ممکن ہے کہ میں کوئی بہت اچھا انسان نہیں ہوں لیکن ہم دونوں ماضی کو بھلا کر ایک بار پھر تعلق قائم کر سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ میرے گھٹنوں کو چھونے لگے جس کی وجہ سے میرے پورے جسم میں ایک ناگوار سی سنسنی پھیل گئی۔

"اب میں اس پوزیشن میں ہوں کہ تمہیں وہ سب کچھ دے سکوں جو تم چاہتی ہو بشرطیکہ تم اپنے پتے صحیح طرح کھیلو، بچے، مکان، گاڑیاں، سیر و تفریح...... تم جس چیز کا نام لو گی وہ تمہاری ہو جائے گی جہاں تک تمہارے شوہر کا تعلق ہے تو مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں، وہ تم سے مایوس ہو کر دریا میں چھلانگ لگا سکتا ہے یا گاڑی سمیت کسی گہرے کھڈ میں گر سکتا ہے۔" اس کی آواز میں دھمکی کا عنصر نمایاں تھا۔ "یہ میرا فلسفہ ہے کہ اچھے لوگ کبھی کسی لڑکی کو نہیں جیت سکتے۔"

"میں اب لڑکی نہیں رہی بلکہ شادی شدہ عورت ہوں۔" میں نے کمزور سی آواز میں احتجاج کیا۔

"تم آج بھی میرے لیے بہت خوبصورت ہو۔" اس نے دوبارہ میرے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "تمہیں فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھ پر تھوڑا سا بھروسا کرو تا کہ میں تمہیں اپنی سلطنت کے دوسرے حصے دکھا سکوں۔"

"اگر تم سمجھ رہے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کسی ایسی جگہ جا سکتی ہوں جہاں دوسرے لوگ نہ ہوں تو اس خیال کو دل سے نکال دو۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"آرام سے میری بات سنو۔ تم وہ دروازہ دیکھ رہی ہو؟" اس نے ایک ایسے دروازے کی طرف اشارہ کیا جو دیکھنے میں آگ لگنے کی صورت میں وہاں سے نکلنے کا راستہ لگتا تھا لیکن اس پر پرائیویٹ کی تختی لگی ہوئی تھی۔

"پریشان مت ہو، تمہیں اس عمارت سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آؤ میرے ساتھ۔"

اس نے اپنا اسٹول پیچھے ہٹایا اور میری بائیں کہنی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتی، وہ مجھے کھینچتا ہوا اس دروازے کی طرف لے گیا۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ اس نے ڈرنک کی قیمت ادا نہیں کی تھی اور نہ ہی بار مین نے اس سے پیسے مانگے۔

فرسٹ فلور پر جانے کے لیے لفٹ موجود تھی اور مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہاں لوگوں کی چہل پہل تھی۔ کوریڈور میں قالین بچھا ہوا تھا۔ جب ہم لفٹ میں داخل ہو رہے تھے تو دوسری لفٹ سے ایک لڑکی باہر آئی اور اس نے مائیک کو بڑے مودبانہ انداز میں مخاطب کیا۔ اس نے بھی اسے ڈینس کہہ کر بلایا۔ انداز سے واقفیت جھلک رہی تھی۔ لفٹ تیزی سے اوپر کی جانب جا رہی تھی۔ ہر منزل پر اس کا دروازہ کھلتا اور بند ہوتا تو لوگ مجھے اپنی میزوں پر سر جھکائے اپنے کام میں مصروف نظر آتے۔ ان میں سے کوئی ایک منزل سے دوسری منزل پر جانے کے لیے لفٹ میں داخل ہوتا تو وہ مائیک کو دیکھ کر تعظیماً سر جھکا دیتا۔ مائیک بھی جواب میں سر ہلا دیتا لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہ آتی اور ان لوگوں کو شاید اس کی توقع بھی نہیں تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس عمارت میں سب لوگ اسے جانتے ہیں اور اس طرح میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔ اس کے باوجود میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہو۔

مجھے شبہ تھا کہ اتنے سالوں میں اسے کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جس سے وہ محبت کر سکتا۔

لفٹ سب سے اوپر کی منزل پر پہنچ کر رک گئی۔ اس کا دروازہ ایک سوٹ میں کھلتا تھا جس کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی استقبالیہ پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ آگے چل کر ایک اور دروازہ تھا جو پرائیویٹ سوٹ میں کھلتا تھا۔ اس کی اندرونی آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی اور اسے چینی طرز پر سجایا گیا تھا۔ پورے کمرے میں بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا اور کھڑکیوں سے پورے لندن اور دریائے ٹیمز کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

اس نے دیوار پر لگی ہوئی ایک خوب صورت چینی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تصویر دیکھنے میں ہی بہت قیمتی معلوم ہوتی ہے۔ یہ سوٹ اسی کمپنی نے تیار کیا تھا جس سے میں نے گزشتہ سال یہ عمارت خریدی تھی، میں نے یہاں کوئی تبدیلی کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ شاید اس کمرے کو اس سے بہتر شکل نہیں دی جا سکتی۔ یہاں سے پورا لندن نظر آتا ہے۔ یہ نظارہ قابلِ دید ہے۔"

اس نے میز میں لگا ہوا بٹن دبایا اور مجھے لے کر کھڑکی کی طرف جانے لگا۔ اس کی ایک بات تو صحیح تھی۔ واقعی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہی استقبالیہ والی لڑکی اندر آئی اور مائیک نے اسے میرے لیے ڈرنک لانے کے لیے کہا۔ لڑکی نے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگائی اور چند منٹ بعد ہی ڈرنکس اور دیگر لوازمات لے کر آگئی۔

"سیڑھیوں کے نیچے اسٹاف کینٹین ہے اور وہ میرے لیے خاص طور پر اہتمام کرتے ہیں۔" اس نے فخریہ انداز میں کہا۔

اس نے میرے بازو پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور شیشے کی بوتل سے مشروب نکال کر میرے لیے گلاس میں انڈیلنے لگا، وہ اورنج جوس تھا لیکن مجھے اس میں الکحل کی ملاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ کسی قیمت پر بھی دوسرا گلاس نہیں لوں گی۔ چاہے وہ کتنا ہی اصرار کیوں نہ کرے۔

"اب تک تم مجھے متاثر کرنے میں کامیاب رہے ہو۔" اس نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ [illegible] ایک بار پھر کھانے کی ٹرے اٹھانے کے لیے اندر [illegible] گی۔ اس لیے فی الوقت اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہی تھی۔ [illegible] حال قابو سے باہر ہوئی تو میں سیکریٹری کے ساتھ ہی [illegible] باہر جا سکتی تھی گو کہ اس نے مجھے قائل کرنے کے [illegible] کی تھی لیکن مجھے اس کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا [illegible] رہا تھا جیسے یہ سب دکھاوا ہے، لہٰذا میں نے اس کے [illegible] لانے کے لیے کہا۔

"گویا تم نے مجھے متاثر کرنے کے لیے اس عالیشان دفتر کے ساتھ ساتھ ایک سیکریٹری کی خدمات بھی ادھار لی ہیں۔ میں کس طرح یقین کر لوں کہ تم یہ سب کچھ مجھے پھنسانے کے لیے نہیں کر رہے ہو۔ تم جیسے فنکار سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔"

اس نے اپنی جیکٹ اتار کر ایک کرسی پر پھینکی اور خود ایک مخصوص زاویے سے اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے دونوں پاؤں اٹھا کر میز کے کنارے پر رکھ دیے اور جوس کے گھونٹ لینے لگا۔ میں کھڑکی کے پاس ہی کھڑی رہی تا کہ اس کی دسترس سے دور رہوں۔

"ادھر دیکھو۔" اس نے الماریوں کی طرف اشارہ کیا جن میں بہت سی فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ "یہاں ایک کمپیوٹر ٹرمینل بھی ہے جو اس عمارت میں نصب تمام کمپیوٹرز سے منسلک ہے۔ تم اسے آن کر کے میرے دعوے کی تصدیق کر سکتی ہو۔ اس کے بعد تمہیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی تھی اور تم مجھ سے معافی مانگنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔"

اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ بیرے کی وردی میں ملبوس ایک لڑکا کھانا لے کر آگیا۔ میں نے سوچا کہ اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل جاؤں لیکن مائیک کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرے چہرے کے تاثرات پڑھ رہا ہو۔ اس نے اپنی پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے ایک شرط لگانا چاہتا ہوں۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اگر کمپیوٹر کے ریکارڈ سے اس کی تصدیق ہو گئی تو تم میرے گھٹنے چھو کر مجھ سے معافی مانگو گی۔"

میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اسے میری توہین کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اس نے بھی محسوس کر لیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا ہے لہٰذا اس نے فوراً ہی اپنا لہجہ تبدیل کیا اور بولا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں نے صرف گھٹنے چھونے کے لیے کہا ہے۔ ان پر بیٹھنے کے لیے نہیں۔ تم تو بہت زیادہ حساس ہو۔"

"میں حساس نہیں ہوں بلکہ ہمیشہ کی طرح تمہارا رویہ آج بھی قابلِ اعتراض ہے۔ تمہارے اندر کوئی تبدیلی نہیں آسکتی چاہے تم کتنے ہی بڑے آدمی کیوں نہ بن جاؤ۔"

میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ کس طرح اس کی حقیقت معلوم کی جائے۔ اس کے لیے کمپیوٹر ہی بہترین ذریعہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں کمپیوٹر ٹرمینل کے سامنے بیٹھ گئی اور مختلف مینو کا انتخاب کرنے لگی۔ سب سے پہلے تو میں نے اس بات کی تصدیق کی کہ یہ کمپیوٹر ٹرمینل واقعی اس

عمارت میں نصب دوسرے کمپیوٹرز سے منسلک ہے۔ جب میں نے مائیک کی فائل کھولی تو اندازہ ہوا کہ میں اس کے بارے میں جو چاہوں معلوم کرسکتی ہوں۔ اس کے حسابات، حصص، فروخت کے اعداد وشمار وغیرہ۔ یہ نظام اتنا واضح اور صاف تھا کہ اس کے ذریعے معمولی سے معمولی جزئیات کا بھی معائنہ کیا جاسکتا تھا جن کی ضرورت آڈٹ کے دوران میں پڑسکتی تھی۔

اس نے محسوس کرلیا کہ میں اس نظام سے متاثر ہوچکی ہوں۔ وہ فخریہ انداز میں بولا۔ ”یہ بہترین سسٹم ہے گو کہ میں اس کا بہت کم استعمال کرتا ہوں۔ جب تک بنیادی امور ٹھیک چل رہے ہوں۔ اس وقت تک مجھے کوئی فکر نہیں۔“

”اور وہ بنیادی امور کیا ہیں؟“ میں نے لمحہ بھر کے لیے کمپیوٹر اسکرین سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت میں حالیہ بورڈ میٹنگ کی کارروائی پڑھ رہی تھی اور اس کے صفحات تیزی سے میری نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

”بہترین لوگوں کو اپنے ساتھ رکھو اور بہترین چیزیں خریدو پھر انہیں مشکل اہداف دو تاکہ بھاری منافع حاصل ہوسکے۔ اگر وہ تمہاری توقعات پر پورا نہ اتر سکیں تو انہیں اپنے سے الگ کردو۔ یہاں صرف وہی آدمی چل سکتا ہے جو مکمل طور پرفٹ ہو۔ اسے کارکردگی دکھانا ہوگی ورنہ منظر سے ہٹنا پڑے گا۔ آپ کچھ عرصہ ان سے خوب کام لیں اور اس کے بعد فارغ کردیں اگر آپ کے اثاثوں کی مالیت مقررہ حد سے بڑھ جائے تو انہیں بھی فروخت کرکے منافع کھرا کرلیں۔“

میں نے محسوس کیا کہ وہ غائب، کا لفظ استعمال کرنے کا عادی ہے۔ اپنی گفتگو میں اس نے کئی بار یہ لفظ دہرایا۔ وہ ہوا میں ہاتھ ہلا کر اور ہونٹوں کو عجیب سے انداز میں سکیڑ کر اپنے اسٹاف کے غائب ہونے کی بات کرتا رہا۔ تازہ مشروب پینے سے اس کی طبیعت میں شگفتگی آگئی تھی۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ میری تحقیق سے کمپنی کی ملکیت کے بارے میں اس کے دعوے کی تصدیق ہوگئی تھی اور اب وہ میری جانب سے اس کا صلہ ملنے کی توقع کررہا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں لیکن ابھی مجھے بہت کچھ دیکھنا تھا جبکہ میرے پاس وقت کی کمی تھی لہٰذا میں نے وقتی طور پر اس کا خیال ذہن سے نکال دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگا اور جب اس سے برداشت نہ ہوا تو بھد بھد کرتا میرے پاس آیا اور میرے بلاؤز کی آستین کو اپنی انگلیوں سے پکڑتے ہوئے بولا۔

”تم نے کافی کچھ دیکھ لیا۔“ اس کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار تھی۔ ”ہم محض وقت ضائع کررہے ہیں۔ تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ تم غلطی پر تھیں۔ تم اپنی شکست تسلیم کرلو اور سیدھی طرح میری آغوش میں آجاؤ۔“

میں نے کمپیوٹر کا بٹن دبا کر اسے آف کیا اور مائیک نے میرے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کرکے مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس کا سر میرے کندھوں پر ٹکا ہوا تھا اور اس کی گرم سانسیں میرے نتھنوں کو جلا رہی تھیں۔ مجھے کراہیت کا احساس ہونے لگا۔ وہ اپنی کرسی پر گر گیا اور مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی پیش قدمی کرتا۔ میں نے اسے ہلکا سا دھکا دیا اور بولی۔

”اتنی بے تابی ٹھیک نہیں۔ تم مجھے ایک سیکنڈ کے لیے چھوڑ دو تو میں تمہیں ایسی چیز دکھاؤں گی کہ تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔“

”اب تم عقل کی بات کررہی ہو۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں احساس ہوگیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔“

میں نے اپنا ہینڈ بیگ کھول کر ایک پلاسٹک کارڈ نکالا اور اس کی میز پر رکھ دیا۔ اس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ”سراغ رساں انسپکٹر۔“ اور اس کے نیچے میرا نام اور پولیس کی وردی میں میری تصویر چسپاں تھی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری بہت شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے اپنے حسابات چیک کرنے کی اجازت دی۔ تم نے واقعی انہیں بہت اچھی طرح ترتیب دیا ہے۔ اس میں جو آمدنی اور منافع دکھایا گیا ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو تم ٹیکس گوشواروں میں ظاہر کرتے رہے ہو۔“

وہ اپنی جگہ پر یوں اچھلا جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے۔

”بہتر ہوگا کہ تم اپنی زبان پر قابو رکھو کیونکہ ہماری گفتگو ریکارڈ ہورہی ہے۔“ میں نے اسے اپنی بیلٹ میں بندھا ہوا مائیکروفون دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اس کا رابطہ براہ راست میرے دفتر سے ہے۔ لہٰذا تمہیں ہنگامہ کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔“

اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ کر پسینا پونچھنے لگا۔ جب تھوڑا سا پرسکون ہوا تو بولا۔ ”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ اس ریکارڈ کو ضائع کرنے کے بارے میں نہ سوچو کیوں کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں پہلے ہی اسے کاپی کرکے انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے دفتر بھیج چکی ہوں۔ اب میں جارہی ہوں اور تمہیں اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک اس ریکارڈ کی چھان بین نہ ہوجائے اور میرے محکمے کے اعلیٰ افسران تم سے رابطہ نہ کریں۔ تمہارے

پاس اتنا وقت ہے کہ اپنی صفائی میں پیش کرنے کے لیے کچھ مواد جمع کرسکو لیکن میں نے تمہارے بورڈ میں کئی ایسے نام دیکھے ہیں جو ہمارے لیے اجنبی نہیں اور ہم کافی عرصے سے ان پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔“

”تم نے تو کہا تھا کہ کوئی کام نہیں کرتیں اور خاتون خانہ کے طور پر زندگی گزار رہی ہو۔“

”میں اپنے اس جھوٹ پر شرمندہ ہوں لیکن تم بھی تو برسوں سے ٹیکس ڈپارٹمنٹ سے جھوٹ بول رہے ہو۔ لہٰذا تمہیں کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔“

”میں تمہیں وہ سب کچھ دے سکتا ہوں جو تم چاہتی ہو۔“

”مجھے یقین نہیں آرہا۔ حالانکہ جانتی ہوں کہ تم مجھے بہت کچھ دے سکتے ہو لیکن جس چیز کی مجھے طلب ہے وہ تم پوری نہیں کرسکتے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہاری اس بکواس پر یقین کرلوں گی جو تم نے میرے بارے میں کی ہے اور یہ ظاہر کررہے ہو کہ بچپن سے میری محبت میں گرفتار ہو۔ مجھے تمہاری بیمار ذہنیت پر افسوس ہوتا ہے۔“

اب میں بہتر پوزیشن میں تھی اور وہ دفاعی انداز اختیار کرنے پر مجبور تھا۔ وہ چہرے سے بیمار نظر آرہا تھا لیکن اس کی آنکھیں دائیں بائیں حرکت کررہی تھی اور اس کا ذہن تمام امکانات کا جائزہ لے رہا تھا پھر اس نے آخری کوشش کے طور پر کہا۔

”کیا تم ان دنوں کا بھی خیال نہیں کروگی جو بچپن میں ہم نے ایک ساتھ گزارے تھے۔“

”ان اذیت ناک لمحوں کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ بہتر ہوگا کہ اس تکلیف دہ ماضی کا تذکرہ نہ کرو۔ اب تم دیکھو کہ میں نے تمہیں کس طرح قابو کیا ہے اور میں اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہورہی ہوں۔“

”میں تمہیں اس سے کہیں زیادہ دے سکتا ہوں جو تم ساری عمر اس ملازمت میں رہ کر کماؤ گی۔ اس بارے میں غور کرو۔ میں تمہیں دس لاکھ پاؤنڈز تک دے سکتا ہوں۔ تمہیں صرف ایک رسید پر دستخط کرنا ہوں گے جس میں لکھا ہوگا کہ یہ رقم کمپنی کی مشاورت کی فیس کے طور پر لی گئی ہے۔ اس کے بعد تم یہاں سے چلی جاؤ گی اور ملازمت سے استعفیٰ دے دو گی۔ مجھے وہ ریکارڈ واپس چاہیے۔ اگر تم نے اس کی نقل اپنے دفتر بھیج دی ہے تو اسے صاف کردو۔ اس میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ تمہیں یہ کام فوراً کرنا ہوگا۔“

”تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تم پر بھروسا کرکے وہ ریکارڈ صاف کردوں گی۔ اتنی احمق نہیں ہوں۔ جانتی ہوں کہ اس کے بعد نہ تو مجھے پیسے ملیں گے اور نہ ہی میں اس کمرے سے زندہ باہر جاسکوں گی۔“

اس نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا لیکن خاموش رہا۔ میں نے اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

”جانتی ہوں کہ تم اس بارے میں سوچ رہے ہو۔ کیا تم اس سے انکار کرسکتے ہو۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔“

اس نے اپنے دونوں ہاتھ پکڑے اور انہیں بھینچتے ہوئے بولا۔ ”تم جانتی ہو کہ میں اس ٹرمینل کے ذریعے براہ راست کسی بھی اکاؤنٹ میں رقم منتقل کرسکتا ہوں اور اس کے لیے مجھے ایک خاص پاس ورڈ استعمال کرنا ہوگا۔ اس سے اندازہ لگالو کہ تمہیں کتنی جلدی پیسے مل سکتے ہیں۔ تم اپنی ڈیمانڈ بتاؤ، میں اسی وقت وہ رقم تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل کیے دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ ٹرمینل پر بیٹھا اور کی بورڈ کے بٹن دباتے ہوئے بولا۔ ”تم مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر بتاؤ۔“

کچھ دیر خاموشی کے بعد اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تمہیں کوئی نہ کوئی راستہ دینا ہوگا۔ اگر میرے پاس کھونے کے لیے کچھ نہ رہا تو کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ یہاں تک کہ تمہیں قتل بھی کرسکتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ تم اتنی جلدی مرنا پسند نہیں کروگی۔“

میں اس کے لہجے میں چھپی ہوئی دھمکی کو واضح طور پر محسوس کرسکتی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے مفاد کی خاطر کسی بھی حد تک جاسکتا ہے لیکن میں بھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ موقع میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔ میں نے آخری پتا پھینکتے ہوئے کہا۔ ”بیس لاکھ پاؤنڈز!“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کے انداز میں ہچکچاہٹ محسوس کی۔

”یہ تمہارے پاس آخری موقع ہے۔“ میں نے بے وقوفی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بیس لاکھ پاؤنڈز یا جیل میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ مجھے مارنے سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ تمہارا سارا کچا چٹھا میرے دفتر پہنچ چکا ہے اور تم ٹیکس چوری کے ساتھ ساتھ قتل کے الزام میں بھی دھر لیے جاؤ گے۔“

وہ غصے کے عالم میں اپنے دانت بھینچتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اپنا اکاؤنٹ نمبر بتاؤ۔“

میں نے اپنے دستی بیگ سے چیک بک نکالی اور اس کی پشت پر لکھا ہوا اکاؤنٹ نمبر پڑھنے لگی۔ اس نے ایک مخصوص کوڈ کے ذریعے وہ اکاؤنٹ نمبر اپنے کمپیوٹر میں فیڈ کیا اور اس کے ساتھ ہی میری مطلوبہ رقم بھی درج کردی پھر اس نے میری

جانب سے ایک رسید بنائی اور اس پر میرے دستخط لے لیے۔ یہ تصدیق کرنے کے لیے کہ یہ رقم میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہو چکی ہے، اس نے ایک اور بٹن دبایا اور میں مطمئن ہو گئی۔

"میں نے اپنا کام کر دیا۔ اب تم بھی وہ سارا ریکارڈ تلف کر دو جو اپنے دفتر بھیج چکی ہو۔"

میں ٹرمینل کے سامنے بیٹھ گئی اور میری انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر چلنے لگیں۔ اس کے ریکارڈ کی فائلیں ایک ایک کر کے اسکرین پر آتی گئیں اور میں انہیں تلف کرتی رہی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں اس کی جانب مڑی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "میرا کام بھی ختم ہو گیا۔"

میں اپنی جگہ سے اٹھنے ہی والی تھی کہ اس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔ میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھی لہٰذا فوری ردعمل کے طور پر میں نے اسے پرے دھکیلنے کی کوشش کی۔ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا لایا اور دھکا دے کر صوفے پر گرا دیا۔ اس دوران میں وہ مغلظات بکتا اور چلا چلا کر کہتا رہا کہ میں نے اسے بلیک میل کر کے جو رقم حاصل کی ہے۔ اس سے کبھی بھی فائدہ نہ اٹھا سکوں گی۔ وہ مجھے آہستہ آہستہ کر کے مارے گا اور اپنی نفسانی خواہشات پوری کرتا رہے گا۔

میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ اچانک ہی مجھے زور کی متلی ہوئی اور میں نے وہیں فرش پر قے کر دی۔ میری یہ حالت دیکھ کر اس کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی رک گئی اور میں نے بھی قدرے سکون کا سانس لیا۔

یہ وقفہ عارضی ثابت ہوا۔ وہ وحشیوں کی طرح میری جانب بڑھا۔ اس کی سانس زور زور سے چل رہی تھی اور وہ کسی ندیدے بچے کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا پھر اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور صوفے کی جانب کھینچنے لگا۔ اس تکلیف کے باوجود بھی میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اور میں اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچ رہی تھی۔

"اب تم پوری طرح میری دسترس میں ہو۔" وہ خباثت سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "آج میں برسوں کی پیاس بجھاؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے میرے بال چھوڑ دیے اور اپنی پتلون کی بیلٹ کھولنے لگا۔ میرے لیے اتنا موقع ہی کافی تھا۔ میں نے ذرا سا جھک کر ہاتھ بڑھایا اور اپنے دستی بیگ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی جو سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے میری جانب بڑھا لیکن میرے ہاتھ میں چھوٹی سی اسپرے گن دیکھ کر اسے رکنا پڑا جس میں پسی ہوئی مرچ بھری ہوئی تھی۔ میں اپنا ریوالور بھی نکال سکتی تھی لیکن اسے جان سے مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ اسپرے گن میں نے گھر سے چلتے وقت اپنی حفاظت کے لیے رکھ لی تھی کیونکہ مجھے اس کی نیت پر بھروسا نہیں تھا۔

میں نے لمحہ بھر توقف کیے بغیر اس کے چہرے کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر گئی تھیں اور اسے باتھ روم جانے کا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنا چہرہ دھو سکے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور کمرے کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر آ گئی۔ اس افراتفری میں میرا کارڈ اس کی میز پر ہی رہ گیا تھا لیکن میرے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ وہ نقلی کارڈ تھا جو میں نے کھلونوں کی دکان سے خریدا تھا اور کمپیوٹر کی مدد سے اس پر اپنا نام اور تصویر چسپاں کر دی تھی۔ میں جانتی تھی کہ اسے اصلی اور نقلی کی پہچان نہیں ہو گی۔ اسی طرح وہ مائیکرو فون بھی کھلونا شاپ سے ہی خریدا تھا۔

سیڑھیاں اترتے وقت مجھے خیال آیا کہ شاید اس مرتبہ میں اسکول کی سالانہ تقریب میں شرکت نہ کر سکوں کیونکہ وہاں مائیک سے سامنا ہو سکتا تھا۔ اس تقریب میں شرکت نہ کرنے کا افسوس تو ضرور تھا لیکن میں نے اس کی بڑی بھاری قیمت وصول کی تھی اور میں اپنے اکاؤنٹ میں منتقل ہونے والی بھاری رقم کے تصور سے ہی محظوظ ہو رہی تھی۔ میں اگلی بار اسکول کی تقریب میں شرکت کر سکتی تھی۔ ممکن تھا کہ اس وقت تک مائیک بھی جیل جا چکا ہوتا۔ میں نے اس کے اطمینان کے لیے جو فائلیں تلف کی تھیں۔ وہ ڈمی تھیں جبکہ اصل فائلیں میں نے اپنے ای میل اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دی تھیں جہاں سے انہیں چند روز بعد ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کو بھیجا جا سکتا تھا۔ جو رقم اس نے مجھے دی تھی وہ میں گمنام رہ کر ان فلاحی اداروں کو عطیہ کے طور پر دے دیتی جو مظلوم اور ستائے ہوئے بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

گزشتہ ہفتے ہی میرے شوہر نے اپنی کمپنی بہت اچھے داموں فروخت کر دی تھی اور ہمیں اس سے ایک معقول آمدنی ہوئی تھی لہٰذا مجھے مائیک کی دی ہوئی ناجائز رقم اپنے پاس رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اگلے روز میں اپنے شوہر کے ہمراہ ایک نئی منزل کی جانب پرواز کر رہی تھی۔ اسے نیویارک کی ایک بڑی فرم میں معقول ملازمت مل گئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ذہن کے دریچوں پر دستک دی اور پھر مائیک کا تصور کر کے اسے ہمیشہ کے لیے اس میں دفن کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب اس کی یاد مجھے کبھی خوف زدہ نہیں کر سکے گی۔ میں نے اس سے ان تمام زیادتیوں کا انتقام لے لیا تھا جو اس نے اسکول کے زمانے میں میرے ساتھ کی تھیں اور اب میں اس کے خوف سے نجات پا چکی تھی۔

❊❊❊

سادہ لوح

کاشف زبیر

سادہ لوحی اگر خواتین میں ہو تو حسن میں اضافہ اور مردوں میں ہو تو بے وقوفی کہلاتی ہے مگر اس خطے کے تو ہر فرد کے مزاج کا حصہ نظر آتی تھی... اور وہ جو اسے بہت ہی سادہ سمجھ بیٹھا تھا اس کے پاس کوئی تو ایسی طاقت تھی جو قدم قدم پر اسے چونکاتی تھی۔ پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھنا اور سوچ سوچ کر آگے بڑھنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ ایسے میں کبھی کبھی وہ ہو جاتا ہے جو انسان نے کبھی سوچا ہی نہیں ہوتا۔

[illegible] سمندروں کے درمیان ایک سادہ لوح فطرت کی عکاسی

طوفان بہت شدید تھا اور کیتو کا خیال تھا کہ شاید وہ زندہ نہ رہ سکے۔ سمندر سے دیو قامت لہریں اس کے چھوٹے سے جزیرے پر چڑھی آ رہی تھیں اور طوفانی ہوائیں ہر چیز کو اڑا لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کیتو کو اپنے لوگوں اور گھر والوں کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں تھے اور کس حال میں تھے۔ وہ گزشتہ کئی گھنٹے سے ناریل کے ایک مضبوط درخت کے تنے سے چمٹا ہوا تھا۔ ہوا کے تیز جھونکے درخت کو دہرا کر رہے تھے اور کیتو کے لیے خود کو اس سے چمٹائے رکھنا دشوار ہو رہا تھا لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح اپنی گرفت قائم رکھی۔ اسے معلوم تھا کہ ایک بار اس کے ہاتھ سے تنا نکل گیا تو پھر اسے دردناک موت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ طوفان کے آغاز میں اسے انسانی چیخیں سنائی دی تھیں لیکن اب سوائے طوفان کی چنگھاڑ کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

یہ کسی دور دراز سمندر میں دنیا سے کٹا ہوا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جس پر کسی نامعلوم زمانے سے ایک چھوٹا سا قبیلہ آباد تھا۔ سرخی مائل گندمی رنگت اور خوب صورت نقوش والے

یہ صحت مند لوگ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کے اجداد اس جزیرے تک کہاں سے آئے اور اس جزیرے سے باہر بھی کوئی دنیا ہے۔ وہ بہت سادہ سی زندگی گزار رہے تھے اور ان کی زبان بھی الگ تھی۔ وہ اپنے اس چھوٹے سے جزیرے کو ہی ساری دنیا سمجھتے تھے۔ اس علاقے میں سمندر مہربان تھا لیکن کبھی وہ اس طرح بپھر جاتا اور ایسا طوفان آتا کہ بعض اوقات تو جزیرے کی آدھی آبادی ختم ہو جاتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اتنے عرصے سے یہاں آباد ہونے کے باوجود ان لوگوں کی تعداد سو سے زیادہ نہیں بڑھی تھی۔ کیتو نے اپنے بڑوں سے ان طوفانوں کے بارے میں سنا تھا لیکن اس کی اٹھارہ سالہ زندگی میں کوئی طوفان نہیں آیا تھا۔

اور جب طوفان آیا تو لگا جیسے پورے جزیرے کو ڈبو کر دم لے گا۔ وہ پوری قوت سے جزیرے کے وسط میں موجود ناریل کے اس مضبوط درخت سے چمٹا ہوا تھا۔ یہ اس کا درخت تھا۔ جزیرے کے ہر باشندے کا فرض تھا کہ وہ ناریل اور پام کا ایک ایک درخت لگائے اور اس کی نگہداشت کرتا رہے۔ کیتو نے چھوٹی سی عمر میں یہ درخت لگایا تھا اور جن دنوں بارش نہیں ہوتی تھی وہ پانی کے تالاب سے ناریل کے خول سے بنے برتن میں پانی لا لا کر اس کی جڑوں میں ڈالتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ سمندر سے دور اور بلند زمین پر ہونے کے باوجود یہ جزیرے کے بہترین درختوں میں سے ایک تھا۔

جب طوفان کے آثار نمودار ہوئے تو کیتو ساحل پر تھا اور ساتھی لڑکوں کے ہمراہ ناریل کو گیند بنا کر فٹ بال جیسا کھیل کھیل رہا تھا۔ آسمان پر سیاہ بادل نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے طوفانی جھکڑ چلنا شروع ہو گئے۔ لوگ جزیرے کے وسطی اور بلند حصے کی طرف بھاگے کیونکہ طوفان میں انہیں وہیں پناہ مل سکتی تھی لیکن یہ طوفان اتنا بڑا تھا اور لہریں ایسے اٹھ رہی تھیں کہ جزیرے کا وسطی حصہ بھی ان سے محفوظ نہیں رہا تھا۔ اوپر سے ہوا کے تند جھونکے ہر چیز کو اڑا لے جانے کے درپے تھے۔ کیتو اپنے درخت سے چمٹ گیا۔ نہ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے درخت سے چمٹا رہے گا تو اس کی جان بچ جائے گی ورنہ یہ طوفان اسے بھی مار دے گا۔ طوفان سورج غروب ہونے سے پہلے شروع ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد تاریکی چھا گئی جسے چمکنے والی بجلی لمحے بھر کے لیے دور کرتی تھی۔

رفتہ رفتہ طوفان کی شدت کم ہوتی گئی۔ ہوا کے جھونکوں میں کمی آئی اور لہریں بھی ساحل کی طرف سمٹنے لگیں۔ کیتو نیم غشی کی کیفیت میں تھا لیکن اس کیفیت میں بھی اس نے تنے پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی۔ جب طوفان کی شدت اتنی کم ہو گئی کہ اسے خطرہ نہیں رہا تو اس نے تنا چھوڑ دیا اور وہیں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر تھکن سے بے ہوش ہو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو دن نمودار ہو چکا تھا اور سورج کی روشنی پھیل رہی تھی۔ طوفان رات کے آخری پہر میں جا کر ختم ہوا تھا۔ کیتو نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسے لگا کہ اس کے جسم میں جان نہیں رہی ہو۔ وہ اپنی جگہ پڑا ہانپتا رہا، جب کسی قدر توانائی محسوس ہوئی تو کھڑا ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے آس پاس ناریل تلاش کیا اور اسے ایک گڑھے میں جمع ڈھیر سارے ناریل مل گئے اس نے ایک ناریل توڑ کر اس کا پانی پیا اور گودا کھایا تو اس کی توانائی کسی حد تک بحال ہو گئی۔

پھر کیتو کو اپنے گھر والوں کا خیال آیا۔ وہ ماں باپ اور بہن بھائیوں کو آواز دینے لگا لیکن کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح پورے جزیرے پر اپنے لوگوں کو تلاش کرنے لگا لیکن اسے ایک فرد بھی زندہ نہیں ملا۔ کچھ لاشیں ملیں لیکن بیشتر مرنے والوں کو طوفان بہا کر سمندر میں لے گیا تھا۔ یہ سوچ کر ہی کیتو کا دل بیٹھنے لگا کہ وہ بچنے والا واحد انسان ہے۔ اس کے سوا اب کوئی باقی نہیں بچا ہے۔ وہ ایک جگہ نڈھال ہو کر بیٹھ گیا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جب دل ہلکا ہوا تو وہ خاموش ہو گیا۔ مگر اکیلے رہ جانے کا خیال بہت عذاب ناک لگ رہا تھا۔ اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ بھی سمندر میں چھلانگ لگا دے اور خودکشی کر لے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس بارے میں مزید سوچتا اسے کسی کی کراہ سنائی دی۔ آواز بہت ہلکی تھی لیکن اس کے کانوں نے سن لی۔ وہ بے تاب ہو گیا۔ اس نے چلا کر کہا۔

”کوئی ہے...... تم کہاں ہو؟“

دوسری بار کراہنے کی آواز واضح اور پاس ہی سے آئی تھی۔ کیتو اس طرف جھپٹا۔ پام کے بہت سارے پتے ایک جگہ جمع تھے اور آواز اسی کے نیچے سے آ رہی تھی۔ کیتو نے تمام پتے اٹھا کر پھینک دیے۔ ان کے نیچے ایک گڑھا تھا اور اس میں ایک نوجوان لڑکی غشی میں کراہ رہی تھی۔ کیتو اسے جانتا تھا اس کا نام ڈالی تھا اور کچھ عرصے پہلے اس کی شادی جونی نامی نوجوان سے ہوئی تھی۔ کیتو نے احتیاط سے اسے گڑھے سے نکالا اور ایک صاف جگہ لٹا دیا پھر وہ ناریل لایا اور اس کا پانی ڈالی کے حلق میں ٹپکانے لگا۔ پانی پی کر اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے خوف زدہ انداز میں پوچھا۔ ”میں کہاں ہوں...... باقی سب کہاں ہیں؟“

کچھ دیر میں ڈالی جان گئی کہ ان دونوں کے سوا سب ہی طوفان کی نذر ہو گئے ہیں۔ وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی

تھی۔ پھر اس نے کیتو سے کہا۔ ”تم نے پورا جزیرہ تو نہیں دیکھا ہوگا آؤ تلاش کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی اور بھی بچ گیا ہو...... شاید جونی بھی......“

ڈالی اپنے شوہر کے لیے بے قرار تھی۔ کیتو نے اس سے اتفاق کیا۔ وہ ایک مربع میل پر پھیلے اس جزیرے کو مکمل طور پر نہیں دیکھ سکا تھا صرف آوازیں دیتا رہا تھا لیکن کوئی اور ڈالی کی طرح کہیں بے ہوش پڑا ہو تو اسے کیسے پتا چلے گا۔ کیتو کچھ ناریل اور لے آیا۔ وہ دونوں اس کا پانی پی کر اور گودا کھا کر روانہ ہوئے اور جزیرے میں گھوم پھر کر دیکھنے لگے۔ جہاں درختوں کے ٹوٹے پتے اور جھاڑیاں جمع ہوتیں وہاں کیتو انہیں بھی ہٹا کر دیکھتا تھا۔ اس تلاش میں انہیں کئی لاشیں اور مل گئیں لیکن کوئی زندہ فرد نہیں ملا۔ لاشوں میں بھی نہ تو کیتو کے گھر والے تھے اور نہ ڈالی کا شوہر ملا تھا۔

”میرا خیال ہے ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں بچا۔“ کیتو نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ ”ان لاشوں کو بھی دفنانا ہوگا ورنہ کل تک ان سے بو آنے لگے گی۔“

ڈالی غم سے نڈھال تھی۔ اسے اپنے شوہر سے بہت محبت تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کا نام لے کر رونے لگتی تھی۔ طوفان نے جزیرے کو تہس نہس کر دیا تھا۔ نصف سے زیادہ درخت گر چکے تھے اور ساحل پر تنوں اور پتوں کا ایک انبار جمع ہو گیا تھا۔ سارا دن وہ جزیرے پر گھومتے رہے۔ شام کو کیتو نے ڈالی سے کہا۔ ”آؤ ساحل کی طرف چلیں۔“

ڈالی نے خود کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ کیتو جہاں جاتا وہ بھی اس کے ساتھ ہو جاتی۔ وہ ساحل پر آئے اس طرف سورج غروب ہونے والا تھا۔ یہاں بھی ملبا بکھرا ہوا تھا جو لہروں تک پہنچا ہوا تھا اور جب لہر آتی تو وہ حرکت کرتا تھا۔ کیتو اور ڈالی ریت پر بیٹھ گئے اور غروب ہوتے سورج کو دیکھنے لگے۔ اچانک کیتو چونکا اس نے ملبے کے درمیان کوئی چیز دیکھی تھی۔ ایک انسانی ہاتھ جھانک رہا تھا۔ اس نے ڈالی کی توجہ اس طرف دلائی اور وہ اٹھ کر اس طرف بڑھے۔ کیتو کا خیال تھا [illegible] کی کوئی لاش ہوگی۔ لیکن جب اس نے گھاس اور پتے [illegible] تو بے ساختہ پیچھے ہو گیا کیونکہ جو آدمی اوندھے منہ پڑا تھا وہ ان میں سے نہیں تھا اور اس نے جسم پر عجیب سی چیز چڑھا [illegible] اور اس کا رنگ بالکل سفید تھا۔ لیکن وہ انسان ہی تھا۔ [illegible] نے اسے کھینچ کر ریت پر ڈالا اور سیدھا کر دیا۔

اس کے چہرے پر سرخی مائل سنہری ڈاڑھی تھی اور بال [illegible] ہی تھے۔ کیتو نے اس کے کپڑے چھو کر دیکھے۔ ان [illegible] میں لباس کا رواج نہیں تھا بس ناریل کے ریشوں سے بنی ہوئی چادر سے وہ جسم کے مخصوص حصے ڈھانپ لیتے تھے اور باقی جسم عریاں رہتا تھا۔ وہ اسے برا نہیں سمجھتے تھے ان میں سے کوئی دوسرے کے عریاں جسم کی طرف توجہ بھی نہیں دیتا تھا۔ جب کہ اس آدمی نے سر سے نیچے پورا جسم ڈھک رکھا تھا حد یہ اس کے پیروں پر بھی کچھ چڑھا ہوا تھا۔ ڈالی ذرا پیچھے کھڑی حیرت اور خوف سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اچانک کیتو کو خیال آیا اور اس نے جھک کر آدمی کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی اور ڈالی سے بولا۔ ”زندہ ہے...... زندہ ہے۔“

”زندہ ہے۔“ وہ تعجب سے بولی۔ ”لیکن یہ کون ہے کہاں سے آیا ہے؟“

”سمندر سے آیا ہے۔“ کیتو نے کہا اور آدمی کو کھینچ کر ساحل پر اس طرف لے آیا جہاں کچھ گھاس تھی اور یہ جگہ لہروں سے بھی محفوظ تھی۔ یہ طے تھا کہ وہ ان کے جزیرے کا نہیں ہے۔ آدمی کے خدوخال نرم اور دلکش تھے۔ کیتو نے ایک ناریل توڑ کر اس کا پانی آدمی کے منہ میں ٹپکانا شروع کیا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور وہ ہوش میں آنے لگا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھا اور اٹھ بیٹھا، اس نے کچھ کہا لیکن زبان کیتو کے لیے اجنبی تھی۔ کیتو نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

وہ کیتو کا منہ دیکھنے لگا کچھ دیر تک وہ اپنی اپنی زبانیں بولنے کے بعد سمجھ گئے کہ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھ سکتے اس لیے اشاروں سے بات شروع کی۔ آدمی نے بتایا کہ وہ سمندر میں تھا کہ طوفان آ گیا اور وہ جس چیز میں تھا وہ ڈوب گئی اسے نہیں معلوم وہ یہاں تک کیسے آیا۔ کیتو اور ڈالی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ سمندر کے اوپر وہ کس چیز میں تھا کیونکہ وہ کشتی سے بھی ناواقف تھے۔ پھر کیتو نے اسے اشاروں میں بتایا کہ اسی طوفان نے اس کے سارے جزیرے کو تباہ کر دیا اور اس کے سارے قبیلے کو مار ڈالا بس وہی دو زندہ بچے تھے۔ ڈاڑھی والا دکھی ہو گیا۔ اس دوران میں اندھیرا چھانے لگا اور وہ ناریل کا گودا کھا کر وہیں لیٹ گئے۔ وہ آگ جلانا نہیں جانتے تھے۔ ان کی خوراک ناریل، پام اور بعض اقسام کے پودے تھے جو قدرتی طور پر یہاں پائے جاتے تھے اس کے علاوہ وہ ساحل سے ذرا دور غوطہ لگا کر سیپیاں اور ہاتھ آنے والے سمندری جانور پکڑ لاتے تھے اور ان کا کچا گوشت کھاتے تھے۔

اگلی صبح گورا آدمی ان سے پہلے بیدار ہو کر جزیرے کا معائنہ کرتا رہا۔ کیتو نے اسے لاشیں دکھائیں اور اس نے اشارے سے کہا کہ ان کو دفنانا مشکل ہے اس لیے سمندر میں

ڈال دیا جائے۔ کیتو نے اس سے اتفاق کیا۔ وہ ایک دوسرے کے نام جان گئے تھے۔ سفید آدمی کا نام چارلس تھا۔ کیتو کے لیے پورا نام لینا مشکل تھا اس لیے اس نے اسے چار کہنا شروع کر دیا۔ اسے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہوں نے مل کر تمام لاشیں سمندر میں ڈال دیں پھر انہوں نے ناشتا کیا۔ اس دوران میں چارلس اور کیتو میں دوستی ہو گئی تھی۔ کیتو نے اپنی زبان میں اسے بتایا کہ وہ اب اس کا دوست ہے۔ چارلس گرم جوشی سے اس کے گلے لگا تھا۔

ڈالی اس سے دور رہی تھی۔ ویسے بھی اس جزیرے میں مرد اور عورت میں دوستی کا تصور نہیں تھا۔ دور ہونے کے باوجود وہ ان کے ساتھ رہی تھی اور اس نے محسوس کیا کہ چارلس جب اسے دیکھتا ہے تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آجاتی ہے۔ ڈالی شادی شدہ تھی اس لیے ....وہ اس چمک کا مطلب بہ خوبی جانتی تھی البتہ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس کے جسم کو اتنے غور سے کیوں دیکھتا ہے جوکی اس کا شوہر تھا اور اس سے محبت کرتا تھا لیکن وہ بھی کبھی اسے اس طرح نہیں دیکھتا تھا۔ ڈالی کو محسوس ہوتا جیسے وہ آنکھوں سے اس کا بدن ٹٹول رہا ہو۔

جلد چارلس اور کیتو کی آپس میں گاڑھی چھننے لگی اور انہوں نے مل کر دو دن میں جزیرے کا وسطی حصہ صاف کیا۔ اس کے بعد چارلس نے کیتو کی مدد سے ناریل کے گر جانے والے تنے جمع کیے اور ان کو دیوار کی طرح کھڑا کر کے اوپر چھت ڈالی۔ کیتو اور ڈالی حیران رہ گئے تھے۔ ان میں گھر بنانے کا رواج نہیں تھا۔ وہ درختوں تلے احاطہ بنا کر رہتے تھے اور یہ احاطہ بھی ناریل کے بڑے پتوں کی مدد سے بنا لیتے تھے۔ جزیرے کا موسم نہ تو زیادہ گرم تھا اور نہ ہی یہاں زیادہ سردی پڑتی تھی۔ بارش مناسب ہوتی تھی نہ بہت زیادہ اور نہ بہت کم۔ ہر تیسرے چوتھے دن دو تین گھنٹوں کا مینہ برستا تھا اس میں وہ نہا دھو لیتے اور کھودے گئے گڑھوں میں پینے اور دوسرے استعمال کے لیے میٹھا پانی جمع کر لیتے۔ اگر کبھی زیادہ دن تک بارش نہ ہو تو وہ ناریل کے پانی سے گزارا کرتے تھے۔ جزیرے کے وسطی حصے میں ناریل اور پام کے درخت اتنے گھنے اور پاس پاس تھے کہ ان میں سورج کی معمولی سی کرنیں ہی نیچے آتی تھیں۔ ان میں وہ سارے سال آرام سے رہتے تھے۔ اس لیے انہیں جھونپڑیاں بنانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

چارلس نے تنوں کی مدد سے جھونپڑی کی دیواریں بنا دی تھیں۔ پھر اس نے کیتو کو سمجھایا کہ انہیں ناریل جمع کر کے رکھنے چاہئیں کیونکہ پینے کا پانی ان سے ہی ملے گا۔ طوفان نے جزیرے پر موجود تمام گڑھوں کو تلخ اور کھارے سمندری پانی سے بھر دیا تھا۔ انہوں نے گر جانے والے ناریل ایک جگہ جمع کر لیے تھے یہ اتنی تعداد میں تھے کہ وہ پورا مہینا ان کی مدد سے گزار سکتے تھے۔ پھر انہوں نے پانی جمع کرنے والے گڑھے صاف کیے اور جب بارش ہوئی تو ان میں میٹھا پانی جمع ہو گیا۔ کیتو خوش تھا۔ اس کا دوست بہت عقل مند تھا اور اس کے پاس ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل موجود تھا۔ اس نے ناریل کے ریشوں کی مدد سے بنی باریک ڈوری سے جال تیار کیا۔ ڈوری اسے کیتو اور ڈالی بنا کر دیتے تھے اور وہ اس سے جال بناتا تھا۔ پھر اس نے جزیرے کی ایک چھوٹی سی کھاڑی میں اس جال کی مدد سے انہیں مچھلیاں پکڑ کر دکھائیں۔ مچھلیاں کبھی کبھی ان کے ہاتھ لگتی تھیں کیونکہ وہ انہیں پکڑنے کے طریقوں سے ناواقف تھے۔ چارلس کے ہاتھ چھوٹی مچھلیاں آئی تھیں لیکن یہ بھی کم نہیں تھیں۔ پہلے انہوں نے کچی مچھلیاں کھائی تھیں کیونکہ وہ عادی تھے لیکن چارلس عادی نہیں تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے کچی مچھلی حلق سے اتاری تھی۔ وہ سارا دن کھانے کی تگ و دو میں ہوتے تھے اور رات کو جھونپڑی میں آکر پڑ جاتے تھے۔ تاریکی میں کہیں نہیں آجا سکتے تھے۔ ہاں چاند ہوتا تو رات بھی روشن ہو جاتی تھی۔

چارلس جب جزیرے میں گھومتا یا سمندر میں نکلتا تو وہ کچھ تلاش کرتا۔ اس نے کیتو کو بھی سمجھانے کی کوشش کی اور پتھر جمع کر کے دکھاتا تھا لیکن وہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ چارلس کو کس چیز کی تلاش ہے۔ بالآخر ایک دن وہ سمندر میں اترا اور جب باہر آیا تو بہت خوش تھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک بڑا سا سیاہی مائل پتھر اٹھا رکھا تھا۔ کیتو اور ڈالی اس کی خوشی کے راز سے انجان تھے۔ چارلس نے پہلے وہ پتھر ایک سخت چٹان پر مار مار کر دو ٹکڑے کر دیا۔ کیتو کو حیرت ہوتی تھی جب چارلس پتھر چٹان پر مارتا تو اس سے چنگاریاں سی بلند ہوتی تھیں۔ پتھر توڑ کر اس نے خشک گھاس اور جھاڑیوں سے نکلی خشک لکڑی اور ناریل کے پرانے خشک پتے ایک جگہ رکھے اور ان پر خشک گھاس پھیلا کر پتھر کے دونوں ٹکڑے ان کے بالکل پاس کر کے آپس میں بار بار ٹکرانے لگا۔

کیتو اور ڈالی اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک ہی خشک گھاس پر گرنے والی چنگاریوں نے آگ لگا دی۔ ڈالی ڈر کر پیچھے ہٹ گئی تھی اور کیتو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ جب آگ خشک پتوں اور لکڑی تک پہنچی اور شعلے مزید بلند ہوئے تو کیتو بھی تھوڑا سا ڈر گیا۔ چارلس نے

اشارے سے اسے سمجھایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس روز انہوں نے ایک بڑی مچھلی شکار کی تھی۔ چارلس نے نوکیلی لکڑی میں اس کے ٹکڑے پرو کر ان کو آگ پر بھونا اور پھر ان لوگوں کو کھانے کے لیے دیا۔ کیتو اور ڈالی حیران رہ گئے کچے گوشت کے مقابلے میں اس کا ذائقہ بہت لاجواب تھا۔ یہ کچے گوشت کے مقابلے میں بہت ہی مزے کا تھا۔ اس دن وہ چارلس کا مزید گرویدہ ہو گیا تھا۔

طوفان آئے بہت دن گزر چکے تھے۔ کیتو اور ڈالی کا دکھ بہت حد تک کم ہو گیا تھا۔ ویسے بھی وہ سادہ فطرت لوگ تھے جو سانحات اور دکھوں کو خود پر حاوی نہیں کرتے تھے۔ پھر چارلس کے آنے سے ان کا دل بہل گیا تھا۔ خاص طور سے کیتو بہت خوش تھا۔ ڈالی کو بھی چارلس برا نہیں لگتا تھا لیکن کبھی کبھی اسے بہت عجیب نظروں سے گھورتا تو ڈالی کو غصہ آنے لگتا تھا اور وہ ایسے موقعے پر وہاں سے ہٹ جاتی تھی۔ اس نے دو تین بار کیتو سے بات کی لیکن کیتو کا کہنا تھا کہ وہ اس بات کو دل پر نہ لے وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی اس لیے وہ اسے دیکھ لیتا تھا۔ یقیناً چارلس کے دل میں اس کے لیے کوئی برا خیال نہیں تھا۔ ڈالی کیتو کے خیال سے متفق نہیں تھی لیکن اس نے بحث نہیں کی۔ البتہ ایک دن جب ڈالی میٹھے پانی کے تالاب میں نہا رہی تھی تو اسے لگا کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے آس پاس دیکھا تو اسے کوئی نظر نہیں آیا لیکن جب وہ تالاب سے باہر آئی تو اسے چارلس کی ایک جھلک دکھائی دی۔ وہ تیزی سے وہاں سے جا رہا تھا گویا وہ اسے چھپ کر دیکھ رہا تھا۔

ایک مہینے میں چارلس کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ اس نے انہیں اتار کر ناریل کے ریشوں سے بنی ہوئی نیکر نما پہن لی تھی جسے وہ کپڑے کی ڈوری سے باندھ کر رکھتا تھا۔ البتہ اس کے پیروں میں موجود جوتے سلامت تھے لیکن وہ انہیں احتیاط سے استعمال کرتا تھا تاکہ وہ دیر تک اس کا ساتھ دے سکیں۔ ڈالی نے کیتو سے شکایت کرنے کا سوچا لیکن پھر شکایت نہیں کی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ کیتو اپنے دوست کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ دونوں ہی آپس میں بہت خوش رہتے تھے۔ چارلس ڈالی کی طرف بس خاص انداز میں ہی متوجہ ہوتا تھا ورنہ اس پر زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا۔ کیتو نے چارلس کو اپنی زبان کے بہت سارے لفظ سکھا دیے تھے۔ وہ مکمل گفتگو تو نہیں کر سکتا تھا لیکن کسی حد تک اپنا مطلب واضح کر دیتا تھا۔

ایک دن جب چارلس اور ڈالی ساحل پر تھے۔ کیتو

ذرا دور ایک کھاڑی میں مچھلی پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چارلس نے اسے لکڑی کے نیزے سے جال میں آئی مچھلی ہلاک کرنا سکھا دیا تھا۔ ڈالی نے محسوس کیا کہ یہ چارلس اسے دیکھ رہا ہے اور شاید اس سے کچھ کہنا بھی چاہتا ہے۔ بالآخر وہ اس کے پاس آبیٹھا۔ ڈالی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مسکرا کر اپنا ہاتھ ڈالی کے شانے پر رکھ دیا۔ جب اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تو وہ آہستہ آہستہ اس کا شانہ سہلانے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے چارلس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور سانس تیز چلنے لگی تھی۔ ڈالی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے چارلس کا ہاتھ شانے سے ہٹا دیا۔ چارلس نے دوبارہ ہاتھ رکھنا چاہا تو اس نے جھٹک دیا۔ اس پر وہ غصے میں آگیا اور اس نے سختی سے ڈالی کا بازو پکڑ لیا۔ اس نے کھڑا ہونا چاہا تو چارلس نے اسے جھٹکا دے کر دوبارہ بٹھا لیا لیکن اس سے پہلے کہ بات بڑھتی انہیں کیتو کی چیخ سنائی دی۔

وہ دونوں ہی دوڑتے ہوئے کھاڑی تک پہنچے تو کیتو نے ایک سبز اور بھورے رنگ کی دھاریوں والا سمندری سانپ دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا اور وہ اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ ڈالی خوف زدہ ہو گئی۔ وہ جانتی تھی یہ سمندری سانپ زہریلا ہوتا ہے۔ اگر کسی کو کاٹ لے تو وہ تھوڑی دیر میں مر جاتا ہے۔ ویسے سمندر میں ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی خشکی پر آجاتا ہے۔ ان کے جزیرے اور اس کے آس پاس کے سمندر میں یہی خطرناک اور جان لیوا جانور تھا۔ اس کا ان کے پاس کوئی علاج بھی نہیں تھا۔ وہ بے بس تھے۔ کیتو نے انہیں دیکھا تو چلا کر بولا۔ ”اسے مارو۔“

چارلس بے دھڑک پانی میں کود گیا اور اس نے سانپ کو دم سے پکڑ کر کیتو کے ہاتھ سے لے لیا اور گھما کر ایک پتھر پر دے مارا۔ سانپ فوراً ہی بے جان ہو گیا۔ لیکن چارلس نے احتیاطاً دو تین بار اور سانپ کا سر پتھر پر مارا اور پھر اسے خشکی پر پھینک دیا۔ کیتو جو پوری جان سے کانپ رہا تھا۔ مارے خوشی کے چارلس سے لپٹ گیا۔ وہ اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ وہ بروقت آگیا، ورنہ سانپ اس کے ہاتھ سے نکلنے ہی والا تھا۔ چارلس نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور وہ پانی سے باہر آگئے۔ ڈالی ان کو دیکھ رہی تھی۔ اس ہنگامے میں وہ بھول گئی کہ چارلس اس کے ساتھ کیا حرکت کر رہا تھا۔ اسے یاد آیا تو اس نے چارلس کو غصے بھری نظروں سے دیکھا اور وہاں سے ہٹ گئی۔ مگر چارلس کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ اب سانپ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے بھی کھانے کی فکر میں تھا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ یہ خاصا موٹا تازہ سانپ تھا۔ اس شام انہوں نے اس کا گوشت بھون کر کھایا۔ پہلی دفعہ آگ جلانے کے بعد چارلس نے اسے بجھنے نہیں دیا تھا۔ اگر الاؤ بجھ جاتا تو وہ لکڑی کی مشعل بنا کر جلا لیتا تھا۔ اب وہ گوشت پکا کر ہی کھاتے تھے۔ کیتو اور ڈالی بھی آگ کے عادی ہو گئے تھے اور اس سے ڈرتے نہیں تھے۔

ڈالی سوچ رہی تھی کہ کیتو کو چارلس کی حرکت کے بارے میں بتائے یا نہ بتائے۔ شوہر کے مرنے کا غم ہلکا ہوا تو اسے کیتو اچھا لگنے لگا تھا مگر وہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔ اس کا خیال رکھتا تھا مگر بس کسی ساتھی کی طرح۔ اسے یہ خیال نہیں تھا کہ ڈالی ایک خوب صورت لڑکی ہے اور اس کی بھی کچھ خواہشات ہوں گی۔ اس جزیرے پر بس وہی دونوں بچے تھے اس لیے اب انہیں ہی ایک دوسرے کا سہارا بننا تھا۔ اگر چارلس درمیان میں نہ ہوتا تو شاید وہ اب تک کیتو کو اپنی طرف متوجہ کر چکی ہوتی اور وہ ایک ہو چکے ہوتے لیکن ان کی زندگی میں چارلس بلاوجہ آگیا تھا۔ ڈالی اس سے خار کھانے لگی تھی۔ وہ اس کی نیت اچھی طرح بھانپ چکی تھی اور آج تو وہ زبردستی پر اتر آیا تھا۔ اگر اس نے پھر ایسا کیا تو وہ خود کو کس طرح اس سے بچائے گی۔ اگر کیتو نے مداخلت کی تو ان دونوں میں لڑائی ہو سکتی ہے اور جسامت میں کیتو اس سے کم تھا۔ پھر کم عمر بھی تھا وہ بہ آسانی اس پر حاوی ہو سکتا تھا۔ ڈالی عمر میں کیتو سے بڑی تھی اور پھر تجربے کار بھی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ معاملہ اس طرح نہیں ٹھیک ہوگا اسے خود کچھ کرنا ہوگا۔

وہ تینوں رات کو جھونپڑی میں سوتے تھے اور اگر دن میں دھوپ تیز ہوتی تب بھی زیادہ وقت اندر ہی گزارتے تھے۔ سونے کے لیے انہوں نے زمین پر موٹی گھاس بچھا کر آرام دہ بستر بنا لیے تھے۔ جب سے چارلس نے آگ روشن کی تھی۔ جھونپڑی کے سامنے ایک چٹان سے لگی مشعل رات بھر جلتی رہتی تھی۔ اس رات جب کیتو اور چارلس دونوں سو گئے تو ڈالی چپکے سے اٹھ کر باہر نکلی اور نیچے ساحل پر آگئی۔ اسی جگہ کیتو پر سمندری سانپ نے حملہ کیا تھا۔ آسمان پر نصف چاند تھا۔ ڈالی سمندر کے سامنے کھڑی سوچ رہی تھی۔ کیتو اس سانپ کے حملے سے بچ گیا تھا لیکن دوسرا سانپ جو ان کی زندگی میں آگیا تھا اس سے وہ کیسے بچے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آگئی اور آکر اپنی جگہ لیٹ گئی۔

طوفان کو اب کئی مہینے گزر گئے تھے اور چارلس اپنے حلیے اور رنگ روپ سے ان کے جزیرے کا آدمی لگنے لگا تھا۔ اس کی بے حد سفید رنگت مٹیالی سی ہو گئی تھی اور سر کے بال اور

ڈاڑھی مونچھیں بے ہنگم بڑھ گئی تھیں۔ خود کیتو کی نہ تو ڈاڑھی تھی اور نہ مونچھیں تھیں۔ ان میں مردوں کے چہرے پر بہت کم رواں آتا تھا۔ اکثر کے چہرے تو بالکل صاف ہوتے تھے اس لیے چارلس عجیب سا لگتا تھا اور ڈالی کو اس سے خوف آتا تھا لیکن خوف اس کے چہرے یا بڑے بالوں سے نہیں اس کے دیکھنے کے انداز سے آتا تھا۔ سانپ والے واقعے کے بعد ڈالی کیتو سے مختلف انداز میں پیش آنے لگی۔ وہ ذرا لگاوٹ اور شوخ ہوگئی تھی۔ کیتو نوجوان، ناتجربے کار اور عورتوں کے معاملے احمق سہی لیکن تھا تو مرد، جلد وہ جان گیا کہ ڈالی اس سے کیا چاہتی ہے۔ ایک دن وہ اکیلے بیٹھے تھے کہ کیتو نے اس سے پوچھ لیا۔

"ڈالی کیا تم میری بیوی بننا چاہتی ہو؟"

"ہاں کیونکہ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے سوا کوئی نہیں ہے۔ ہمیں ہی اپنی نسل کو دوبارہ سے شروع کرنا ہے۔"

کیتو نے سوچا اور سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اس کے لیے مجھے الگ جگہ بنانا ہوگی۔"

"تو بنالو۔" ڈالی خوش ہو کر بولی۔ "اب میں چاہتی ہوں ہم جلدی سے میاں بیوی بن جائیں۔"

اگلے دن سے کیتو نے ڈالی کے ساتھ مل کر چارلس کی بنائی جھونپڑی کے ساتھ ہی اپنی جھونپڑی بنانا شروع کردی۔ چارلس حیران ہوا پھر اس نے پوچھا تو کیتو نے اسے بتایا کہ وہ اور ڈالی شادی کرچکے ہیں اب میاں بیوی کی حیثیت سے ساتھ رہیں گے۔ کیتو نے تو نہیں لیکن ڈالی نے واضح طور پر محسوس کیا کہ یہ سن کر چارلس کا چہرہ بجھ گیا تھا وہ خود ڈالی کا امیدوار تھا۔ اسے دکھانے اور جتانے کے لیے ڈالی ہر وقت کیتو کے ساتھ رہنے لگی اور اس سے لگاوٹ بھرے انداز میں پیش آتی تھی۔ ڈالی کا مقصد اسے جلانا نہیں تھا بلکہ وہ اسے جتانا چاہتی تھی کہ وہ خود کیتو کو پسند کرتی ہے اور وہ اس کا خیال ذہن سے نکال دے۔

کیتو آنے والی زندگی کے خیال سے خوش اور مگن تھا وہ دیکھ نہیں سکا کہ چارلس کا رویہ بدل گیا ہے اب وہ پہلے جیسی نظروں سے اسے نہیں دیکھتا تھا۔ کیتو کے لیے اس کی نظروں میں نفرت اور کینہ جھلکنے لگا تھا۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے یہ نفرت اور کینہ عملی صورت اختیار کر گیا تھا۔ کیتو اور چارلس کھاڑی کے پانی میں مچھلی کا شکار کر رہے تھے۔ کیتو جال استعمال کر رہا تھا اور چارلس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ ڈالی وہاں نہیں تھی لیکن اتفاق سے وہ اس وقت وہاں پہنچی جب چارلس نیزہ اٹھائے کیتو پر وار کرنے جا رہا تھا وہ پیچھے تھا اور کیتو کی توجہ جال پر تھی جس میں ایک بڑی مچھلی پھنس گئی تھی۔ لیکن چارلس کے نیزے کا رخ کیتو کی پشت کی طرف تھا۔ ڈالی نے دیکھا تو بے ساختہ چیخ اٹھی تھی۔ "کیتو...... بچو۔"

کیتو چونک کر سیدھا ہوا اور چارلس بھی ڈالی کی چیخ سن کر گڑبڑا گیا۔ اس کا ہاتھ بہکا اور نیزہ کیتو کی پشت میں اترنے کے بجائے اس کے بازو کو لگتا ہوا مچھلی میں جا گھسا۔ کیتو بازو پکڑ کر پیچھے ہوگیا۔ اس کا ہاتھ خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ ڈالی نے بھاگ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔ "یہ تم پر نیزہ مارنے جا رہا تھا۔"

"یہ مچھلی کو مار رہا تھا۔" کیتو نے غصے سے کہا۔ "تم نے آواز کیوں دی اس وجہ سے اس کا ہاتھ ہل گیا اور نیزہ مجھے لگا۔"

چارلس بھی شاید ایسی ہی وضاحت کر رہا تھا کہ وہ مچھلی کو مار رہا تھا لیکن غلطی سے نیزہ کیتو کے بازو کو چھو گیا۔ کیتو نے بھی یہی کہا تو ڈالی چپ ہوگئی۔ حالانکہ اس نے واضح طور پر دیکھا تھا کہ نیزے کا رخ کیتو کی پشت کی طرف تھا۔ وہ خوفزدہ ہوگئی اس کا مطلب تھا کہ چارلس کی نیت درست نہیں تھی۔ وہ کیتو کو اوپر جنگل میں لائی اور ایک مخصوص پودے کے پتوں سے اس کا زخم صاف کر کے اس میں ان ہی پتوں کو مسل کر بھر دیا۔ خون فوراً رک گیا۔ یہ پودا آزمودہ تھا اور اپنے زخموں اور چھوٹی موٹی تکلیفوں کا علاج اس سے ہی کرتے تھے۔ جب ڈالی کیتو کے زخم کو دیکھ رہی تھی تو اس وقت چارلس وہاں نہیں تھا۔ وہ مچھلی کے حصے کرنے کے لیے وہیں رک گیا تھا۔ ڈالی نے ایک بار پھر کیتو کو سمجھانے کی کوشش کی کہ چارلس اس کا دشمن ہوگیا ہے مگر کیتو نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

"نہیں وہ میرا دوست ہے۔"

"وہ تمہارا دوست تھا اب دشمن ہے۔ وہ تمہیں مار دینا چاہتا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"تاکہ مجھ پر قبضہ کر سکے۔"

"وہ ایسا نہیں ہے اس نے کبھی مجھ سے نہیں کہا کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔" کیتو نے انکار کیا۔

ڈالی جھنجلا گئی۔ "نہ مانو، اس نے اب بھی تمہیں مارنے کی کوشش کی ہے۔"

کیتو ڈالی کو پسند ضرور کرتا تھا لیکن وہ اس کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے خیال میں ڈالی نے پہلے دن سے چارلس کو ناپسند کر دیا تھا اس لیے اب وہ اس کی ہر بات پر شک کرتی ہے۔ اس کے خیال میں کچھ عرصے میں سب ٹھیک ہو جائے گا مگر ڈالی کا خیال مختلف تھا۔ چارلس نے کیتو کو قتل کرنے کی ایک کوشش کی اور ڈالی کی مداخلت کی وجہ سے ناکام رہا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ دوبارہ کوشش نہیں کرے گا۔ ڈالی چاہتی تھی کہ کیتو بے شک اس کی بات پر یقین نہ کرے لیکن ہوشیار ضرور رہے تاکہ چارلس اس پر آسانی سے وار نہ کر سکے۔ کیتو کا بازو زخمی ہونے کے وجہ سے جھونپڑی کی تعمیر کا کام چند دن کے لیے ملتوی ہو گیا تھا۔ چارلس جان بوجھ کر اس کام سے کم ہاتھ بٹاتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی کوشش اور خواہش ہے کہ جھونپڑی جلد تعمیر نہ ہو اور اسے کیتو پر دوسرا وار کرنے کا موقع مل جائے۔ اسے پروا نہیں تھی کہ یہ لوگ کتنے سادہ مزاج اور دوسروں پر اعتبار کرنے والے ہیں۔ وہ اپنی نسل کی فطرت کے مطابق ہر چیز پر پہلے اپنا حق سمجھتا تھا۔ ڈالی اس ویران جزیرے کی واحد عورت تھی۔ شروع میں کیتو کے انداز میں اس کی طرف کوئی میلان نہیں تھا اس لیے چارلس اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح ڈالی کو رام کر لے اور وہ اس کی ہو جائے لیکن اب ڈالی نے اسے مسترد کر کے کیتو کا انتخاب کر لیا تھا۔ وہ اندر سے سلگ اٹھا تھا اور ڈالی کو حاصل کرنے کے لیے کیتو کی جان لینے پر تیار ہو گیا تھا۔

دوسری طرف کیتو چارلس کو دوست سمجھتا تھا۔ وہ فطرت کے لحاظ سے سادہ شخص تھا جسے فریب اور مکاری نہیں آتی تھی۔ اس لیے وہ ڈالی کی بات سننے کو بھی تیار نہیں تھا۔ اس بے چارے کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ چارلس جس دنیا سے آیا تھا مکر و فریب کو وہاں آرٹ کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں دشمن کو میدان میں للکارنے کا رواج نہیں تھا۔ بلکہ چھپ کر حملہ کرنا کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔

رات کے وقت وہ تینوں سو رہے تھے کہ صبح سے ذرا پہلے کیتو اٹھا۔ شاید اسے حاجت محسوس ہو رہی تھی اور وہ جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ اس کا رخ اس کھاڑی کی طرف تھا جو وہ رفع حاجت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد چارلس اٹھا، اس نے پہلے اطمینان کیا ڈالی سو رہی ہے پھر وہ بھی دبے قدموں باہر آیا اور کیتو کے پیچھے چل پڑا۔ ایک جگہ سے اس نے ایک درمیانے سائز کا پتھر اٹھایا۔ دبے قدموں کیتو کا تعاقب کرنے لگا۔ کیتو درختوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ چارلس کسی قدر بلندی [illegible] اتنے عرصے سے اس جزیرے پر رہنے کی وجہ سے وہ [illegible] چپے چپے سے واقف ہو گیا تھا۔ وہ کیتو کے پیچھے ذرا [illegible] رہا تھا۔

اچانک کیتو رک گیا۔ چارلس بھی رک گیا۔ اسے شبہ ہوا شاید کیتو نے اس کی موجودگی بھانپ لی ہے۔ آسمان پر پورا چاند تھا لیکن یہاں درختوں تلے اس کی روشنی کم ہی آ رہی تھی، اس لیے چارلس کو صرف کیتو کا رکا ہوا خاکہ نظر آ رہا تھا۔ چارلس اس سے کچھ ہی دور تھا اور اس نے سوچا کہ موقع اچھا ہے کیتو رکا ہوا ہے اس لیے وہ آسانی سے وار کر سکتا ہے۔ اس نے دبے قدموں حرکت کی اور پھر دوڑ کر پتھر دونوں ہاتھوں سے اوپر کرتے ہوئے اس نے فضا میں جست لگائی جیسے ایک ہی وار میں کیتو کا کام تمام کر دینا چاہتا ہو لیکن اس سے پہلے کہ وہ کیتو پر وار کرتا وہ اچانک ہی اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور چارلس اس جگہ جا پڑا جہاں ایک لمحے پہلے کیتو تھا۔ وہ بہت زور سے گرا تھا اور پھر فوراً ہی اسے بازو میں شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ تب اس نے پہلی بار اسی زہریلے سمندری سانپ کو دیکھا جس سے ایک بار کیتو کو بچایا تھا۔ سانپ نے اسے ڈس لیا تھا۔ شاید اسے ہی دیکھ کر کیتو رکا تھا اور پھر اس کے حملے سے بچنے کے لیے اچھل کر پیچھے گیا تھا، اسی وقت چارلس نے اس پر وار کرنے کی کوشش کی اور کیتو کے پیچھے ہونے کی وجہ سے ناکام رہا۔ نہ صرف ناکام رہا بلکہ اب وہ مرنے ہی والا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر وہی پتھر اٹھا کر سانپ پر دے مارا۔ پتھر اس کے سر پر لگا اور وہ مارا گیا۔ کیتو بے حد حیران تھا یہ دوسری بار ہوا تھا جب چارلس نے اس کی جان بچائی تھی اور اس بار تو اس نے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی تھی۔ کیتو اس کے پاس بیٹھ گیا اور گلوگیر لہجے میں بولا۔

"میرے دوست یہ تم نے کیا کیا؟"

لیکن دوست جواب دینے کی حالت میں نہیں تھا۔ زہر اتنا سریع الاثر تھا کہ اس پر جاں کنی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے چارلس نے دم توڑ دیا تھا۔ کیتو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

صبح کے قریب جب باہر روشنی ہونے لگی تو ڈالی کی آنکھ کھلی اور وہ ان دونوں کو غائب پا کر فکرمند ہوگئی اور جلدی سے اٹھ کر باہر آئی پھر وہ انہیں تلاش کرتی نیچے آئی تو اس نے کیتو کو چارلس کی لاش سینے سے لگائے بیٹھے پایا، اسے دیکھ کر کیتو نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ڈالی میرے دوست نے مجھے سانپ سے بچانے کے لیے اپنی جان قربان کردی۔"

ڈالی نے ایک نظر مردہ سانپ اور پھر چارلس کو دیکھا اور سر جھکا کر کیتو کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

☆☆

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

ساتویں قسط

کشکول

انوار صدیقی

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے… جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ… کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ… یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا… زندگی کو برتنے والا یہ انسان… زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم… انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی… محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین… ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر… صرف آپ کے لیے۔

فرحین کے واپس آجانے کے بعد لیاقت حسین کے دل سے تنہائی کا احساس بھی ختم ہو گیا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا، انیکسی کو دیکھ کر فرحین کی خوشی قابل دید تھی۔ انیکسی کی تزئین و آرائش میں خود راحیلہ بیگم نے بھی دامے، درمے، سخنے بھرپور حصہ لیا تو اس جگہ کا حسن اور نکھر گیا...... ہر شے کا حسن دوبالا ہو گیا۔

فرحین کے ذریعے لیاقت حسین کو گھر کا حال احوال بھی تفصیل سے معلوم ہوا۔

"اماں نے تمہاری ترقی کا سن کر سب سے پہلے شکرانے کی نماز پڑھی تھی۔ وہ ہر وقت ہم دونوں کے لیے دعائیں کرتی رہتی ہے۔ میرے ساتھ آنا بھی چاہتی تھی لیکن......"

"سردار سرفراز خان کی اونچی ہیگ نے اس کا راستہ روک لیا ہوگا۔" لیاقت حسین کے دل کی تلخی زبان تک آگئی۔

"ایسی بات بھی نہیں ہے......" فرحین نے سچائی کا اظہار کیا۔ "میں تم سے غلط نہیں بولے گا...... اس بار چاچا سرفراز نے مجھے دیکھ کر آنکھیں نہیں پھیرا۔ میرا سر پر محبت سے ہاتھ رکھا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا لیکن اس کا آنکھیں بولتا تھا۔ وہ تمہارا خیریت معلوم کرتا تھا۔"

"پھر...... اماں تمہارے ساتھ کیوں نہیں آئی......؟" لیاقت حسین نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"وہ آجاتا تو چاچا سرفراز اکیلا رہ جاتا لیکن اس نے اماں کو روکا بھی نہیں۔" فرحین نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "وہ ہمارا ساتھ آجاتا تو چاچا تمہارا یاد میں اور بے چین ہو جاتا...... تم اس کا خون ہے لیاقت۔ وہ تم کو بھول نہیں سکا۔ زبان سے کچھ نہیں کہتا یہ اور بات ہے۔"

"اماں کو پیسے کب دیے تھے......؟" لیاقت حسین نے پہلو بدل کر پوچھا۔ "میرا مطلب ہے کہ......"

"ہم تمہارا مطلب سمجھ گیا۔" فرحین نے پھر نوشہرہ کی زبان میں اردو بولی۔ "ہم جو کچھ لے گیا تھا وہ چاچا کے سامنے اماں کے ہاتھ میں دیا۔ چاچا نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں اس کا حالت دیکھتا تھا۔ وہ کچھ بھی ہے لیکن تمہارا باپ ہے۔ اندر سے تڑپ کر رہ گیا، مگر زبان نہیں ہلایا۔"

فرحین پوری تفصیل سے ساری باتیں بتاتی رہی۔ لیاقت حسین سنتا رہا، اندر ہی اندر دل مسوس کر رہ گیا پھر اپنا غم چھپانے کی خاطر بولا۔ "اب تم ادھر کراچی آگئی ہو...... صاحب یا بیگم صاحب کے سامنے کھڑا زبان میں بات نہ کرنا۔"

"نہیں کروں گی۔" فرحین نے مسکرا کر وعدہ کیا پھر ذرا سینہ تان کر بولی۔ "دو تین مہینے کی بات ہے، اس کے بعد میں تمہارے ساتھ گٹ اپ بھی کرنے لگوں گی۔"

"گٹ پٹ......" لیاقت حسین نے اسے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ "تو میری دلبر جان ہے فرحین، بغیر گٹ پٹ کے بھی مجھے پیاری لگتی ہے۔"

"میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔" فرحین نے لیاقت حسین کی گردن میں بانہیں ڈال کر جواب دیا۔ "بیگم صاحب کہہ رہی تھیں کہ میں ان سے گٹ پٹ پڑھنا شروع کردوں۔"

"گٹ پٹ نہیں...... انگریزی میں کہا ہوگا۔"

"ہاں...... وہی، انگریزی۔" فرحین نے خمار آلود نظروں سے لیاقت کو دیکھا۔ "ایمان سے کہنا، میں فر فر انگریزی بولتی کیسی لگوں گی؟"

"ایک دم فرسٹ کلاس۔" لیاقت حسین نے اس کے بالوں میں انگلی پھیرتے ہوئے پیار سے جواب دیا۔

"کھل گئی نہ تیری قلعی۔" وہ مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "اس کے مطلب یہ ہوا کہ ابھی میں تجھے ایک دم فرسٹ کلاس نہیں لگتی۔"

"رات ہو لینے دے پھر تفصیل سے بتاؤں گا۔" لیاقت حسین کا لہجہ نشیلا ہونے لگا۔

"ارے ہاں......" فرحین کو کچھ یاد آیا تو وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "تیرے حادثے کی خبر سن کر ادھر سب پریشان ہو گئے تھے۔ اماں کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔ تیری زندگی کی خاطر وہ دن رات خدا سے دعائیں کیا کرتی۔ چاچا سرفراز بھی غمگین ہو گیا تھا۔ اس نے اماں کو تسلی دی تھی، یہی کہا تھا کہ غم نہ کر خدا نے چاہا تو وہ پھر بھلا چنگا ہو جائے گا۔"

لیاقت فرحین کو دیکھتا رہا، گھر کا تازہ دودھ اور گھی کھا کر وہ مہینا بھر میں ہی پھر ویسی ہو گئی تھی، جیسی شادی سے پہلے لگتی تھی...... ماں نے جو چیزیں بھیجی تھیں فرحین وہ لیاقت حسین کو دکھانے لگی لیکن لیاقت کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"ایسے کیوں دیکھ رہا ہے گھور گھور کر؟" فرحین نے اسے چھیڑنے کی خاطر منہ بنا کر کہا۔ "کیا پہلے کبھی نہیں دیکھا؟"

"ٹھیک ہے......" لیاقت حسین اٹھتے ہوئے بولا۔ "اگر تجھے میرا دیکھنا برا لگ رہا ہے تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔"

"دل سے کہہ رہا ہے......؟" فرحین کی نظروں میں خمار چھلک اٹھا۔

اس رات انیکسی کے پرسکون ماحول میں لیاقت حسین نے سارے کاموں سے فارغ ہو کر فرحین کو مخمور نظروں سے دیکھا تو وہ اس کی نظروں کی تپش سے موم کی طرح پگھل گئی۔ ایک ماہ کی دوری جیسے دونوں کے لیے عذاب بن گئی تھی۔ بھولا ہوا سبق وہ بار بار دہراتے رہے، دونوں پر ایک جنون سا طاری تھا جس کا اظہار برملا کیا گیا پھر دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے۔

دوسری صبح لیاقت حسین نہا دھو کر ڈیوٹی کا لباس پہن کر جانے لگا۔ فرحین ابھی تک تازہ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح بستر پر بکھری پڑی تھی، رات کا خمار اس کے چہرے سے چھلک رہا تھا۔ لیاقت حسین جاتے جاتے رک گیا، دبے قدموں قریب جا کر اس نے فرحین کے گداز ہونٹوں کو چھوا تو فرحین نے مسکرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"جلدی سے اٹھ کر نہا دھو کر کوئی اچھا سا جوڑا پہن لے، بیگم صاحب تجھے دو بار بلوا چکی ہیں۔"

فرحین کے جسم کو جیسے کرنٹ لگ گیا؟ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی، لیاقت حسین اس بوکھلاہٹ پر ہنس دیا۔ اس نے فرحین کو جگانے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔ نہ بولتا تو وہ اس خوبصورت گھبراہٹ کو حیا کی سرخیوں کے ساتھ گھلتا ملتا بھی نہ دیکھ پاتا۔ وہ مسکراتا ہوا قدم مارتا دوسرے بنگلے پہنچ گیا، گارڈ نے اسے مسکرا کر خوش آمدید کہا۔

"سیٹھ صاحب نے تو بتایا تھا کہ ابھی تم کچھ دن اور آرام کرو گے۔" اس نے لیاقت حسین سے کہا۔

"بستر پر پڑے پڑے جوڑ پٹھے اکڑنے لگے تھے......" لیاقت نے کہا پھر وہ حسب معمول گاڑی کو اچھی طرح کپڑا مار کر پورٹیکو میں لے آیا۔ سیٹھ عثمان کی تحفے میں دی جانے والی دستی گھڑی پر نظر ڈالی تو مطمئن نظر آنے لگا۔ سیٹھ عثمان وقت کی پابندی کے عادی تھے۔ ابھی ان کے باہر آنے میں پورے سات منٹ باقی تھے، لیاقت حسین پوری طرح مستعد نظر آرہا تھا جب دوسرا ڈرائیور آگیا۔

"تم؟" اس نے لیاقت حسین کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا پھر ہاتھ ملا کر کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم بھلے چنگے ہو۔"

"ایک دم فٹنگ فٹا تنگ۔" لیاقت نے بڑے ترنگ میں جواب دیا پھر گاڑی کی چابی ہوا میں لہراتا ہوا بولا۔ "آج میں ڈیوٹی پر آگیا...... تم بیگم صاحب کی ڈیوٹی سنبھال لو۔"

سیٹھ عثمان ٹھیک وقت پر باہر آئے، راحیلہ بیگم بھی خدا حافظ کہنے کی خاطر ساتھ تھیں، دونوں نے لیاقت حسین کو ڈیوٹی کے لیے آمادہ دیکھا تو انہوں نے نگاہوں نگاہوں میں ایک دوسرے کو دیکھا پھر راحیلہ بیگم نے سر کی معمولی جنبش کا جو اشارہ کیا وہ لیاقت حسین کے حق میں ہی تھا۔ دونوں نے گاڑی کے قریب آکر لیاقت حسین کو اس کی صحت مندی کی مبارک دی پھر راحیلہ بیگم نے دوسرے ڈرائیور سے کہا۔ "اب تم میری گاڑی پر ڈیوٹی دو گے۔"

☆☆☆

ڈی ایس پی لودھی اس وقت بالکل نئی کلف لگی وردی میں تھا۔ شیخ حامد کی گڈ بکس میں ہونے کی وجہ سے وہ خاصا نڈر ہو گیا تھا۔ بگ باس کی سفارش ہی کے سبب وہ گزشتہ تین سال سے اسی علاقے میں تعینات تھا جس میں شیخ حامد کا دفتر تھا، ہر ماہ اسے ایک خاصی معقول لگی بندھی رقم ٹھیک وقت پر پہنچ رہی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تب بھی وہ کسی وفادار پالتو جانور ہی کی طرح اس کے اشاروں پر دم ہلانے پر مجبور تھا، وہ شیخ حامد کے اثر و رسوخ سے پوری طرح واقف تھا اس لیے اس کی مخالفت کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

تین سال کے طویل عرصے میں اسے آج پہلی بار بگ باس نے اپنی عمارت کے آفس میں طلب کیا تھا۔ شاید اسی دن کے لیے اس نے نئی وردی کو بہت سنبھال کر رکھا تھا۔

دفتر کے مین فلور پر قدم رکھنے کے بعد اس کی نظر سب سے پہلے شبنم پر پڑی تو اس کے ہونٹوں نے سیٹی بجانے کے انداز میں گول دائرے کی شکل اختیار کی۔ لیکن وہ سیٹی بجانے کی جرأت نہیں کرسکا۔ وہ ریسپشن کاؤنٹر کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کر کے سیدھا شبنم کے سامنے جا کر رک گیا۔ سوئچ بورڈ پر مختلف کال ملانے کے سلسلے میں وہ پوری طرح منہمک تھی، ہاتھوں کی حرکت نے اس کے جسم کے دوسرے حصوں کو بھی اسی مناسبت سے متحرک کر رکھا تھا جسے لودھی بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا، کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر آہستہ سے اس نے شبنم کو مخاطب کیا۔

"ہیلو مس......"

شبنم نے اس کی طرف توجہ دی تو جھلا کر رہ گئی۔ لودھی کی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ کس ٹائپ کا آدمی ہے۔ جس انداز میں اس نے "ہیلو" کہا تھا وہ بھی چھچھوروں جیسا تھا۔ اس کی نظریں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ کسی خوبصورت لڑکی کی خاطر کس حد تک اپنی سطح سے نیچے گر سکتا ہے۔

"فرمائیے...... کیسے زحمت کی؟" اس نے تیکھے لہجے میں لودھی سے دریافت کیا۔

"مجھے شیخ صاحب نے طلب کیا ہے۔ اسی علاقے میں تعینات ہوں۔" لودھی نے وہاں آنے کا مقصد بیان کرنے کے ساتھ اپنی تعیناتی کا ذکر بھی کر دیا۔ شبنم اس کی نظروں میں

ابھرنے والی پسندیدگی کی جھلک دیکھ کر جلس اٹھی۔

"آپ...... ری...... سپ...... شن...... کاؤنٹر پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔" شبنم نے اسے شرمندہ کرنے کی خاطر رک رک کر سمجھانے کی کوشش کی۔ "آپ وہاں جا کر مس نیلوفر سے دریافت کریں...... وہ آپ کو ملاقاتوں کا وقت بھی...... فرفر...... بتا دے گی۔"

لودھی بے شرمی سے مسکرا دیا۔ شبنم کا جواب تلخ اور طنزیہ ہونے کے باوجود اسے برا نہیں لگا، اس نے نظر بھر کر اسے دیکھا پھر ریسپشن کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔

"ڈی ایس پی لودھی!" اس نے متعلقہ کاؤنٹر پر جا کر سنجیدگی سے اپنا تعارف کرایا۔ "شیخ حامد صاحب نے طلب فرمایا ہے۔"

نیلوفر نے اس کو جواب دینے کے بجائے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر بگ باس سے رابطہ قائم کیا پھر ریسیور رکھتے ہوئے بولی۔ "آپ کو پندرہ منٹ انتظار کرنے کو کہا گیا ہے...... سامنے ریسپشن روم میں تشریف رکھیں۔"

لودھی نے نیلوفر کے خشک لہجے میں بیزاری کی جھلک بھی محسوس کی لیکن وہ شیخ حامد کی وجہ سے مجبوراً مسکرا کر "تھینکس" کہتا ہوا "انتظارگاہ" والے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔

شیخ حامد اس وقت اپنے ساؤنڈ پروف کمرے میں تنہا ہی تھا لیکن اس نے لودھی کو فوری طلب نہیں کیا، لودھی کی آمد کا سن کر اس کے ذہن میں پھر سراج کے کہے ہوئے کچھ جملے گونجنے لگے، اس نے شیخ حامد کی بازپرس کے جواب میں کہا تھا۔

"یقین کرنا نہ کرنا آپ کی مرضی پر منحصر ہے...... بحیثیت ایک پولیس آفیسر کے ہم دیدہ و دانستہ قانون کی نظروں میں دھول بھی نہیں جھونک سکتے۔ تعاون ایک حد تک کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ایک دوسرے پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرنا بھی شرط ہے......" اس نے سراج کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی خاطر بے حد سنجیدگی سے کہا تھا۔

"میں آپ کو ابھی تک دوست سمجھ رہا ہوں لیکن...... ایک بات واضح کر دوں، میں ڈبل کراس کرنے والوں کو نظرانداز کرنے کا عادی نہیں ہوں، لوگوں کو اپنے اشاروں پر چلانے کے ٹرکس بھی جانتا ہوں۔" جواب میں سراج نے معنی خیز انداز اختیار کرتے ہوئے بڑی دیدہ دلیری سے کہا تھا۔

"گڈ...... کسی بھی انسان کی کامیابی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ موقعے کی مناسبت سے اپنے کارڈز استعمال کرے۔"

وہ تلخ جملے شیخ حامد کے لیے کسی چیلنج سے کم نہیں تھے۔ اس نے سراج کے کالر کا کلف نکالنے کی ٹھان لی تھی، اسی مقصد کے لیے اس نے ڈی ایس پی لودھی کو طلب کیا تھا جو اسی کی سفارش کی بدولت کئی سینئرز کا حق مار کر ڈی ایس پی کے عہدے تک پہنچا تھا۔ ایک لمحے تک وہ اپنے ذہن میں کچھ پلان مرتب کرتا رہا پھر اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کہا تھا۔

"لودھی کو اندر بھیج دو۔"

دو منٹ بعد ہی لودھی اس کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھا تھا۔

"تمہارے تبادلے کی فائل پھر موو ہوئی تھی لیکن میں نے اسے رکوا دیا۔" شیخ حامد نے سنجیدگی سے کہا۔ "جب تک تم میری گڈبکس میں ہو عیش کرتے رہو۔"

"اپنا خادم ہی سمجھیں......" لودھی نے کسمسا کر متانت سے جواب دیا۔ "میں آپ کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔"

"کبھی ایسی حماقت بھول کر بھی نہ کرنا ورنہ میرے ایک فون پر تمہاری وردی بھی اتر سکتی ہے۔"

جواب میں لودھی کسمسا کر رہ گیا۔ وہ کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

"میں نے اس وقت تمہیں ایک خاص کام کے سلسلے میں بلایا ہے۔"

"آپ حکم کریں......" لودھی نے کسی تنخواہ دار ملازم کی طرح سعادت مندی سے کہا۔

"سراج سے کس حد تک واقف ہو......؟" شیخ حامد نے اسے گھورتے ہوئے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"بہت زیادہ تعلقات نہیں ہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اب اس میں وہ پہلی جیسی تن پھن نہیں رہے گی۔" لودھی نے دبی زبان میں وضاحت کی۔ "ڈی جی کرائمز کی سپورٹ کی وجہ سے خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگا تھا۔ اب اس کرسی پر آپ کے آغا منظور صاحب آ گئے ہیں اس لیے......"

"فضول باتوں سے پرہیز کرو۔" شیخ حامد نے اسے جھڑک دیا۔ کچھ توقف سے سرسراتے لہجے میں بولا۔ "میں سراج کو ایک جھٹکا دینے پر غور کر رہا ہوں۔ حالات کے پیش نظر یہ ضروری ہو گیا ہے۔"

"یہ تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے سر...... اسے کہیں اندرونی علاقے میں ایسی جگہ پوسٹ کرا دیں جہاں شدت کی گرمی ہر سال نیا ریکارڈ قائم کرتی ہے۔ ہفتہ دس دن میں ہی ساری افسری بھول کر پھر آپ ہی کے قدموں میں آ گرے گا۔"

"نان سنس!" شیخ حامد نے ناگواری کا اظہار کیا۔ "میں اپنے حریف کو ہمیشہ للکار کر نیچا دکھانے کا عادی ہوں۔"

"پھر جیسا آپ حکم دیں...... میں ہر طرح تیار ہوں۔" لودھی نے کہنیوں کے بل آگے جھکتے ہوئے رازداری سے کہا۔ "کچھ بندے بہت دنوں سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے عیش کر رہے ہیں...... آپ کا صرف ایک اشارہ کافی ہے۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر مسٹر سراج کے دماغ کے کیڑے بھی جھاڑ دیے جائیں گے۔"

"ربش!" شیخ حامد نے اسے جھڑک دیا۔ پھر سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کو مسلتے ہوئے بڑے معنی خیز لہجے میں بولا۔ "کیڑے جھاڑنے کے لیے میری فورس میں بھی ایسے ...یالے موجود ہیں جو میری خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ایک پل کی بھی دیر نہیں کریں گے۔"

"پھر......؟" لودھی نے ہونقوں کی طرح منہ پھاڑ کر وضاحت چاہی۔

"ایڈیٹ......" شیخ حامد نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ "شکار کو ایک گولی مار کر ختم کر دینا میرے اصولوں کے ...ف ہے۔ لطف تب آتا ہے جب شکار قدموں میں پڑا ...ت اور زندگی کی کشمکش سے دوچار ہو...... سسک رہا ... زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو اور...... شکاری اس پر ... لگانے سے پہلے آخری بار دریافت کرے...... کیا ... کرنے کے بعد تمہاری دم ہمیشہ ایک اشارے پر ہلنا ... کر دے گی؟"

"میں سمجھ رہا ہوں سر......" لودھی نے پہلو بدل کر ...کاتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔ "الماس...... ڈی ایس ... کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ نہ ہوتی تو وہ اسے ... سے گھومنے پھرنے کی اجازت بھی نہ دیتا، اگر ...وں کے لیے چھومنتر کر دیا جائے تو ہم سراج کو اپنی ... (Terms Dictate) کر سکتے ہیں۔"

"گڈ......" شیخ حامد نے مسکرا کر پوچھا۔ "کیا تم ایسا ...؟"

"آپ حکم کریں...... باقی کام خادم کا ہے۔"

"...ن ایک بات سوچ لو...... میں ناکامی کے سلسلے ... نہیں سنوں گا۔" شیخ حامد کے چہرے پر تناؤ کی ... ہو گئی...... "ڈو...... اور...... ڈائی (Do or ...) ... صورت حال ہو گی۔"

"...منظور ہے سر......" لودھی نے سنجیدگی سے کہا۔ "دو روز کے اندر اندر کام ہو جائے گا۔"

"ایک بات کا خیال رکھنا...... میں جانتا ہوں کہ عورت کے معاملے میں تمہاری نیت بہکنے میں دیر نہیں لگتی...... لیکن تمہیں الماس کے سلسلے میں محتاط رہنا ہو گا...... اپنی حد اور میرے حکم سے تجاوز کرنے کی غلطی نہ کرنا۔"

"رائٹ سر......"

"او۔کے، گیٹ لاسٹ!" شیخ حامد نے مسکراتے ہوئے کہا تو لودھی نے جلدی اٹھ کر اسے باقاعدہ سیلیوٹ کیا پھر ایڑیوں کے بل گھوم کر نپے تلے قدم اٹھاتا ساؤنڈ پروف کمرے سے باہر نکل گیا۔

لودھی کے جانے کے بعد شیخ حامد بھی اٹھا لیکن اسی لمحے اس کے موبائل نے وائبریٹ کرنا شروع کر دیا، اسکرین پر بلیک ٹائیگر کے حروف چمک رہے تھے۔ شیخ حامد نے موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔

"کیا رپورٹ ہے......؟" اس نے ضروری خفیہ کوڈ کے تبادلے کے بعد بے پروائی سے سوال کیا لیکن...... اس کے چہرے کا سکون زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی خون کی ڈوریاں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ دوسری جانب سے اسے جو رپورٹ دی جا رہی تھی وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہی تھی......!

☆☆☆

"ہر کہ آمد عمارت نو ساخت" کے پیشِ نظر آغا منظور نے بھی ڈی آئی جی کرائمز کا عہدہ سنبھالنے کے دو تین دن بعد ہی پہلے ایک پریس کانفرنس کال کی تھی جس میں جرائم کے گراف کو گرانے کے سلسلے میں اس نے ایک رسم کے تحت...... اپنی سخت پالیسی کے دعوے کیے تھے۔ پریس سے اپنے تعلقات بڑھانے کی خاطر اس نے خاصا اہتمام کیا تھا۔

پریس رپورٹرز اس قسم کے دعوے پہلے بھی سن چکے تھے۔ انہیں علم تھا کہ تمام نئے آنے والے شروع میں اپنی ساکھ بنانے کی خاطر نئی پالیسیاں مرتب کرنے اور ان پر عمل کرنے پر لمبی چوڑی باتیں کرتے ہیں۔ کچھ ان پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن جب بیوروکریسی ان کے آڑے آ جاتی ہے تو وہ بھی آنکھ بند کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ پریس کے تجربہ کار رپورٹر جانتے تھے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ آغا منظور اپنے دو سینئر افسران کو پھلانگ کر جس کرسی پر براجمان تھا اس کی وجہ بھی ان کے علم میں تھی۔ بیشتر پریس کے نمائندوں کو اس بات کا علم تھا کہ آغا منظور کی پشت پر شیخ حامد کا نام ہے، اس لیے وہ بہت غور سے

اس کی تقریر سنتے رہے۔ وہ تقریر ختم کرنے کے بعد محض دکھاوے کے طور پر ایک دو سوال کر کے خاموش ہو گئے۔ جو اس میدان میں نو وارد تھے وہ بال کی کھال ادھیڑنے لگے۔

"آپ کی طرح ہر آنے والا آفیسر یہی کہتا ہے کہ وہ جرائم پیشہ افراد کی بیخ کنی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرے گا لیکن بعد میں جب اوپر سے احکام ملتے ہیں تو وہ بھی......"

"ون منٹ......" آغا منظور نے مسکرا کر کہا۔ "میں آپ کی بات کی تردید نہیں کروں گا لیکن یہی صورت آپ حضرات کے ساتھ بھی ہے۔ آپ جان کی بازی لگا کر موقع واردات تک پہنچتے ہیں، حقائق معلوم کرتے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں اپنی خبر تیار کرتے ہیں لیکن آپ کے اخبارات کی بھی اپنی اپنی پالیسیاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے آپ کی رپورٹ بھی عوام کے سامنے نہیں آپاتی...... آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہوں گے...... چھوٹی بڑی مچھلیاں ہر تالاب میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے درمیان رہ کر ہی چھوٹی مچھلیوں کو بھی گزارہ کرنا پڑتا ہے۔"

"گویا آپ بھی ان بڑی مچھلیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے؟" ایک نوجوان رپورٹر نے پرجوش انداز میں چبھتا ہوا سوال کیا۔

"ایسا نہیں ہوگا لیکن ہمیں بہرحال مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی خاطر کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور اختیار کرنا پڑے گا۔"

"کیا آپ کے علم میں ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو بڑے مجرموں کی پشت پناہی کرتے ہیں؟" دوسرے رپورٹر نے تند لہجہ اختیار کیا۔

"سوری......" اس بار آغا منظور نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ "ہمارے پاس اس قسم کی کوئی فائل نہیں ہے اس لیے کہ چہرے آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ نئی پالیسی آجائے تو اس پر ہمیں اور آپ کو مل کر عمل کرنا پڑتا ہے۔"

"آپ کے پاس کچھ ایسے مجرموں کے نام تو ضرور ہوں گے جو بڑے بڑے جرائم میں ملوث ہونے کے باوجود ابھی تک آزادی سے سانس لے رہے ہیں؟"

"آپ کا سوال بہت اہم ہے لیکن اس کی وجوہات مختلف ہوتی ہیں۔ پولیس کا کام ہے کہ مجرم کو گرفتار کر کے اسے عدالت کے روبرو پیش کر دے۔ وہاں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ہمیں عدالت کے فیصلوں کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔"

"گویا ہماری عدالتیں......"

"جی نہیں...... میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی جس کا آپ کوئی گرما گرم سرخی بنا سکیں۔" آغا منظور نے بڑی خوبصورتی سے رپورٹر کے سوال کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "وکیلوں اور بیرسٹروں میں بھی درجہ بندی ہوتی ہے...... جتنا بڑا مجرم ہوتا ہے، اتنا بڑا وکیل بھی کھڑا کر دیتا ہے...... کے فیصلے ہمیشہ وکیلوں کے دلائل پر ہوتے ہیں۔ پریس بھی اس بات سے واقف ہے کہ کالی بھیڑیں ہر جگہ موجود ہیں حقائق کے پیش نظر قانون کی پیچیدہ شقوں کی روشنی میں کچھ رعایتیں بھی حاصل ہوتی ہیں جس کا فائدہ مجرم کو مل جاتا ہے...... ہم فیصلوں کے خلاف اپیل تو کر سکتے ہیں لیکن ان سے انکار نہیں کر سکتے۔"

ایک گھنٹے تک سوالات کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ آغا منظور پرانا کھلاڑی تھا، کئی سینئر رپورٹر اس کی مٹھی میں بھی تھے، وہ ہر بات کا جواب دیتا رہا پھر وقت ختم ہو جانے کے بعد حسبِ معمول بات آئی گئی ہو گئی۔

پریس کانفرنس کے دو گھنٹے بعد آغا منظور نے اپنے حلقے کے تمام سینئر پولیس آفیسروں کو طلب کیا تھا۔ اس میٹنگ کے دوران بھی وہ اپنے نئے عہدے کی حیثیت میں کچھ بدلا بدلا نظر آیا۔ اس نے تمام تھانہ انچارج کو کھلے لفظوں میں تاکید کی تھی کہ وہ کسی قسم کی غفلت کو برداشت نہیں کرے گا۔ اس لیے وہ پوری فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی ڈیوٹیاں پوری پابندی اور دیانتداری سے نبھائیں۔ تقریباً چالیس منٹ تک وہ نرم و گرم انداز میں مختلف ہدایتیں دیتا رہا پھر اس نے وہ میٹنگ بھی برخاست کر دی لیکن خاص طور سے دو افسروں کو روکے رکھا جس میں سے ایک سراج تھا اور دوسرا ایس پی اورنگ زیب تھا جو کچھ دنوں پیشتر ہی دوسرے شہر سے ٹرانسفر ہو کر آیا تھا اور اب ترقی حاصل کرنے کے بعد آغا منظور کی سیٹ پر اس کی تعیناتی ہوئی تھی۔

اپنے پرانے ریکارڈ کے مطابق ایس پی اورنگ زیب ایک قانون پسند آفیسر تھا، اس کا تعلق ایک ایسی فیملی سے تھا جس میں کئی افراد صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں بھی بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے جس کی وجہ سے وہ قانونی معاملات میں کسی کے ساتھ رعایت کرنے کا عادی نہیں تھا، بحیثیت ڈی ایس پی بھی اس نے کبھی کسی غلط کام کے سلسلے میں کسی کے سامنے جھکنا نہیں سیکھا تھا۔ آغا منظور کو اس کا اپنی ماتحتی میں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کی خاص وجہ شیخ حامد تھا جس سے وہ فی الحال کوئی بگاڑ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

رسمی تعارف اور کچھ پریس کانفرنس کی باتوں کے بعد آغا منظور نے سنبھل کر گفتگو کی ابتدا سراج سے کی، وہ اس کے کندھے پر بندوق رکھ کر اورنگ زیب کو اپنی پالیسیوں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔

"مسٹر سراج......" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "بحیثیت ایس پی مجھے آپ کا تعاون ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ اب بھی مجھے آپ سے زیادہ بہتر کارکردگی کی امید ہے لیکن موجودہ پوزیشن میں ہمیں فاصلوں کا خیال بھی رکھنا ہوگا۔"

"فاصلے......؟" سراج چونکا۔ "میں سمجھا نہیں سر کہ آپ کی فاصلوں سے کیا مراد ہے؟"

"غلط نہ سمجھیں......" وہ کسمسا کر بولا۔ "بحیثیت ڈی آئی جی کرائمز کے میرا ہر ایک سے زیادہ میل جول بھی مناسب نہیں ہوگا۔ آپ واقف ہیں کہ مسٹر علیم احمد اور آپ کے مراسم کو بھی لوگوں نے غلط رنگ دیا تھا۔"

سراج جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ آغا منظور نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا پھر اورنگ زیب سے مخاطب ہوا۔

"آپ کی فائل میں نے بہت غور سے پڑھی ہے۔ آپ کی کارکردگی بے مثل رہی ہے لیکن چھوٹے صوبوں اور بڑے شہروں میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ یہاں ہمیں ایسے لوگوں کو مجبوراً برداشت کرنا پڑتا ہے جن کے تعلقات ہماری اور آپ کی سوچ سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔"

"مجھے اس کا اندازہ ہے سر...... لیکن قانون تو سب کے لیے ایک ہی ہوتا ہے۔"

"ضرور ہوتا ہے مگر یہاں ہمیں اپنی پانچ انگلیوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے جو برابر نہیں ہوتیں......" آغا منظور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اگر ہم ایک دوسرے سے تعاون رکھیں تو معاملات زیادہ آسانی سے نمٹائے جا سکتے ہیں۔"

"میں آپ کو اپنے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

سراج کو یہ بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ آغا منظور جس کی سفارش پر ڈی آئی جی کرائمز کی کرسی پر بیٹھا تھا اس کے بارے میں وہ ابھی سے اورنگ زیب کو بریفنگ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

"ایک بات کا خاص خیال رکھیے گا۔" آغا منظور نے بلا توقف سے کہا۔ "کوئی رپورٹ فائنل کرنے سے پیشتر اگر ہم اسے قبل از وقت ڈسکس کر لیں تو زیادہ مناسب رہے گا۔"

"سر...... کیا ہمارے علاقے میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو قانون سے زیادہ قوت رکھتے ہیں؟" اورنگ زیب نے دبی زبان میں سوال کیا۔

"اس کا اندازہ آپ کو آہستہ آہستہ ہو جائے گا۔ میں نے آپ کو بریفنگ اس لیے دی ہے کہ...... آپ اندھیرے میں نہ رہیں۔"

"شکریہ سر......" اورنگ زیب نے کسمسا کر کہا۔ "میں کوشش کروں گا کہ کسی سے میرا کلیش نہ ہو لیکن کسی مجرم کے سامنے گھٹنا ٹیکنے کی پالیسی پر عمل کرنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہو۔"

آغا منظور نے اورنگ زیب کو گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ چاہتا تو شیخ حامد کے تعاون سے محض چند گھنٹوں میں اس کا تبادلہ بھی کرا سکتا تھا لیکن میڈم روبی کے باعث وہ فوری طور پر شیخ حامد سے اس مسئلے پر بھی بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ سراج نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ کر دبی زبان میں کہا۔

"سر...... میرا خیال ہے کہ کرسی کا تجربہ ہر آفیسر کے لیے اس کی رہنمائی کا بہترین ذریعہ ہوتا ہے۔"

اورنگ زیب نے تیزی سے نظریں گھما کر سراج کی طرف دیکھا لیکن قبل اس کے کہ وہ سراج کے معنی خیز جملے کا کوئی معقول جواب دیتا، سراج کے موبائل پر کسی کی کال ریسیو ہوئی۔ نمبر شناسا نہیں تھے لیکن سراج نے دیدہ دانستہ وہاں سے وقتی طور پر ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ "ایکسکیوز می سر۔" کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے میں ایک طرف چلا گیا۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں اورنگ زیب سے الجھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

"ہیلو...... ڈی ایس پی سراج اسپیکنگ......" اس نے موبائل آن کر کے بڑے مہذب لہجے میں کہا۔

"میں نے کسی سے سنا ہے کہ تم پر بھروسا کیا جا سکتا ہے......" دوسری جانب سے کسی عورت کی آواز ابھری جس میں کرب کی آمیزش بھی صاف محسوس کی جا رہی تھی۔

"آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا......؟"

"میرے پاس تعارف کرانے کا وقت نہیں ہے آفیسر لیکن ایک مجبور عورت اپنی آخری سانسیں پوری کرتے وقت تمہارے اوپر اعتماد کر رہی ہے...... اس کے اعتماد کو...... ٹھیس نہ پہنچانا۔"

آخری سانسوں والی بات سن کر سراج یک لخت بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے تیزی سے پوچھا۔ "کیا آپ......"

"ہاں آفیسر...... میں زہر پی چکی ہوں اس لیے...... میری بات غور سے سن لو...... م...... میں صبا...... بیگم شیخ حامد

بول رہی ہوں...... میں نے ایک تفصیلی خط لکھ کر...... سائڈ ٹیبل کے گلدان کے نیچے...... دب...... دبا دیا ہے۔'' اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان کہا گیا۔ ''شاید تت...... تم...... اس خط کے مضمون کے ذریعے...... اے...... اے...... ایک ایسے مجرم کو پھپ...... پھانسی کے تختے تک پہنچا...... سکو جس نے...... مجھ...... مجھے حرام موت مرنے پر مجبور کر دیا...... مم...... میں ایسا قدم...... مم...... نہ اٹھاتی تو...... شاید مم...... میرا انجام زیادہ...... وہ...... اذیت ناک ہوتا...... مم میں...... تم پر بھب...... بھروسا کر...... رہی...... ہوں...... ام...... مم...... مسٹر سراج...... مجھے مایوس نہ...... آ آ...... نا...... کررر...... نا...... خد...... خدا...... آ آ...... آ آ......''

دوسری جانب سے کسی ٹھوس شے کی گرنے کی آواز ابھری تو سراج نے تیزی سے کہا۔

''ہیلو...... ہیلو...... کیا آپ تک میری آواز پہنچ رہی ہے......؟ ہیلو...... ہیلو۔'' سراج کی کوشش نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ دوسری سمت سے کوئی جواب نہیں ملا۔ سراج کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا لیکن تصدیق بہرحال شرط تھی۔ وہ موبائل آف کرتے ہوئے تیزی سے قدم اٹھاتا آغا منظور کے قریب آکر بولا۔

''سر...... ہمارے لیے ایک بری خبر ہے......''

''کس کی کال تھی......؟'' آغا منظور نے سنبھل کر پوچھا۔

''ہوسکتا ہے کسی نے محض مذاق کیا ہو لیکن اس وقت ہمارا فوری طور پر شیخ حامد کی کوٹھی پر پہنچنا ضروری ہے۔''

''شیخ حامد!'' آغا منظور، سراج کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چونکا۔ ''سب خیریت تو ہے......؟''

''صبا بیگم...... شیخ حامد کی مسز......'' سراج نے کہا۔ ''اسی کا فون تھا لیکن......''

''لیکن کیا......؟''

''باتوں سے اور پھر گفتگو کے اچانک ختم ہو جانے سے یہی لگتا ہے جیسے...... اس نے خودکشی کرلی ہے۔''

''خودکشی......'' آغا منظور اچھل پڑا۔ ''کیا آپ کا موبائل نمبر اس کے پاس تھا؟''

''یہی تو تعجب کی بات ہے سر...... میں نے آج سے پہلے کبھی فون پر اس سے بات نہیں کی، آمنا سامنا بھی نہیں ہوا۔''

''آپ تھانے فون کر کے کوٹھی پہنچیں۔ میں مسٹر اورنگ زیب کو ساتھ لے کر آتا ہوں۔'' آغا منظور نے ایس پی کی طرف دیکھ کر کہا۔

سراج تیزی سے آئی جی کرائمز کے دفتر سے نکلا، فوری طور پر اس نے علاقے کے تھانہ انچارج کو حادثے کی اطلاع دی۔ یہ بھی ہدایت کی کہ آئی جی کرائمز کے آنے تک لاش اور جائے حادثہ کی کسی چیز کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے۔ پھر سراج تیزی رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیخ حامد کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس نے صبا بیگم سے کبھی بات نہیں کی۔ پھر اس کا موبائل نمبر اسے کس طرح ملا...... خاص طور پر صبا بیگم نے اسی کو اپنی حرام موت کی اطلاع دینی کیوں ضروری سمجھی؟...... وہ کون تھا جس نے سراج اور اس کے نمبروں کے بارے میں مرنے والی کو آگاہ کیا تھا؟ موبائل بھی یقیناً تحویل میں لیا جائے گا جو اس بات کی گواہی دے گا کہ مرنے والی نے آخری کال کس کو کی تھی؟...... شیخ حامد اس نکتے کو کس انداز میں سوچے گا......؟ اگر مرنے والی کے آخری جملے حقیقت پر مبنی تھے تو شیخ حامد کا سراج کی طرف سے مشکوک ہو جانا قدرتی بات تھی؟ دو دن پہلے ہی سراج اور شیخ حامد کے درمیان اسپتال میں کچھ ٹھوس اور سخت جملوں کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ ان حالات میں بہت سارے اور خدشات بھی جنم لے سکتے تھے؟

شیخ حامد کی کوٹھی کے باہر علاقہ انچارج کی جیپ اور ایمبولینس موجود تھی، سارا عملہ باہر کھڑا نظر آرہا تھا۔ شاید انہیں اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ سراج کے دریافت کرنے پر تھانہ انچارج نے اس کے شبہے کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

''گارڈز کا کہنا ہے کہ وہ شیخ حامد یا ڈی ایس پی لودھی کے آنے تک کسی کو اندر نہیں جانے دیں گے۔''

تین گارڈز پوری طرح مسلح دروازے پر تعینات تھے۔ سراج ان کی طرف بڑھا۔ اسی وقت لودھی کی جیپ بھی اس کے قریب آکر رکی۔ اس نے سراج سے رسمی انداز میں ہاتھ ملایا پھر سرد لہجے میں پوچھا۔

''کیا آپ کو حادثے کی اطلاع مل چکی ہے......؟''

''ڈی آئی جی کرائمز نے بتایا تھا...... وہ بھی ایس پی اورنگ زیب کے ساتھ پہنچنے والے ہیں۔'' سراج نے کچھ سوچ کر یہ ظاہر کرنے سے گریز کیا کہ حادثے کی اطلاع براہ راست اسی کو دی گئی تھی۔

گارڈز نے کوٹھی کا پھاٹک کھول دیا۔ پولیس افسران اور عملہ اندر داخل ہوا تھا کہ آغا منظور اور ایس پی اورنگ زیب بھی آگئے۔ صبا بیگم کے کمرے کا دروازہ آغا منظور نے

کھولا، اس کے پیچھے پیچھے ایس پی اورنگ زیب تھا، سراج نے دیدہ و دانستہ ہاتھ کے اشارے سے لودھی کو پہلے اندر چلنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی کمرے میں داخل ہوگیا۔ تھانہ انچارج بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

سراج نے جو صورت حال دیکھی وہ فون پر ہونے والی گفتگو اور کسی وزنی شے کے گرنے کی آواز کے عین مطابق تھی، صبا بیگم کی لاش اس کی مسہری کے ساتھ فرش پر اوندھی پڑی تھی، مسہری سے گرتے وقت شاید اس نے قریب رکھی میز کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی جو اس کے سامنے الٹی پڑی تھی، اس پر موجود برش بھی بکھر گئے تھے۔ سائڈ کے دونوں لیمپ اپنی جگہ موجود تھے، اس کے ساتھ خوبصورت اور وزنی گلدان بھی موجود تھے۔ سراج کے ذہن میں وہ آخری تحریر ابھرنے لگی جو صبا بیگم کے کہنے کے مطابق کسی گلدان کے نیچے دبی تھی...... جس کے ذریعے مرنے والی کے خیال کے مطابق شیخ حامد کو پھانسی کے پھندے تک پہنچایا جاسکتا تھا۔ وہ کسی طرح اس تحریر کو حاصل کرنا چاہتا تھا کہ کسی اور کی نظر نہ پڑ سکے۔ یہ خاصا مشکل کام تھا لیکن سراج کسی نہ کسی طرح اس کو ممکن بنانے پر پوری طرح آمادہ تھا۔

آغا منظور کے حکم پر سب سے پہلے فوٹو گرافرز نے مختلف اینگل سے جائے واردات کو محفوظ کیا۔ ساری تصویروں میں وہ موبائل بھی یقیناً آیا ہوگا جو مرحومہ کے [illegible] مگر بے جان ہاتھ کے قریب ہی پڑا تھا۔ فوٹو سیشن کے بعد فنگر پرنٹس ایکسپرٹ نے اپنا کام پوری مہارت سے انجام دینا شروع کیا۔ بعدازاں سارے افسران موت کے امکانات پر توجہ دینے لگے۔ لودھی، سراج کے ساتھ ساتھ لگا تھا لیکن اس وقت وہ بھی لپک کر نئے ایس پی اورنگ زیب کے قریب چلا گیا جس نے مرنے والی کے الٹے ہاتھ کی بند مٹھی کھول کر وہ شیشی برآمد کرلی تھی جو یقیناً کچھ دیر قبل زہر سے بھری ہوگی۔ ایس پی کے اشارے پر فوٹو گرافرز اس شیشی کو بھی ہاتھ میں دبے ہوئے محفوظ کرنے لگے، سب کی نگاہیں اسی شیشی کی طرف تھیں جب سراج نے بڑی خوبصورتی سے بستر کے سیدھے طرف والے گلدان کے سامنے جاکر اسے اپنی پشت سے پرے کیا پھر پلک جھپکتے میں وہ تہ کیے کاغذ کو دوسروں کی نظر بچا کر اپنی جیب میں رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کاغذ کو حاصل کرنے کے بعد وہ لودھی کے قریب چلا گیا۔

''کیا شیخ حامد صاحب کو ابھی اطلاع نہیں ملی......؟'' اس نے سرسری طور پر دریافت کیا۔

''آپ کا کیا خیال ہے......؟'' لودھی نے خشک لہجے میں منہ بنا کر کہا۔ ''کیا ان کو اطلاع ہے اور وہ جان بوجھ کر یہاں موجود نہیں ہیں؟''

جواب میں سراج نے لودھی کو تیکھی نظروں سے دیکھا، شاید یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے بہت سینئر تھا اور اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ترقی حاصل کی جبکہ لودھی کو اس کے عملے کے کچھ لوگ بھی ''سفارشی ٹٹو'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔

باکمال

☆ دو آدمی ایک چھوٹی سی الماری درمیانی منزل سے اوپر کے کمرے میں لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کوشش میں وہ پسینا پسینا ہوگئے لیکن الماری ایک سیڑھی بھی اوپر نہ چڑھ سکی۔ کچھ دیر کے بعد ایک شخص بری طرح ہانپتے ہوئے بولا۔ ''ہم اسے اوپر ہرگز نہیں لے جاسکتے۔''

''اوپر؟'' دوسرے شخص نے حیرت سے چلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو یہ سمجھا تھا کہ اسے نیچے لے جانا ہے......''

☆☆☆

☆ ماسٹر صاحب۔ ''دیکھو بچو، ہیڈ ماسٹر صاحب آنے والے ہیں۔ وہ تم سے کچھ سوالات کریں گے کہ تم کو کس نے بنایا؟ (احمد سے مخاطب ہوکر) تم کہنا ہمیں اللہ نے بنایا ہے۔ (رشید سے) اگر تم سے سوال کریں کہ تم کون سی جماعت میں پڑھتے ہو تو کہنا۔ میں تیسری جماعت میں پڑھتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد ہیڈ ماسٹر آئے تو پوچھا۔

''بچو، تمہیں کس نے بنایا؟''

رشید فوراً اٹھ کر بولا۔ ''جناب، جسے خدا نے بنایا تھا وہ تو پیشاب کرنے چلا گیا ہے البتہ میں تیسری جماعت میں پڑھتا ہوں......''

مرسلہ: اختر شاہ عارف، جہلم

"کیا آپ کے خیال میں ان کا اس وقت یہاں موجود نہ ہونا حیرت انگیز نہیں ہے؟" سراج نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ "جب آپ یہاں آگئے تو پھر شیخ صاحب کو حادثے کی اطلاع بھی ضرور مل چکی ہوگی۔"

لودھی کی پیشانی شکن آلود ہوگئی، وہ اپنی نظروں میں ابھرنے والی نفرت پر قابو نہ پاسکا لیکن کوئی جواب دینے کی حسرت بھی اچانک شیخ حامد کے کمرے میں داخل ہونے کے سبب اس کے دل میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

شیخ حامد کا چہرہ کسی قسم کے جذبات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا۔ ایک لمحے تک دروازے پر کھڑا وہ مرنے والی کی لاش کو گھورتا رہا پھر اس نے سب کو نظر انداز کر کے براہِ راست لودھی کی طرف خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کسی نے ابھی تک یہاں کی چیزوں کو ہاتھ تو نہیں لگایا......؟"

"جی نہیں......" لودھی نے فوری جواب دیا۔ "فی الحال صرف فوٹو سیشن اور فنگر پرنٹس اٹھانے کا کام ہوا ہے اور...... ابھی ایک منٹ پیشتر...... ایس پی صاحب نے بیگم صاحبہ کے الٹے ہاتھ میں دبی ایک خالی شیشی برآمد کی ہے۔"

شیخ حامد کی نظریں اورنگ زیب کی طرف گھوم گئیں، ان نظروں میں نفرت اور جھلاہٹ کا ملا جلا تاثر بھی صاف پڑھا جاسکتا تھا۔

"تمہارا نام شاید ایس پی اورنگ زیب ہے؟" اس نے آپ کے بجائے ایس پی کو تم کہہ کر مخاطب کیا تو اورنگ زیب کے چہرے پر بھی ایک رنگ آکر گزر گیا، جواب میں اس نے بھی شیخ حامد کو سر سے پاؤں تک کچھ ایسے انداز میں دیکھا جیسے احساس دلانا چاہتا ہو کہ اس کا شمار ان افسروں میں نہ کیا جائے جو بڑی مچھلیوں کے سامنے نظریں اور گردن جھکانے کے عادی ہوتے ہیں۔ ڈی آئی جی کرائمز نے صورتِ حال کشیدہ ہوتے دیکھی تو قدم اٹھاتا دونوں کے درمیان آگیا۔

"ہم نے ابھی ضابطے کی کارروائی کی ابتدا کی ہے......" اس نے نرم لہجہ اختیار کیا۔ "اب آپ آگئے ہیں تو آپ کی اجازت ہی سے باقی کارروائی بھی ہوگی۔"

"کس قسم کی کارروائی......؟" شیخ حامد نے کسی زخمی کی طرح بل کھا کر سوال کیا۔

"ہمیں اس خودکشی کے محرکات بھی معلوم کرنے ہوں گے۔" آغا منظور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "مرحومہ کے چہرے کی نیلی رنگت اور منہ سے نکلتا ہوا جھاگ بھی نشاندہی کر رہا ہے کہ موت کسی مہلک زہر کا نتیجہ ہے۔"

"کیا خیال ہے آپ کا؟" جواب میں شیخ حامد تلملا کر بولا۔ "جب میں گھر پر موجود نہیں تھا تو مرنے والی کو زہر کس نے پینے پر مجبور کیا ہوگا؟"

"آپ کی ذات پر شبے کا سوال نہیں ہے مسٹر حامد۔" ایس پی اورنگ زیب نے آغا منظور کے قریب آکر شستہ الفاظ میں کہا۔ "ایسے خودکشی کے کیسز میں ضابطے کی تمام کارروائی اہم ہوتی ہے۔"

"کیا تمہارا اشارہ اب پوسٹ مارٹم کی طرف ہے؟" شیخ حامد کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور گہری ہونے لگی۔

"جی ہاں......" اس بار بھی ایس پی نے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا۔ "ایسے کیسز میں پوسٹ مارٹم سب سے اہم ہوتا ہے۔ اسی رپورٹ کی روشنی میں......"

"اگر میں تمہیں لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کی اجازت نہ دوں تو......؟" شیخ حامد کا لہجہ اور سرد ہوگیا۔ نگاہوں میں سرخی پھیلنے لگی۔

"آپ کی مرضی نہ ہوگی تو ہم اصرار نہیں کریں گے۔" آغا منظور نے بات نبھانے کی کوشش کی لیکن اورنگ زیب خاموش نہ رہ سکا۔

"سر نے ٹھیک کہا مسٹر حامد...... اگر آپ تحریری طور پر......"

"کیا تم آئی جی کی موجودگی میں اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتے۔" شیخ حامد کا پارہ چڑھنے لگا۔ "ایک بات اور ذہن نشین کرلو...... صوبائی اور مرکزی وزرا اور سینیٹر بھی مجھے مسٹر نہیں...... صرف شیخ حامد...... یا شیخ صاحب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"

"مسٹر اورنگ زیب نے ابھی یہاں جوائن کیا ہے۔" آغا منظور نے بڑی مصلحت سے شرمندگی کا اظہار کیا۔ "میں انہیں آپ کے بارے میں سمجھا دوں گا۔"

آغا منظور کے جواب پر اورنگ زیب کے چہرے پر ناگواری کے شدید تاثرات ابھرے تھے۔ اس نے ایک نظر بھر کر شیخ حامد کو دیکھا پھر پلٹ کر آئی جی کرائمز سے درخواست کی۔ "سر...... آپ اگر اس کیس میں میرا نام تفتیشی افسروں کی فہرست میں نہ شامل کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

پھر اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا، اٹینشن پوزیشن میں آکر آغا منظور کو سیلیوٹ کیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

شیخ حامد کی تلملاہٹ بھی قابلِ دید تھی، اورنگ زیب کے جملے اس کے لیے کھلا چیلنج تھے لیکن وہ موقع کی نزاکت کے سبب اپنا غصہ پی گیا۔

"آئی ایم سوری سر......" آغا منظور نے شیخ حامد کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر دبی زبان میں کہا۔

ایک لمحے تک ماحول پر کھنچاؤ کی کیفیت طاری رہی پھر شیخ حامد نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ "اس سانحے کی اطلاع سب سے پہلے کس کو ملی تھی؟"

"مجھے......" لودھی بول پڑا۔ "آپ کی ملازمہ نے اطلاع دی تھی سر......"

سراج نے ایک پل کے لیے سکون کا سانس لیا لیکن اس کی نظریں بار بار اس موبائل کی جانب اٹھ رہی تھیں جو اس بات کا اہم گواہ تھا کہ اس سے آخری کال سراج ہی کو کی گئی تھی۔ اس بات کا علم ہوجانے کے بعد شیخ حامد کے ذہن میں ایک نہیں بہت سارے اہم سوالات بھی ابھر سکتے تھے۔

کچھ دیر ماحول پر ایک سوگوار سی خاموشی طاری رہی، شیخ حامد مرنے والی کو ٹکٹکی باندھے گھور رہا تھا۔ اس کے دل میں یقیناً اس کے لیے نفرت ہی نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی لیکن نظروں سے اس نے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ لودھی اس کے قریب ہی کسی ملازم کی طرح ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"مسٹر آغا منظور......" شیخ حامد نے بیوی کی لاش سے نظر اٹھا کر آئی جی کرائمز کو دیکھا۔ "میں اپنی مسز کی لاش کو اپنی مرضی سے دفن کرنا پسند کروں گا...... پوسٹ مارٹم کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنی رپورٹ میں جو چاہیں ظاہر کریں۔ میری طرف سے پوری اجازت ہے لیکن...... اگر آپ حضرات کسی قسم کی تفتیش کرنا پسند کریں تو اس کے لیے مجھ سے براہِ راست سوال جواب کیے جائیں۔ میں اسے پسند نہیں کروں گا کہ میرے کسی گھریلو ملازم کو بلاوجہ تختہ مشق بنایا جائے...... سب میرے اعتماد کے لوگ ہیں۔"

"آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا سر......" آغا منظور کے بجائے لودھی نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔ "کیس میرے علاقے میں رجسٹرڈ ہوا تو اس کی انکوائری بھی میں ہی کروں گا۔"

"اس میں شبے کی کیا گنجائش ہے؟" آغا منظور نے لودھی کو سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ "جب یہ سانحہ آپ کے حلقے میں ہوا ہے تو کسی دوسرے حلقے میں اس کا اندراج کیسے ہوسکتا ہے؟"

"سوری سر......" لودھی نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "اس وقت میری زبان سے غلط جملہ نکل گیا۔ شاید اس لیے کہ مرحومہ بھی شیخ صاحب کی طرح میرا خیال رکھتی تھیں......"

سراج بدستور خاموش کھڑا رہا۔ شیخ حامد نے بھی اسے مخاطب نہیں کیا۔ شاید اسپتال میں کچھ تیز و تند جملوں کے الفاظ اب بھی اس کے ذہن میں منتقی انداز میں گونج رہے تھے...... سراج کو ان سب باتوں سے زیادہ اس موبائل کی فکر تھی جو صبا بیگم کی لاش کے قریب پڑا تھا۔

☆☆☆

شیخ حامد نے صبا بیگم کو سپردِ خاک کرنے میں خاصی عجلت کا مظاہرہ کیا، اس لیے جنازے میں لوگوں کی تعداد بھی خلافِ توقع بہت کم تھی لیکن دوسرے دن اس کی کوٹھی پر بڑے بڑے لوگوں کی آمد کا تانتا بندھا رہا، ان میں مرکزی وزرا کے علاوہ صوبائی کابینہ کے بھی بیشتر چہرے نظر آرہے تھے، پولیس کے اعلیٰ افسران بھی دو دو چار چار کی ٹولی میں شرکت کر رہے تھے۔ آغا منظور اور سراج نے بھی پرسے کے لیے حاضری ضروری سمجھی لیکن ایس پی اورنگ زیب شریک نہیں ہوا۔ شیخ حامد ہر شخص کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرتا رہا، وہ صبا بیگم کی موت سے دکھی نہیں تھا لیکن خودکشی کے سبب کچھ الجھا ہوا نظر آتا تھا۔ اس غم کے موقعے پر بھی اس نے اپنے اثر و رسوخ کا پورا پورا استعمال کیا تھا، مقامی پریس میں سے کسی ایک نے بھی مرنے والی کی خبر نہیں شائع نہیں کی، ایک اخبار نے "شیخ حامد کو صدمہ" کا ایک باکس ضرور لگایا تھا مگر اس میں موت کا سبب ظاہر نہیں کیا گیا تھا۔

حاضری لگا کر واپس جاتے وقت آغا منظور نے سراج سے کہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ اورنگ زیب نے شیخ حامد کو جس انداز میں ناراض کردیا ہے، وہ رنگ ضرور لائے گا۔"

"شیخ حامد کو بھی ماتحتوں کی موجودگی میں کسی ایس پی کے ساتھ مہذب انداز اختیار کرنا لازم تھا۔" سراج نے کسمسا کر جواب دیا۔ "بہرحال، اورنگ زیب کے عزیز بھی مرکز اور صوبائی اسمبلیوں میں کچھ کم نہیں ہیں۔ جیت کس کی ہوگی اور کون شرمندگی کا شکار ہوگا۔ کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔"

"آپ شیخ حامد کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتے۔" آغا منظور نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ "جہاندیدہ اور بہت چالاک آدمی ہے، جہاں تعلقات میں لچک محسوس کرتا ہے وہاں طاقت کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتا۔"

"اس کی فکر مجھے بھی ہے۔" سراج نے صبا بیگم کی آخری کال کے حوالے سے کہا۔ "مجھے حیرت ہے کہ مرحومہ کے پاس میرا موبائل نمبر کہاں سے آگیا؟"

"اوہ......" آغا منظور نے ہونٹ چباتے ہوئے

جواب دیا۔ ”شیخ حامد مرنے والی کا موبائل ضرور چیک کرے گا، اس کے بعد وہ آپ سے باز پرس بھی کرے گا۔“

”میں بھی اسی بات پر غور کر رہا ہوں کہ اسے کس طرح مطمئن کیا جاسکتا ہے۔“ سراج نے اسپتال کی باتیں دہراتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرے خلاف پہلے ہی بھرا بیٹھا ہوگا۔ صبا بیگم سے میری پہلی اور آخری گفتگو جلتی پر تیل ہی کا کام انجام دے گی۔“

”اس بارے میں بھی سوچیں گے۔“ آغا منظور نے کہا پھر کچھ توقف سے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس موقع پر میڈم روبی کو بھی شیخ حامد سے رسمی طور پر ضرور مل لینا چاہیے۔“

”میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے لیکن......“ سراج جملہ مکمل نہ کرسکا۔ اس کے موبائل نے اس کی توجہ بٹادی، پھر لودھی کا نام چمکتا دیکھ کر اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ ”ہیلو...... سراج اسپیکنگ!“ اس نے خشک انداز میں کال ریسیو کی۔

”اس وقت آپ کہاں مل سکتے ہیں؟“ دوسری جانب سے سوال کیا گیا تو سراج کی طبیعت اور مکدر ہوگئی۔

”کوئی خاص ضرورت پیش آگئی ہے؟“ سراج نے اسے سنجیدگی سے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

”خاص ضرورت نہ ہوتی تو آپ کو بلاوجہ ڈسٹرب بھی نہ کرتا۔“ لودھی نے بدستور خشک انداز میں جواب دیا۔ ”شیخ صاحب نے ایک ضروری کام مجھے سونپا ہے جس کا تعلق آپ ہی سے ہے۔“

”اس وقت میں بھی ایک ضروری کام سے کہیں جارہا ہوں۔ ویسے بائی دا وے۔ شیخ صاحب نے جو کام میرے حوالے سے آپ کے سپرد کیا ہے، اس کی نوعیت کیا ہے؟“

”آپ کا موبائل نمبر جو بیگم صبا نے آخری بار استعمال کیا تھا۔“ دوسری جانب سے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا گیا۔

”وہ کال مجھ ہی کو کی گئی تھی۔“ سراج نے دبنگ لہجہ اختیار کیا۔ ”مرحومہ نے مجھ سے صرف ایک ہی بات کہی تھی کہ...... وہ حالات کا مقابلہ کرتے کرتے تھک چکی ہے۔ اب آرام کرنا چاہتی ہے...... آپ کی اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ میری مرحومہ سے وہ پہلی اور آخری گفتگو تھی۔“

”کیا اب موبائل کے نمبروں کی بھی کوئی ڈائریکٹری......“

”مسٹر لودھی......“ سراج نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میں ہر کس و ناکس سے بے تکلفی پسند نہیں کرتا۔“ جملے کے اختتام کے ساتھ اس نے موبائل آف کردیا۔

”کس کی کال تھی؟“ آغا منظور نے سراج کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو بھانپ کر دبی زبان میں دریافت کیا۔

”ڈی ایس پی لودھی تھا۔“ سراج نے بدستور کشیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”شیخ حامد کی وجہ سے اب یہ اپنی اوقات سے بڑھنے لگا ہے۔“

”مرحومہ کی آخری کال کے بارے میں کیا اسی کو ذمے داری سونپی گئی ہے؟“

”کچھ اسی قسم کی ڈینگ مار رہا تھا۔“

”مسٹر سراج......“ آغا منظور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”آپ جانتے ہیں کہ میڈم روبی میری کمزوری ہے۔ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ مگر مچھ بھی ایسے ہی شکار کی تلاش میں رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ہم دونوں کا......“

”میں سمجھ رہا ہوں سر لیکن...... میں لودھی جیسے آدمیوں کو اپنے اوپر مسلط بھی نہیں ہونے دوں گا۔“

”خود میں بھی اسے پسند نہیں کروں گا مگر...... مجھے یقین ہے کہ وہ شیخ حامد سے اور زیادہ قریب ہونے کی خاطر بات کو غلط انداز میں بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا موقع بھی ضائع نہیں کرے گا۔“

”آئی ڈونٹ کیئر فار دیٹ۔“ سراج نے تند لہجے میں جواب دیا پھر گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ”شہر میں جونئی وارداتوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”وثوق سے فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن...... میرا ذاتی خیال ہے اس میں حامد گروپ کے حریف گروپس میں سے کسی ایک کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔“

سراج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈی آئی جی کرائمز کا جواب سن کر اس بات کا اطمینان ضرور ہوگیا کہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں کم از کم میڈم روبی کا خیال نہیں ابھرا تھا۔

☆☆☆

اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے بارہ کا عمل تھا جب الماس ایک رفاہی ادارے کی میٹنگ میں شرکت کرنے کے بعد گھر واپس لوٹ رہی تھی، حسب معمول اس کی گاڑی کے اسپیڈومیٹر کی سوئی ستّر اور اسّی کلومیٹر کے درمیان متحرک تھی جب ایک موڑ کاٹتے ہوئے اچانک ایک کھٹارا قسم کی پرانے ماڈل کی اسٹیشن ویگن اس کے راستے میں حائل ہوگئی۔ الماس نے فل بریک لگا کر حادثے سے بچنے کی کوشش کی تو پہیوں کی چرچراہٹ کی تیز آواز بلند ہوکر دور تک پھیلتی چلی گئی۔ اس کی گاڑی کا رخ بھی تبدیل ہوگیا۔ جس روڈ سے اس نے واپسی کا راستہ اختیار کیا تھا اس پر اس وقت زیادہ ٹریفک نہیں ہوتا تھا۔ اب بھی کوئی اور گاڑی موجود ہوتی تو ایکسیڈنٹ بھی ضرور ہوتا...... گاڑی کے رکنے اور گھومنے کے ساتھ ساتھ الماس کی کھوپڑی بھی گھوم گئی۔ وہ جھلا کر نیچے اتری، اس نے طے کرلیا تھا کہ اسٹیشن ویگن میں اگر کوئی نارزن کا پردادا بھی ہوا تو وہ اسے بھی معاف نہیں کرے گی۔ بڑے غصے میں پھنکتی ہوئی وہ اسٹیشن ویگن کے قریب گئی۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ الماس کے ذہن میں کسی خطرے کا خیال تیزی سے ابھرا۔ گاڑی خالی دیکھ کر فوری طور پر اسے احساس ہوگیا تھا کہ یا تو وہ خراب ہوگئی تھی جس کی وجہ سے اسے لاوارث چھوڑ دیا گیا...... یا پھر کسی نے اس کا راستہ بلاک کرنے کی خاطر دیدہ ودانستہ اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی ہوگی۔ اس خیال کے ساتھ اس کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا۔ گاڑی سے باہر آتے وقت وہ اپنا لیڈیز اعشاریہ دو پانچ کا آٹومیٹک پستول بھی اٹھانا بھول گئی تھی جو رات میں سفر کرتے وقت ہمیشہ برابر کی سیٹ پر ہی اس کی دسترس میں ہوتا تھا۔ اس نے جھلا کر واپسی کے لیے قدم اٹھائے لیکن ان تین نقاب پوشوں کو دیکھ کر رک گئی جو اس کو پوری طرح گھیر چکے تھے۔ قریب ہی فٹ پاتھ کے ساتھ ایک سیاہ رنگ کی وین بھی پارک نظر آرہی تھی۔ ان کا چوتھا ساتھی یقیناً وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ہوگا۔

”کون ہو تم لوگ؟“ الماس نے اپنے اوسان خطا نہیں ہونے دیے۔ اس وقت بھی اسے یہ خیال تھا کہ وہ ایک دبنگ پولیس آفیسر کی بیوی ہے۔

”اپنا خادم ہی سمجھیے۔“ ایک درمیانہ قد نقاب پوش نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ انکار کی صورت میں ہمیں مجبوراً آپ کے جسم کو ہاتھ بھی لگانا پڑے گا۔“

”اوہ......“ الماس نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ ”یقیناً کسی نے تمہاری خدمات بڑے بڑے نوٹوں سے خریدی ہوں گی۔ میں تمہیں اس سے زیادہ بھی دے سکتی ہوں۔ یہ بھی بتا دوں کہ میں ایک سینئر ڈی ایس پی کی بیوی ہوں جو بہرحال تمہیں تلاش کرلے گا، اس کے بعد اپنا انجام بھی سوچ لو۔“

”ہمیں ساری تفصیل معلوم ہے لیکن آپ کو ہر صورت میں ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہوگا...... ہمیں آپ کو پورے احترام سے اٹھانے کی ہدایت ملی ہے۔ آپ نے انکار کیا تو ہمیں طاقت استعمال کرنے کا حق بھی دیا گیا ہے۔“

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے......؟“ الماس نے جھلا کر پوچھا۔ وہ اب بھی ان تینوں سے مرعوب نظر نہیں آرہی تھی۔

”جی ہاں...... کسی ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ فیصلہ کن لہجے میں جواب ملا تو الماس نے ایک لمحے کو کچھ سوچا۔ وہ گندے ہاتھوں کو اپنے جسم کے ساتھ دھینگا مشتی کی اجازت نہیں دے سکتی تھی اس لیے خاموشی سے قدم اٹھاتی وین میں جاکر پچھلی نشستوں پر بیٹھ گئی...... دو مسلح نقاب پوش اس کی سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ایک آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر سیاہ وین سنسان سڑک پر دوڑنے لگی۔ ڈرائیور خاصی برق رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ الماس صرف گزرتے وقت کا اندازہ لگاتی رہی۔ سیاہ وین کے سیاہ شیشوں کے سبب وہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ راستوں کا تعین کرسکتی۔

بیس منٹ تک خاموشی رہی پھر الماس نے کچھ سوچ کر سامنے بیٹھے آدمیوں کو مخاطب کیا۔

”کیا تم کو علم ہے کہ تمہیں میرے اغوا کا حکم کن لوگوں نے دیا ہے؟“

”ہم صرف آم کھانے سے مطلب رکھتے ہیں...... پیڑ گننا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔“

”اور اگر آم بعد میں ترش ثابت ہوا تو؟“ الماس نے انہیں اپنی حیثیت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

”ہم جس راستے کے مسافر ہیں اس پر پیچھے مڑ کر دیکھنا بیکار ہے۔“ دوسرے نے پہلو بدل کر بے پروائی سے جواب دیا۔ ”ہمیں اپنا آخری انجام بھی معلوم ہے اس لیے موت سے بھی ڈرنا حماقت ہی سمجھتے ہیں۔“

”عادی جرائم پیشہ معلوم ہوتے ہو؟“ اس نے نفرت کا اظہار کیا۔

”ہم آپ کے اندازے کی تردید نہیں کریں گے۔“ جواب شانے اچکا کر انتہائی بے پروائی سے دیا گیا۔

الماس نے اس سے مزید بات کرنی مناسب نہیں سمجھی، دس منٹ مزید گزر گئے تو وین کے ڈرائیور نے ایک مخصوص انداز میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہارن بجانا شروع کردیا۔ یقیناً وہ اس بات کی سگنل ہوگا کہ وہ کامیاب واپس لوٹے ہیں۔ تین چار منٹ بعد وین بتدریج رفتار کم کرتے ہوئے رک گئی۔ پہلے دونوں نقاب پوش نیچے اترے پھر ان کے اشارے پر الماس بھی باہر نکلی، اس نے نظر گھما کر اطراف کا جائزہ لیا۔ اس وقت وہ کسی چھوٹے مکان کے باہر ایسے احاطے میں کھڑی تھی جس کی چہار دیواری کی اونچی دیواروں کے سبب باہر کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے مکان کی سمت غور کیا جو درمیانہ درجے کا کوارٹر لگ رہا تھا۔

دونوں نقاب پوش اسے چند قدموں کے فاصلے پر کور کیے موجود تھے جب ان کا تیسرا ساتھی بھی اگلی نشست سے اتر کر سامنے آ گیا شاید اس مشن کا سربراہ وہی تھا۔

''میں شکر گزار ہوں میڈم کہ آپ نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔'' اس نے سامنے آ کر الماس کو مخاطب کیا۔ ''اب آپ اندر چل کر ایک کمرے میں آرام کریں جہاں آپ کی چوکیداری کے لیے خاص لوگ موجود ہوں گے۔ ہمارے ذمے آپ کو بخیر و عافیت اس کمرے تک پہنچانے کا حکم ملا تھا۔''

''پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو؟'' الماس نے مسکرا کر اس بات کا اظہار کرنے کی کوشش کی کہ وہ اب بھی خوف زدہ نہیں ہے۔

''میں نے آپ سے اندر چلنے کی درخواست کی تھی۔'' جواب میں اس کو اس ہاتھ سے مکان کی سمت اشارہ کیا گیا جس میں اعشاریہ تین آٹھ کا پستول بھی موجود تھا، اس پر سائلنسر بھی فٹ تھا۔

الماس نے خاموشی سے قدم کوارٹر نما مکان کی طرف اٹھائے۔ اندر چار دوسرے نقاب پوش بھی موجود تھے جنہوں نے اسے ایک ایسے دس بائی دس کے کمرے میں پہنچا دیا جہاں ایک پلنگ کے علاوہ ایک میز اور دو کرسیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ اٹیچ باتھ روم بھی تھا۔ وہ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک نقاب پوش اندر رہا، باقی نے باہر جا کر دروازہ بند کر دیا تو الماس کو پہلی بار خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے قدرے ہچکچا کر نقاب پوش سے سوال کیا۔

''تم کب تک میرے سر پر مسلط رہو گے؟''

''پریشان مت ہوں۔'' نقاب پوش نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہاں تک لانے والوں نے آپ کی تلاشی نہیں لی اس لیے میں اس وقت تک آپ کے ساتھ رہوں گا جب تک اصل آدمی نہیں آ جاتے......وہ......وہ نہایت تفصیل سے آپ کی جامہ تلاشی لیں گے۔ اس کے بعد......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو کر مسکرانے لگا۔ اس کے زردی مائل دانت نمایاں ہو گئے۔

''اس کے بعد کیا ہوگا......؟'' الماس نے اس کی مسکراہٹ پر تلملا کر سوال کیا۔

''ناگن اس وقت تک خطرناک ہوتی ہے جب تک اس میں زہر موجود ہو......زہر نکل جانے کے بعد وہ بے ضرر ہو جاتی ہے۔''

''تم......تم کیا بکواس کرنا چاہ رہے ہو......؟'' الماس غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مم......میں نیچرل تصویروں کی بات کر رہا ہوں۔'' نقاب پوش کا لہجہ معنی خیز ہو گیا، اس نے للچائی ہوئی نظروں سے الماس کے جسمانی نشیب و فراز پر نظر دوڑاتے ہوئے مستی بھرے لہجے میں کہا۔ ''خوبصورت عورتوں کا زہر بھی ان کے لباس میں ہوتا ہے.....لباس اتر جائے تو پھر زہر بھی تصویروں کی شکل میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ناگن کسی کو ڈسنے کی غلطی بھی نہیں کرتی۔ اشاروں پر پھن ہلاتی رہتی ہے۔''

الماس اس کا جواب سن کر کانپ اٹھی۔ اس کا مقصد بہت واضح تھا۔ اگر اغوا کرنے والے اس کی برہنہ تصاویر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر وہ زبان کھولنے کی پوزیشن میں نہ رہتی۔ سراج بھی بے بس ہو جاتا۔ الماس کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ کوئی ایسی صورت کہ وہ اغوا کرنے والوں کو ''بلیک میلنگ اسٹف'' حاصل کرنے سے روک سکے، نقاب پوش کا آخری جملہ سن کر اس کا سارا طنطنہ جھاگ کے مانند بیٹھنے لگا تھا۔

اسی لمحے کسی نے مخصوص انداز میں بند دروازے پر تین چار بار دستک دی تو نقاب پوش بھی الرٹ ہو کر دروازے کی طرف لپکا۔ اس کے ساتھ ہی الماس کے دل کی دھڑکنیں بھی ڈانواڈول ہونے لگیں۔

☆☆☆

سوئم کی رسمی کارروائی بھی ادا ہو گئی تو شیخ حامد نے سکون کا سانس لیا۔ اسے اپنی اہمیت اور وسیع تعلقات کے علاوہ اس بات کا بھی بخوبی اندازہ تھا کہ صبا بیگم نے خودکشی جیسا اقدام اٹھا کر اس کی قوت کو اندر سے کس قدر کمزور کر دیا تھا۔ اگر لاش کا پوسٹ مارٹم ہو جاتا اور زہر خورانی کی میڈیکل رپورٹ اخبارات کے ذریعے طشت ازبام ہو جاتی تو پھر وہ فائل سرد خانے تک پہنچانے کے سلسلے میں دانتوں پسینا آ جاتا، جو پولیس کے اعلیٰ افسران اس سے ڈرتے تھے وہ بھی شیر ہو جاتے۔ اس کی بنی بنائی ساکھ بھی خراب ہو جاتی۔

وہ فاتحہ خوانی کے بعد کچھ دیر آرام کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں گیا تو وہاں بھی فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ اس موقع پر وہ کسی کال کی جانب سے منہ بھی نہیں پھیر سکتا تھا، اس کے خاص کارندے ان افراد کی فہرست تیار کر رہے تھے جو اس کے غم میں کسی زاویے سے بھی شریک ہوئے تھے۔ بذات خود بھی وہ آنے جانے والوں کے چہرے اپنے ذہن میں محفوظ کر رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کے ذہن میں کچھ لوگوں کے چہرے رہ رہ کر ابھر رہے تھے۔ سیٹھ عثمان کے ساتھ اس نے دوبار کھیل ختم پیسا ہضم کرنے والی چال چلی تھی لیکن وہ اور

راحیلہ بیگم بھی اس کے غم میں ہاتھ بٹانے کے لیے پیش پیش رہے تھے اور بھی کچھ حریف کاروباری افراد نے رسم دنیا نبھانے کی خاطر شرکت کی تھی لیکن دو جانے پہچانے چہرے ایسے تھے جو ابھی تک سامنے نہیں آئے تھے...... ایک ایس پی اورنگ زیب جس نے پوسٹ مارٹم کرانے کے سلسلے میں اس سے قانونی انداز میں کھل کر گفتگو کی تھی پھر اپنی ناراضی کا اظہار کرکے اسے سلام کیے بغیر چلا گیا تھا۔ شیخ حامد بھی اس کے اونچے تعلقات سے بخوبی واقف تھا اس لیے اس نے بھی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ دوسرا اہم نام میڈم روبی کا تھا۔

اس وقت وہ ان دونوں ناموں پر غور کررہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ شیخ حامد نے برا سامنہ بنا کر ریسیور اٹھایا لیکن دوسری جانب سے میڈم روبی کی آواز سن کر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بڑے سوگوار لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"شیخ حامد مجھے صبا بیگم کی موت پر دکھ کا صرف اظہار کرنا بڑی رسمی بات لگتی ہے۔ آپ پر کیا گزری ہوگی، میں اس کا اندازہ بھی لگا سکتی ہوں، برسوں کا ساتھ ایک نازک رشتے کے ٹوٹ جانے سے بڑا جاں گسل ہوتا ہے۔ انسان کی نظریں برسوں اسے قرب وجوار میں تلاش کرتی رہتی ہیں۔ میں اس حادثے سے دوچار ہوچکی ہوں اس لیے آپ کے دل کی کیفیت کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکتی ہوں۔ اس موقعے پر میں آپ کے غم میں برابر کی شریک ہوں اور اس بات کے لیے معذرت خواہ ہوں کہ ذاتی طور پر شریک نہیں ہوسکی...... حوصلے سے کام لیجیے گا، وقت ہر زخم کے لیے تریاق بن جاتا ہے، زندگی کے کاروبار چلتے رہتے ہیں۔ کوئی کسی کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر اس کے غم کی پیمائش نہیں کرسکتا۔ جس پر گزر جاتی ہے وہی جانتا ہے۔"

"مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے اس موقعے پر مجھے فون کیا۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یہ میرا فرض تھا......" دوسری جانب سے مرنے والی کی بخشش کے لیے دعا کی گئی۔

"کبھی تشریف لائیں، مجھے خوشی ہوگی۔" شیخ حامد نے دبی زبان میں کہا۔ "آپ کے شوہر، خدا ان کی مغفرت کرے، میرے واقف کاروں میں سے تھے، ہمارے درمیان کبھی کاروباری تعلق نہیں رہا لیکن جب بھی ملے کھلے دل سے ملے۔"

"ہاں......" میڈم نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "وہ اکثر آپ کا ذکر کرتے تھے۔"

"کچھ وقت گزر جائے تو میں آپ کو باقاعدہ انوائٹ کروں گا۔"

"اس تکلف کی ضرورت نہیں...... چالیسواں گزر جائے تو میں خود حاضری دوں گی۔"

کچھ دیر بعد گفتگو کا سلسلہ ختم ہوگیا تو شیخ حامد بڑی سنجیدگی سے میڈم روبی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے ذہن میں فون پر اس کی سوگوار باتوں کا ایک ایک جملہ بار بار گونج رہا تھا۔ اس میں کوئی بناوٹ، کوئی دکھاوا نہیں تھا جس کا مطلب یہی لیا جاسکتا تھا کہ شاید وہ اپنے شوہر کی اندوہناک موت کی اصلیت سے ابھی تک واقف نہیں تھی۔

شیخ حامد خاصی دیر تک میڈم روبی کی باتوں کو مختلف زاویے سے اپنے اندازوں کی کسوٹی پر پرکھتا رہا پھر آنے والی کالوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

☆☆☆

لیاقت حسین سوتے سوتے اچانک اس طرح ہڑبڑا کر اٹھا جیسے اس کا جسم بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گیا ہو۔ کچھ دیر تک وہ نئے ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ ایجنسی کے خوابناک ماحول میں فرحین اس کے برابر آرام دہ بستر پر بکھری پڑی تھی۔ شاید نئے ماحول، نئی جگہ کی وجہ سے کسی انجانے احساس کے تحت اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے ذہن کو جھٹک کر طویل انگڑائی لی پھر سونے کے ارادے سے دوبارہ لیٹا تو ایک مانوس آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

"یہ وقت سونے کا نہیں ہے...... تمہیں شاید اب رات بھر جاگنا پڑے۔"

"ہم زاد......" لیاقت حسین کی زبان سے بے ساختہ یہی لفظ ادا ہوا۔ شاید اس لیے کہ جو آواز اس کے کانوں میں ابھری تھی وہ سو فیصدی اس کی اپنی آواز تھی جسے وہ دو موقعوں پر پہلے بھی سن چکا تھا۔

"میری بات غور سے سنو......" وہی آواز پھر اس کی قوت سماعت میں ابھری۔ "فوری طور پر تیار ہوکر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کو فون کرکے بلا لو۔"

"اس وقت؟" لیاقت حسین نے دل ہی دل میں سوچا پھر اس خوبصورت دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی جس میں رات کے بارہ بج کر چالیس منٹ ہورہے تھے۔

"سراج صاحب کو کوئی وجہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ تم کو کسی وجہ سے ان کی فوری مدد درکار ہے۔"

"لیکن......"

"وقت کم ہے......" اس کا جملہ رد کرکے کہا گیا۔

"سراج صاحب کی گاڑی تم ڈرائیو کرنا...... میں تمہاری رہنمائی کرتا رہوں گا۔"

"مگر صاحب اس وقت آنے کی وجہ ضرور دریافت کریں گے؟" لیاقت حسین کے ذہن میں تجسس سا بیدار ہوا۔

"تم وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں...... باقی باتیں میں سنبھال لوں گا۔ صرف ایک بات کا خیال رکھنا کہ اگر تم ایک ہی وقت میں دو جگہ دیکھے جاؤ تو اس کے بارے میں صرف حیرت اور لاعلمی کا اظہار کرنا۔ کوئی الٹی سیدھی توجیہہ پیش کرنے کی حماقت نہ کرنا۔"

"دو جگہ دیکھا جاؤں......" لیاقت حسین نے بوکھلا کر کہا۔ "میں تمہاری بات کا مقصد نہیں سمجھا؟"

"میں تمہارا ہم زاد ہوں...... ہم زاد جسے تم شیطان یا جن...... جو چاہے سمجھ لو...... کہیں کتابوں میں یہ بھی لکھا ملے گا کہ وہ ہم شکل جو ہر انسان کے ساتھ ہی دنیا میں جنم لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی رہتا ہے اور ساتھ ہی مر جاتا ہے۔ کچھ حریص لوگ اسے قابو کرنے کی خاطر ہزاروں جتن بھی کرتے ہیں۔"

"تم کفر کی باتیں کررہے ہو......" لیاقت حسین کے وجود میں ایمان کی روشنی جگمگانے لگی۔

"کفر اور ایمان کے راستے بھی خدائے بزرگ و برتر نے وضع کیے ہیں۔ اسی لیے خاکی انسان کو ہمارے سرکار ﷺ نے یہی نصیحت فرمائی ہے کہ دنیا میں یوں رہو جیسے کہ اجنبی راہ چلتا مسافر...... اور یہ بھی فرمایا کہ "تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے وہ اپنے ہاتھ (طاقت) سے بدلے۔ اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے منع کرے...... اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو دل سے برا جانے جو ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے......" یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ ایک طلسم کدہ ہے، اس کے بارے میں مت الجھو...... جیسا کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو۔ وقت گزر گیا تو ایمان پر حرف آجائے گا۔ کفر ہی کفر باقی رہ جائے گا۔"

لیاقت حسین کا ذہن الجھنے لگا۔ وہ کسی ہم زاد کے تصور پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن کسی بزرگ کی ایک ملاقات کے بعد اس کے ساتھ جو بھی ہوا۔ ہوتا رہا اسے وہ فراموش بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ہر موقعے پر اسے نیکیاں، نیکیاں ہی نظر آتی تھیں، جو کچھ بھی اسے یاد تھا ہر بار اسے حیرت میں مبتلا کردیا کرتا تھا...... وہ دونوں صورتوں میں مجبور تھا۔ اسے زبان کھولنے سے روک دیا گیا تھا۔ اگر وہ حکم عدولی کرتا تو شاید ان نعمتوں سے محروم کردیا جاتا جو منجانب اللہ ہی اسے حاصل ہوئی تھیں..... جو ذریعہ بنا تھا اس میں بھی مشیت ایزدی کو دخل تھا...... گزری باتیں یاد آئیں تو وہ تیزی سے اٹھا...... سیٹھ عثمان اور راحیلہ بیگم کی مہربانی تھی جو اسے فون کی سہولت بھی فراہم کردی گئی تھی۔ اس نے نائٹ بلب کی روشنی میں جلدی جلدی سراج کے گھر کے نمبر گھمانے شروع کردیے۔ جلدی کس بات کی تھی؟ اسے خود بھی اس کا کچھ علم، کوئی اندازہ نہیں تھا۔ کوئی نادیدہ قوت تھی، کوئی روحانی طاقت جو اسے عمل کرنے پر اکسا رہی تھی، ذہن عجیب کشمکش سے دوچار تھا۔

"ہیلو...... سراج!" دوسری جانب سے سراج کی آواز ابھری۔ وہ کسی وجہ سے ابھی تک جاگ رہا تھا۔

"سر...... م...... میں لیاقت حسین بول رہا ہوں۔" اس نے قدرتی طور پر بوکھلائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"سب خیریت تو ہے......؟" سراج نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ "تم کچھ بوکھلائے ہوئے لگ رہے ہو؟"

"جتنی جلدی ممکن ہو میری ایجنسی پر آجائیں...... میں ریسیور رکھ کر باہر دروازے کی طرف جارہا ہوں۔"

"بات کیا ہے......؟" سراج نے بے چینی سے معلوم کیا لیکن سلسلہ منقطع ہوچکا تھا۔

سراج اس وقت سونے کی تیاری کررہا تھا لیکن لیاقت حسین کے فون نے کسی خطرے کا احساس دلایا۔ اگر بات اہم نہ ہوتی تو رابطہ اس قدر عجلت میں نہ ختم کیا جاتا۔ سراج کے ذہن میں ہزاروں وسوسے جاگ اٹھے۔ اس نے دیر نہیں لگائی۔ اپنا سروس ریوالور تکیے کے نیچے سے نکال کر جیب میں ڈالتے ہوئے برق رفتاری سے باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ کر تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بنگلے سے باہر نکلا پھر اس نے حالات کے پیش نظر نہایت برق رفتاری کا مظاہرہ کیا۔ لیاقت حسین نے اسے فوری پہنچنے کی تاکید کی تھی، صرف اپنی ایجنسی کا حوالہ دیا تھا۔ کوئی تفصیل بتائے بغیر لائن کاٹ دی تھی۔ ان باتوں کی روشنی میں سراج کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ بات اہم نہ ہوتی تو لیاقت حسین بھی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ نہ کرتا۔

بیس منٹ بعد وہ سیٹھ عثمان کے برابر والے بنگلے پر پہنچا تو لیاقت حسین اسے باہر ہی کھڑا نظر آ گیا۔ اس کا چہرہ ستا ستا نظر آرہا تھا۔

"کیا بات ہے لیاقت حسین؟" سراج انجن بند کیے بغیر تیزی سے اتر آیا۔ "فرحین تو خیریت سے ہے؟"

"م...... مجھے کچھ نہیں معلوم صاحب......" لیاقت حسین نے معصومیت سے اپنی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیا پھر لپک

کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سراج کو مجبوراً دوسری نشست پر بیٹھنا پڑا۔ اس کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ لیاقت حسین نے پہلے کبھی اتنی بے چینی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

"کہاں چل رہے ہو......؟" اس نے لیاقت حسین کو جھلا کر مخاطب کیا۔ "اصل بات کیا ہے؟ کچھ بتانے سے کیوں گھبرا رہے ہو؟"

"میں...... سچ کہہ رہا ہوں صاحب۔" لیاقت حسین نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کہیں پہنچنے کا حکم ملا ہے...... کہاں؟ مجھے خود بھی نہیں معلوم۔"

سراج نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ اگر اس نے خود اپنی نظروں سے دو تین موقعوں پر لیاقت حسین کو ایسی ہی کیفیت سے دوچار نہ دیکھا ہوتا تو شاید وہ اس کے ساتھ اس وقت کوئی نرم سلوک نہ کرتا۔ کچھ سوچ کر سراج نے خاموشی اختیار کرلی۔ اسے حیرت تھی کہ لیاقت حسین بار بار یہی جملہ دہرا رہا تھا کہ اسے کچھ نہیں معلوم پھر...... وہ گاڑی کو مختلف راستوں سے کس طرف لے جا رہا تھا؟

دس بارہ منٹ بعد لیاقت حسین نے بالکل مشینی انداز میں گاڑی...... خلافِ معمول خاصی اونچی چہار دیواری والے مکان کے پھاٹک کے قریب روکی اور برق رفتاری سے دروازہ کھول کر اتر گیا۔ سراج نے احتیاط سے کام لیا، وہ گاڑی سے اتر کر اس کی آڑ میں کھڑا رہا۔ حالات کو پوری طرح سمجھے بغیر وہ عجلت میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا پھر...... اس نے دیکھا کہ لیاقت حسین مکان کے پھاٹک کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے سراج بھی لپکا۔ اس کی نظریں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا، وہ بھی پھاٹک کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو ایک لمحے کو ٹھٹک کر رک گیا، دو مسلح نقاب پوش صحن میں بے ہوش پڑے دیکھ کر اسے خطرے کا اندازہ بھی ہوگیا۔ وہ سنبھل کر سامنے کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو اس کو اپنی نظروں پر بھی یقین نہیں آیا۔ الماس اس کی نظروں کے سامنے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی، کمرے میں اس کے علاوہ ایک اور مسلح نقاب پوش بھی موجود تھا۔ دو سادہ لباس والے اور ان کے قریب ہی فوٹو گرافری کا کچھ سامان بھی بکھرا پڑا تھا۔ وہ تینوں بھی بے سدھ نظر آرہے تھے۔ الماس کی نظریں لیاقت حسین پر جمی ہوئی تھیں۔ سراج کو اندر آتا دیکھ کر وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ لیاقت حسین کی طرف اشارہ کرکے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے...... اٹک اٹک کر بولی۔

"اگر...... یہ وقت پر نہ آجاتا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہتے۔ خدا نے اسے فرشتہ بنا کر میری مدد کو بھیج دیا۔"

سراج کو موقعے کی نزاکت سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ لیاقت حسین خاموشی سے مشینی انداز میں باہر نکل گیا۔ اس نے الماس کی بات سن کر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"یہ...... یہ...... بدمعاش مجھے اغوا کرکے لائے تھے۔" الماس نے بیہوش افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ان کے ارادے نیک نہیں تھے، اگر لیاقت حسین وقت پر نہ آجاتا تو......" الماس کچھ کہتے کہتے رک گئی پھر اس نے بڑی حیرت سے کہا۔ "مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ تنہا لیاقت حسین نے ان تین مسلح نقاب پوشوں اور ان کے دو ساتھیوں کو کس طرح قابو کیا۔ دو تین فائر بھی کیے گئے تھے لیکن لیاقت حسین حیرت انگیز طور پر ان کے نشانے کی زد میں نہیں آسکا پھر...... سب کو ٹھکانے لگانے کے بعد شاید وہ آپ کو فون کرنے چلا گیا تھا۔"

الماس کی بات سن کر خود سراج بھی چکرا گیا۔ لیاقت حسین اس کے ساتھ اپنے گھر سے اسی کی کار میں بیٹھ کر آیا تھا۔ پھر، دوسرا لیاقت حسین کون تھا......؟ اسے میڈم روبی کے اغوا کیے جانے کا واقعہ یاد آگیا۔ اس وقت بھی اس نے یہ بات ماننے سے انکار کردیا تھا کہ گاڑی سے نیچے اترا تھا لیکن اس وقت کا معاملہ زیادہ پیچیدہ تھا۔ سراج نے اس پر غور کرنے کے بجائے الماس کو ہاتھ تھام کر باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ لیاقت اس کی کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں خوابیدہ خوابیدہ سی نظر آرہی تھیں، چہرہ بھی جذبات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا۔

"لیاقت حسین......" سراج نے الماس کو پچھلی نشست پر بٹھانے کے بعد...... اس کے قریب جا کر کہا۔ "تم بیگم صاحبہ کو میرے گھر چھوڑ دو اور میرے آنے تک تم بھی وہیں ٹھہرنا۔"

لیاقت حسین نے صرف اثبات میں سر کو خفیف سی جنبش دی پھر گاڑی اسٹارٹ کرکے دوبارہ کھلی سڑک پر آگیا۔ راستے میں اس کے اور الماس کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔

سراج نے الماس کو روانہ کرنے کے بعد متعلقہ حلقے کے تھانے کو فون کرکے جائے وقوعہ پر پہنچنے کی ہدایت کی پھر وہ الماس کے اغوا کے بارے میں سوچنے لگا کہ یہ ذلیل حرکت کون کرسکتا ہے؟ اس کے ذہن میں صرف شیخ حامد کا نام

بار بار ابھر رہا تھا، اس وقت وہ جس مکان میں کھڑا تھا وہ بھی ڈی ایس پی لودھی کے حلقے میں آتا تھا۔ وہ چاہتا تو ملحقہ تھانے کے عملے کو گھر جا کر بھی کسی اور کے ذریعے ان مسلح نقاب پوشوں کی اطلاع دے سکتا تھا لیکن اس وقت اس پر ایک جنون سوار تھا۔ الماس اس کی بیوی تھی، وہ اس کے اغوا کے معاملے میں مصلحتوں کو نظر انداز کرنے پر پوری طرح آمادہ تھا۔ دشمن نے چھپ کر کمینگی سے اس پر وار کیا تھا۔ وہ انہیں للکار کر جواب دینے کا مصمم ارادہ کرچکا تھا۔

پندرہ منٹ کے اندر تھانہ انچارج انسپکٹر دانش چار مسلح سپاہیوں کے ساتھ آگیا۔ کسی زمانے میں وہ سراج کا سب سے پسندیدہ اور قابلِ اعتماد ماتحت بھی رہ چکا تھا۔

"سر...... آپ؟" اس نے سراج کے قریب جا کر سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کی گاڑی نظر نہیں آرہی۔"

"اطمینان سے سب سمجھا دوں گا...... پہلے اپنے لودھی صاحب کو خبر ہونے سے پہلے ان مجرموں کی باقاعدہ پرچی تیار کرلو۔"

انسپکٹر نے سب کے نقاب اتار کر دیکھے۔ تینوں نقاب پوش پولیس کو مطلوب مجرموں کی فہرست میں درج تھے، ان کے بعد انسپکٹر دانش ایک سادہ لباس والے کو دیکھ کر چونکا۔

"یہ فرنانڈس اس وقت یہاں کیسے آگیا؟"

"کون ہے یہ......؟" سراج نے تیزی سے سوال کیا۔

"یہ ایک بدنام فوٹو گرافر ہے سر۔ شرفا کو بلیک میل کرنے کے لیے خاصا مشہور بھی ہے، ہم ایک عرصے سے اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے جال بچھا رہے تھے، پھر ہماری ہی ایک لیڈی کانسٹیبل نے بھیس بدل کر اسے رنگے ہاتھوں پکڑوا دیا۔ ہم نے اس کا دس روز کا ریمانڈ لے رکھا ہے۔ اس کا یہاں ہونا حیرت انگیز ہی ہے۔ یہ جیل کی سلاخوں سے باہر کیسے آیا......؟"

"تم ضابطے کی کارروائی کرو......" سراج نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "کاغذات میں میرا نام بھی خاص طور سے لکھ دو۔ کہانی میں بتاتا ہوں، میں ادھر کسی سے ملنے آیا تھا، کسی لڑکی کے زور زور سے شور مچانے کی آواز سن کر ادھر آیا تو کوئی نظر نہیں آئی۔ شاید بچانے والوں کو بروقت صورتِ حال کی اطلاع مل گئی تھی جو خاموشی سے لڑکی کو لے گئے۔ اغوا کرنے والوں کا حال دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ لڑکی کو بچانے والے نہ صرف مسلح تھے بلکہ تعداد میں بھی زیادہ تھے۔ انہوں نے قتل و غارت سے بچنے کی خاطر اغوا کرنے والوں کو

جس حال میں پہنچایا وہ تمہارے سامنے ہے۔" سراج نے انسپکٹر دانش کو ایک فرضی کہانی سناتے ہوئے کہا۔ "کاغذات میں اس بات کا ذکر ضرور کرنا کہ فرنانڈس ریمانڈ پر تھا لیکن موقعۂ واردات پر بھی وہ کیمرے سمیت موجود پایا گیا۔"

"سر......" دانش نے کچھ کہنا چاہا لیکن سراج نے افسرانہ انداز میں اس کو بولنے کا موقع نہیں دیا۔

"میں کاغذات پر بطور گواہ دستخط کرنے کو بھی تیار ہوں...... اس واردات کی پشت پر مجھے کچھ اپنوں کے چہرے بھی نظر آرہے ہیں۔"

"شاید ڈی ایس پی صاحب اسے پسند نہ کریں۔" دانش ہچکچا کر بولا۔ "ویسے بھی وہ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ آپ کا نام آجانے کے بعد......"

"او کے......" سراج نے دوسرا حربہ اختیار کیا۔ "اگر تم کو کسی بات کا اندیشہ لاحق ہے تو میں براہِ راست ڈی آئی جی کرائمز کو فون کرکے یہاں آنے کی درخواست کروں گا...... پھر وہی سب درج کیا جائے گا جو اس وقت ہم دیکھ رہے ہیں۔"

ڈی آئی جی کرائمز کا حوالہ سننے کے بعد انسپکٹر نے ویسے ہی کاغذات تیار کیے جو سراج چاہتا تھا، حقیقت بھی وہی تھی، تفصیل میں بدنام فوٹو گرافر فرنانڈس کا نام بھی تحریر میں لایا گیا جو دس روز کے لیے حوالات میں بند کیا گیا تھا۔ سراج نے بطور گواہ اس مشیر نامے پر دستخط کرنے کے بعد انسپکٹر سے کہا۔

"میں موقع کا عینی گواہ ہوں، کاغذات پر میرے دستخط بھی ہیں، اسے کسی صورت میں بدلنے کی حماقت نہ کرنا...... ہوسکے تو اس کی ایک نقل مجھے بھی فراہم کردینا...... میرا وعدہ ہے کہ تمہاری اجازت کے بغیر اسے کہیں استعمال نہیں کروں گا۔ یہ بات آف دی ریکارڈ ہے۔"

"ایک چھوٹی سی درخواست کروں گا سر......" مجرموں کی گرفتاری، ان کے پاس سے برآمد ہونے والے اسلحے کی تفصیل وغیرہ مکمل کرنے کے بعد اس نے سراج کو ایک طرف علیحدگی میں جا کر درخواست کی۔ "اگر ممکن ہو تو آپ مجھے اپنے حلقے کے کسی بھی تھانے میں پوسٹ کرادیں۔"

"کوشش کروں گا لیکن...... کاغذات کی ایک کاپی کا وعدہ یاد رکھنا۔"

"آپ کیسے جائیں گے...... آپ کی گاڑی......"

"قریب ہی اس جگہ موجود ہے جہاں میں کسی سے ملنے آیا تھا۔ لڑکی کی چیخوں کی آواز سن کر میں نے گاڑی پر آنا

مناسب نہیں سمجھا۔" سراج نے بڑی خوبصورت سی ایک فرضی کہانی گھڑتے ہوئے کہا۔ "لیکن افسوس...... دوسری پارٹی میرے آنے سے پہلے ہی لڑکی بچا کر لے گئی ورنہ کیس زیادہ مضبوط ہو جاتا......"

"میں کوشش کروں گا سر کہ فرنانڈس کی زبان کھلوا سکوں، وہ یقیناً پوری تفصیل سے واقف ہوگا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" اس بار سراج نے بے تکلفی سے انسپکٹر دانش کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مدھم آواز میں دریافت کیا۔ "کیا اس واردات میں تمہارے لودھی صاحب کی شرافت کا بھی کوئی دخل نہیں ہوگا؟"

"میں آپ سے متفق ہوں سر۔" انسپکٹر نے دبی زبان میں جواب دیا۔ "کئی موقعوں پر موصوف ہی کی وجہ سے فرنانڈس پر ہمارا ریڈ کامیاب نہیں ہو سکا۔ جب مجرموں اور ہمارے ڈانڈے ملے ہوں تو پھر ان کو گرفت میں لانا بھی آسان نہیں ہوتا۔"

انسپکٹر دانش دوبارہ سراج کو سیلوٹ کر کے اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ مجرموں کی گاڑی بھی اسی کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ سراج نے سڑک تک پیدل مارچ کیا پھر اتفاق سے ملنے والی ایک خالی ٹیکسی پکڑ کر گھر آگیا جہاں الماس بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔

لیاقت حسین کو دوسرے کمرے میں بٹھایا گیا تھا، سراج کے اصرار پر الماس نے بے کم و کاست پوری تفصیل بیان کر دی۔

"پریشان مت ہو لیکن آئندہ کسی پولیس گارڈ کو کچھ عرصے تک ساتھ رکھو تو زیادہ مناسب ہوگا۔" سراج نے کسی تھمے ہوئے طوفان کی طرح خود کو بکھرنے نہیں دیا۔

"یہ کن لوگوں کی حرکت ہو سکتی ہے؟"

"تم فکر مت کرو...... وہ جو بھی ہوئے میں انہیں سمندر کی تہ سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا......" سراج لیاقت حسین کی طرف جانے کے لیے گھوما تو الماس نے اسے روک کر سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہ لیاقت حسین کیا کسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہے؟"

"ہاں......" سراج نے فوری جواب دیا۔ "میں بھی کئی موقعوں پر ایسا ہی محسوس کر چکا ہوں لیکن...... آدمی ایماندار، نڈر اور بے خوف بھی ہے۔ عثمان کو بھی اسی کی ذہانت موت کے منہ سے بچانے میں کام آئی تھی لیکن کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کر جاتا ہے جو سمجھ میں نہیں آتیں...... تم سے کیا کہہ رہا تھا؟"

"پوچھ رہا تھا کہ اس وقت وہ ہمارے گھر کس طرح آگیا؟"

"کیا...... اسی نے تنہا سب پر قابو پا لیا تھا؟" سراج نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

"ہاں...... مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا۔" الماس نے بتایا۔ "نقاب پوش مسلح تھے اس لیے وہ ایک نہتے آدمی کو دیکھ کر اسے گھیرنا چاہتے تھے مگر...... جب دو زمیں بوس ہوئے تو تیسرے نے دو بار گولی بھی چلائی تھی لیکن تیسرا فائر کرنے کی حسرت پوری نہ کر سکا، لیاقت حسین کا الٹا ہاتھ حرکت میں آیا تو وہ بھی بے ہوش ہو گیا۔ سادہ لباس والوں کے ساتھ اس کا سلوک ناقابل یقین ہی تھا۔ اس نے ان دونوں کی گردنیں ہاتھ میں دبوچ کر پوری قوت سے ایک دوسرے سے ٹکرا دی تھیں۔ دونوں پلک جھپکتے میں ڈھیر ہو گئے، اس کے بعد وہ شاید آپ کو اطلاع کرنے چلا گیا تھا مگر آپ اتنی جلدی......"

"میں اسے گھر چھوڑ کر آتا ہوں پھر تفصیل سے بات کروں گا۔" سراج نے بات ٹالتے ہوئے جواب دیا پھر دوسرے کمرے میں آگیا جہاں لیاقت حسین کسی ذہنی الجھن میں مستغرق نظر آرہا تھا۔ سراج کے کہنے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ گھر جاتے ہوئے راستے میں بھی وہ کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔

سراج کو اس بات کا اندازہ تھا کہ کوئی روحانی قوت اس کی مدد کر رہی تھی اس لیے اس نے لیاقت حسین سے زیادہ سوال جواب بھی نہیں کیے۔ البتہ لیاقت حسین نے اس سے بھی یہی پوچھا تھا کہ وہ کچھ دیر پیشتر گھر پر سو رہا تھا پھر...... سراج کے گھر کس طرح پہنچ گیا؟ جواب میں سراج نے کہا تھا کہ وہ خود اسے کسی کام سے لایا تھا، لیاقت حسین کو شاید سراج کی بات پر یقین نہیں آیا۔ اس نے مزید کچھ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی لیکن سراج محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو......؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا صاحب۔" لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ "کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی کھائی درمیان میں آگئی ہو جسے میں عبور نہیں کر پاتا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" سراج نے مسکرا کر کہا۔ "جس وقت میں تم کو لے گیا تھا اس وقت تم شدید نیند کی کیفیت سے دوچار تھے۔ اسی لیے الجھ رہے ہو...... گھر جا کر آرام کرنا۔ صبح تک تم بالکل تازہ دم ہو جاؤ گے۔"

لیاقت حسین نے جواب میں مزید کچھ کہنا چاہا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر کے پیچھے بھاگتی ہوئی سڑک پر نظریں جما دیں۔

☆☆☆

شیخ حامد کی گاڑی حسب معمول پارکنگ لاٹ کے اس حصے میں رکی جو اس کے لیے مخصوص تھا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو مسلح گارڈز تیزی سے اتر کر نیچے آگئے۔ انہوں نے اطراف کا جائزہ لینے کے بعد ڈرائیور کو گرین سگنل دیا جس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ شیخ حامد بڑے طمطراق سے نیچے اتر کر ایک گارڈ کے ساتھ اس لفٹ میں سوار ہو گیا جو اس نے ذاتی خرچ سے صرف اپنے آفس تک جانے کے لیے لگوائی تھی۔ لفٹ سے ایک منٹ بعد باہر نکل کر سیدھا اپنے ذاتی آفس میں داخل ہوا۔ اس وقت وہ بے حد پرسکون نظر آرہا تھا۔ اپنی آرام دہ نشست پر بیٹھنے کے بعد اس نے حسب عادت نظر گھما کر وہاں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیا پھر سامنے رکھی ہوئی فائل کو کھولنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس کی خوبصورت پرسنل سیکریٹری اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی جو شیخ حامد کے لیے غیر متوقع تھی۔

"خیریت......" اس نے پرسنل سیکریٹری کو مخاطب کیا۔ "تم آج صبح ہی صبح بجھی بجھی سی کیوں نظر آرہی ہو؟"

"ڈی ایس پی لودھی کا فون دوبارہ آچکا ہے۔ وہ آپ سے فوری طور پر ملاقات کرنے کا خواہش مند ہے۔"

"تم نے وجہ نہیں دریافت کی؟"

"کی تھی لیکن...... وہ کوئی خاص اطلاع ہوگی جو وہ صرف آپ کو دینا چاہتا ہے۔"

"اس کے فون سے تمہاری سنجیدگی کا کیا تعلق ہے......؟" اس نے تیز نظروں سے پرسنل سیکریٹری کو کریدا۔

"مسٹر لودھی کے فون کے بعد انسپکٹر دانش نے بھی کال کی تھی وہ...... وہ کچھ بوکھلایا بوکھلایا محسوس ہو رہا تھا۔"

"بیٹھ جاؤ......" اس نے کچھ سوچ کر کہا پھر دراز سے اپنا خاص موبائل نکال کر کسی کے نمبر پنچ کرنے لگا، اس کی نظریں بدستور پرسنل سیکریٹری کے چہرے پر منڈلا رہی تھیں جو روزانہ صبح اسے مسکراتی نظروں سے خوش آمدید کہہ کر استقبال کرتی تھی۔ اس کا انتخاب خود شیخ حامد نے چند ماہ پیشتر کیا تھا۔ خوبصورت جسم کی مالک تھی، اگر ماڈلنگ کی فیلڈ اختیار کرتی تو تہلکہ مچا دیتی۔ اس کے جسمانی نشیب فراز میں جنس مخالف کے لیے کشش کوٹ کوٹ کر بھری تھی، شیخ حامد نے پہلی ہی نظر میں اس کا انتخاب کر لیا تھا، اس کی تنخواہ بھی خود مقرر کی تھی، اس کا نام کنول تھا، خود بھی وہ کنول کے پھول ہی کی طرح سرسبز و شاداب نظر آتی تھی۔ وہ کسی مصور کا خواب تھی۔ کسی ماہر سنگ تراش کا حسین شاہکار تھی۔ اس کے گال کا گداز دلوں پر بجلی گراتا تھا۔ کنول کا پھول گدلے تالاب میں کھلتا ہے۔ کنول نے بھی ایک غریب گھر میں جنم لیا تھا، اسے اپنی قیمت کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ نایاب ہیرا تھی، پکھراج تھی، صاف و شفاف اور خوشنما موتی تھی جسے شیخ حامد نے اپنے لیے وقف کر لیا تھا، اتنی تنخواہ مقرر کر دی تھی کہ کوئی دوسرا گاہک اس کی بولی نہ لگا سکے۔ بڑے بڑے سودے کرتے وقت جب سامنے والی پارٹی چپڑ چپڑ کرتی تو وہ اسے کام کے بہانے اپنے آفس میں طلب کرتا۔ سودا کرنے والا اپنا نفع نقصان بھول کر کنول کی ایک جھلک دیکھ کر موم ہو جاتا۔ معاہدے پر دستخط کرنے سے اس کی ساری حجت پل بھر میں دور ہو جاتی۔

کنول شیخ حامد کے لیے بیرر چیک تھی لیکن ابھی تک اس نے اسے کیش نہیں کیا تھا، وہ چاہتا تو تورو پیار یز گاری بھی بن سکتا تھا لیکن اس نے سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح نہیں کیا...... اس پارس پتھر کو سنبھال کر رکھا تھا۔ اس کی نظریں اس وقت کنول کے چہرے پر بھٹک رہی تھیں جب دوسری جانب سے کال ریسیو کی گئی۔ شیخ حامد نے منہ پر ہاتھ رکھ کر مدھم آواز میں کوئی کوڈ ورڈ استعمال کیا پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔

"لودھی مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے...... اور انسپکٹر دانش نے میرے نمبر ملانے کی حماقت کیوں کی؟"

جواب میں جو کچھ کہا گیا اسے سن کر شیخ حامد کے چہرے پر کھنچاؤ کی کیفیت تیزی سے ابھرنے لگی، اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی سرخی اس بات کی علامت تھی کہ وہ بڑی مشکل سے کسی بات کو زبردستی حلق کے نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کنول اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتی رہی۔ خاصی دیر تک شیخ حامد دوسری جانب سے سنائی جانے والی کہانی سن کر ہونٹ چباتا رہا پھر بڑے سرد لہجے میں بولا۔

"دونوں نمک حراموں کو منع کر دو کہ بھول کر بھی مجھ سے ملنے یا فون کرنے کی حماقت نہ کریں...... ڈونٹ وری...... میں اسے بھی سنبھال لوں گا...... اتنی جلدی نہیں...... حالات کے پیش نظر ٹھنڈا کر کے کھانے کی ضرورت ہے...... نہیں، اس پر صرف نظر رکھو۔ اس نے چار بار کسی منحوس سیاہ بلی کی طرح میرا راستہ کاٹنے کی غلطی کی ہے...... ٹھیک ہے، میں تمہیں دوبارہ کال کروں گا۔" شیخ حامد نے موبائل آف کر دیا۔ اس کے چہرے پر بڑی خوفناک سنجیدگی طاری تھی۔

"کیا ہوا سر......؟" کنول نے معصومیت سے پوچھا۔ "کوئی بری خبر ہے......؟"

"نہیں......" شیخ حامد نے اسے دیکھ کر بڑے زہریلے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں بری خبروں پر بھی

مسکرانے کا عادی ہوں۔ بزنس میں نفع ونقصان ہوتا رہتا ہے لیکن...... میں بساط کا رخ پلٹنے کے فن سے بھی واقف ہوں۔"

"کیا میں آپ کے کسی کام آسکتی ہوں......؟"

"ہاں......" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تم اپنے دفتر میں جا کر آرام کرو...... کوئی ملنے آئے تو مجھ سے پوچھے بغیر ہی اسے منع کر دینا۔"

"ایز یو وش سر......" کنول اٹھ کر لہراتی بل کھاتی چلی گئی تو شیخ حامد کسی بھوکے شیر کی طرح اٹھ کر دفتر میں ٹہلنے لگا۔ موبائل پر اسے بلیک ٹائیگر نے الماس کے اغوا...... سراج اور لیاقت حسین کی بروقت مداخلت اور لودھی کی کمزور پلاننگ کے علاوہ ان قانونی کاغذات کے بارے میں بھی پوری تفصیل دہرادی جس پر سراج نے بھی بطور گواہ دستخط کیے تھے...... لیاقت حسین کے بارے میں کچھ ایسی ناقابل یقین کہانی بھی سنائی تھی جس پر شیخ حامد کو پوری طرح یقین نہیں آرہا تھا۔

کچھ دیر وہ اپنے وسیع وعریض آفس میں ٹہلتا رہا، پھر اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر مرکزی وزیر داخلہ سے براہ راست رابطہ قائم کیا۔ "میں شیخ حامد بول رہا ہوں۔" اس نے دوسری جانب سے وزیر داخلہ کی آواز سن کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بہت عرصے بعد آپ کو ایک چھوٹی سی زحمت دے رہا ہوں۔"

"تکلف چھوڑیں شیخ صاحب۔" دوسری جانب سے بے تکلفی سے پوچھا گیا۔ "یہ فرمائیں، کام کیا ہے؟"

"میں چاہتا ہوں کہ ایس پی اورنگ زیب کو فوری طور پر کسی دوسرے صوبے میں ٹرانسفر کر دیا جائے۔"

"خیریت...... ابھی تو وہ تبادلہ ہونے کے بعد ہی تعینات ہوا ہے۔ اتنی جلدی اس سے کیا شکایت ہو گئی؟"

"کیا میں نے کوئی مشکل کام کہہ دیا ہے......؟" شیخ حامد نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"آپ کو شاید اس کے بارے میں پوری طرح علم نہیں ہے۔" تھوڑے توقف سے کہا گیا۔ "مرکز میں اس کے بھی کچھ واقف کار اور ایک دو عزیز دار بھی اونچے عہدے پر تعینات ہیں اس لیے فوری طور پر اسے ہٹانا مشکل ہے۔ ویسے بھی پولیس کی بساط پر کسی ایس پی کی حیثیت گھوڑے جیسی ہوتی ہے جو ہر سمت ڈھائی گھر پھلانگ سکتا ہے، آپ اگر اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کریں تو بہت فائدے میں رہیں گے۔"

"میرے لائق کوئی خدمت ہو تو عرض کریں۔" شیخ حامد نے موضوع بدل کر سنجیدگی سے کہا۔

"آپ شاید خفا ہو گئے...... میں آپ کو پھر کسی وقت تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔" وزیر داخلہ نے جواب دیا۔ "اس وقت ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ ویسے میں کوشش کروں گا اورنگ زیب خود آپ سے مل کر......"

"بہت بہت شکریہ چودھری صاحب!" شیخ حامد نے اس بار خشک انداز میں جواب دیا۔ "میں اس سے ملنا پسند نہیں کروں گا۔" اس نے اپنا جملہ مکمل کر کے ریسیور ایک طرف ڈال دیا پھر موبائل اٹھا کر اس پر...... بلیک ٹائیگر کے نمبر ملائے، ضروری پاس ورڈز کے تبادلے کے بعد اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "فرنانڈس کو پہلی فرصت میں زہر دے کر ختم کر دو...... اس کو کسی بیان دینے کے لیے عدالت تک جانے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔"

"نہیں ملے گا باس......" دوسری جانب سے سنجیدگی سے کہا گیا۔ "اس کا دوپہر کا کھانا اس کی زندگی کی آخری خوراک ثابت ہوگا۔"

"جن نقاب پوشوں کو گرفتار کیا گیا ہے ان کے ساتھی اپنے آدمیوں کو پولیس کسٹڈی سے چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ بھی کر سکتے ہیں۔" شیخ حامد کا جملہ معنی خیز تھا۔ "تھانے میں شعلے بھڑکیں گے تو قانونی کاغذات بھی راکھ ہو جائیں گے...... کوئی سنسناتی ہوئی گولی...... انسپکٹر دانش کے لیے بھی پیغام اجل ثابت ہو سکتی ہے...... بطور گواہ دستخط کرنے والے کو میں خود دیکھ لوں گا۔ ابھی اس کو کچھ دن اور خوش ہو لینے دو کہ اس کی عزت کی دھجیاں اڑتے اڑتے رہ گئی ہیں۔"

"جس نے چوتھی بار راستہ کاٹا ہے، اس کے لیے کیا حکم ہے......؟"

"اسے بھی گنی چنی باقی سانسیں پوری کر لینے دو۔" شیخ حامد کسی زخمی ناگ کی طرح پھنکارا پھر اس نے موبائل آف کیا، ایک لمحے تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے شبنم کو فوری طور پر اپنے ساؤنڈ پروف کمرے میں بلوانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

ایس پی اورنگ زیب اور سراج اس وقت ڈی آئی جی کرائمز کے آفس میں موجود تھے۔ انہیں فون پر کال کیا گیا تھا۔ دونوں پندرہ منٹ کے وقفے سے آگے پیچھے آغا منظور کے دفتر میں داخل ہوئے۔ تینوں افسران اپنی اپنی جگہ بے حد سنجیدہ نظر آرہے تھے خاص طور سے اورنگ زیب زیادہ اکھڑا اکھڑا نظر آرہا تھا۔ اسے اپنے ذرائع سے خبر مل گئی تھی کہ شیخ حامد نے براہِ راست وزیر داخلہ سے اس کے فوری تبادلے کی درخواست کی تھی۔ اس کے علاوہ دوپہر کو ایک پولیس چوکی پر ہونے والی خونی واردات کی تفصیل بھی اسے مل

چکی تھی جس میں سلاخوں کے پیچھے بند ایک قیدی کی موت کے بعد اس کے جتھے کے لوگوں نے بپھر کر حملہ کر دیا تھا، کچھ شرپسند عناصر جو ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے، پولیس نے اپنے دفاع کے لیے آنسو گیس کے شیل کے علاوہ بے دریغ ہوائی فائرنگ کر کے حملہ آوروں کو تھانے میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ بپھرے ہوئے لوگوں کا سیلاب ساری بندشوں کو توڑ کر تھانے میں داخل ہوا پھر وہاں توڑ پھوڑ کرنے کے بعد آگ بھی لگا دی گئی۔ تھانہ انچارج انسپکٹر دانش کو ایک گولی نے زندگی کی قید سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا۔ تھانے میں موجود بیشتر فرنیچر اور ریکارڈ جل کر خاک ہو گیا۔ بعد میں پولیس کی بھاری نفری نے موقع واردات پر پہنچ کر حالات پر قابو پایا۔ پندرہ افراد کو حراست میں بھی لے لیا گیا۔ زخمی ہونے والوں میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لودھی بھی شامل تھا جسے پولیس اسپتال میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ اس کی چوٹیں زیادہ خطرناک نہیں تھیں۔

شام کے اخبارات نے نمک مرچ لگا کر مختلف انداز میں اپنی معلومات کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کی ...... مذکورہ تھانہ چونکہ ایس پی اورنگ زیب کے حلقے میں تھا اس لیے ایک اخبار نے "نئے ایس پی کا شاندار استقبال" کی سرخی لگا کر گرما گرم رپورٹ شائع کی تھی ...... مرنے والے کے بارے میں ...... جو بدنام فوٹو گرافر فرنانڈس کے سوا کوئی نہیں تھا، بیشتر اخبارات نے کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی تھی۔

ڈی آئی جی کرائمز نے دونوں افسران کے آنے کے بعد دروازے پر لگی سرخ بتی کا سوئچ آن کر دیا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اب کسی کو بھی اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایس پی اورنگ زیب کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔ وہ بظاہر کسی ٹینشن کا شکار نہیں تھا لیکن سراج بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ ذاتی طور پر وہ سمجھ رہا تھا کہ تھانے پر ہونے والے حملے، انسپکٹر دانش کی موت اور جلاؤ گھیراؤ کی پشت پر کس کا ہاتھ ہوگا۔ اسے اس بات کا بھی ملال تھا کہ انسپکٹر دانش اپنی موت سے پیشتر اس دستاویز کی نقل بھی نہیں پہنچا سکا تھا جو سراج کے لیے سب سے زیادہ اہم تھی۔ شیخ حامد کو اس کی اطلاع لودھی یا اس کے پالتو غنڈوں نے ضرور پہنچا دی ہوگی پھر اسی بڑے مگرمچھ کے اشارے پر ایسے سارے ثبوت مٹانے کی تخریبی کارروائی کا راستہ اختیار کیا ہوگا، انسپکٹر دانش کی موت بھی ضروری سمجھی گئی ہوگی۔ عدالت میں اس کا بیان بے حد موثر ثابت ہو سکتا تھا۔

سراج کے ذہن میں گرم آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے۔ شیخ حامد نے الماس پر ہاتھ ڈال کر اس کی غیرت کو للکارا تھا۔ اگر وہ اپنی مذموم پلاننگ میں کامیاب ہو جاتا تو شاید سراج کو بھی مجبوراً اس کے سامنے جھکنا پڑتا۔ الماس پر جو بیتی تھی اس کی اطلاع شیخ حامد کو بھی ہوگی، اپنی ناکامی پر وہ یقیناً تلملایا ہوگا۔ لیاقت حسین نے بروقت وہاں پہنچ کر پھر ایک نئی پراسرار کہانی کو ہوا دی تھی۔ سب سے تعجب خیز بات یہ تھی کہ وہ ایک ہی وقت میں دو جگہ دیکھا گیا تھا، الماس نے بھی وقت کا حساب کتاب کرنے کے بعد حیرت ہی کا اظہار کیا تھا۔

سراج کی گھٹن کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی قانونی حیثیت میں بھی ان تمام باتوں کو کھل کر منظر عام پر نہیں لا سکتا تھا۔ بات الماس کے بجائے کسی اور کی ہوتی تو دوسری بات تھی۔ اسے ان تین نقاب پوشوں کا خیال بھی تھا جو الماس کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ فرنانڈس کا وجود مٹ چکا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی نہیں ہو سکا لیکن جن لوگوں نے الماس کو اغوا کیا ہوگا، جو اس کی نگرانی پر تعینات کیے گئے تھے ان کا خیال بھی سراج کے ذہن میں چکرا رہا تھا۔ جس تھانے میں واردات ہوئی تھی وہ سراج کے حلقے میں نہیں تھا ...... پھر اسے کیوں بلایا گیا تھا ...... کیا ڈی آئی جی کرائمز کو شیخ حامد یا اور کسی ذریعے سے اصل صورت کا علم ہو گیا تھا؟ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا جب آغا منظور نے سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"شام کو شائع ہونے والے اخبارات آپ حضرات کی نظروں سے بھی ضرور گزرے ہوں گے، میں نے اس وقت اسی سلسلے میں آپ حضرات کو زحمت دی ہے۔"

"آپ کا حکم تھا، میں حاضر ہو گیا سر ...... لیکن حادثہ جس علاقے میں ہوا ......"

"اس سے آپ کا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔" آغا منظور نے کہا۔ "مجھے آپ کی کارکردگی کا بخوبی علم ہے، اس کے علاوہ بھی ہمارے درمیان ذاتی انڈر اسٹینڈنگ بھی رہ چکی ہے۔ میں نے آپ کو اپنی ذاتی پسند پر کال کیا ہے۔"

"شکریہ سر ......" سراج نے اطمینان کا سانس لیا۔

"مجھے بھی خوشی ہے کہ اس وقت آپ بھی میرے استقبال میں شریک ہیں۔" اورنگ زیب نے اخبار کی سرخی کے حوالے سے کہا پھر پہلو بدل کر بولا۔ "آج جس کرسی پر میں ہوں۔ ہو سکتا ہے کل آپ اس پر بیٹھے ہوں۔"

"مسٹر اورنگ زیب ......" آغا منظور نے اس کے لب و لہجے کی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس وقت آپ دونوں کو کچھ سنجیدہ گفتگو کے لیے انوائٹ کیا ہے۔"

"میں سنجیدہ ہوں سر ......" اورنگ زیب نے کسمسا کر کہا۔ "اگر میرے تبادلے کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں تو آپ کا پہلا انتخاب بھی مسٹر سراج ہی ہوں گے۔"

"تبادلہ ......" آغا منظور نے چونک کر پوچھا۔ "یہ تبادلے کا خیال آپ کے ذہن میں کہاں سے آ گیا؟"

"مرکز میں کچھ چھوٹے موٹے تعلقات میرے بھی ہیں۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مسٹر حامد نے وزیر داخلہ سے آج صبح ہی میرے فوری تبادلے کی درخواست کی تھی۔ سرخ جھنڈی دیکھ کر اکثر جانور بھی بدک جاتے ہیں۔"

"آپ ...... کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟" آغا منظور نے کسمسا کر پوچھا۔ سراج بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"جو حادثہ پیش آیا وہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔" اورنگ زیب نے بے پروائی سے کہا۔ "یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ آج اس حادثے سے پہلے تھانہ انچارج مرحوم انسپکٹر دانش نے بھی مجھے فون کیا تھا ...... وہ مجھے کسی کیس کے قانونی کاغذات دکھانے کا خواہش مند تھا میں نے اسے شام کا وقت دیا تھا لیکن ......" اورنگ زیب نے جملہ مکمل نہیں کیا۔

"میں دخل اندازی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" سراج نے ایس پی کو براہ راست مخاطب کیا۔ "کیا انسپکٹر دانش نے اس فائل کے بارے میں کوئی کارآمد بات بھی کی تھی؟"

"سوری ......" اورنگ زیب نے جواب دینے سے گریز کیا۔ "اب صورت حال چونکہ بدل چکی ہے اس لیے میں قبل از وقت کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

"کیا آپ تھانے پر حملہ ہونے اور انسپکٹر دانش کی موت کے سلسلے میں کسی خاص شخص پر شبہ کر رہے ہیں؟" آغا منظور نے دبی زبان میں دریافت کیا۔

"اصل مجرم کون ہے؟ تھانے پر حملے میں کون لوگ ملوث تھے؟ اس کے پیچھے کیا مصلحتیں کارفرما تھیں؟ خاص طور پر انسپکٹر دانش ہی کو نشانہ کیوں بنایا گیا اور ...... وہ کون سی اہم فائل تھی جو مرحوم مجھے دکھانا چاہتا تھا؟ ان ساری باتوں کا جواب مکمل تفتیش کے بعد ہی سامنے آ سکتا تھا۔"

سراج کے علاوہ آغا منظور بھی اورنگ زیب کے تیور محسوس کر رہا تھا لیکن اس نے کھل کر کچھ کہنے سے گریز کیا اور بڑی خوبصورتی سے بات بنانے کی کوشش کی۔

"کبھی کبھی ایسے اتفاقات بھی رونما ہوتے ہیں جو بہت سے امکانات کو جنم دیتے ہیں مگر ...... کسی ٹھوس شواہد کے بغیر ہم کسی کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ بھی نہیں کر سکتے۔"

"میں آپ سے متفق ہوں سر ......" اورنگ زیب نے ٹھوس لہجے میں کہا لیکن چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ذاتی طور پر کسی مجرم کو ذہن میں محفوظ کر چکا ہے۔

سراج کے اندر بھی اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں اس حادثے سے پیشتر کسی کی زبان پر الماس کا نام نہ آ گیا ہو، ذاتی طور پر اس کے ذہن میں بھی شیخ حامد ہی کا نام گونج رہا تھا۔ آغا منظور نے باری باری دونوں افسران کو دیکھا پھر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں آپ دونوں حضرات کو یہ مشورہ دوں گا کہ قیاس اور امکانات کے پیچھے بھاگنے کے بجائے ہمیں ایسے ثبوت درکار ہوں گے جو اصل مجرم کو قانون کے شکنجوں میں جکڑنے کی خاطر موثر ثابت ہوں۔ میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ مجرم خواہ کوئی ہو، میں اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا ...... تعلقات اپنی جگہ لیکن کچھ واقف کار اگر اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں انہیں بھی کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔"

"مسز حامد کی ڈیڈ باڈی کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا جبکہ ساری علامتیں یہی ظاہر کر رہی تھیں کہ مرنے والی نے یا تو خودکشی کی ہے، یا اسے زہر دیا گیا ہے۔" اورنگ زیب نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "آپ کے خیال میں کیا ......"

"سمجھنے کی کوشش کریں مسٹر اورنگ زیب!" آغا منظور نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا۔ "اگر مقتول کے ورثا نہ چاہیں تو ہم انہیں مجبور نہیں کر سکتے۔"

"میرا خیال اس کے برعکس ہے۔" اورنگ زیب نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "ورثا میں ماں باپ اور بھائی بہن کے سلسلے میں تو خیر ہم اپنی آنکھیں بند کر سکتے ہیں لیکن شوہر اور بیوی کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی ذاتی اغراض و مقاصد، کسی مالی فائدے کے تحت ایک فریق نے دوسرے کو زہر دینے کی کوشش کی ہو، ایسی شکل میں قانون بھی اپنے وسیع اختیارات استعمال کرنے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔"

"میں انکار نہیں کروں گا لیکن ...... ہم دوسروں سے مختلف بھی نہیں ہیں۔ کہیں کہیں چشم پوشی بھی ضروری ہوتی ہے۔" آغا منظور نے مجبوری کا سہارا لیا۔ "کہیں کہیں حالات ہمارے بس سے باہر بھی ہو جاتے ہیں ...... اوپر والوں کی بھی سنی پڑتی ہے۔ نہ سنیں تو چھٹی ہو جاتی ہے۔ آپ کی مثال سامنے ہے ...... اگر مرکز میں آپ کی جڑیں مضبوط نہ ہوتیں تو شاید اس وقت آپ بھی ہمارے درمیان نہ ہوتے۔

میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”آئی ایگری ود یو سر......“ اورنگ زیب نے پہلی بار نرمی کا مظاہرہ کیا۔ ”لیکن کسی مجرم کو برداشت کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے...... زیادہ ڈھیل دی جائے تو پھر گلی کا کتا بھی شیر بن جاتا ہے۔“

”موجودہ کیس میں آپ کے تفتیشی آفیسر بنانا پسند کریں گے؟“ آغا منظور نے گفتگو سمیٹنے کی کوشش کی۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں بھی اس خدمت کو حاضر ہوں۔“

”آپ......؟“ سراج کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”آپ میری فکر نہ کریں مسٹر سراج...... بس ایک بات ضرور یاد رکھیں کہ ہمیشہ لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے۔“ اورنگ زیب نے جو مثال دی تھی اسے سن کر آغا منظور بھی کسمسانے لگا لیکن اس نے فوری طور پر کسی کو انکوائری آفیسر مقرر کرنے کے سلسلے میں جلد بازی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔ خاصی دیر تک اس حادثے کے مختلف پہلوؤں پر غور ہوتا رہا پھر آغا منظور نے میٹنگ ختم کی تو اورنگ زیب اور سراج ایک ساتھ ہی باہر نکلے تھے۔

آغا منظور کی موجودگی میں بھی ایس پی اورنگ زیب نے جس صاف گوئی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اسے سراج نے بھی خاص طور پر محسوس کیا تھا، الماس کے معاملے میں شیخ حامد کا حساب چکتا کرنے کے لیے اسے کسی ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی جو اس کی پشت پر ہاتھ رکھ سکے۔ اسی خیال کے پیش نظر وہ اورنگ زیب کو اس کی گاڑی تک چھوڑنے گیا تھا۔ اورنگ زیب گاڑی میں بیٹھنے لگا تو سراج نے اسے روک کر کہا۔

”سر...... میں آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوہ...... شیور۔“ اورنگ زیب بڑے دوستانہ انداز میں سراج کا بازو تھام کر گاڑی سے کچھ دور لے گیا۔ ”فرمایئے...... میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں؟“

”انسپکٹر دانش آپ کو جو فائل دکھانا چاہتا تھا اس میں ایک قانونی کاغذ پر میں نے بھی بطور آئی وٹنس دستخط کیے تھے۔“ سراج نے مدھم لہجے میں کہا پھر الماس کا نام درمیان سے نکال کر وہی فرضی کہانی سنا دی جو وہ انسپکٹر دانش کو سنا چکا تھا۔

”آئی۔سی......“ اورنگ زیب نے الفاظ کو کھینچ کر ادا کیا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ لودھی بھی اس حادثے میں برابر کا شریک ہے۔ مجھے یہ اطلاع مل چکی ہے کہ وہ شیخ حامد کا خاص آدمی ہے۔“

”بدنام فوٹو گرافر فرنانڈس کو بھی اسی لیے راستے سے ہٹا دیا گیا ہے کہ اگر اس کی زبان کھل جاتی تو کچھ مخصوص چہرے بھی بے نقاب ہوجاتے۔“ سراج نے ہونٹ کاٹتے ہوئے تاسف کا اظہار کیا۔ ”انسپکٹر دانش کو بھی اسی لیے ختم کر دیا گیا کہ وہ اس دستاویز کی نقل مجھے نہ پہنچا سکے۔“

”ویری سیڈ......“ اورنگ زیب نے دکھ کا اظہار کیا۔ ”کاش آپ مجھے یہ بات کل رات یا آج صبح ہی بتا دیتے۔“

”مجھے اس بات کا شبہ تھا سر کہ شاید آپ مجھے بھی......“

”ہاں۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ”کچھ کہانیاں آپ کی بھی میرے کانوں تک ضرور پہنچی ہیں لیکن اب......“

”وہ کہانیاں کسی حد تک درست ہیں۔“ سراج نے سنجیدگی سے اعتراف کیا۔ ”میں کسی مگرمچھ کو اپنے جال میں پھانسنے کی خاطر جال پھینک رہا ہوں...... آؤٹ گوئنگ ڈی آئی جی کرائمز مسٹر علیم احمد کے پاس کچھ باتوں کا......“

”آپ نے جس انداز میں اعتراف کرلیا وہی میرے لیے بہت ہے۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں ہر طرح سے آپ کی مدد کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ مجھ پر اعتماد کریں۔“

جواب میں سراج نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا پھر اورنگ زیب کے جانے کے بعد وہ بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گھر جاتے ہوئے اسے اپنی ایک غلطی کا احساس بھی شدت سے ہوا...... جو پرچہ صبا شیخ حامد نے مرنے سے پیشتر اس کے لیے چھوڑا تھا، ابھی تک وہ اسے بھی نہیں پڑھ سکا تھا۔ سراج نے گاڑی کی رفتار تیز کردی پھر......

مرنے والی صبا بیگم کے آخری کربناک الفاظ اور...... اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان ادا کیے جانے والے جملے اس کے کانوں میں سنسنانے لگے۔

☆☆☆

فرحین نئے بنگلے کی خوبصورت انیکسی میں آکر بے حد خوش ہوئی تھی۔ راحیلہ بیگم نے اس کی واپسی کے بعد اسے اپنے ساتھ بازار لے جاکر شاپنگ کرائی تھی۔ انیکسی کو پوری طرح سیٹ کرنے میں بھی وہ پیش پیش رہی تھی۔ فرحین کے آجانے سے خود راحیلہ بیگم کو وقت گزارنے کے لیے ایک ساتھی بھی مل گیا تھا۔ ادھر لیاقت حسین اپنی ڈیوٹی پر سیٹھ عثمان کو لے کر دفتر روانہ ہوتا، ادھر فرحین کا بلاوا آجاتا پھر وہ شام تک راحیلہ بیگم کے پاس رہتی، ہر کام میں ان کا ہاتھ بٹاتی۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی لیکن سلیقہ شعار ضرور تھی۔ راحیلہ

بیگم نے اسے اپنے بے شمار لباس دیے تھے جنہیں پہن کر فرحین پھولے نہیں سماتی تھی۔

اسپتال سے واپسی کے بعد لیاقت حسین پھر پوری طرح ڈیوٹی کا پابند ہو گیا تھا لیکن اس روز اس کی آنکھ دیر سے کھلی، وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ عام طور پر وہ آٹھ بجے اٹھنے کا عادی تھا، نہا دھو کر ناشتا کرتا پھر اپنی وردی پہن کر ٹھیک پونے نو بجے تک سیٹھ عثمان کے بنگلے پر گاڑی کو کپڑا مارنے کے بعد پورٹیکو میں آکر کھڑا ہو جاتا۔ سیٹھ عثمان وقت کے بے حد پابند تھے۔ وہ نو بجے راحیلہ بیگم کے ساتھ باہر آتے۔ لیاقت حسین ان کا بریف کیس لے کر گاڑی میں رکھتا پھر سیٹھ عثمان کے بیٹھنے کے بعد وہ اپنی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لیتا۔ جب تک گاڑی بنگلے سے نکل کر روانہ ہو جاتی، راحیلہ بیگم دروازے پر کھڑی ہاتھ ہلاتی رہتیں، سیٹھ عثمان مسکرا کر اس کا جواب دیتے رہتے لیکن آج......

لیاقت حسین تیزی سے بستر سے نیچے اترا، غسل خانے میں جاکر پانی کا ایک چھپکا منہ پر مارا۔ منہ پونچھتے ہوئے باہر آکر اس نے جلدی جلدی وردی پہنی پھر اس نے فرحین کو آواز دی لیکن فرحین گھر پر موجود نہیں تھی۔ یقیناً وہ راحیلہ بیگم کی طرف چلی گئی ہوگی۔ لیاقت حسین نے دل کو تسلی دی۔ اس کے ساتھ اسے غصہ بھی آرہا تھا، جب کسی وجہ سے اس کی آنکھ وقت پر نہیں کھلتی تھی تو فرحین ہی اسے بڑے پیار سے جگاتی تھی لیکن آج اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے کچن میں جاکر دیکھا تو اس کا ناشتا چھوٹی سی فولڈنگ ٹیبل پر پلیٹوں سے ڈھکا رکھا ہوا تھا۔ جلدی جلدی اس نے ناشتا کیا پھر چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ قدم مارتا سیٹھ عثمان کے بنگلے پر پہنچا تو ڈیوٹی گارڈ نے مسکرا کر کہا۔

”آج تم آرام کرو۔ صاحب دوسرے ڈرائیور کے ساتھ چلا گیا۔“

لیاقت کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس سے بڑی کوتاہی ہوگئی ہو۔ پھر دیر وہ گارڈ کے ساتھ کھڑا باتیں کرتا رہا۔

”تمہاری گھر والی نے تمہیں جگانے کی کوشش کی تھی پر بیگم صاحب نے اپنی ملازمہ کو بھیج کر اسے بلوا لیا۔“

”سب خیریت تو ہے؟“ لیاقت حسین نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”صاحب کہہ رہا تھا کہ تمہیں ابھی آرام کی ضرورت ہے اس لیے تمہیں نہیں جگایا گیا۔“

لیاقت حسین کے ذہن سے دھند چھٹنے لگی، کچھ یادیں اس کے دماغ میں ابھرنے لگیں۔ رات وہ کسی وقت خلاف معمول جاگا تھا۔ کسی نے اس سے باتیں بھی کی تھیں۔ اس کے بعد وہ گھر سے باہر نکلا تھا جہاں سے ڈی ایس پی سراج کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ پھر اس نے خود کو سراج کے گھر پر پایا تھا، الماس بیگم نے اس سے کچھ باتیں بھی کی تھیں...... لیاقت حسین اپنے ذہن پر زور دیتا رہا لیکن کوشش کے باوجود اسے یہ یاد نہیں آیا کہ وہ سراج کے ساتھ کہاں اور کیوں گیا تھا...... الماس بیگم کے ساتھ اس کی کیا باتیں ہوئی تھیں......؟ وہ واپس کب آیا تھا......؟ شاید، شاید اسی لیے اس کی آنکھ وقت پر نہیں کھل سکی۔

”کیا سوچ رہے ہو لیاقت حسین؟“ گارڈ نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

”وہ...... ہم...... میں رات بھر جاگتا رہا اس لیے صبح وقت پر نہیں اٹھ سکا۔“ لیاقت نے افسردہ انداز میں کہا۔ ”خدا جانے صاحب نے کیا خیال کیا ہوگا میرے بارے میں۔“

”پریشان مت ہو میرے دوست!“ گارڈ نے مسکرا کر کہا۔ ”تم اور تمہاری گھر والی دونوں خوش قسمت ہیں جو صاحب اور بیگم صاحب دونوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔“

لیاقت حسین کوئی معقول جواب سوچ رہا تھا کہ ایک ملازم نے قریب آکر کہا۔

”لیاقت حسین، تمہیں بیگم صاحب اندر بلا رہی ہیں۔“

لیاقت حسین گارڈ کی بات کا جواب دینے کے بجائے تیزی سے گھوم کر بنگلے کے دروازے پر آگیا جہاں سے فرحین اسے اندر لے گئی۔ راحیلہ بیگم لاؤنج میں ایک صوفے پر بیٹھی تھیں، فرحین بھی ان کے قریب جاکر بیٹھ گئی۔ اس نے نگاہوں نگاہوں میں لیاقت حسین سے پوچھا تھا۔ ”سچ بتانا...... فرحین تمہیں بیگم صاحب کے ساتھ بیٹھی کیسی لگ رہی ہے؟“

”لیاقت حسین......“ راحیلہ بیگم نے لیاقت حسین کو اپنائیت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جانتے ہو فرحین ابھی مجھ سے تمہاری کیا شکایت کر رہی تھی......؟“

”اس کی باتوں میں نہ آیا کریں بیگم صاحب۔ نئی کوٹھی میں آنے کے بعد سے یہ بڑی بڑی باتیں کرنا سیکھ گئی ہے۔“

”خبردار لیاقت حسین!“ راحیلہ بیگم نے فرحین کو خوش کرنے کی خاطر مسکرا کر مصنوعی خفگی سے کہا۔ ”فرحین اب میری سہیلی بن گئی ہے اس لیے میں اس کے خلاف کوئی بات نہیں سنوں گی۔“

فرحین نے بھی اسی وقت ہلکی سی زبان باہر نکال کر منہ چڑایا تو لیاقت حسین دل ہی میں مسکرا دیا۔ فرحین کی بات اور تھی، وہ عورت ذات تھی لیکن لیاقت حسین، سیٹھ عثمان اور

راحیلہ بیگم دونوں کی پرخلوص محبتوں کا مقروض تھا اس لیے خاموش کھڑا رہا۔

"فرحین مجھے بتا رہی تھی کہ تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ وقت پر کھانا نہیں کھاتے۔ رات کو بھی آرام نہیں کرتے۔"

"آئندہ خیال رکھوں گا۔" لیاقت حسین نے مسکینی صورت بنا کر جواب دیا پھر نظریں جھکا کر بولا۔ "میں شرمندہ ہوں کہ آج وقت پر صاحب کی ڈیوٹی کے لیے حاضر نہیں ہو سکا۔"

"اس غیر حاضری کی وجہ بھی جانتے ہو......؟"

"جی......" اس نے گھبرا کر راحیلہ بیگم کی طرف دیکھا۔

"سراج صاحب نے تمہاری سفارش کی تھی کہ آج تمہیں آرام کرنے دیا جائے۔ تم کل رات شاید ان کے ساتھ کہیں گئے تھے؟"

"کہاں گیا تھا......؟" لیاقت حسین نے معصومیت سے کہا۔ "مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ وہ اپنے ساتھ مجھے گھر لے گئے تھے پھر واپس بھی چھوڑ گئے تھے۔"

"اور کہیں نہیں گئے تھے......؟" اس بار راحیلہ نے بھی اسے کریدنے کی کوشش کی۔

"میں نیند میں تھا اس لیے...... کچھ یاد نہیں آ رہا۔"

"یہ بات میرے دل کو نہیں لگتی......" فرحین نے کسمسا کر پھر لیاقت حسین کو چھیڑنے کی خاطر راحیلہ بیگم سے کہا۔ "ڈپٹی صاحب نے اسے اسلحہ کا تحفہ بھی دے کر اس کا دماغ ساتویں آسمان پر کر دیا ہے۔ بالکل پولیس والوں کی طرح اونچی اونچی باتیں کرنے لگا ہے۔ جو بات اس کے پیٹ میں اتر جائے پھر آسانی سے باہر نہیں آتی......"

"لیاقت حسین......" راحیلہ بیگم نے اس بار لیاقت حسین کو سنجیدگی سے دیکھا۔ "صبح سات بجے سراج صاحب کا فون تمہارے صاحب کے پاس آیا تھا، وہ بتا رہے تھے، کل رات تم نے ان کے ساتھ جا کر کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔"

لیاقت حسین کا ذہن پھر الجھنے لگا۔ کوئی بات اس کے لاشعور میں ضرور کلبلا رہی تھی۔ وہ سراج صاحب کے گھر گیا تھا تو بلا کسی مقصد کے یونہی نہیں گیا ہوگا...... لیکن اس کے بعد کہاں گیا تھا؟ اس نے کیا کارنامہ انجام دیا تھا؟ یہ بات اس کے شعور میں نہیں آ رہی تھی۔ الماس بیگم نے بھی اس سے کچھ خاص باتوں کی تفصیل جاننے کی کوشش کی تھی۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔ دیتا بھی کیسے جبکہ صرف اسے اتنا یاد تھا کہ وہ سراج صاحب کے گھر میں موجود تھا۔ سراج صاحب اسے خود واپس چھوڑنے آئے تھے، راستے میں لیاقت حسین نے اپنی ذہنی گرہوں کو کھولنے کی خاطر ان سے بھی یہی [illegible] کیا تھا کہ وہ ان کے گھر کیسے پہنچ گیا؟ جواب میں [illegible] صاحب نے بھی گول مول جواب دے کر اسے ٹال دیا تھا۔

لیاقت حسین کو اگر کچھ یاد تھا تو صرف اتنا کہ...... خان کی کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد کسی نامیناریش [illegible] بزرگ نے اسے اللہ کے اس برگزیدہ دیوانے تک پہنچا دیا جس نے اسے ایک چٹکی خاک سے نوازا تھا پھر...... اس کے بعد سے وہ بھی کہیں نظر نہیں آیا...... لیاقت حسین نابینا کی [illegible] کے بعد اس بات کو زبان تک نہیں لا سکتا تھا۔ بڑی سختی سے اسے یہی تاکید کی گئی تھی۔

خود راحیلہ بیگم کو بھی پوری بات کا علم نہیں تھا۔ سیٹھ [illegible] نے دفتر کے لیے تیار ہوتے وقت صرف اتنا ہی بتایا تھا [illegible] سراج اسے رات کسی ذاتی کام سے لے گیا تھا اس لیے [illegible] کم از کم ایک دن آرام کرنے دیا جائے۔ لیاقت حسین کو گھر [illegible] دیکھ کر وہ بات ٹالنا چاہتی تھیں جب فرحین نے شوخی سے کہا۔

"دیکھا آپ نے...... اب یہ ڈپٹی صاحب کا ایک پکا والا چمچہ......"

"ایسا مذاق میں بھی نہیں کہتے فرحین۔" راحیلہ بیگم نے اسے پیار سے سمجھایا۔ "لیاقت حسین، ہم سب کے لیے [illegible] ہے یہ تم نہیں سمجھ سکو گی۔"

اس بار لیاقت حسین کو بھی زبان چڑانے کا موقع [illegible] گیا۔ اس کے بعد وہ راحیلہ بیگم کو سلام کر کے الٹے قدم باہر چلا گیا۔ اس کے ذہن میں جو باتیں الجھ رہی تھیں بدستور الجھتی رہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر نے افضل خان کا ضروری معائنہ کیا پھر [illegible] زبان میں بولا۔

"میرا مشورہ ہے کہ آپ اسپتال سے جانے کے بعد بھی کم از کم ایک ہفتے تک بیڈ ریسٹ ضرور کریں۔"

"ٹھیک ہے۔" افضل خان نے کہا۔ "میں خود بھی [illegible] کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔"

"زندگی ایک نعمت ہے افضل صاحب، اس کا [illegible] رکھیے گا۔" ڈاکٹر نے اس بار مدھم لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو سسٹر کے ذریعے ڈسچارج سلپ بھیج دوں گا۔ آ[illegible] آج تک کا بل مسٹر حامد نے پے کر دیا ہے۔"

"کیا اب میں یہاں......" افضل خان اپنا جملہ مکمل [illegible] کر سکا۔ ڈاکٹر کا آخری جملہ سن کر اس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا تھا۔

”رہ سکتے ہیں لیکن...... جنرل وارڈ میں، اس کے اخراجات بھی آپ کو......“

”نہیں......“ افضل خان نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں اپنے گھر پر زیادہ کمفرٹ ایبل محسوس کروں گا۔“

”وش یو آل دی بیسٹ۔“ ڈاکٹر ہیڈ نرس کے ساتھ راؤنڈ لینے کی خاطر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

افضل خان کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری۔ ڈاکٹر نے کھلے لفظوں میں ظاہر کردیا تھا کہ اب بگ باس نے اس کی بیماری کے اخراجات برداشت کرنے سے انکار کردیا ہے۔ اس کے ذہن میں اپنا ماضی کلبلانے لگا۔ کل تک وہ حامد ایسوسی ایٹس کا بزنس منیجر تھا، آفس اسٹاف کے علاوہ کاروباری حلقے میں بھی اس کی بڑی قدرومنزلت تھی۔ وہ بگ باس کا دست راست تھا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران بھی شیخ حامد کی وجہ سے اس پر ہاتھ ڈالنے سے کتراتے تھے لیکن اب وہ ایک ہی جھٹکے سے عرش سے فرش پر واپس آگیا تھا۔

میڈم روبی کو بھی وہ بگ باس کے اشارے پر ٹریپ کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوگیا تھا۔ اگر وہ اس کی مووی اور برہنہ تصاویر بھی بنوانے میں کامیاب ہوجاتا تو بگ باس اسے سر پر اٹھا لیتا لیکن...... قسمت کی خرابی اس کے آڑے آگئی۔ کسی طرح سراج کو اس کے پروگرام کی مخبری ہوگئی...... بلیک ٹائیگر کی بروقت اطلاع ملنے کے بعد وہ موقع سے فرار ہوگیا، مگر اس کے بعد اسے جن اذیت ناک حالات سے گزرنا پڑا وہ اس کی توقع بھی نہیں کرسکتا تھا۔ شیخ حامد نے خود کو معصوم ظاہر کرنے کی خاطر اسے آزمائشوں کی جس چکی میں پیسا وہ بھی ایک المیہ تھا...... اس کے ساتھ ڈبل کراس والا گیم کھیلا گیا۔ کچرا کنڈی میں برہنہ حالت میں برآمد کیے جانے کے بعد اسے یقین تھا کہ اس کی سانسیں اب گنی چنی رہ گئی ہیں۔ شیخ حامد کے جرائم کی ڈکشنری میں کسی اہم غلطی کو معاف کردینے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے اغوا کا ڈراما رچانے کی پلاننگ میں اس کا اپارٹمنٹ بھی شامل تھا جسے توڑ پھوڑ کر برباد کردیا گیا۔

افضل خان کو پورا یقین تھا کہ جس اسپتال میں اسے رکھا گیا ہے وہاں سے بھی وہ زندہ نہیں جاسکے گا۔ اس کی موت یا قتل کا ملبا بھی پولیس پر ڈال دیا جاتا لیکن...... شاید سراج کی سفارش اس کے کام آگئی تھی۔ ڈاکٹر کے آخری جملے سن لینے کے بعد اس کا ذہن چکرا گیا تھا۔ اس کے پاس سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ شیخ حامد نے اسے اس کے سابقہ عہدے پر بحال کرنے سے انکار کردیا تھا۔ البتہ اتنا ضرور اقرار کیا تھا کہ وہ سراج کی سفارش پر غور کرے گا۔

اس کا ذہن بری طرح چکرا رہا تھا۔ اسپتال سے نکل کر وہ کہاں جائے گا؟ شیخ حامد کی نگاہیں بدلنے کے بعد کوئی بھی اس کی مدد کرنے کا رسک نہیں لے گا۔ اسے میڈم روبی کی وہ آفر یاد آئی جو اس نے پہلی بار اس کے اپارٹمنٹ پر آکر دی تھی۔ اگر وہ اس آفر کو قبول کرلیتا اور بگ باس کو کسی طرح ٹھکانے لگا دیتا تو شاید اس وقت وہ بیرون ملک میں کسی شاندار کوٹھی میں مقیم ہوتا۔ اس کے بعد تاج محل ہوٹل میں اس کی قسمت کی خرابی نے اسے میڈم روبی کی نظروں میں بالکل ہی ننگا کردیا ہوگا۔ وہ اس کے دروازے پر بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے ذہن میں دو چار پرانے ساتھیوں کے نام ابھرے مگر اسے یقین تھا کہ تاریکی میں سایہ بھی انسان کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی بھی شیخ حامد کے مقابلے میں اس کی مدد کرنے پر بھی آمادہ نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ انہی خیالات میں غرق تھا جب سسٹر نے کمرے میں داخل ہوکر اسے ڈسچارج سرٹیفکیٹ تھما دیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے سسٹر کو الوداع کہا پھر خاموشی سے نیچے جانے والی لفٹ پر سوار ہوگیا، اسے فوری طور پر کوئی آخری فیصلہ کرنا تھا۔ جس شہر میں وہ اونچے حلقوں میں سر اٹھا کر چلتا تھا وہاں اب وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا بھی پسند نہیں کرسکتا تھا۔ ایک ہی طریقہ تھا...... خودکشی!...... حرام موت! انسان موت کی نیند سوجائے تو سارے دلدر دور ہوجاتے ہیں۔ وہ اندھا ہوجاتا ہے۔ کسی کی نظروں میں نفرت دیکھنے کے قابل نہیں رہتا...... بہرا ہوجاتا ہے اس لیے اپنے بارے میں کسی کی تلخ باتیں بھی سن کر اسے ملال بھی نہیں ہوتا...... ہر غم سے نجات پالیتا ہے۔ اس کے لیے بھی ایک راستہ تھا جس کو اپنانے کا فیصلہ کرلینے کے بعد اس کے ذہن پر طاری بوجھ کچھ ہلکا ہوگیا۔

سراج نے اس کی سفارش کرکے جو احسان کیا تھا وہ بھی اسے یاد آرہا تھا۔ شیخ حامد کے جملے بھی اس کے وجود میں گونج رہے تھے...... ”میں وعدہ نہیں کرتا، البتہ آپ کی سفارش پر غور کروں گا۔“ ان جملوں کی آزمائش کے لیے بھی اس نے بگ باس کے سامنے جانا فضول سمجھا تھا۔ اگر وہ اسے نفرت سے دھتکار دیتا تو دفتر والوں کی نظروں میں اور گر جاتا۔

اسپتال سے نکل کر باہر آیا تو زندگی کے ہنگامے دیکھ کر اسے اپنی حالت پر ہنسی آگئی۔ اس وقت اس کی جیب بھی خالی تھی۔ بالکل تہی دست ہوگیا تھا، ساحل سمندر یا کسی بلند عمارت تک جانے کی خاطر بھی اسے پیدل ہی سفر کرنا تھا۔

ایک لمحے کو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زیادہ دیر اپنے قدموں پر جم کر نہیں کھڑا رہ سکے گا۔ کچھ اندرونی زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے بھی ایک ہفتے مزید بیڈ ریسٹ کا مشورہ دیا تھا لیکن...... جب بیڈ ہی نہیں تھا تو ریسٹ کا خیال بھی بڑا اذیت ناک تھا۔ اس نے سڑک پر دوڑتی بھاگتی زندگی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا پھر دو چار قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اس نے شبنم کو اسپتال کے پاس ایک گاڑی سے اترتے دیکھا۔ گاڑی وہ خود ہی ڈرائیو کررہی تھی...... افضل خان کو تعجب ہوا پھر وہ مسکرا دیا۔ ”شاید میرے بعد بگ باس کی نظر عنایت نے شبنم کی ترقی کردی ہو۔“ اس نے سوچا پھر وہ نظریں جھکا کر شبنم کی نظروں سے دور ہوجانا چاہتا تھا کہ اتفاق سے شبنم نے بھی اسے دیکھ لیا، ایک پل کو وہ ٹھٹکی پھر لمبے لمبے قدم اٹھاتی اس کے قریب آگئی۔

”تم یہاں......؟“ اس نے افضل خان کو حیرت سے دیکھا۔ ”میں اس وقت تمہاری خیریت ہی دریافت کرنے آئی تھی۔“

”کیا بگ باس کو علم ہے کہ تم مجھ سے ملنے آئی ہو؟“

”ہو بھی سکتا ہے۔“ اس نے شانے اچکا کر حیرت کا اظہار کیا۔ ”لیکن اس وقت تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں ابھرا؟“

”مجھے اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا ہے۔“ افضل خان نے خود کو بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”تعجب ہے......“ اس نے افضل خان کو سر سے پاؤں تک گھورا۔ ”تم ابھی مکمل طور پر صحت مند نظر نہیں آرہے ہو پھر......“

”ڈاکٹر نے جو فیصلہ کیا اس میں بگ باس کا اشارہ بھی ضرور شامل ہوگا۔“

”یہ تمہارا ذاتی خیال ہے۔“ شبنم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو بگ باس مجھے بھی ضرور آگاہ کردیتا۔“

”یہ گاڑی......“ افضل خان نے اس کی گاڑی کی سمت دیکھا۔

”باس کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔“ شبنم نے جواب دیا۔

”اوہ...... گویا اب تمہاری اہمیت بڑھ گئی ہے......“

شبنم نے افضل خان کے جواب میں کھلے طنز کی تلخی محسوس کرلی تھی لیکن انجان بن کر معصومیت سے سوال کیا۔

”تم اس وقت کہاں جارہے ہو؟“

”میرے جواب پر شاید تمہیں یقین نہ آئے۔“ افضل خان کے ہونٹوں پر بڑا زہریلا تبسم جاگ اٹھا۔

”قبل از وقت کیے گئے فیصلے اکثر غلط بھی ثابت ہوتے ہیں.....“ اس بار شبنم نے مسکرا کر کہا۔

افضل خان حالات کی ستم ظریفی پر تڑپ اٹھا۔ بے حد سنجیدگی سے بولا۔ ”اس وقت مجھے کہیں قریب، کسی ایسی چھ سات منزلہ عمارت کی تلاش ہے جو میری مشکل آسان کردے۔“

”کیا مطلب......؟“ شبنم چونکی۔ ”کیا تم نے خودکشی کی ٹھان لی ہے؟“

”اب یہی ایک راستہ باقی رہ گیا ہے۔“ افضل خان ہونٹ چبانے لگا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تمہارا اپارٹمنٹ رہائش کے قابل نہیں رہا۔ پولیس نے ابھی تک اسے تالا لگا رکھا ہے لیکن......“ شبنم نے ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”اسی شہر میں میرا ایک چھوٹا موٹا فلیٹ بھی ہے۔“

”تم...... تم بگ باس کی ناراضی مول لے سکو گی......؟“

”میرے ساتھ چل کر گاڑی میں بیٹھو، باقی باتیں راستے میں اور فلیٹ پر پہنچنے کے بعد بھی ہو سکتی ہیں۔“

جواب میں افضل خان نے شبنم کو بہت غور سے دیکھا...... کچھ کہنے کے بجائے وہ قدم اٹھاتا اس کی گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا...... کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر شبنم نے سنجیدگی سے گفتگو کی ابتدا کی۔

”ہوسکتا ہے مجھے تمہارے ساتھ یہ ہمدردی مہنگی پڑے لیکن بگ باس نے مجھے تم سے دور رہنے کا کوئی اشارہ بھی نہیں دیا۔“

”تم چاہو تو کوئی رسک نہ لو...... مجھے یہیں کہیں راستے میں اتار دو۔“ افضل خان نے بجھی آواز میں جواب دیا۔

”باس سے تمہاری آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟“ شبنم نے پھر کچھ توقف کے بعد دریافت کیا۔ جواب میں افضل خان نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سراج کی موجودگی میں شیخ حامد سے ہونے والی تمام باتیں تفصیل سے دہرا دیں۔

”میرے مقابلے میں تم باس سے زیادہ قریب رہ چکے ہو......“ شبنم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”پولیس کے ڈی ایس پی اور ایس پی باس کی نظروں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے...... اگر اسے تمہارے بارے میں غور نہ کرنا ہوتا تو وہ اس کا اظہار کھل کر بھی کر سکتا تھا۔“

”کیا مطلب......؟“ افضل خان شبنم کا جواب سن کر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا بگ باس اب بھی مجھے کوئی چانس دے سکتا ہے؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی، مگر میرا خیال ہے کہ باس کو شاید ابھی تمہاری ضرورت ہو......“

”میں سمجھا نہیں۔“ افضل خان نے وضاحت چاہی۔

”تمہیں شاید کچھ اہم معاملات کا علم نہیں ہے۔“ شبنم نے بدستور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”ایک شخص ہے جو آج کل باس کے لیے خاصا ناقابل برداشت ثابت ہو رہا ہے۔ ممکن ہے تمہیں ایک آخری چانس اور دیا جائے۔“

”تت...... تم کس کی بات کر رہی ہو؟“

”میں فی الحال اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نکالنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں جو بگ باس کے لیے ناقابل برداشت ہو۔“ شبنم نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ ”خودکشی کے مقابلے میں اگر تم بگ باس کے لیے کسی آخری امتحان میں کامیاب ثابت ہوئے تو ممکن ہے باس تمہاری سابقہ کوتاہیوں کو بھی معاف کردے...... کیا یہ چانس لینا تمہارے لیے زیادہ کارآمد نہیں ہوگا؟“

”تم...... جانتی ہو کہ وہ شخص کون ہے؟“ افضل خان نے کسمسا کر دریافت کیا۔

”ہاں...... لیکن باس کی مرضی کے بغیر اس کا نام زبان تک نہیں لا سکتی۔“ شبنم نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”تم مجھے کیا مشورہ دو گی؟“ افضل خان نے شبنم کو کریدنے کی کوشش کی۔

”میں تمہارے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتی لیکن...... اتنا اندازہ ہے کہ باس نے تمہیں ہیرا سمجھ کر ہی اپنا دست راست بنایا ہوگا۔“ شبنم نے معنی خیز انداز میں ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”جو لوگ بلائنڈ کھیلنے کے عادی ہوں وہ چانس لینے میں ہچکچاتے بھی نہیں۔“

افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں شبنم کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور شبنم...... اسے یقین تھا کہ شیخ حامد نے ساؤنڈ پروف کمرے میں بلا کر اسے جو کام سونپا تھا وہ اس سلسلے میں اپنا پارٹ پلے کرنے میں صد فیصد کامیاب رہی تھی۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

عاقبت نااندیش

منظر امام

ڈوبتا سورج کبھی ابھرتے سورج کی ضمانت نہیں دیتا... یہ تو بس انسان کے اندر بسی ایک خوش فہم دنیا اسے آنے والے کل کی امید دلاتی ہے مگر... اس کے بھروسے پر کوئی غلطی پہ غلطی کرتا جائے، کہاں کی عقل مندی ہے؟ وہ بھی عقل کے اسی ہیرپھیر میں مبتلا جیسے جیسے آگے بڑھتا جارہا تھا ویسے ویسے اس پر دنیا کے بھید کھلتے جارہے تھے۔

...اجالے کے اس دور میں کچھ دوراندیشوں کا قصہ

ساری کہانیاں چار دائروں کے گرد گھومتی ہیں۔
یہ کہانیاں سبق دیتی ہیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیرتی ہیں۔ انسانی رشتے اور سارے جذبے ان کہانیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

یہ بھی ایک پرانی کہانی ہے۔ لیکن اس کہانی کو آج کے حالات اور ماحول کے تحت تبدیل کر دیا گیا ہے کیونکہ آج زندگی کے مسائل کل سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور حیرت انگیز ہو گئے ہیں۔

فرہاد علی ایک ایسا انسان تھا جس کو زندگی نے سوائے مفلسی اور پریشانی کے اور کچھ نہیں دیا تھا۔ اس نے کئی طرح کے کاروبار کیے اور ہر کاروبار نا کام ہوتا چلا گیا۔

فرہاد علی کو مذہب سے اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ ہر مصیبت کی گھڑی میں خدا کو یاد کرتا تھا۔ اس کے ساتھ جب ایک بار بہت زیادہ ایمرجنسی ہوگئی تو وہ نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں گھس گیا۔

جماعت ختم ہو چکی تھی' اس نے دو رکعت نوافل ادا کیے اور ہاتھ پھیلا کر گڑگڑانے لگا۔ "یا مولا میری پریشانیاں دور فرما دے تیرا بہت احسان ہوگا کیونکہ میں اپنی زندگی سے عاجز آچکا ہوں۔ اب مجھے موت ہی دے دے۔"

اس وقت کسی طرف سے ایک آواز آئی۔ "ہم نے تیری فریاد سن لی ہے۔ تجھے بہت جلد موت مل جائے گی۔"

فرہاد علی نے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ ہاتھ اٹھا دیے۔ "مولا۔ میں نے ابھی ابھی ایک آواز سنی ہے جو ظاہر ہے تیری آواز نہیں ہوگی لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اپنی زندگی سے بہت عاجز آچکا ہوں۔"

دوسری بار پھر آواز آئی۔ "تیری دعا قبول ہونے والی ہے۔ ٹھیک پانچ منٹ کے بعد تجھے موت آجائے گی۔"

فرہاد علی کو اب یقین ہو گیا کہ یہ آواز اس کے لیے اوپر ہی سے آئی ہے۔ اس نے فوراً اپنا پینترا بدلا۔ "دیکھ مولا کوئی ضروری نہیں ہے کہ تو میری ہر دعا قبول ہی کر لے اور بھی دکھ ہیں زمانے میں دعاؤں کے سوا۔ میں ایک مفلس آدمی ہوں بس میری مفلسی دور کرنے کی ترکیب بتا۔"

"ٹھیک ہے۔" پھر آواز آئی۔ "ہم نے تیری موت ٹال دی۔ اب تو موت کے فرشتے کو دیکھ سکے گا۔ جس کے سر پر موت کا فرشتہ دکھائی دے۔ سمجھ لینا کہ دو چار دنوں میں وہ مرنے والا ہے۔"

فرہاد علی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس تحفے کو اپنے لیے زحمت سمجھے یا رحمت، بہر حال مسجد سے اٹھ کر وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اس کی ملاقات خلیفہ نذیر سے ہو گئی۔ اس نے خلیفہ سے ادھار لے رکھا تھا اور خلیفہ جب بھی فرہاد علی سے ملتا اس کی بے عزتی کر کے رکھ دیتا۔ ابھی خلیفہ فرہاد علی کا گریبان پکڑنے ہی والا تھا کہ اسے خلیفہ کے سر پر ایک سفید سفید سی چیز منڈلاتی ہوئی دکھائی دے گئی۔

وہ موت کا فرشتہ ہو سکتا تھا۔

معمول کے مطابق خلیفہ نے اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ "ہاں اب بتا میرے پیسے کب دے رہا ہے۔ ایک وعدہ کرنا ورنہ جان سے مار دوں گا۔"

"ٹھیک ہے تین دنوں کے بعد۔" فرہاد علی نے بڑے اطمینان سے بتا دیا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" خلیفہ غصے سے بولا۔

"دیکھو خلیفہ میں نے شاید پہلی بار اتنے اطمینان کے ساتھ ایک ٹائم بتا دیا ہے۔ اس سے پہلے یہی کہا کرتا تھا کہ بس جیسے ہی ہوں گے دے دوں گا۔ اپنے ایمان سے کہو کبھی ایسی بات کی میں نے؟"

"نہیں۔" خلیفہ نے نرم ہو کر اس کا گریبان چھوڑ دیا تھا۔ "پہلے تو کبھی نہیں کہا۔"

"تو بس بھروسا کرو مجھ پر۔"

خلیفہ خوشی خوشی واپس چلا گیا۔ موت کا فرشتہ بدستور اس کے سر پر منڈلا رہا تھا اور دوسری شام ہی کو خلیفہ کی اچانک موت ہوگئی۔ فرہاد علی کے لیے یہ بہت زبردست خبر تھی۔ خدا نے اسے ایک بہت بڑی قوت دے دی تھی۔ اگر وہ سلیقے اور ہوشیاری سے کام لیتا تو اس کے وارے نیارے ہو سکتے تھے۔

وہ کئی دنوں تک سوچتا رہا کہ آخر اس قوت سے کیسے فائدہ اٹھایا جائے.... بالآخر کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد اسے ایک ترکیب سمجھ میں آگئی۔

سید نگر اس کے شہر سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرا شہر تھا۔ اس شہر میں فرہاد علی کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے یہاں ایک دکان کرائے پر لے لی اور ایک بڑا سا بورڈ لگوا لیا جس پر لکھا تھا۔ "حکیم چٹکی۔ دھمال پور والے۔"

دھمال پور نام کی کسی جگہ کے بارے میں اس نے کسی کتاب میں پڑھ رکھا تھا کہ وہاں بہت سے حکیم پیدا ہوئے ہیں بس وہ بھی دھمال پوری ہو گیا۔ اب اس کا پورا نام تھا حکیم فرہاد علی دھمال پوری۔

پہلے ہی دن ایک مریض اس کے پاس آگیا۔

وہ ایک جوان آدمی تھا۔ اسے صرف ہلکی سی کھانسی کی شکایت تھی لیکن فرہاد علی نے اس کے سر پر موت کے فرشتے کو منڈلاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

"حکیم صاحب مجھے پرسوں سے کھانسی ہے۔" مریض نے بتایا۔

"تو پھر؟"

"جناب میں آپ کے پاس علاج کے لیے آیا ہوں میرا علاج کریں۔"

"نہیں بھائی تمہارا علاج نہیں ہو سکتا۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ تمہاری آنکھیں یہ بتا رہی ہیں کہ کل یا پرسوں تمہارا انتقال ہونے والا ہے۔"

"حکیم صاحب تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔" مریض اکڑنے لگا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں مرنے والا ہوں کیا میں تمہیں بستر مرگ پر دکھائی دے رہا ہوں؟"

"تم نہیں سمجھو گے۔" فرہاد نے ایک گہری سانس لی۔ "تم میرا مشورہ مانو۔ گھر جاؤ۔ گھر والوں کے ساتھ وقت گزارو اور اگر اللہ اللہ کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔ کسی قسم کی وصیت کرنی ہو تو جا کر کر آؤ۔"

مریض نے فرہاد علی کا گریبان تھام لیا۔ "تیری حکمت کی تو ایسی کی تیسی۔ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ ابے اگر تو ایسا ہی افلاطون ہے تو اس سید نگر میں کیا جھک مار رہا ہے۔"

دو چار گھونسوں کے بعد فرہاد علی کرسی سے نیچے گر گیا اور مریض اسے برا بھلا کہتا گالیاں دیتا واپس چلا گیا تھا۔ اس نے شاید گھر واپس جا کر اپنے گھر والوں کو بھی فرہاد علی کی اس اچانک پیش گوئی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اسی لیے وہ سب کے سب فرہاد علی کو مارنے کے لیے چلے آئے تھے۔

فرہاد علی کو بھاگ کر جان بچانی پڑی تھی...... لیکن جب دوسری شام واقعی اس مریض کا انتقال ہو گیا تو پورے سید نگر میں فرہاد علی کی دھوم مچ گئی تھی۔

"کیا کمال کا حکیم ہے۔ آنکھیں دیکھ کر بتا دیا کہ مریض بچنے والا نہیں ہے۔"

"ہاں بھئی آج کل کے دور میں ایسے حکیم کہاں ملتے ہیں۔"

"یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اس جیسا ایک آدمی ہمارے شہر میں آگیا ہے۔"

فرہاد علی نے بڑی شان سے اپنی حکمت جاری رکھی۔ اس کے وارے نیارے ہو گئے تھے۔ اس کی حکمت کا ایک واقعہ بہت ہی دلچسپ تھا۔ ایک مریض چارپائی پر ڈال کر لایا گیا تھا۔

وہ ایک انتہائی ضعیف آدمی تھا۔

اس کے دونوں گردے جواب دے چکے تھے۔ گردوں میں پانی بھر گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ مگر فرہاد علی کا یہ خیال تھا کہ یہ بندہ دو چار دنوں سے زیادہ کا نہیں ہے لیکن حیرت انگیز طور پر موت کا فرشتہ اس کے سر پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

فرہاد نے ایک مرتبان سے تھوڑی سی مٹی نکال کر ایک پڑیا میں باندھتے ہوئے بوڑھے کے ساتھ آئے ہوئے آدمی سے پوچھا۔

"اس آدمی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

"یہ میرے دادا جی ہیں حکیم صاحب۔ ان کا سایا ہے ہمارے سر پر ہے لیکن اب یہ سایا بھی اٹھنے والا ہے۔"

"یہ کس نے کہہ دیا کہ سایا اٹھنے والا ہے۔"

"ان کی حالت بتا رہی ہے حکیم صاحب۔ دادا جی بس دو چار دنوں کے مہمان ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" فرہاد علی مسکرا دیا۔ "تمہارے دادا ابھی زندہ رہیں گے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں۔ سارے ڈاکٹرز نے جواب دے دیا ہے۔"

"ہو سکتا ہے لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔ یہ لو یہ ایک پڑیا ہے ان کے منہ میں ڈال دو۔"

"لیکن یہ تو مٹی ہے۔"

"اس کی پروا مت کرو میرا نام حکیم چٹکی دھمال پور والے ہے۔ میں نے ایک چٹکی دے دی ہے' یہ اب بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

بوڑھے کے پوتے نے یقین نہ کرنے والے انداز سے فرہاد سے وہ پڑیا لے لی اور مریض کو لے کر واپس چلا گیا۔

تین دن کے بعد ایک عورت فرہاد علی کے پاس آگئی۔ "حکیم جی یہ بتاؤ ہم لوگوں سے کب کی دشمنی نکالی ہے تم نے؟"

"کیوں خاتون۔ کیا بات ہو گئی ہے' خیریت تو ہے نا؟"

"تم کو یاد ہے حکیم جی۔ پرسوں ایک مرتا ہوا بوڑھا تمہارے پاس آیا تھا میرا میاں اس کو لے کر آیا تھا۔"

"ہاں یاد تو ہے کیا اس کا انتقال ہو گیا؟"

"انتقال تو نہیں ہوا وہ بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔" عورت نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

"اچھا۔" فرہاد علی خوشی سے لرزنے لگا تھا۔ "یہ تو بہت زبردست بات ہو گئی۔ مبارک ہو تم لوگوں کو۔"

"ارے کس بات کی مبارک۔" عورت غصے سے بولی۔ "اس بوڑھے نے تو ہم سب کو پریشان کر رکھا تھا' ہر بات میں روک ٹوک گھر میں دن بھر بک بک پھر وہ بیمار پڑ گئے تھے تو پورے گھر نے سکون کی سانس لی، چلو اب جان

چھوٹ جائے گی لیکن تم نے دوبارہ اسے صحت مند کر کے ہمارے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے۔"

"دیکھیں نیک بخت خاتون۔" فرہاد علی کے ہونٹوں پر اپنی شاندار کامیابی کی مسکراہٹ چپک کر رہ گئی تھی۔ "میں حکیم ہوں، میرا کام علاج کرنا ہے کسی کو مارنا نہیں ہے۔ تمہیں تو اس بات کی خوشی ہونی چاہیے کہ تمہارے شہر میں مجھ جیسا ایک حکیم موجود ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اس بوڑھے کا کامیاب علاج کر دیا ہے تم مجھے مبارکباد دو گی۔ تم تو الٹا مجھ پر ناراض ہو رہی ہو۔"

"ارے بھاڑ میں جائے تمہاری مبارکباد۔ میں تو تمہیں گالیاں دینے آئی تھی۔"

فرہاد علی اپنی کامیابی پر خوش ہوتا رہا اور وہ عورت اسے برا بھلا کہتی ہوئی واپس چلی گئی۔

پورے سید نگر میں فرہاد علی کی واہ واہ ہو گئی تھی۔ "واہ حکیم ہو تو حکیم چٹکی جیسا ہو۔ مردے تک کو چٹکی بھر مٹی دے تو نعرے لگاتا ہوا اٹھ کھڑا ہو اور جس کو کہہ دے کہ تم لاعلاج ہو چکے ہو موت تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کا علاج نہیں کر سکتی۔"

فرہاد علی نے کامیابی کا سفر طے کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنی فیس میں بے تحاشا اضافہ کر دیا تھا پھر بھی لوگ اس کے مطب کے سامنے لائن لگائے کھڑے رہتے۔

ایک دن اس نے اپنے ہی سر پر موت کے فرشتے کو منڈلاتے ہوئے دیکھ لیا۔

اس کے ہوش اڑ گئے تھے اس نے اتنی جلدی مرنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔ ابھی ابھی تو اس نے دولت کمانی شروع کی تھی اور ابھی سے موت کا فرشتہ اس کے سر پر منڈلانے لگا تھا۔

وہ ایک بار پھر بہت دنوں کے بعد مسجد میں داخل ہوا تھا۔ اس نے دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ "میرے مولا۔ ابھی تو میں نے زندگی کو پوری طرح انجوائے بھی نہیں کیا ہے اور تو نے خود میرے ہی سر پر موت کے فرشتے کو بٹھا دیا۔"

وہ بہت دیر تک گریہ وزاری کرتا رہا۔ دعائیں مانگتا رہا لیکن جواب میں کوئی آواز نہیں آئی۔ البتہ وہ روتا کراہتا ہوا مسجد سے باہر آ گیا۔

وہ ابھی مسجد سے تھوڑی دور ہی گیا ہو گا کہ ایک آدمی نے آواز دے کر روک لیا۔ "حکیم صاحب! ایک منٹ کے لیے ذرا بات سن لو۔"

فرہاد علی رک گیا۔ اسے مخاطب کرنے والا ایک ادھیڑ عمر کا باوقار انسان تھا جس کے چہرے پر گھنی مونچھوں نے اسے اور بھی باوقار بنا دیا تھا۔ وہ فرہاد علی کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ "حکیم صاحب۔ بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ بس یونہی۔"

"یونہی تو نہیں موت کے فرشتے نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے۔" اس آدمی نے کہا۔

"کیا!" فرہاد علی چونک اٹھا تھا۔ "تمہیں کیسے معلوم؟"

"اس لیے کہ میرے پاس بھی وہ قوت ہے جس کی مدد سے موت کے فرشتے کو دیکھ سکتا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "تم مرنے والے ہو یہ تو تمہیں معلوم ہو گا لیکن یہ نہیں بتا سکو گے کہ کس وقت جب کہ میں بالکل صحیح وقت بتا سکتا ہوں۔ اب تم بتاؤ کہ تم کیا کرو گے؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔" فرہاد علی نے کہا۔

"چلو میرے ساتھ۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔"

"سامنے کی بات ہے ابھی تم نے زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے۔" اس آدمی نے کہا۔ "کوئی تفریح نہیں، کوئی انجوائمنٹ نہیں۔ زندگی تمہارے سامنے بنجر میدان کی طرح ہے۔ اسی لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی موت سے پہلے زندگی کو قریب سے دیکھ لو اس کے سارے رنگ اپنے آنکھوں میں سمیٹ لو۔ اپنی ساری خواہشیں پوری کر لو تاکہ تمہیں کوئی دکھ نہ ہو کوئی حسرت باقی نہ رہے۔ کہو تیار ہو۔"

"ہاں تیار ہی ہوں۔" فرہاد علی بھی رضامند ہو گیا تھا۔ "تم جو کہو گے میں وہی کروں گا۔"

☆☆☆

پہلا رنگ۔ وہ آدمی فرہاد علی کو سید نگر سے نکال کر ایک بڑے شہر میں لے آیا تھا۔ اس نے فرہاد علی سے کہا۔ "بس تم میرے ساتھ ساتھ چلتے رہو۔ تمہیں بہت کچھ معلوم ہوتا چلا جائے گا۔"

وہ دونوں اس وقت ایک مارکیٹ سے گزر رہے تھے جب فرہاد علی نے ایک دکاندار کے سر پر موت کے فرشتے کو منڈلاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ کپڑوں کی دکان تھی اور دکاندار ایک عورت سے دکانداری کرنے میں مصروف تھا۔

"ارے وہ دیکھو۔" فرہاد علی نے اس دکاندار کی

طرف اشارہ کیا۔ "وہ اس کے سر کے اوپر۔"

"ہاں میں بھی دیکھ چکا ہوں۔" اس آدمی نے کہا۔ "چلو قریب چل کر ان کی باتیں سنتے ہیں۔"

دکاندار اس عورت کو کوئی کپڑا جاپانی کہہ کر فروخت کر رہا تھا۔ اس نے اس عورت کو اس کی قیمت دو سو روپے میٹر بتائی تھی۔

"خود دیکھ لو۔" اس نے فرہاد علی سے کہا۔ "اول تو یہ کپڑا جاپانی نہیں پاکستانی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی قیمت اسی روپے میٹر سے زیادہ نہیں ہے۔"

"میرے خدا اتنی چوربازاری۔" فرہاد علی نے حیرت ظاہر کی۔ "چلو چل کر اسے بتاتے ہیں کہ اس کے سر پر موت منڈلا رہی ہے۔"

"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" اس آدمی نے کہا۔ "بلکہ ایسا کرو کہ اسے بھڑکانے کی کوشش کرو۔ اسے بھی زندگی سے بھرپور لطف اٹھانے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس نے اچھا خاصا لطف اٹھا لیا ہو گا۔"

"لیکن آخری وقت کے لطف کی بات اور ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ اپنی موت کے بعد بھی تمہیں یاد رکھے گا۔"

فرہاد علی اور اس آدمی نے مل کر اس دکاندار کو یقین دلا دیا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ بالکل درست ہے بلکہ اسے کچھ اور بھی کرنا چاہیے کیونکہ وقت بہت تیزی سے اس کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔"

دکاندار نے نہ صرف ان دونوں کا شکریہ ادا کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ اس پیغام کو دوسرے دکانداروں تک بھی پہنچانے کی کوشش کرے گا۔

دوسرا رنگ۔ ایک جگہ انہیں کچھ مذہبی لوگ دکھائی دیے۔ جو اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ فلاں فرقہ صحیح ہے یا غلط۔ چھٹی جمعہ کے دن ہونی چاہیے یا اتوار کے دن۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی ایسے مسائل تھے، جن میں وہ الجھے ہوئے تھے اور ان میں سے کئی لوگوں کی سروں پر موت کا فرشتہ منڈلا رہا تھا۔

"ارے۔ یہ لوگ کن چکروں میں الجھے ہوئے ہیں؟" فرہاد علی نے حیرت ظاہر کی۔ "ان کو سمجھاؤ۔"

"نہیں۔ انہیں اپنے آخری اوقات میں کھل کر اپنے مسلک کی تبلیغ کرنی چاہیے۔" اس آدمی نے کہا۔ "صرف زبانی مباحثے سے کام نہیں چلے گا۔ ان سے کہو کہ یہ ایک

مقولہ

ایک شخص نے کسی سے یہ مثل سن رکھی تھی کہ زر کو زر کھینچتا ہے۔ اس کے پاس صرف ایک روپیہ تھا۔ اس قول کی آزمائش کے لیے وہ ایک صراف کی دکان پر پہنچا اور اپنا روپیہ صراف کے روپوں کے ڈھیر کی طرف پھینک کر انتظار کرنے لگا کہ اب روپیہ کتنے روپوں کو کھینچ کر لاتا ہے لیکن کوئی روپیہ نہ آیا۔ صراف نے اسے اپنی دکان پر اس طرح کھڑا دیکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے، تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

اس نے جواب دیا "میں اپنے روپے کے ساتھ دوسرے روپوں کا منتظر ہوں۔"

اس پر صراف نے مسکرا کر کہا "میرے روپے زیادہ تھے اس لیے انہوں نے تمہارے ایک روپے کو کھینچ لیا۔ تمہارا مقولہ سچا ہے کہ زر کو زر کھینچتا ہے۔"

☆☆☆

مزاحیہ اداکار نے نرمی سے پوچھا۔ "کیا میں اگلے جنم میں گدھا بن سکتا ہوں؟"

نجومی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ایک ہی روپ بار بار نہیں ملتا۔"

☆☆☆

ایک بار تین مسافروں کو جنگل میں رات گزارنی پڑی۔ گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دو مسافروں نے اقرار کر لیا کہ وہ بے حد ڈر گئے ہیں۔ تیسرے کو بھی ڈر لگ رہا تھا لیکن وہ اس کا اقرار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تجویز پیش کی۔ "اگر تم لوگ زیادہ ڈر گئے ہو تو تم میں سے ایک میرے دائیں جانب سو جائے اور دوسرا بائیں جانب۔"

مرسلہ: مریم متین، ڈیلاس، یو ایس اے

دوسرے کو مارنا بھی شروع کریں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ یہ بے چارے اپنے آخری دنوں میں ایسی منزل کا تجربہ کرلیں گے جو انہیں کبھی حاصل نہیں ہوئی ہوگی۔"

پھر ان دونوں نے وہی کیا۔

مذہبی لوگوں نے ان کی بات مان لی اور وہیں فساد شروع ہوگیا۔ ان میں سے دو چار تو on the spot ہی ٹھنڈے ہوگئے تھے۔

تیسرا رنگ۔ وہ کچھ سیاست دان تھے جو آپس میں الجھے ہوئے تھے اور ان کے سروں پر بھی موت کے فرشتے منڈلا رہے تھے۔ ان میں سے ایک معقول صورت آدمی نے کہا۔ "ہم پر روزانہ ڈرون حملے ہو رہے ہیں۔ دشمن ہمارے گھروں کے دروازوں تک پہنچ گیا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" دوسرے نے اس کی تائید کی۔ "یہ ایک اہم ایشو ہے لیکن اس سے زیادہ اہم اس بات کا فیصلہ ہے کہ ہم فلاں تاریخ کو جلوس نکالیں یا نہ نکالیں۔"

"دیکھیں۔ دشمن نے چاروں طرف سے ہمارا گھیراؤ کرلیا ہے۔" معقول صورت نے دہائی دی۔

"یہ ہم بھی جانتے ہیں بے وقوف۔" ایک سیاست دان نے کہا۔ "لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ ایک بااثر شخص کی بیٹی کو اضافی نمبروں سے پاس کردیا گیا ہے۔ ہم اس معاملے کو دیکھیں یا دشمنوں پر نگاہ رکھیں؟"

"دیکھیں۔ آئی ایم ایف نے قرضوں کی شرائط بہت سخت کردی ہیں۔"

"بالکل ٹھیک لیکن لگژری طیاروں کی خریداری بھی تو ضروری ہے۔ ہمارے بڑے بڑے وزیر سائیکل پر تو سواری نہیں کرسکتے نا۔"

"بھائی یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" فرہاد علی نے اس آدمی کا بازو تھام لیا۔

"جو کچھ ہو رہا ہے۔ بالکل ٹھیک ہو رہا ہے۔" اس آدمی نے کہا۔ "خود سوچو اگر یہ سب نہ ہو تو پھر انہیں سیاست دان کون کہے۔"

"لیکن موت تو سروں پر منڈلا رہی ہے نا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ خود ان کو تو دکھائی نہیں دے رہی۔ یہ تو میں اور تم دیکھ رہے ہیں۔"

"کیا ان سے کچھ نہیں کہنا؟"

"نہیں۔ ان سے کچھ نہیں کہنا۔ خود ہی سمجھدار ہیں۔ آؤ آگے بڑھتے ہیں۔"

غرضیکہ وہ شخص فرہاد علی کو جگہ جگہ لیے پھرا۔ ہر جگہ لوگوں کے سروں پر موت کے فرشتے منڈلاتے دکھائی دے رہے تھے لیکن کوئی بھی اپنی ڈگر سے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ فرہاد علی نے ایک جگہ رک کر اس سے پوچھا۔ "بھائی تم یہ بتادو کہ تم کون ہو۔ تم نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کروایا۔"

"کمال ہے۔ تم مجھے پہچان نہیں سکے۔" وہ مسکرا دیا۔ "بھئی۔ میں شیطان ہوں۔"

"شیطان۔" فرہاد علی نے لاحول پڑھنی شروع کردی۔

"کوئی فائدہ نہیں۔" شیطان ہنس پڑا۔ "لاحول پڑھ تو رہے ہو لیکن میں تمہارے وجود میں حلول کرچکا ہوں۔ اپنے وجود کو کیسے خود سے دور کرو گے؟"

"مردود۔" فرہاد علی غصے سے دہاڑا۔ "یہ تم نے مجھے کس کام پر لگادیا۔ تمہارے کہنے پر میں لوگوں کو بھڑکا تا رہا ہوں۔"

"میرے بھولے دوست اگر میں راستے سے ہٹ جاؤں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ تم جس قوم کے فرد ہو اس قوم کی یہی صورت حال ہے۔ موت سروں پر منڈلا رہی ہے اور فرقوں کی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ موت سروں پر ہے اور دھرنے اور جلوس کی بات ہو رہی ہے۔ موت سروں پر ہے اور چوری اور بے ایمانی کیے چلے جا رہے ہیں۔"

"میرے خدا۔" فرہاد علی نے ایک گہری سانس لی۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری موت بالکل صحیح وقت پر ہونے والی ہے۔ میں لوگوں کی ایسی حالت دیکھنے کے لیے مزید زندہ نہیں رہوں گا۔"

"یہ کس نے کہہ دیا۔" شیطان ہنس پڑا۔ "تمہارے سر سے موت کا فرشتہ ہٹا لیا گیا ہے اب تم زندہ رہو گے اور یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہو گے۔ دیکھتے رہو گے۔ دیکھتے رہو گے۔"

اور اب اس قوم میں بہت سے فرہاد علی ہیں جو اپنی آنسوؤں بھری آنکھوں سے اس قوم کی حالت دیکھ رہے ہیں اور جب وہ یہ سب دیکھ دیکھ کر خون کے آنسو رونے لگتے ہیں اور موت کی دعائیں مانگتے ہیں تو پھر انہیں موت بھی نہیں آتی۔

☆☆

سیر کو سوا سیر

سیدہ عابدہ نرجس

روپ بدلتی اس دنیا کا ایک اور انوکھا روپ

بھیس بدل کر بھید کھولنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ جب اندھیروں نے پنکھ پھیلائے... جب سناٹوں کا راج ہو اور جب ہر شے نے سکوت کی چادر اوڑھ لی تو دھیرے دھیرے وہ ایک سایا حرکت کرنے لگا جس کی ہیبت نے بہت سوں کو گنگ کرڈالا... دل کی دھڑکن میں بھی طوفان برپا ہوا مگر افسوس... وہ کیا تھا اور کیا نکلا۔ اس کی حقیقت کو جب وہ سمجھا تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

میں نے ابھی کمرے میں روشنی بھی نہیں کی تھی کہ مجھے محسوس ہوا جیسے کھڑکی کے ساتھ ساتھ کوئی تاریک سایہ بڑے پراسرار انداز میں رینگ رہا ہے۔ چاند کی مدھم زرد روشنی اسے ایک دھبے کی مانند نگاہوں کے سامنے لا رہی تھی۔ میں لمحے بھر کو ٹھٹک گیا اور میں نے روشنی کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اس کی نقل و حرکت کا بغور جائزہ لینے لگا۔

گھر میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس وقت گھر کے مکین گھر میں موجود نہیں ہیں اسی لیے وہ زیادہ احتیاط سے کام نہیں لے رہا تھا اور کھڑکی کے فریم کے ساتھ ساتھ عام رفتار سے چلتا جا رہا تھا۔ میں مسلسل اسے نگاہ

میں رکھے ہوئے تھا۔ وہ اب دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے پتلون کی جیب سے ریوالور نکال لیا تا کہ کوئی خطرناک صورت پیش آجائے تو اپنی حفاظت کرسکوں۔

اس نے شاید دروازے کو دھکیلا تھا۔ مگر میں اسے بند کر چکا تھا۔ وہ پھر کھڑکی کی طرف آیا۔ کچھ دیر کھڑکی پر ہاتھ مارتا رہا جیسے اسے کھولنے کی کوشش میں ہو...... پھر وہ کھڑکی سے دور ہٹ گیا۔ میں نے سمجھا شاید وہ ہمت ہار بیٹھا ہے اور میرے حق میں یہی بہتر تھا۔ میں اس وقت بالکل کسی چور ڈاکو سے مقابلہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور کمرے میں روشنی کرنے کی غرض سے بٹن دبانا ہی چاہتا تھا کہ کھڑکی کے شیشے کے ساتھ کوئی سخت شے ٹکرائی اور چھناکے کی آواز کے ساتھ شیشے کی کرچیاں بکھر گئیں۔ میں ہوشیار ہو گیا اور پستول اپنے ہاتھ میں سنبھال لیا۔ پھر ایک ہاتھ اندر آیا اور کنڈی ٹٹول کر کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں بڑے صبر و تحمل سے اس کی یہ حرکتیں دیکھتا رہا اور پستول سے اس کی جانب نشانہ لیے کسی متوقع خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

کھڑکی کے پٹ کھل جانے کی وجہ سے چاند کی مدھم زرد روشنی کمرے میں پھیل گئی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ گیا تا کہ اگر وہ کھڑکی کے راستے اندر آنے کی کوشش کرے تو مجھے نہ دیکھ سکے۔ اگلے ہی لمحے وہ کھڑکی کے راستے اندر کود گیا...... اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر میں نے جلدی سے لائٹ جلا دی۔

کمرا تیز روشنی سے بھر گیا...... اس کی آنکھیں چندھیا گئیں، اس نے ہکا بکا ہو کر چاروں طرف دیکھا...... میرے ہاتھ میں موجود پستول کا رخ اپنی طرف دیکھ کر اس کی چندھیائی ہوئی آنکھیں پوری طرح پھیل گئیں۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ بے چارے کا منہ بالکل ہی اتر گیا۔

''ہینڈز اپ......!'' میں نے اس کی گھبراہٹ کا لحاظ کرتے ہوئے بڑی شرافت سے کہا۔

اس نے ایک دم ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لیے...... اب میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا، وہ شکل سے ہی پرلے درجے کا احمق نظر آتا تھا۔ وہ نسبتاً چھوٹے قد کا ایک ڈھیلا ڈھالا سا انسان تھا۔ اس کا لباس بھی معمولی تھا۔ بہ ظاہر اس کی شخصیت میں کوئی کشش نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس جیسا احمق شخص بھی کسی کے گھر میں یوں دیدہ دلیری سے داخل ہوسکتا ہے۔ وہ ابھی تک صورت حال کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پایا تھا اور خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہاں تو جناب، کیا ارادے تھے آپ کے......؟'' میں نے اس کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے تمسخر سے کہا۔ اب مجھے اس کی ہیت کذائی پر ترس بھی آنے لگا تھا۔

اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوک نگل کر حلق تر کرتے ہوئے بولا۔ ''میں خود نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہو گیا تھا اور...... اور میں نے یہ حماقت کیوں کی ہے۔''

''فکر نہ کرو......'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تمہیں ابھی پتا چل جاتا ہے کہ تمہیں کیا ہوا تھا اور تم نے کیا، کیا ہے؟'' میں ٹیلی فون کی طرف بڑھا تو جیسے اس کا حلق خشک ہو گیا، وہ پاگلوں کی طرح میری جانب پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔

اسی دوران میرے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا اور میں نے اس کے ساتھ ایک سودا کرنے کی ٹھانی ''مسٹر معلوم ہوتا ہے تم تجوریاں اور سیف کھولنے والے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہو جو رات کی تاریکی میں بغیر کوئی نشان چھوڑے اپنا کام دکھا جاتا ہے...... لیکن تمہارے چہرے پر حماقت کچھ اتنی موسلا دھار برس رہی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے تم ابھی کہو گے کہ تم سوتے میں چلنے کے عادی ہو...... اور تمہاری آنکھ کھلی، تو تم نے خود کو اس گھر میں پایا۔''

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ ابھی تک ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے وحشت زدہ چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی جیبیں ٹٹولیں۔ یہ یقین کر لینے کے بعد کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں، میں نے اسے ہاتھ نیچے کر لینے کی اجازت دیدی...... اس کی جیسے جان میں جان آگئی۔

میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کی اور خود ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے بھی بیٹھ جانے کے لیے کہا اور بڑی بردباری سے تمہید باندھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس پر رعب ڈالوں اس لیے میں نے بات گھما پھرا کر شروع کی۔

''اس سے پہلے کہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کردوں۔ میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں...... لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا تم جانتے ہو کہ تم اس وقت کہاں اور کس کے گھر میں ہو......؟''

خلاف توقع اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ''جی ہاں...... میں نے ابھی باہر لگا ہوا بورڈ پڑھا ہے۔ میں انسپکٹر قریشی صاحب کے دولت کدے پر ہوں۔''

''بکو مت......'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ''یہ بورڈ تم نے ابھی نہیں پڑھا بلکہ تم نے اخبار میں یہ خبر پڑھی ہے کہ مشہور

سوشل ورکر مسز قریشی امدادی کیمپ میں تین روز تک مصروف رہیں گی...... اور تم نے سوچا کہ تمہیں انسپکٹر قریشی کا گھر خالی ملے گا اور پھر بے چارا انسپکٹر تو یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ کوئی دیدہ دلیر چور اس کے یہاں چوری کرنے کی جرأت بھی کرسکتا ہے۔''

میری اس تقریر کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ الٹا اس نے پیشانی پر شکنیں ڈال کر بیزاری سے کہا۔ ''جو ہونا تھا، ہو چکا...... اب اگر میں آپ کے ہاتھ آ ہی گیا ہوں، تو آپ ذرا جلدی فیصلہ کریں کہ آپ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں۔''

مجھے غصہ تو بہت آیا، جی چاہا کہ اس گستاخ کی طبیعت ابھی صاف کردوں لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ وہ میرے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے، اسی لیے میں نے غصے پر قابو پا لیا اور نارمل انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ''اچھا اب مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم کس شعبے کی مہارت رکھتے ہو؟''

''کیا مطلب......؟'' اس نے تجاہلِ عارفانہ سے سوالیہ انداز میں ابرو اچکائے۔

''یعنی...... میرا مطلب ہے کہ تمہاری ان مجرمانہ سرگرمیوں کا دائرہ کار کیا ہے، تم تالے کھولنے کے ماہر ہو، تجوریاں توڑتے ہو یا نقب وغیرہ لگاتے ہو؟ تم کس فن کے ماہر ہو......؟''

میں نے تھوڑا توقف کیا کہ شاید وہ کچھ بولے گا لیکن وہ اسی طرح ہونٹ بھینچے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہا۔ کم بخت میرے اندازے سے کچھ زیادہ ہی چالاک ثابت ہو رہا تھا۔ حالانکہ بہ ظاہر اس کے چہرے پر حماقت بری طرح برس رہی تھی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''دیکھو...... میں جانتا ہوں کہ تم ان زیورات کی تاک میں ہو جو گزشتہ دنوں مسز قریشی کو ان کی والدہ کی طرف سے ترکے میں ملے ہیں اور وہ اس لوہے کے سیف میں ہیں...... اب تم یہ بتاؤ کہ تم انہیں حاصل کرنے کے لیے کیا ترکیب آزماؤ گے؟''

وہ چند لمحے بڑی بے نیازی سے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ میں اس کی طرف جواب حاصل کرنے کی غرض سے دیکھ رہا ہوں تو عجیب بے پروا سے انداز میں بولا۔ ''یہ سیف...؟ اونہہ...... اس سیف کو تو میں دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں کہ کس کمپنی کا بنا ہوا ہے...... کس طرح کھلتا ہے، اس میں کتنے تالے ہیں اور اس کے الارم کو کس طرح بیکار کیا جاسکتا ہے؟''

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ کام کا آدمی تھا اور میری مدد کرسکتا تھا۔ میں نے اپنے لہجے کو ملائم کیا اور سنجیدگی

سے کہا۔ ''اگر تم پانچ منٹ کے اندر اس سیف کو کھول دو...... تو میں تمہیں اسی کھڑکی سے باہر جانے کی اجازت دے دوں گا اور تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو...... ؟'' اس نے غیر یقینی سے پوچھا۔

''بالکل...... میں نے جیسا کہا ہے، ویسا ہی کروں گا۔ بشرطیکہ تم یہ سیف کھولنے میں کامیاب ہو جاؤ......'' میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

اس نے سر جھٹکا اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اچھا...... دیکھتے ہیں، ایک کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ دعا کرو کہ قسمت مہربان ہو جائے، ورنہ تو آج ستارے گردش میں ہی ہیں۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا سیف کے قریب پہنچا...... اور اس کا جائزہ لینے لگا۔

میں دلچسپی اور تجسس سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں اتنی خاموشی تھی کہ میں اس کے اور اپنے سانس لینے کی آواز بھی سن سکتا تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی زور سے چیخی اور دبیز خاموشی کی تہوں کو چور چور ہوتے دیکھ کر ہم دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے میرے چہرے کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا کہ میں بڑھ کر ریسیور اٹھاتا ہوں یا نہیں لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔

وہ منحنی سا آدمی اپنے دونوں ہاتھ جیب میں ڈالے ہوئے میری جانب مڑ کر جیسے انتظار کرنے لگا کہ میں فون پر بات کر لوں تو وہ اپنا کام کرے۔ میں نے اب بھی فون کی طرف توجہ نہیں دی تو وہ رہ نہیں سکا اور قدرے جھلا کر بولا۔ ''ٹیلی فون کیوں نہیں سنتے آپ......؟''

''اس کو بجنے دو...... تم اپنا کام کرو۔'' میں نے ہلکی سی سختی سے اسے حکم دیا۔

وہ ڈھیٹ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں اور اس نے بڑے غور سے میری جانب دیکھا اور یوں سر ہلایا۔ جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہو، پھر میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا بات ہے؟ آپ یہ فون کیوں نہیں سن رہے، میرا اندازہ ہے کہ آپ اس وقت اپنے گھر پر اپنی موجودگی ظاہر نہیں کرنا چاہتے...... آخر کیوں......؟ کوئی وجہ تو ہو گی......؟''

اس نے اپنی بات ختم کر کے نگاہیں مجھ پر گاڑ دیں۔

میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور فون کی پانچویں گھنٹی بجی۔ ''بہت ہو چکی اب اپنی یہ بکواس بند کرو...... اگر کام کرنا ہے تو کرو ورنہ......''

اس پر میری اس دھمکی کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوا۔ وہ بہ دستور میرے سامنے ڈٹا رہا...... اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''جناب یہ آپ مجھے کسی زیادہ ہی سنگین جرم میں پھنسانا چاہتے ہیں، لیکن میں بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں...... میں اسی انداز میں گرفتار ہونا پسند کروں گا کہ میں غیر قانونی طور پر اس گھر میں داخل ہوا ہوں، لیکن میں آپ کا آلۂ کار نہیں بنوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ بڑے اطمینان سے ایک کرسی پر جا بیٹھا اور بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ ''جناب، جب تک آپ مجھے اپنا پورا منصوبہ نہیں سمجھاتے؛ میں آپ کا کوئی کام نہیں کر سکتا۔ میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔''

میں نے غصے سے دانت پیسے...... یہ بڈھا تو لومڑی کی طرح چالاک تھا۔ کم بخت کے بے ڈول سر میں بھیجا بھی تھا جو بڑے دور کی کوڑی لایا تھا، مگر اس کی مدد کے بغیر میرا مقصد حاصل ہونا بھی تو ممکن نہیں تھا۔

''دیکھو......'' مجبوراً مجھے کہنا پڑا۔ ''یہ ایک خاندانی راز ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی دوسرے کو اس کی ہوا بھی لگے...... لیکن تم ایسے ڈھیٹ انسان ہو کہ تم نے مجھے اس کو زبان پر لانے پر مجبور کر دیا ہے...... مگر اب وعدہ کرو کہ تم اس کی حفاظت کرو گے...... اور یہ تمہارے سینے میں دفن رہے گا۔''

''بالکل بالکل......'' اس نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اتنی انسانیت کی توقع تو تم مجھ سے یقیناً رکھ سکتے ہو۔''

''میں تمہیں ایک منٹ میں پولیس کے حوالے بھی کر سکتا ہوں سمجھے......'' میں اس کے مدبرانہ انداز پر چڑ سا گیا۔ ''لیکن تم ایک مفید آدمی ہو اور تمہارا فن تمہاری حفاظت کر رہا ہے...... اس وقت تم میرے کام آ سکتے ہو...... اس لیے میں تمہیں یہ سب کچھ بتا رہا ہوں...... کہ میں اس سیف کو زیورات اور ہیرے جواہرات کے لیے نہیں کھولنا چاہتا...... بلکہ مجھے ایک اور چیز کی تلاش ہے۔'' میں نے پراسرار لہجے میں کہا تو اس کی آنکھیں تجسس سے چمکنے لگیں۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

''مجھے کچھ خطوط کی تلاش ہے...... جو میری بیوی کے ماضی کی یادگار ہیں۔ مجھے کچھ روز ہوئے ان کے بارے میں پتا چلا ہے۔ میں ان خطوط کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہوں لیکن اس طرح کہ اسے فی الحال شک نہ ہو کہ انہیں نکالنے میں میرا ہاتھ ہے۔ بس یہی میرا منصوبہ ہے اور میرا خیال ہے کہ اس سے تم جیسے اونچی نسل کے بدمعاش کو کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہو سکتا۔''

''ہوں......'' اس نے ایک طویل سانس لیا۔ یوں جیسے اسے میری بات پر یقین آ گیا ہو...... لیکن اس کے چہرے پر

ہمدردی کا کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ بلکہ وہ کاروباری لہجے میں پوچھنے لگا۔ ''اس سارے قصے میں مجھے کیا حاصل ہو گا؟''

غصے سے میرا برا حال ہو گیا۔ میں نے بہ مشکل خود کو چیخنے سے روکا اور دانت پیس کر کہا...... ''الو کے پٹھے...... تم جیل میں سڑنے سے بچ جاؤ گے...... سمجھے...... تم جانتے ہو کہ تم نے ایک انسپکٹر کے گھر میں داخل ہونے کی غلطی کی ہے۔''

وہ تمسخر سے ہنسا۔ ''جناب اب مجھے آپ کی نہیں، آپ کو میری ضرورت ہے۔ میرا کیا ہے...... میں جیل میں کچھ دن سرکاری مہمان داری کا لطف اٹھا لوں گا اور بس...... لیکن آپ کو سیف کھولنے کا اس سے اچھا موقع شاید پھر کبھی نہیں ملے گا، ویسے آپس کی بات ہے اگر آپ مجھے کچھ زیورات یا ہیروں پر ہاتھ صاف کرنے دیں، تو یہ ایک حقیقی واردات معلوم ہو گی۔ ورنہ دوسری صورت میں آپ کی بیگم صاحبہ کو آپ پر بھی شک ہو سکتا ہے۔''

میں زچ ہو گیا۔ ''اب کچھ کرو گے بھی یا یونہی بک بک کیے جاؤ گے۔''

''یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔'' وہ بڑی مکاری سے کہنے لگا۔

''اچھا...... اچھا...... میں تمہارا منہ بند کر دوں گا...... مگر تم کچھ کرو تو سہی......'' میں نے اس بک بک سے تنگ آ کر کہا۔

وہ آستین چڑھاتا ہوا اٹھا اور بڑی متانت سے کہنے لگا۔ ''ٹھیک ہے...... میں پوری کوشش کروں گا۔''

''تمہیں کسی ہتھوڑی یا اوزار وغیرہ کی ضرورت تو نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب......'' وہ ہنسا۔ ''میں تو اس کام میں ماہر تصور کیا جاتا ہوں۔'' وہ سیف کی طرف بڑھا۔ میں اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ وہ سیف کو چاروں طرف سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے نمبر لگائے اور کان لگا کر سنتا رہا...... اس کو اس طرح مسخروں جیسی حرکتیں کرتے ہوئے کئی منٹ گزر گئے مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

میں بددل ہو گیا۔ یہ کم بخت بھی اناڑی ہی تھا اور میرے سامنے خواہ مخواہ ہی اپنی مہارت کی ڈینگیں مار رہا تھا۔ کمرے میں کچھ حبس سا ہو چلا تھا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی اور اس کا شٹر ہٹایا۔ تازہ ہوا کے جھونکوں نے کمرے کی فضا کو رات میں کھلنے والے پھولوں کی بھینی بھینی مہک سے بھر دیا۔ میں نے ایک نگاہ باہر چھائی ہوئی تاریک رات کو دیکھا کہ کہیں گھر کے اردگرد کوئی ہمسایہ تو موجود نہیں...... اسی وقت مجھے سیف کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں خوشی سے پلٹا۔

''واہ بھئی...... تم تو واقعی بہت بڑے فنکار ہو۔'' میں نے مسرور لہجے میں کہا اور اس کی طرف بڑھا کہ سیف میں جھانکوں لیکن مجھے ٹھٹک کر رک جانا پڑا اور ایک بار تو مجھے دانتوں پسینا آ گیا۔ اسی منحنی سے احمق شخص نے سیف میں سے پستول نکال کر پلک جھپکتے میں میری طرف تان لیا۔

میری حسرت بھری نگاہ اپنے ریوالور کی طرف گئی جو میں بے خیالی میں کرسی پر ہی پڑا چھوڑ آیا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس منحوس صورت شخص کے ساتھ کیا کروں...... مجھے واقعی اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا...... لیکن اب پچھلی باتوں پر افسوس کرنے کا وقت نہیں تھا، اب تو ذرا ہوشیاری کے ساتھ اس سے معاملہ طے کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے تھوک نگل کر حلق تر کرنے کی کوشش کی اور ابھی میں کچھ کہنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس بدمعاش نے فائر کر دیا۔

دھماکے سے در و دیوار لرز اٹھے۔ میں ایک لمحہ تاخیر کیے بغیر زمین پر لیٹ گیا۔ گولی بالکل میری آستین کو چھوتے ہوئے میرے برابر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی تھی۔

شاید اس کا نشانہ اچھا نہیں تھا، مگر میرے اس طرح گر پڑنے سے اسے یہ غلط فہمی ہوئی کہ شاید مجھے گولی لگ گئی ہے اور میں زخمی ہو چکا ہوں۔ میں اس کم بخت کی گولی سینے پر نہیں کھانا چاہتا تھا۔ میرا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا اور میں برابر سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اسی لیے میں نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی کہ کہیں وہ پھر فائر نہ کر دے۔

اس نے پستول میری طرف سیدھا کیا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''اگر تم نے اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کی، تو سمجھو تمہارے بھیجے میں سوراخ ہو جائے گا۔''

میں اور دبک گیا اور وہ فون کی طرف بڑھا...... اور نمبر ملا کر بولا۔ ''ہیلو...... میں انسپکٹر قریشی بول رہا ہوں...... گھر کی چابی دفتر میں رہ گئی تھی...... میں کھڑکی سے کود کر اندر آیا تو دیکھا کہ ایک شخص یہاں سیف کھولے بیٹھا ہے...... میں نے اس پر قابو پا لیا ہے، تم لوگ جلدی پہنچو...... فوراً......!''

''دھت تیرے کی...... ساری محنت ہی اکارت گئی، اس کم بخت کے ساتھ یونہی وقت برباد کیا۔'' میں نے خود کو کوسا، اب تو جان بچانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

میں نے زمین پر پڑے پڑے اپنی ٹانگ سے قریب پڑی ہوئی میز کو پوری قوت سے الٹا دیا...... اس کی توجہ ہٹی تو میں چھلانگ لگا کر کھلی ہوئی کھڑکی میں سے باہر کود گیا۔

......☆......

زخم جفا

ملک صفدر حیات

وراثت میں قدرت نے ایسی کشش رکھی ہے کہ اس کے بارے میں سوچنا اچھا لگتا ہے۔ جسے مل جائے وہ اس کے استعمال پر غور کرتا ہے اور جسے نہ ملے وہ پانے کے رستے تلاش کرتا ہے... اس کے جذبات میں بھی کچھ ایسا ہی تلاطم برپا تھا... وہ بھی سوچ کی راہوں پر چلتے چلتے بہت دور پہنچ گیا تھا کہ اچانک اس سے منزل کا نشان گم ہوگیا... پیچھے پلٹنے کے تمام راستے بھی مسدود ہوگئے... پھر دل نہ گھبرائے تو کیا ہو... مگر ایسے میں جو ہوتا ہے اسے دل ماننے کو ہرگز تیار نہیں ہوتا... دل مانے یا نہ مانے حقیقت کو تو ہر حال میں تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے... اور جب ملک صفدر حیات نے حقیقتوں سے پردہ اٹھایا تو بہت سے چہرے بے نقاب ہوگئے۔

اپنوں کے ستم اور حاسدانہ کارروائیوں کا عبرت انگیز احوال

ایک روز میں تھانے میں بیٹھا کسی کیس کا چالان تیار کررہا تھا کہ باہر شور کی آواز سن کر مجھے ہاتھ روکنا پڑا۔ بے ساختہ میری نگاہ کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی جانب اٹھ گئی۔ میں نے دیکھا، چند دیہاتی ایک بچے کو دھکیلتے، گھسیٹتے ہوئے میری طرف لارہے تھے۔

ہاتھ تو رک ہی چکا تھا، میں نے قلم کو بھی چھوڑ دیا اور الجھن زدہ نظر سے اس وحشی منظر کو دیکھنے لگا۔ اس دوران میں دیہاتی مذکورہ بچے کو میرے سامنے پہنچا چکے تھے۔ میں نے گرج کر کہا۔

"چھوڑ دو اسے......!"

میرے حکم کا فوری اثر ہوا اور ان دیہاتیوں نے بچے کو مارنا بند کردیا تاہم اس کا گریبان ابھی تک ایک مشتعل دیہاتی کی گرفت میں تھا۔ میں نے مذکورہ دیہاتی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا نا، اس بچے کو چھوڑ دو ورنہ میں تم سب کو حوالات میں بند کردوں گا۔"

"جناب! حوالات میں تو آپ اس شیطان کو بند کریں......" ان میں سے ایک خفگی آمیز انداز میں بولا۔ "جس نے سب کا جینا عذاب کررکھا ہے۔"

"اس معصوم نے ایسا کون سا جرم کیا ہے؟" میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا۔

"جناب! یہ پوچھیں کہ اس نے کیا نہیں کیا۔" ایک دیہاتی طنزیہ لہجے میں بولا۔ "آپ اسے معصوم نہ سمجھیں۔ یہ شکل سے سیدھا سادا نظر آتا ہے لیکن اس کے وجود میں بڑی خبیث روح بند ہے۔ یہ آج بڑی مشکل سے ہاتھ آیا ہے۔ پچھلے آٹھ دس دن سے اس نے ہماری مٹی پلید کررکھی ہے۔ چودھری صاحب کا سارا غصہ بھی ہم ہی پر اترتا ہے۔"

"چودھری صاحب!" کے الفاظ پر میں چونک اٹھا۔ "اس بچے کے قصور کے بارے میں تو میں بعد میں پوچھوں گا۔" میں نے کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ، آپ کون لوگ ہو؟"

"ہم چودھری ارشاد کے ملازم ہیں۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ "ہم چودھری صاحب کے باڑے میں کام کرتے ہیں۔"

"اتنی اکڑ تو کبھی چودھری ارشاد نے نہیں دکھائی۔" میں نے جواب دینے والے کو تیز نظر سے گھورا۔ "تم چودھری کے ادنیٰ سے ملازم ہوکر بڑی اچھل کود مچارہے ہو۔ بچے کا جرم سننے سے پہلے تم لوگوں کے دماغ درست کرتا ہوں گے۔ کیا خیال ہے، تمہیں ٹرائل روم کی سیر کرائی جائے......؟"

وہ میری اس خطرناک دھمکی سے ٹھنڈے پڑ گئے۔ ان میں سے جو زیادہ بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا، نرم لہجے میں بولا۔

"تھانے دار جی! آپ ہمیں معاف کردیں۔ دراصل...... اس مردود کی حرکتوں نے پچھلے کئی دن سے ہمارا جینا حرام کررکھا ہے، اوپر سے روزانہ چودھری صاحب کی ڈانٹ پھٹکار بھی سننا پڑتی ہے۔ بس، اسی وجہ سے دماغ گرم

ہو گیا تھا......"

"اگر دماغ اور مزاج ٹھنڈا ہو گیا ہو تو بتاؤ، اس بچے نے ایسا کون سا سنگین جرم کیا ہے جو تم اسے بے دریغ مارتے ہوئے یہاں تک لائے ہو؟" میں نے باری باری ان افراد کی آنکھوں میں دیکھا پھر بچے سے کہا۔

"اوئے بچے...... تم ادھر جا کر بینچ پر بیٹھو۔ ابھی تمہارا بیان بھی ہوگا۔"

میرے کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ لمبی سی چوبی بینچ رکھی ہوئی تھی۔ وہ بچہ خاموشی سے اٹھا اور جا کر مذکورہ بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس بچے کی عمر گیارہ بارہ سال رہی ہوگی۔ وہ اپنی عمر سے کافی کم دکھائی دیتا تھا۔ اس کی صحت بھی تسلی بخش نظر نہیں آتی تھی۔ جسم نحیف تھا اور چہرے پر معصومیت کھیلتی تھی۔ اسے ایک مجرم کی حیثیت سے دیکھ کر بڑا ترس آتا تھا۔ دل ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اس سے کوئی جرم سرزد ہوا ہوگا۔ بہرحال، یہ تو تفتیش کے بعد ہی پتا چل سکتا تھا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

چودھری کے بندوں میں جو کھڑپینچ قسم کا تھا، اس کا نام عنایت معلوم ہوا۔ وہی باڑے کا انتظام و انصرام بھی سنبھالتا تھا۔ اس کی مدد کے لیے صدیق، اشرف اور خاور باڑے پر موجود رہتے تھے۔ چودھری ارشاد کے باڑے میں کل ملا کر سات بھینسیں، تین گائیں، چار بکریاں اور دو اعلیٰ نسل کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ مذکورہ باڑا خاصا وسیع و عریض تھا جس کے ایک حصے میں قطار سے چار بڑے بڑے کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے پر ملازموں کا قبضہ تھا۔ دوسرے میں مویشیوں کا چارا وغیرہ اسٹاک کیا گیا تھا اور باقی دو کمرے حسبِ ضرورت جانوروں کے استعمال میں رہتے تھے۔ خصوصاً موسم سرما اور موسم برسات میں ان مویشیوں وغیرہ کو کمروں کے اندر باندھنا پڑتا تھا۔ یہ کمرے ہال نما تھے لہٰذا جگہ کے حوالے سے کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ باڑے کے کشادہ صحن میں مختلف رنگ و نسل کے چند سایہ دار درخت ایستادہ تھے۔ باڑے کے حوالے سے یہ تفصیل بیان کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جو لوگ شکایت لے کر میرے پاس آئے تھے ان کا اور ان کے مسئلے کا تعلق اسی باڑے سے تھا۔

عنایت نامی اس اکھڑ مزاج بندے کی زبانی قیصر کے جرم کی جو تفصیل مجھ تک پہنچی میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ بعد میں آنے والے واقعات کا مطالعہ آپ کے ذہن کو الجھانے کی کوشش نہ کرے۔ ان میں سے بعض باتیں ایسی ہیں جو بعد میں میرے علم میں آئی تھیں لیکن واقعات کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے بھی بیان کر دی ہیں۔

ایک بات کا میں ذکر کرنا بھول گیا۔ عنایت اور اس کے ساتھی جس نوعمر لڑکے کو زدوکوب کرتے ہوئے میرے پاس لائے تھے اس کا نام قیصر عرف کیسو تھا۔

☆☆☆

چودھری ارشاد کا تعلق موضع فتح پور سے تھا۔ یہ ایک بڑا گاؤں تھا جہاں لگ بھگ ساڑھے تین سو گھر آباد تھے۔ کم و بیش ڈیڑھ ہزار نفوس پر مشتمل یہ گاؤں میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا اور تھانے سے چند گز کے فاصلے پر واقع تھا۔ ماڈرن زبان میں آپ اس فاصلے کو واکنگ ڈسٹینس کہہ سکتے ہیں۔

ارشاد بڑا دبنگ اور رعب داب والا چودھری تھا۔ آس پاس کے چھوٹے گاؤں دیہات پر بھی در پردہ اسی کی چودھراہٹ چلتی تھی۔ موضع فتح پور میں چودھری ارشاد کی حویلی کسی عالیشان محل کا نظارہ پیش کرتی تھی لیکن اس حویلی کے ساتھ ایک خاص نوعیت کی بدقسمتی بھی جڑی ہوئی تھی۔

چودھری کی شادی کوئی بتیس تینتیس سال پہلے ہوئی تھی۔ اللہ نے شادی کے دوسرے سال ایک بیٹی عطا کی۔ نادرہ نامی وہ بچی بہت ہی خوبصورت اور گول مٹول تھی جسے پیار سے رانی کہا جاتا تھا۔ رانی کے بعد چودھری کے یہاں دو، دو، تین تین سال کے وقفے سے تین بچے یعنی لڑکے پیدا ہوئے لیکن وہ بدقسمتی جس کا اوپر میں نے ذکر کیا ہے، اس کے ہاتھوں ان بچوں میں سے کوئی ایک بھی زندگی کا ساتھ نہ دے سکا اور ان میں سے ہر کوئی اپنی پیدائش کے ایک سال کے اندر اندر دارِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ چودھری قدیر دو ماہ کی عمر میں، چودھری نعیم چھ ماہ کی عمر میں اور چودھری سلطان نو ماہ کی عمر میں چل بسا۔ کسی نے بھی زندگی کا ایک سال مکمل نہیں کیا تھا۔ یہ صورت حال یقیناً چودھری ارشاد اور اس کی بیوی چودھرائن نور جہاں کے لیے بڑی تکلیف دہ اور اذیت ناک تھی۔ چودھری ارشاد کا تو دماغ گھوم کر رہ گیا تھا۔ آٹھ دس سال کے اندر تین بیٹوں کی اموات کا صدمہ اس کا دل لہو کر گیا تھا۔ اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ وہ اولادِ نرینہ سے محروم تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا لیکن اس زمین و جائداد اور مال و دولت کا کوئی حقیقی وارث موجود نہیں تھا۔ کوئی ایسا شخص جو چودھری کا نام لیوا ہو اور جس کے نام اور وجود سے چودھری کی نسل آگے چلے۔ یہ سوچ دن رات اسے اندر سے کریدتی رہتی تھی کہ اس کے بعد اس کا اور اس کے خاندان کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

متفکر تو چودھرائن بھی بہت تھی۔ اس لیے نہیں کہ نسل کو

آگے بڑھانے والا کوئی بیٹا نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ اس ناکامی اور نامرادی کے نتیجے میں چودھری کوئی الٹا سیدھا فیصلہ نہ کر لے۔ وہ چودھری کی محرومی کی شدت اور اس کی خواہش کی حدت کو بہ خوبی دیکھ اور محسوس کر رہی تھی۔ وہ ایک جنونی... کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ پچھلے پانچ چھ سال سے اس کی کوکھ بھی ہری نہیں ہوئی تھی۔ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اس کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد چودھری کہیں دوسری شادی نہ کر لے۔ سوتن کا آسیب ہر لحظہ کسی شمشیر برہنہ کے مانند اس کے سر پر لٹکتا رہتا تھا۔

نادرہ عرف رانی جب سنِ بلوغت کو پہنچی تو قلعہ چاند والا کے چودھری افتخار کے بڑے بیٹے سے اس کی شادی کر دی گئی۔ اب حویلی میں چودھری اور چودھرائن کے علاوہ نصف درجن سے زیادہ ملازم اور ملازمائیں رہ گئی تھیں۔ چودھرائن نے رانی کی شادی کے بعد سکھ کا سانس لیا تھا کہ شاید اب چودھری اس خطرناک رخ پر نہ سوچے جس کا خدشہ چودھرائن کے دل و دماغ کا قیمہ بناتا رہتا تھا۔ نور جہاں کا اطمینان اس حوالے سے بھی تھا کہ چودھری ارشاد اب ساٹھ کا ہندسہ عبور کر چکا تھا۔

پھر ایک روز حویلی میں جیسے بھونچال آ گیا۔ نور جہاں کے سر پر لٹکنے والی خطرناک تلوار کی رسی ٹوٹ گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی قسمت کا ستارہ ٹوٹ گیا ہو۔ چودھری ارشاد نے دوسری شادی کا اعلان کر کے ہر خاص و عام کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ سب سے زیادہ مہلک بجلی تو نور جہاں کے حواس پر گری تھی۔ چودھری، اس کی زندگی کا ساتھی اور اس کا محرم راز...... اس پر سوتن لا رہا تھا اور وہ بھی جوان جہان، صرف بائیس سال کی ایک الہڑ مٹیار جو اس کی بیٹی رانی سے بھی آٹھ سال چھوٹی تھی۔

نور جہاں کا میکا اتنا طاقت ور نہیں تھا کہ وہ کھلم کھلا چودھری کے اس منصوبے کی مخالفت کرتا، لہٰذا چودھری کو اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے کسی دقت یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نورین اس کی دوسری بیوی بن کر حویلی میں آ گئی۔

نورین...... جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، اکیس سے بائیس سال کی ایک بھرپور اور جوان لڑکی تھی اور اس کے مقابلے میں چودھری کا باسٹھ سالہ بڑھاپا تھا لیکن چودھری نے اگر یہ قدم اٹھایا تھا تو جگ ہنسائی کے لیے نہیں۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد ہی دوسری شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ بیساکھیوں کے سہارے چلنے کا قائل نہیں تھا۔

شادی کے کچھ عرصے بعد ہی چودھری ارشاد نے یہ

نہلے پہ دہلا

ایک دفعہ کسی صاحب کو معلوم ہوا کہ ایک طوطا بازار میں بکنے کے لیے آیا ہے جو تین زبانیں جانتا ہے۔ وہ صاحب آزمانے کے لیے پہنچ گئے۔ جاتے ہی طوطے سے سوال کیا۔ "ہاؤ آر یو؟"

طوطا بولا۔ "فائن!"

صاحب بولے۔ "کیا حال ہے؟"

طوطے نے جواب دیا۔ "ٹھیک ٹھاک۔"

پھر وہ صاحب بولے۔ "کی حال اے؟"

"بے وقوفا! حال ہی پوچھی جائیں گا کہ کوئی ہور گل دی کریں گا۔" طوطا برہم ہو کر بولا۔

☆☆☆

استاد کلاس میں بچوں کو قواعد سمجھا رہے تھے اور زمانہ ماضی، حال اور مستقبل سمجھانے کے بعد جب وہ اچھی طرح سمجھا چکے تو انہوں نے ایک لڑکے سے پوچھا۔

"میں نہا رہا ہوں، تم نہا رہے ہو، ہم نہا رہے ہیں، وہ نہا رہا ہے۔ بتاؤ ان جملوں میں کون سا زمانہ استعمال ہوا ہے؟"

طالب علم نے فوراً جواب دیا۔ "سر، عید کا۔"

☆☆☆

ایک شخص نے اپنی ہونے والی بیوی کو ایک خط لکھا، جس میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا کہ میں اور بہت سی باتیں لکھنے والا تھا لیکن یہ باتیں نہیں لکھ رہا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ پوسٹ آفس میں ایک صاحب ایسے بھی ہیں جو دوسروں کے خط کھول کر پڑھتے ہیں۔

چند دن بعد انہیں پوسٹ آفس کی جانب سے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا۔ "ہم دوسروں کے خط کھول کر نہیں پڑھتے، ہم پر یہ الزام درست نہیں ہے۔"

☆☆☆

ایک گلوکار نے اپنے پڑوسی سے شکایت کرتے ہوئے کہا۔ "جناب! جب بھی میں گانا شروع کرتا ہوں، آپ کا کتا بھونکنے لگتا ہے۔"

پڑوسی نے جواب دیا۔ "اس میں کتے کا کیا قصور ہے، پہل تو آپ ہی کرتے ہیں۔"

مرسلہ: شیث بن سجاد، الخبر، سعودی عرب

ثابت کردیا کہ وہ ماٹھا نہیں بلکہ ساٹھا اور پاٹھا ہے۔ نورین سے اس کی شادی کو پانچ چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ حویلی کے درودیوار نے یہ خوش خبری سماعت کی کہ اس حویلی میں کوئی نیا مہمان آنے والا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ چودھری کا جانشین اور وارث ثابت ہو۔

نورین ادھر امید سے ہوئی، ادھر جیسے نور جہاں کا دل بجھ کر رہ گیا۔ ظاہر ہے، نورین اس کے مقابلے میں زیادہ حسین، زیادہ جوان اور زیادہ پُرہیجان تھی اور آنے والے دنوں میں وہ چودھری کے بچے کو بھی جنم دینے والی تھی اور اگر وہ بچہ لڑکا ہوتا تو پھر یہ سیدھی سیدھی نور جہاں کی شکست تھی۔ ظاہر ہے، اس عمل کے بعد نورین کو اس پر سبقت حاصل ہوجاتی۔ گویا...... نورین چودھری ارشاد کی توجہ کا محور ومرکز بن کر رہ جاتی۔

نور جہاں عمومی انداز میں سوچ رہی تھی کیونکہ ہمارے معاشرے اور ہمارے سماج کا یہی چلن ہے لیکن چودھری ارشاد کے ذہن میں اس نوعیت کی کوئی بھی منفی سوچ نہیں تھی۔ وہ نور جہاں کی اب بھی وہی قدر کررہا تھا جو نورین کی آمد سے قبل تھی لیکن نور جہاں کو اس کی محبت میں اب مصنوعی اور کھوکھلا پن محسوس ہوتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے چودھری محض خانہ پری کے لیے اس کا خیال رکھتا ہے۔ وہ نور جہاں کی دلجوئی اور نورین کی دلداری کرتا ہے۔

نور جہاں کے ذہن میں یہ بات نقش ہوچکی تھی کہ نورین کی آمد کے بعد چودھری کی اس میں دلچسپی اور توجہ ختم ہوگئی ہے لہٰذا اس کے مثبت عمل کو بھی خانہ پری اور رواروی کے کھاتے میں ڈال رہی تھی جبکہ چودھری کی نیت میں درحقیقت کوئی فتور نہیں تھا۔ اگر وہ نورین کا نسبتاً زیادہ خیال رکھ رہا تھا تو اس کی فطری وجوہات تھیں۔ وہ ظاہر ہے، ایک جوان اور نئی نویلی بیوی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں نور جہاں بوڑھی اور کڑوی کسیلی ہوچکی تھی، خاص طور پر جب سے نورین نے حویلی میں قدم رکھا تھا، چودھری کے ساتھ نور جہاں کا طرز عمل بڑا روکھا اور بے گانگی کا ہوگیا تھا۔ وہ ہر وقت چودھری سے شاکی اور خفا دکھائی دیتی تھی۔ شاید یہ اس کے اندر کا غصہ اور ناپسندیدگی تھی جو اسے چودھری بدلا بدلا اور پرایا پرایا سا نظر آتا تھا۔

اس وقت تو نور جہاں کے سینے پر گویا سانپ ہی لوٹ گئے جب چودھری ارشاد نے گاؤں کی تین ماہر دائیوں کو نورین کے طبی اور نفسیاتی معائنے کے لیے حویلی میں بلالیا۔ مذکورہ دائیاں اس کام میں بڑی مہارت رکھتی تھیں کہ وہ حاملہ عورت کا جسمانی اور نفسیاتی تجزیہ کرکے بتادیا کرتی تھیں کہ وہ بیٹے کو جنم دے گی یا بیٹی کو۔

اس زمانے میں الٹراساؤنڈ ایسی سہولت لوگوں کو میسر نہیں تھی لہٰذا تجربہ کار اور کہنہ مشق دائیوں سے ایسے معاملات میں ماہرانہ مدد لی جاتی تھی۔ دو دائیوں نے نورین کے طبی معائنے، اس کی نشست وبرخاست کے مشاہدے اور پیٹ کے پھیلاؤ کا جائزہ لینے کے بعد فتویٰ صادر کردیا کہ نورین کے یہاں اولاد نرینہ ہوگی جبکہ تیسری اور عمر رسیدہ دائی نے ایک عملی تجربہ کرکے اپنی ہم عصر دائیوں کے فتوے کی تصدیق کردی۔ وہ دلچسپ تجربہ کچھ اس طرح کیا گیا تھا۔

نورین کو کمرے کے ایک کونے میں دونوں پاؤں جوڑ کر کھڑا کردیا گیا۔ اس دیوار کے دوسرے سرے پر خود وہ دائی کھڑی تھی۔ اس نے نورین کو ہدایت کی کہ وہ بہ آہستگی چلتے ہوئے اس کی جگہ پر آجائے۔ جب نورین نے اس کی ہدایت کی تعمیل کردی تو دائی کمرے کے دوسرے کونے میں چلی گئی اور نورین سے اس کونے میں پہنچنے کو کہا گیا۔ نورین نے یہ بھی کردکھایا۔ الغرض، اس دائی نے نورین کو کمرے کی چاروں دیواروں کے ساتھ چلانے کے بعد نقطہ آغاز پر پہنچا دیا یعنی جہاں سے اس نے چلنے کی ابتدا کی تھی بالآخر وہ وہیں پہنچ گئی۔ دائی نے ایک گہری سانس خارج کی اور حتمی لہجے میں اپنا فیصلہ سنادیا۔

"چودھری صاحب! اگر چھوٹی چودھرائن خیر خیریت سے ساری منزلیں طے کرگئیں تو انشاء اللہ! آپ ایک بیٹے کے باپ بن جائیں گے۔"

"تت...... تم نے...... کس بات سے یہ اندازہ لگایا ہے......" چودھری نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ اس کا اضطرار حد سے زیادہ خوشی کا مظہر تھا۔

"میرا تجربہ یہ کہتا ہے چودھری صاحب!" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

"تم نے ابھی جو تجربہ کیا ہے، وہ تو میں نے بھی دیکھا ہے۔" چودھری نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔ "لیکن چلت پھرت میں وہ کون سا نکتہ ہے جس کی بنا پر تم اتنے وثوق سے مجھے اولاد نرینہ کی خوش خبری دے رہی ہو......؟"

"وہ نکتہ میں آپ کو سب کے سامنے نہیں بتاسکتی......"

"ٹھیک ہے......" چودھری ارشاد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم آؤ میرے ساتھ۔"

چودھری کے دل ودماغ میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ایک تو اولاد نرینہ کی خوش خبری نے اس کے جذبات اور

احساسات کو کیف وانبساط کی آخری منزل پر پہنچا دیا تھا۔ دوسرے دائی صفیہ نے جتنے اعتماد سے وہ پُراسرار تجربہ کیا تھا اس نے چودھری کو تجسس میں مبتلا کردیا تھا۔ وہ پہلی فرصت میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ ایسا کون سا نکتہ ہے جس کی بنا پر دائی صفیہ نے فتویٰ صادر کیا ہے۔ وہ فی الفور اس نکتے سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔

وہ دائی صفیہ کو اپنے ساتھ چلاتے ہوئے حویلی کے ایک دوسرے کمرے میں لے آیا جہاں ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

چند لمحات کی گمبھیر خاموشی کے بعد صفیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "دیکھیں چودھری صاحب! دیوار کے پیچھے اور ماں کے پیٹ کے اندر کیا ہے، یہ تو سوہنا رب ہی بہتر جانتا ہے۔ انسان تو صرف اندازہ ہی لگا سکتا ہے۔ میں نے بھی ایک اندازہ ہی لگایا ہے......"

"صفیہ!" چودھری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں ماضی کے ان ظالم حکمرانوں جیسا نہیں ہوں جو کسی کی غلط پیش گوئی یا غلط اندازے پر ناراض ہوکر اس کی گردن اڑا دیا کرتے ہیں۔ اگر بعد میں تمہارا اندازہ غلط بھی ثابت ہوگیا تو میں اف تک نہیں کہوں گا۔ تم جلدی سے بتاؤ کہ کس نکتے کی بنیاد پر تم نے بڑے وثوق سے کہا ہے کہ چھوٹی چودھرائن کے گھر بیٹا ہی پیدا ہوگا؟"

دائی صفیہ نے مذکورہ نکتہ بیان کرتے ہوئے بتایا۔ "چودھری صاحب! میں اپنے تجربے کی روشنی میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ جن عورتوں کے پیٹ میں نر اولاد پروان چڑھ رہی ہوتی ہے وہ ساکن حالت سے جب چلنا شروع کریں تو پہلے اپنا دایاں پاؤں اٹھاتی ہیں اور لڑکی کی ماں بننے جانے والی حاملہ عورتیں بایاں پاؤں اٹھا کر سفر شروع کرتی ہیں۔ میں نے چودھرائن جی کو چار مرتبہ روک کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تک چلایا ہے اور ہر بار انہوں نے دایاں پاؤں اٹھا کر چلنا شروع کیا تھا......"

"اچھا...... کمال ہے......!" چودھری نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم بڑی تجربہ کار اور دانش مند دائی ہو۔" چودھری نے تعریفی نظروں سے صفیہ کی طرف دیکھا۔ "آج کے بعد تم ہی نورین کی دیکھ بھال کروگی اور جب تک نورین میرے بیٹے کو جنم نہیں دے لیتی، تم اس کے آس پاس ہی رہوگی۔"

"چودھری صاحب! آپ مجھے اتنی عزت دے رہے ہیں اس لیے میں آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں، کم ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "لیکن میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے......!"

"کیا مسئلہ ہے؟" چودھری نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

وہ بڑی عاجزی سے بولی۔ "چودھری صاحب! میں صبح سے شام تک تو آپ کی حویلی میں رہ سکتی ہوں مگر رات کو مجھے اپنے گھر ہی جانا ہوگا۔ میرا گھر والا بہت ضعیف اور بیمار ہے۔ میں رات میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ میری مجبوری ہے۔"

وہ اپنے شوہر کو ضعیف اور بوڑھا کہہ رہی تھی جبکہ خود بھی ساٹھ سے اوپر ہی کی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا، اس کا شوہر ستر کے پیٹے میں ہوگا۔ بہرحال، چودھری ارشاد نے اس کی مجبوری کا احساس کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے منظور ہے صفیہ۔ تم صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوکر حویلی آجایا کرو اور جیسے ہی سورج ڈھلے، اپنے گھر چلی جایا کرو۔ اگر رات میں کبھی نورین کو تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں گھر سے بلالوں گا لیکن تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا......"

چودھری نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے صفیہ کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے پوچھا۔ "کیسا وعدہ چودھری صاحب؟"

"جب نورین کا آخری مہینا شروع ہوگا تو پھر تمہیں زچگی تک دن رات حویلی ہی میں رہنا ہوگا۔" چودھری نے بہ صد اصرار کہا تو صفیہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے چودھری صاحب! آپ نے میری بات مانی ہے، میں آپ کی بات مان رہی ہوں۔"

چنانچہ اسی روز سے صفیہ، نورین کی دائی مقرر کردی گئی اور اس کے ساتھ ہی نورین کے لیے اس کے مشوروں کا بھی آغاز ہوگیا۔ دیگر تجاویز کے ساتھ ہی اس نے چودھری ارشاد سے کہا۔

"چودھری صاحب! آپ دونوں وقت نہایت پابندی کے ساتھ چھوٹی چودھرائن جی کو بھینس کا دودھ بھی پلانا شروع کردیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" چودھری نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"جو مائیں حمل کے دوران میں باقاعدگی سے دودھ پیتی ہیں ان کی اولاد گوری اور خوبصورت پیدا ہوتی ہے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ "ویسے تو ماشاء اللہ! آپ کا خاندان

گورا چٹا ہی ہے لیکن اگر آپ میرے مشورے پر عمل کریں گے تو آپ کے آنے والے بچے کی خوب صورتی پر اور نکھار آجائے گا۔"

"نورین تو ویسے بھی دودھ شوق سے پیتی ہے۔" چودھری خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "میں آج ہی سے اس کے لیے ایک بھینس مخصوص کردیتا ہوں۔"

تھوڑی دیر کے بعد صفیہ تو سلام کرکے رخصت ہوگئی اور چودھری اپنی آنے والی اولادِ نرینہ کے بارے میں سوچ سوچ کر خوش ہونے لگا۔ اس نے صفیہ دائی کو بہت زیادہ انعام واکرام سے نوازنے کے وعدے بھی کیے تھے کیونکہ اس کی پیش گوئی اور بعد ازاں محبت ونگہداشت کے نتیجے میں، اس حویلی میں چودھری کا وارث جنم لینے والا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

چودھری کے باڑے میں چھ کالی بھینسیں، تین گائیں، چار بکریاں اور دو اعلیٰ النسل گھوڑے موجود تھے۔ یہ گھوڑے چودھری کی ذاتی سواری کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ان میں ایک گھوڑا مشکی اور دوسرا انڈے کے مانند سفید تھا۔ چھ بھینسیں تو باڑے میں بندھی تھیں اور وہ ماشاءاللہ! اچھا خاصا دودھ بھی دیتی تھیں لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ...... یہ عالمِ شوق کا دیکھا نہ جائے ...... یا...... نیا نیا فقیر اور نیا نیا امیر جو بھی کرلے، کم ہے کے مصداق چودھری کو چھوٹی چودھرائن کے لیے الگ سے ایک بھینس پالنے کی سوجھی۔ چنانچہ ایک صحت مند اور خوب صورت بھوری بھینس خریدی گئی۔ نہ صرف خریدی گئی بلکہ اس کی دیکھ ریکھ، کھلائی پلائی اور دودھ وغیرہ نکالنے کے لیے ایک ملازم کو بھی مخصوص کیا گیا۔ اس ملازم کا نام تھا عنایت عرف عنایتا جو باڑے کا انتظام بھی چلاتا تھا لیکن یہیں سے ایک دلچسپ مگر کوفت بھری کہانی کا بھی آغاز ہوا۔

چودھری حویلی کے اندر جس طرح چھوٹی چودھرائن کے ناز نخرے اٹھا رہا تھا، ویسے ہی حویلی کے باہر بھی نورین کے حوالے سے اس کی سرگرمیاں بڑے جوش وخروش سے جاری تھیں۔ اس نے نورین کو دودھ پلانے کے لیے بھوری بھینس کا بندوبست تو کرلیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عنایت کو سختی سے تاکید کردی تھی کہ وہ بھوری بھینس کا دودھ خود اپنے ہاتھوں سے نکالے گا اور خود ہی جاکر دودھ والا برتن چاچی بسم اللہ کے حوالے کرے گا۔ چاچی بسم اللہ وہ ملازمۂ خاص تھی جسے صرف اور صرف نورین کی دیکھ بھال کے لیے مخصوص کردیا گیا تھا اور وہ چودھری ارشاد کے بھروسے کی عورت تھی جس طرح کہ چودھری، عنایت پر اعتماد کرتا تھا۔

جب انسان کی زندگی میں کچھ ایسا وقوع پذیر ہونے جارہا ہو جو اس کی شدید خواہش تو ہو لیکن اس خواہش کی تکمیل کے امکانات دکھائی نہ دے رہے ہوں تو پھر ہر لمحہ اسے ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے، دل میں طرح طرح کے خدشے اور ذہن میں قسم قسم کے اندیشے سر اٹھانے لگتے ہیں۔ انسان یقینی اور بے یقینی کے درمیان سوالیہ نشان کے مانند لٹک کر رہ جاتا ہے۔ آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی حقیقت کا یقین نہیں آتا اور روز وشب یہ خطرہ سر پر منڈلاتا رہتا ہے کہ کہیں یہ نہ ہوجائے، کہیں وہ نہ ہوجائے۔

چودھری ارشاد بھی ان دنوں کچھ ایسی ہی متذبذب کیفیت کا شکار تھا۔ اندیشوں، وسوسوں اور خدشات کی راہ روکنے کے لیے وہ حد درجہ محتاط ہوگیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ معمولی سی کوتاہی یا ذرا سی بے احتیاطی کوئی گل کھلا کر بنے بنائے کھیل کو بگاڑ دے۔ نورین کے کیس کو اس نے ہاتھ کا چھالا بنالیا تھا۔

چودھری ارشاد جتنا زیادہ محتاط اور الرٹ تھا، عنایت بھی اتنا ہی ہوشیار اور چوکنا تھا لیکن اس کی تمام تر ہوشیاری اور چالاکی اس وقت خاک میں مل کر رہ گئی جب پہلے ہی قدم پر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

پہلے دن جب وہ بھوری بھینس کا دودھ نکالنے کے لیے اس کے نیچے بیٹھا تو بھینس نے شدید ترین ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ اس کے ہاتھ لگاتے ہی بھینس نے اچھل کود مچانا شروع کردی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نادیدہ قوت نے بھوری بھینس کو کوئی شدید ضرب لگادی ہو۔ وہ بار بار سر کو جھٹکتی، چاروں قدموں پر اچھل اچھل کر گول گھومتی چلی گئی۔ عنایت کافی دیر تک اسے پچکارنے، سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بھینس نے اس کی ایک نہیں سنی۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے، وہ بھینس کا دودھ نکالنے سے قاصر رہا۔

اور اس ناکامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے چودھری ارشاد کی ڈانٹ کھانا پڑی۔

اگلے روز بھی یہی ہوا۔

اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا......!

عنایت جب دودھ نکالنے کے لیے اس کے نیچے بیٹھتا، وہ شدید ردعمل کا مظاہرہ کرنے لگتی۔ بھوری بھینس کے اس عجیب وغریب کارنامے کا سبب جاننے کی متعدد کوششیں کی گئیں۔ مثلاً یہ چیک کیا گیا کہ اسے ڈنگروں کی کوئی مخصوص بیماری تو نہیں حالانکہ اس بات کے امکانات صفر کے برابر

تھے۔ وہ چودھری کے ڈیرے پر آنے سے پہلے اچھا خاصا اور صحت افزا دودھ دے رہی تھی۔ اس کے دودھ پر بڑی موٹی ملائی (بالائی) آتی تھی، وغیرہ وغیرہ......لیکن اب تو اس نے دودھ دینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایک ترکیب یہ بھی آزمائی گئی کہ عنایت کے بجائے باڑے کے ایک دوسرے ملازم کو برتن دے کر اس کا دودھ نکالنے کو کہا گیا، اس خیال سے کہ کہیں اسے عنایت کا ہاتھ پسند نہ ہو لیکن اس غیر منطقی کوشش کا نتیجہ بھی وہی برآمد ہوا یعنی......ڈھاک کے تین پات......!

یہ تمام تر واہیات صورتِ حال تو جاری وساری تھی لیکن اس میں سب سے برا حال بے چارے عنایت عرف عنایتا کا تھا۔ ایک طرف تو اسے اپنی ناکامی بلکہ شکست پر جھنجلاہٹ کا سامنا تھا تو دوسری جانب چودھری ارشاد کی ڈانٹ پھٹکار نے اس کے دماغ کو پھوڑے کے مانند پکادیا تھا۔ اسے نالائق، نکما، کام چور اور پتا نہیں، کس کس بات کے طعنے سننا پڑ رہے تھے۔

بالآخر ایک روز اس نے اس مسئلے کی جڑ کھود نکالی......!

☆☆☆

"جناب! یہی شیطان ہے ہماری پریشانی کی وجہ......!" عنایت نے کونے میں بیٹھے قیصر عرف کیسو کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آج اتفاق ہی سے یہ ہمارے ہتھے چڑھ گیا ہے ورنہ پتا نہیں اور کتنے دن تک ہمیں چودھری صاحب کی جھڑکیاں سننا پڑتیں......"

"عنایتا......!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "بھوری بھینس کی اچھل کود اور دودھ دینے کے لیے آمادہ نہ ہونے کا اس لڑکے سے کیا تعلق ہے؟"

"بڑا گہرا تعلق ہے سرکار!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "پتا ہے، یہ مردود اتنے دن سے کرکیا رہا تھا......؟"

اس نے کچھ ایسے انداز سے جملہ نامکمل چھوڑ کر سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا جیسے اپنی دانست میں کوئی بہت بڑا انکشاف کرنے جارہا ہو۔ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم، تم بتاؤ......!"

وہ بتانے لگا۔ "باڑے کی حد بندی والی دیوار کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف درخت لگے ہوئے ہیں۔ انہی میں جامن کا ایک بہت بڑا درخت ہے جس کی شاخوں کا پھیلاؤ باڑے کے باہر تک چلا گیا ہے۔ بیرونی دیوار چونکہ زیادہ اونچی نہیں ہے لہٰذا باڑے کے باہر سے بھی اس طرح جامن کے درخت پر چڑھا جاسکتا ہے کہ اندر موجود لوگوں کو کوئی خبر نہ ہو کیونکہ درخت کی شاخیں اس طرح باڑے کے باہر تک گئی ہوئی ہیں کہ وہاں دیوار واضح طور پر دکھائی نہیں دیتی۔ یہ شیطان چپکے سے اس درخت پر چڑھ کر خود کو شاخوں اور پتوں میں چھپا کر بیٹھ جاتا تھا اور جیسے ہی میں بھوری بھینس کا دودھ نکالنے کے لیے برتن لے کر اس کے نیچے بیٹھتا، یہ اپنی کارروائی شروع کردیتا۔ اتفاق سے بھوری بھینس کو دوسری بھینسوں سے تھوڑے فاصلے پر الگ کنڈلی پر باندھا گیا ہے اور چارے والی یہ کنڈلی اسی دیوار کے قریب ہے جہاں جامن کا درخت کھڑا ہے اور......"

"بھوری بھینس، کالی بھینسوں کے قریب ہے یا دور......" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "تم مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ یہ لڑکا وہاں جامن کے درخت پر چھپ کر ایسی کون سی کارروائی کرتا تھا کہ بھوری بھینس دودھ دینے سے انکاری ہوجاتی۔ کیا یہ کوئی جادو وغیرہ جانتا ہے......شکل سے تو یہ ایسا نظر نہیں آتا۔"

"جناب! یہ غلیل اور غلوں کے ساتھ وہاں چھپ کر بیٹھتا تھا۔" عنایت نے بتایا۔ "جب میں نے اسے پکڑا تو اس کے پاس سے ایک غلیل اور درجنوں غلّے برآمد ہوئے تھے جو اس نے اپنی جیب میں بھر رکھے تھے۔ اس کے غلّے بھی کوئی عام پتھر نہیں تھے بلکہ اس نے چھوٹے چھوٹے نکیلے سنگ ریزے جمع کررکھے تھے جو جہاں بھی لگیں، جان نکال دیں۔ اس پر، اس کم بخت کا نشانہ بھی غضب کا ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ کرتا کیا تھا......" وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بولا۔

"میں جیسے ہی دودھ نکالنے کے لیے بھوری (بھوری بھینس) کے نیچے بیٹھتا، یہ مردود نشانہ باندھ کر بھینس کی تھوتھنی ناک یا کان وغیرہ پر وار کردیتا۔ نکیلے سنگ ریزے کی ایسی دردناک چوٹ لگتی کہ بھینس تڑپ کر رہ جاتی۔ وہ بے چاری بے زبان یہ تو بتا نہیں سکتی تھی کہ اسے کیا تکلیف ہے، بس وہ سر جھٹک جھٹک کر اور اچھل کود مچا کر اپنی تکلیف اور برہمی کا اظہار کرتی تھی۔ میں جب دودھ نکالنے کے لیے بھوری کے نیچے بیٹھتا تھا تو جامن کا درخت میری پشت پر پڑتا تھا اس لیے بھی میں کیسو کی کارروائی تک نہ پہنچ سکا۔ آج میں دوسری جانب سے دودھ نکالنے کے لیے بیٹھا تو اس شیطان کی بدمعاشی میری نظر میں آگئی۔ بھوری جیسے ہی اچھلی، غیر ارادی طور پر میری نگاہ سامنے اٹھ گئی اور اسی وقت مجھے جامن کی شاخوں کے اندر غیر معمولی حرکت نظر آئی۔ بعد میں کیسو ہی کی زبانی پتا چلا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا تھا جس کی وجہ سے پتوں

میں کھڑ کھڑاہٹ پیدا ہوئی تھی بہر حال......!"

اس نے ایک مرتبہ پھر تھوڑا وقفہ کر کے سانسیں لیں پھر اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "اس وقت میرے ذہن میں ہرگز یہ خیال نہیں تھا کہ جامن پر جو کوئی بھی موجود ہے وہی بھوری کے مسئلے کا سبب ہے۔ میں نے فوراً صدیق، اچھو اور خاور کو آوازیں دیں اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ پھر ہم سب نے فوری کارروائی کر کے اس خبیث کو پکڑ لیا۔ ہمیں متحرک ہوتے دیکھ کر یہ درخت سے نیچے اتر آیا تھا اور وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہم نے اس کی کوشش ناکام بنادی اور ایک منٹ کے اندر اندر ہم نے گھیرا ڈال کر اسے قابو کرلیا۔ اس کے پاس سے غلیل اور غلے بھی برآمد ہوئے۔ میں نے جب ایک دو جھانپڑ رسید کیے تو اس نے فوراً اقرار کرلیا کہ بھوری کی تمام تر تکلیف اور پریشانی کا سبب یہی تھا...... یہ دیکھیں، اس کی غلیل اور غلے......"

بات کے اختتام پر عنایت نے ایک غلیل اور اس کا ایمونیشن (غلے) میرے حوالے کردیا۔ میں نے گھورتی ہوئی نظر سے، بینچ پر بیٹھے ہوئے کیسو کی طرف دیکھا اور کڑے لہجے میں پوچھا۔

"یہ غلیل اور غلے تمہارے ہی ہیں؟"

"جج...... جی......!" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

"تم بھوری بھینس کو کیوں ستاتے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے جواب نہیں دیا بلکہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

"بولو...... میری بات کا جواب دو......؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

"جناب! دیکھا آپ نے......" عنایت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ کیسا میسنا بنا ہوا ہے۔ یہ سوال تو ہم نے چھتیس ہزار مرتبہ اس سے پوچھا ہے لیکن یہ زبان کھولنے کو تیار نہیں۔ جب اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تو ہم اسے پکڑ کر چودھری صاحب کے پاس لے گئے تھے۔ انہوں نے بھی سخت اور نرم دونوں طریقوں سے اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کی ہے۔ تنگ آکر چودھری صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے آپ کے حوالے کردوں۔ آپ ہی تفتیش کے ذریعے اس سے اگلوا سکتے ہیں کہ اس کی واہیات شرارت کا مقصد کیا تھا؟" وہ لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"اور اب یہ آپ کے حوالے ہے......!"

بظاہر یہ فضول اور عام سا واقعہ تھا لیکن مجھے کیسو کی اس شرارت کے پیچھے کوئی گمبھیر کھیل چھپا ہوا محسوس ہوا۔ یہ ایسی حرکت نہیں تھی کہ یہ سوچ کر اس پر مٹی ڈال دی جاتی کہ وہ بچہ ہے...... بچے ایسی نادانیاں کرتے ہی رہتے ہیں۔ کیسو اتنے دنوں سے بھوری بھینس کے ساتھ جو کچھ کر رہا تھا اس کا یقیناً کوئی مقصد تھا۔ یہ ممکن تھا کہ کیسو کو اس عظیم مقصد سے آگاہی نہ ہو لیکن یہ کارروائی وہ جس کے حکم پر کر رہا تھا وہ یقیناً اپنے ذہن میں ایک واضح منصوبہ بندی رکھتا ہوگا۔ میں نے ہنگامی بنیادوں پر اپنے ذہن میں چند فوری نوعیت کے فیصلے کیے اور عنایت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے عنایتا! تم کیسو کو ٹرائل کے لیے میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ میں رات میں اس سے پوچھ گچھ کروں گا۔ انشاءاللہ! صبح سے پہلے ہی یہ زبان کھول دے گا۔"

"اچھا جی......!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں کل صبح آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوجاؤں گا۔"

"دیکھ عنایتا......!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم یہاں سے سیدھا چودھری صاحب کے پاس جانا......" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "انہیں میرا سلام کہنا اور بتانا کہ میں کل دوپہر میں خود ان سے ملنے حویلی آرہا ہوں۔ کیسو کے حوالے سے جو بھی حقیقت نکل کر سامنے آئے گی، میں چودھری صاحب کو بتادوں گا۔"

"ٹھیک ہے جناب، جیسی آپ کی مرضی!" وہ بادلِ ناخواستہ بولا۔ "پر اس شیطان کو کڑی نگرانی میں رکھیے گا۔ کہیں یہ......"

"یہ کہیں نہیں جائے گا عنایتا......!" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "یہ چودھری صاحب کی امانت کے طور پر میرے پاس محفوظ ہے۔ تم مطمئن ہو کر جاؤ۔"

وہ مزید کسی جرح بحث کے بغیر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تھانے سے رخصت ہوگیا۔

وہ گرمیوں کا موسم تھا۔ مئی کا مہینا چل رہا تھا۔ عنایت اور اس کے ساتھی عصر کے وقت میرے پاس آئے تھے اور اب شام ہونے والی تھی۔ کمرے میں اچھا خاصا حبس ہو رہا تھا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ میں نے حوالدار بشیر احمد سے کہا کہ وہ تھانے کے صحن میں میرے بیٹھنے کا بندوبست کرے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میری حسبِ منشا بندوبست کردیا گیا۔ میں قیصر عرف کیسو کو لے کر صحن میں آگیا۔

کیسو کو تو میں نے چارپائی پر بٹھایا اور خود ایک کرسی

سنبھال لی۔ وہ خاصا ڈرا سہا نظر آرہا تھا۔ وہ پچھلے چند روز سے بھوری بھینس کے ساتھ جو حرکت کررہا تھا اسے مضحکہ خیز ہی کہا جاسکتا تھا لیکن میری چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ کیسو کی وہ حرکت بے مقصد اور خوامخواہ نہیں ہوسکتی تھی۔

"کیسو......!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مشفقانہ لہجے میں پوچھا۔ "میں کون ہوں؟"

میں نے اس سے پوچھ گچھ کا آغاز کرتے ہوئے اپنا انداز اس لیے نرم رکھا تھا کہ اس بات کا مجھے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ اس برتن سے گھی سیدھی انگلی ہی سے نکل آئے گا۔ اس سے پہلے عنایت، اس کے ساتھیوں اور چودھری ارشاد نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے سختی بھی کرکے دیکھ لی تھی لیکن وہ اس کوشش میں ناکام رہے تھے اسی لیے میں نے نفسیاتی طریقہ آزمانے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ "آپ...... تھانے دار...... ہیں جی......"

"پتا ہے نا، تھانے دار کیا کرتا ہے......؟"

"جی......" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "تھانے دار مجرموں کو بہت مارتا ہے۔"

"ہاں، تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا...... ایک تھپڑ بھی نہیں ماروں گا۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو؟"

"لیکن...... وہ لوگ تو مجھے تھانے اسی لیے لے کر آئے ہیں۔" وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "انہوں نے مجھے بہت مارا ہے جی...... وہ عنایتا کہہ رہا تھا کہ تھانے دار مجھے سولی پر چڑھا دے گا...... اور آپ......؟" وہ بولتے بولتے رک گیا۔

میرا نرم اور ہمدردانہ رویہ اسے پریشان کررہا تھا۔ ظاہر ہے جب کیسو نے عنایت اور چودھری کی تفتیش کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے تو انہوں نے تھانے کے حوالے سے پتا نہیں اسے کیسی کیسی خطرناک دھمکیاں دی ہوں گی۔ میرا انداز چونکہ ان دھمکیوں سے لگا نہیں کھاتا تھا لہٰذا وہ خوف زدہ ہونے کے ساتھ ساتھ گہرے تذبذب کا بھی شکار تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ میری نرمی کو کوئی گہری چال سمجھ رہا ہو۔

"میں تمہیں ماروں گا، نہ سولی پر چڑھاؤں گا اور نہ ہی پھانسی پر لٹکاؤں گا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

اس کی حیرت اور بے یقینی میں حد درجہ اضافہ ہوگیا، لرزتی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔ "اور...... وہ...... بھوری بھینس کو جو میں غلیل سے......"

"وہ تمہاری نادانی تھی کیسو!" میں نے اس کا جملہ قطع کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "وہ سب کچھ تم کسی کے کہنے میں آکر کررہے تھے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔"

"لیکن آپ کو...... کیسے پتا چلا کہ......" وہ جلدی سے بولا۔ "کہ میں کسی کے کہنے میں آکر غلیل سے بھوری بھینس کو تنگ کرتا تھا؟"

"تم یہ تو مانتے ہونا...... میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"جی...... جی ہاں!" اس نے اپنی منڈی کو اثبات میں حرکت دی۔

"جو شخص تھانے میں تھانے دار بن کر بیٹھا ہوتا ہے نا......" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "اسے علاقے کے ایک ایک شخص کے بارے میں اچھی طرح خبر ہوتی ہے۔ میں بھی جانتا ہوں کہ یہاں کون کون شریف اور کون کون بدمعاش ہے۔ تم بہت ہی بھولے بھالے اور سیدھے سادے بچے ہو۔ بس، ذرا لالچ میں آگئے تھے اور کسی کے کہنے میں آکر تم نے غلیل والی حرکت شروع کی تھی...... ہیں نا؟"

"جی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں بولا۔

"ہم اس شخص کے بارے میں، بعد میں بات کریں گے جس نے تمہیں اس کام پر لگایا تھا۔" میں نے کیسو کے اعتماد میں توانائی بھرتے ہوئے کہا۔ "پہلے تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ......"

میرا ہر ہر انداز اس کے لیے حیرت اور استعجاب کا ایک نیا در کھول رہا تھا۔ اس میں اس بے چارے کی سوچ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ تھانے اور تھانیدار کے حوالے سے اس کے معصوم ذہن میں جو بھی تصور تھا، میں اس کے برعکس ثابت ہورہا تھا۔ میرے طرزِ عمل کے جواب میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میں اپنے بارے میں کیا بتاؤں جی......؟"

"کیا تم بھی فتح پور ہی میں رہتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"جی ہاں!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"تمہارے بہن بھائی، ماں باپ کہاں ہیں؟" میں نے دھیمے انداز میں اسے ٹٹولنا شروع کیا۔ "چودھری کے بندوں نے کافی دیر سے تمہیں گھیر رکھا ہے اور تمہارے ساتھ مار پیٹ بھی کی ہے۔ تمہارے گھر والوں میں سے ابھی تک کوئی آگے کیوں نہیں آیا؟"

"میرا کوئی ہوگا تو آگے آئے گا نا جی......!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

"جناب! میری صرف ایک ماں ہے......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس بے چاری کو تو پتا نہیں، اس واقعے کی خبر بھی ہوئی ہے یا نہیں......"

"جب تمہاری پکڑ کی خبر باڑے سے لے کر چودھری ارشاد کی حویلی تک گردش کررہی ہے تو پھر تمہاری ماں کو کیسے پتا نہیں چلا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔ "وہ گاؤں میں تو موجود ہے نا...؟"

"جی ہاں...... وہ گاؤں میں موجود ہے اور اس وقت وہ بھٹی میں دانے وغیرہ بھون رہی ہوگی۔" اس نے جواب دیا۔ "دراصل ہمارا گھر گاؤں کے دوسرے کنارے پر ہے اور باڑا اس کنارے پر۔ ویسے بھی میں دن میں زیادہ وقت باہر ہی گھومتا پھرتا رہتا ہوں۔ جب سورج غروب ہونے پر آتا ہے تو میں گھر کا رخ کرتا ہوں۔ اب شام ہونے ہی والی ہے۔ ہوسکتا ہے جب میں گھر نہ پہنچوں تو اماں کو میری فکر ہو......" وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"چودھری کے بندے مجھے باڑے کے باہر سے پکڑ کر سیدھے حویلی کی طرف لے آئے تھے اور پھر انہوں نے مجھے آپ کے پاس تھانے پہنچا دیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے، گاؤں کے جس حصے میں میرا گھر ہے، ادھر کے لوگوں کو ابھی اس واقعے کا پتا ہی نہ چلا ہو۔ میں گھر نہیں جاؤں گا تو اماں بہت پریشان ہوگی تھانے دار جی......" بات ختم کرکے اس نے رحم طلب انداز میں مجھے دیکھا۔

میں اس کی نگاہ میں چھپے ہوئے مطلب کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ مجھ سے ملتمس تھا کہ میں اسے گھر جانے کی اجازت دے دوں لیکن یہ فوری طور پر ممکن نہیں تھا۔ ابھی مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا۔ میں اپنے ذہن میں ایستادہ سوالات کے جوابات حاصل کیے بغیر اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا لہٰذا نرمی سے انداز میں کہا۔

"ہاں، یہ تو ہے بھئی۔ ایک ماں کو اپنے بچے کے لیے پریشان تو ہونا ہی چاہیے لیکن تمہیں اپنی ماں کی پریشانی کے لیے زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں......" میں نے تھوڑا توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"جب تم معمول کے مطابق، شام کو گھر نہیں پہنچو گے تو تمہاری اماں کو پریشانی لاحق ہوگی۔ ظاہر ہے، وہ تمہیں ڈھونڈنے کے لیے نکلے گی پھر اسے پتا چل جائے گا کہ چودھری کے بندے تمہیں باڑے کے باہر سے پکڑ کر حویلی لے گئے ہیں۔ وہ تمہاری تلاش میں حویلی پہنچے گی پھر اسے بتایا جائے گا کہ تمہیں تھانے والوں کے حوالے کردیا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ یقیناً تھانے آئے گی اور یہاں تم سے ملاقات ہوجائے گی۔"

"پھر آپ مجھے اماں کے ساتھ گھر جانے دیں گے نا......؟" اس نے پُراشتیاق نظر سے مجھے دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں اُمیدوں کے جگنو جگمگا رہے تھے۔ ان لمحات میں کیسو مجھے پہلے سے کہیں زیادہ معصوم اور پیارا لگا۔ میں نے اس کی تمناؤں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں کیسو! میں تمہیں تمہاری اماں کے ساتھ جانے کی اجازت دے دوں گا اور یہ وعدہ بھی کہ آیندہ پھر کبھی تھانے بھی نہیں بلاؤں گا لیکن اس کے لیے تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"کیسا وعدہ جی......؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"اب میں تم سے جو بھی پوچھوں گا، اس کا تم سچا اور کھرا جواب دو گے۔" میں نے اس کی سوالیہ نظر کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔ "اس بات کا وعدہ......!"

"میں نے تو پہلے بھی آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھانے دار صاحب......!"

"اسی لیے تو میں تمہارے ساتھ نرمی کا برتاؤ کررہا ہوں۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "آگے بھی سچ بولو گے تو میں نہ صرف یہ کہ تمہارے ساتھ نرمی سے پیش آؤں گا بلکہ تمہیں تھانے سے جانے کی اجازت بھی دے دوں گا۔ آج کی رات تم حوالات کے فرش پر نہیں بلکہ اپنے گھر کی چارپائی پر سوسکو گے......"

"میں سچ بولوں گا جی...... بالکل سچ بولوں گا۔" وہ ننھے بچوں کے مانند مچل کر بولا۔ "آپ پوچھیں جی...... کیا

پوچھنا ہے؟"

"اب مجھے تم سے جو کچھ بھی پوچھنا ہے وہ پندرہ منٹ کے بعد پوچھوں گا۔" میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"پندرہ منٹ بعد کیوں جی......؟" وہ تعجب خیز انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

اس کے سوال کا جواب میں نے نہیں، گاؤں کے موذن نے دیا۔ ادھر کیسو کی بات ختم ہوئی، ادھر فتح پور کی مسجد سے اذان مغرب کی صدا بلند ہونے لگی۔

"اللہ اکبر......اللہ اکبر......!"

☆☆☆

ہم دونوں ایک مرتبہ پھر روبرو بیٹھے ہوئے تھے۔ نماز مغرب کی ادائی کے لیے جاتے ہوئے میں کیسو کو حوالدار بشیر احمد کے سپرد کر گیا تھا اور اسے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ وہ بچے کے لیے کھانے پینے کا بھی بندوبست کرے...... تاکہ ذہن کے ساتھ ساتھ اس کی جسمانی توانائی بھی بحال ہو جائے۔ حوالدار نے میری ہدایت پر من وعن عمل کیا تھا۔ قیصر عرف کیسو اب خاصا ہشاش بشاش اور فریش دکھائی دے رہا تھا۔ اس وقت وہ میرے کمرے میں بیٹھا تھا۔

کیسو سے سوال وجواب کے دوران میں مجھے اس کے گھریلو حالات کے بارے میں بھی چند باتوں کا پتا چلا تھا جن کا میں ذکر کرنا بھول گیا ہوں مثلاً...... یہ کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ جب وہ ایک سال کا تھا تو اس کا باپ تاج دین انتقال کر گیا تھا۔ تاج دین ایک کھیت مزدور تھا۔ کیسو کی ماں صغراں نے اسے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا۔ سر پر چونکہ باپ کا سایہ موجود نہیں تھا اور ماں کی طرف سے بھی خاصا لاڈ پیار ملا تھا چنانچہ وہ کسی حد تک بگڑ گیا تھا۔ دن کا زیادہ حصہ وہ کھیل کود میں گھر سے باہر گزارتا تھا۔ گلی ڈنڈا، بنٹے (کنچے)، پتنگ اڑانا، غلیل کی مدد سے چڑیا اور کبوتر کا شکار کرنا، چھوٹی نہر میں نہانا، کھیتوں میں سے تربوز اور خربوزے اور باغ میں سے مختلف پھل چرا کر کھانا، اس کے پسندیدہ کھیل اور مشغلے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک تیز اور ہوشیار لڑکا تھا۔ اس حوالے سے عنایت کا فتویٰ بالکل درست تھا کہ......

"اس کی معصوم صورت پر نہ جائیں تھانے دار صاحب...... یہ اندر سے پکا شیطان ہے......!"

کیسو کی ماں صغراں پیشے کے اعتبار سے ماچھن تھی۔ اس نے اپنے گھر کے سامنے ہی روٹی والا تنور لگا رکھا تھا۔ اسی تنور کے ساتھ اس کی بھٹی (بھاڑ) بھی تھی جہاں وہ چنے، مکئی وغیرہ بھونا کرتی تھی۔ وہ دوپہر اور شام دونوں وقت تنور میں روٹی لگایا کرتی تھی لیکن بھٹی کا کام وہ صرف ایک وقت یعنی عصر اور مغرب کے درمیان کرتی تھی۔ یہی اس کا پیشہ تھا اور یہی روزگار۔ اس کام میں وہ اتنا کما لیتی تھی جس میں وہ ماں بیٹا بڑے آرام سے گزارہ کر رہے تھے۔

میں کیسو کی جانب متوجہ ہوا تو میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ پوچھ بیٹھا۔ "اب بتائیں جناب...... آپ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

"میں نے جب تم سے پوچھا تھا کہ تم نے کسی نہ کسی شخص کے کہنے پر بھوری بھینس کو تنگ کرنا شروع کیا تھا تو تم نے جواب دیا تھا...... ہاں!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "پھر میں نے کہا تھا کہ اس بندے کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے...... کہا تھا نا......؟"

"ہاں، کہا تو تھا جی!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن پھر آپ نے کوئی بات کی ہی نہیں اور نماز پڑھنے چلے گئے......!"

"اب میں نماز پڑھ کر واپس آ چکا ہوں۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "سچ سچ بتاؤ، تم کس شخص کے کہنے پر، پچھلے آٹھ دس دن سے یہ حرکت کر رہے تھے؟"

"جناب...... اس بندے کا نام ہے، اللہ دتا!" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا اللہ دتا بھی فتح پور ہی میں رہتا ہے؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ "سب لوگ اسے چاچا اللہ دتا کہتے ہیں۔"

"اللہ دتا کا حلیہ بتاؤ۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔ "اور میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ اللہ دتا کا گھر کس طرف واقع ہے؟"

قیصر عرف کیسو نے بڑی تفصیل سے اللہ دتا کا حلیہ بیان کیا جس کے مطابق وہ بندہ دبلا پتلا اور دراز قامت تھا۔ رنگت گہری سانولی اور ہاتھ پاؤں بڑے۔ اس کے بالائی ہونٹ پر کٹ کا نشان بھی تھا جو کئی سال پہلے ہونے والے ایک جھگڑے کی یادگار تھا۔ آخر میں کیسو نے کہا۔

"تھانے دار جی! اللہ دتا کا گھر ٹیوب ویل اور باغ کے درمیان ہے۔ اس کی کوئی اولاد نہیں......"

"تمہاری اللہ دتا سے کیسے ملاقات ہوئی تھی۔" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "اور اس نے تم سے کیا

کہا تھا؟"

"ہم اکثر ٹیوب ویل پر نہانے جایا کرتے ہیں اور باغ میں بھی......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اور آتے جاتے اللہ دتا سے سامنا ہو جاتا تھا۔ یہ کوئی آٹھ دس دن پہلے کی بات ہے......" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے اپنے ذہن میں واقعات کو ترتیب دینے لگا۔ چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے بتانا شروع کیا۔

"وہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں اس دن اکیلا ہی باغ میں امرود توڑنے گیا تھا۔ میں جیبوں میں امرود بھر کر جیسے ہی باغ سے نکلا" اللہ دتا سے سامنا ہو گیا۔ میں اسے دیکھتے ہی گھبرا گیا۔

اس نے مجھے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا اور معنی خیز انداز میں بولا۔ "باغ میں سے چوری کر کے آ رہے ہو نا......؟"

بے ساختہ میرے ہاتھ امرودوں سے بھری ہوئی جیبوں پر چلے گئے۔ اس نے پوچھا۔ "آج کیا شکار کر کے لائے ہو؟"

"ام......رود......"

"تمہارے دوسرے شیطان ساتھی کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"وہ سب تربوز لے کر نہر کی طرف گئے ہیں۔" میں نے بتایا۔ "وہ دو تین گھنٹے نہر میں خود بھی نہائیں گے اور تربوزوں کو بھی ٹھنڈا کریں گے پھر سب درختوں کے نیچے بیٹھ کر مزے سے کھائیں گے۔"

"آج تم ان کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟"

"مجھے صبح سے ہلکا ہلکا بخار ہے۔" میں نے بتایا۔ "اماں نے سختی سے منع کیا ہے کہ آج کا دن میں نہ تو ٹیوب ویل میں نہاؤں گا اور نہ نہر کی طرف جاؤں گا۔"

"اسی لیے تم باغ میں گھس گئے۔" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "چور، چوری چھوڑ سکتا ہے ہیرا پھیری نہیں...... اس وقت مالی آرام کرتا ہے اس لیے تم لوگوں کو موقع مل جاتا ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں پکڑ کر ابھی مالی کے حوالے کر سکتا ہوں۔ وہ ایسی چھیتی لگائے گا کہ سارا بخار ناک کے راستے نکل جائے گا لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔"

میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ اس کی بات کا مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"آؤ...... میرے ساتھ......!"

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ ہم ٹیوب ویل سے آگے ٹیلی والے کھوہ کے پاس پہنچے اور کھوہ کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔

اللہ دتا نے پہلے تو میرے نشانے کی بہت تعریف کی اور کہا کہ وہ مجھے غلیل سے چڑیوں کا شکار کرتے دیکھتا رہتا ہے۔ اگر میں اس کا ایک کام کر دوں تو وہ مالی سے میری شکایت نہیں کرے گا اور مجھے ایک روپیہ بھی دے گا۔ میں اس کی بات سن کر خوش ہو گیا۔

وہ بولا۔ "ایک روپیہ تو میں تمہیں پہلے دوں گا اور جب کام پورا ہو جائے گا تو پھر میں تمہیں پورے پانچ روپے دوں گا۔"

میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔

"چاچا...... کام تو بتاؤ، مجھے کرنا کیا ہے؟"

پھر اس نے ٹھہر ٹھہر کر مجھے کام کے بارے میں بتایا۔ مجھے کسی محفوظ جگہ پر چھپ کر باڑے میں کھڑی بھوری بھینس کو تنگ کرنا تھا۔ جب بھی کوئی اس بھینس کا دودھ نکالنے بیٹھے مجھے غلیل کی مدد سے اسے پریشان کرنا تھا اور ایسا پریشان کرنا تھا کہ اس کا دودھ نہ نکالا جا سکے۔ بس جناب...... پھر میں اس کام پر لگ گیا۔" وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اللہ دتا نے ایک روپیہ تو اسی وقت مجھے دے دیا تھا اور میں انتظار کر رہا تھا کہ کب اس کا کام ختم ہو اور کب مجھے پانچ روپے اور ملیں لیکن اس سے پہلے ہی کام خراب ہو گیا۔ آج جامن کے درخت پر میرا پاؤں پھسلا اور پتوں کی کھڑ کھڑاہٹ سے عنایا کو شک ہو گیا پھر جب میں درخت سے کود کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا تو ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا اور اب...... میں آپ کے سامنے ہوں جی......"

اس زمانے میں ایک روپیہ اور پانچ روپے کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ جب بچوں کو روزانہ کی جیب خرچی آنہ، دو آنہ ملتی ہو وہاں سولہ آنے کا روپیہ تو ان کے لیے بہت بڑی رقم ہی تھا۔ اللہ دتا، کیسو کو کام کی تکمیل پر پانچ روپے دیتا یا نہیں لیکن وہ ایڈوانس میں اسے ایک روپیہ دے چکا تھا اسے امید تھی کہ چاچا اللہ دتا ایک دن اسے پانچ روپے بھی دے گا۔ بہرحال، وہ دن آنے سے پہلے ہی کیسو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا لیکن ایک بات مجھے حیرت میں ڈال رہی تھی کہ اس نے عنایا اور اس کے ساتھیوں کی مار پیٹ کے نتیجے میں اپنی زبان پر قفل کیوں ڈالے رکھا تھا اور خاص طور پر جب چودھری نے اس سے باز پرس کی تو بھی اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ معما سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ گیارہ بارہ سال کا ایک بچہ اتنے مضبوط اعصاب کا مالک بھی ہو سکتا ہے، یہ امر میرے لیے قابل یقین نہیں تھا۔

میں نے اپنی الجھن دور کرنے کے لیے اسی سے پوچھ لیا۔ ”کیسو! ایک بات تو بتاؤ۔ جب عنایتا اور اس کے ساتھیوں نے تمہیں مارا پیٹا تو تم نے انہیں چاچا اللہ دتا کے بارے میں کیوں نہیں بتایا...... تم مار کھاتے رہے لیکن زبان نہیں کھولی...... اس کی کیا وجہ ہے؟“

جواب دینے سے پہلے اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”تھانے دار جی! ایک تو میں لالچ میں آ گیا تھا اور دوسری بات یہ کہ مجھے چاچا اللہ دتا کا بھی ڈر تھا۔“

”کیا مطلب......!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”ذرا وضاحت کرو۔“

”مجھے لالچ تو اس بات کا تھا کہ اللہ دتا نے پانچ روپے دینے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔“ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ”اللہ دتا نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں نے کبھی اس کا نام لیا تو وہ پھر مجھے کبھی پانچ روپے نہیں دے گا اور وہ اس بات سے بھی مکر جائے گا کہ اس نے مجھے کوئی کام کرنے کو کہا تھا...... تھانے دار جی! میں نے ایک روپے کی بہت ساری مزے دار چیزیں کھائی تھیں اس لیے پانچ روپے بھی حاصل کرنا چاہتا تھا اسی لیے میں نے زبان بند رکھی تھی۔“

”سمجھو کہ تم نے ابھی زبان بند ہی رکھی ہوئی ہے۔“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ”مجھے بھی تم نے اللہ دتا اور اس کے کام کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

”جی......“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”ل ل...... لیکن میں نے تو آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے تھانے دار صاحب......“

”یہ راز صرف ہم دونوں کے درمیان رہے گا کہ تم نے مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم باہر جا کر یہی کہنا کہ تم نے مجھے یہ بتایا ہے کہ بس، شرارت میں تم بھوری بھینس کو تنگ کرتے تھے۔ تمہاری اس شیطانی کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ مجھ سے جو پوچھے گا، میں بھی اسے یہی بتاؤں گا۔ اس طرح وہ چاچا اللہ دتا بھی تم سے ناراض نہیں ہوگا اور ہو سکتا ہے، وہ تمہیں پانچ روپے بھی دے دے۔“

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”آپ کتنے اچھے تھانے دار ہیں......“

”میں اچھا تھانے دار اسی وقت تک ہوں بچے جب تک سامنے والا میرے ساتھ سیدھا رہتا ہے۔“ میں نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر کوئی بندہ مجھے چکر دینے کی کوشش کرے تو پھر میں اس کی کھال بھی اتار لیا کرتا ہوں۔“

”آپ تو ڈرا رہے ہیں مجھے......“ وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔

”اگر تمہارا کسی گڑبڑ کا ارادہ نہیں تو پھر تمہیں بالکل نہیں ڈرنا چاہیے۔“ میں نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔ ”میں نے تمہیں جو کچھ سمجھایا ہے، خاموشی سے اس پر عمل کرنا۔ بس، پھر سب کچھ ٹھیک رہے گا۔“

وہ پیٹ کا کتنا مضبوط ہے، اس بات کا تو مجھے بہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ عنایت اور چودھری ارشاد کی سختی کے سامنے جب اس نے زبان نہیں کھولی تو وہ یقیناً میری ہدایات کا بھی پاس کرتا۔ میری تاکید کے جواب میں اس نے کہا۔

”تھانے دار جی! میں آپ کی ہر بات مانوں گا لیکن جب آپ چاچا اللہ دتا سے پوچھ گچھ کریں گے تو پھر میرا راز کھل جائے گا۔“

وہ گیارہ بارہ سال کا ہونے کے باوجود بھی کمزور صحت کے باعث آٹھ نو سال کا بچہ نظر آتا تھا لیکن اس کی بات چیت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سترہ، اٹھارہ سال سے کم کا نہیں۔ اس کی بے باکی اور اعتماد پر مجھے حیرت تھی۔ میں نے کہا۔

”کیسو! تم بالکل بے فکر ہو جاؤ...... میں اللہ دتا اور چودھری ارشاد سے اپنے انداز میں بات کروں گا۔ تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا۔“

”پھر تو ٹھیک ہے جناب!“ اس نے اطمینان بھری سانس خارج کی۔

میں نے پوچھا۔ ”تم بھوری بھینس کے ساتھ جو کچھ کرتے رہے ہو، اس کے بارے میں اللہ دتا کے علاوہ اور کس کس کو پتا ہے؟“

”کسی کو بھی نہیں تھانے دار جی......!“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

”کسی کو پتا چلنا بھی نہیں چاہیے......“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے...... شاباش!“ میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”اب میں تمہیں گھر بھجوانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“

پھر میں نے دروازے کی جانب منہ کر کے کانسٹیبل کو آواز دی۔ ”حکم داد......!“

تھوڑی دیر کے بعد کانسٹیبل حکم داد میرے سامنے حاضر تھا۔ میں نے انگلی سے کیسو کی جانب اشارہ کیا اور کانسٹیبل سے کہا۔

”حکم داد! تم اس کے ساتھ موضع فتح پور تک جاؤ گے اور اسے صغراں ماچھن کے گھر پہنچا کر آؤ گے...... ابھی اور اسی وقت......!“

”جی......!“ کانسٹیبل نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ نے کیا نام بتایا ہے ملک صاحب......؟“

”کس کا نام؟“ میں نے الٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

”ماچھن کا جناب......!“ اس نے کہا۔

”صغراں ماچھن......!“ میں نے دہرایا پھر پوچھا۔ ”حکم داد! کیا تم کیسو کی ماں کو جانتے ہو؟“

”تھوڑی دیر سے جاننے لگا ہوں جناب......!“

”تھوڑی دیر سے...... کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جناب! کافی دیر سے ایک مائی باہر برآمدے میں آئی بیٹھی ہے۔ وہ آپ سے ملنے کی ضد کر رہی تھی لیکن آپ اس لڑکے سے پوچھ گچھ کر رہے تھے اس لیے ہم نے اسے آپ کے کمرے میں نہیں بھیجا......“ وہ لحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ مائی بھی اپنا نام صغراں ہی بتا رہی ہے۔“

میری چھٹی حس نے بڑا واضح اعلان کر دیا۔ وہ صغراں، کیسو کی ماں صغراں ماچھن کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اگلے ہی لمحے میں نے کانسٹیبل کو حکم دیا۔

”حکم داد...... اس صغراں مائی کو فوراً اندر بھیجو......“

حکم داد نے چشم زدن میں میرے حکم کی تعمیل کی اور صغراں نامی مذکورہ مائی کو میرے سامنے پیش کر دیا۔ میں نے یکے بعد دیگرے کیسو اور صغراں کے چہروں کا جائزہ لیا اور میری چھٹی حس کی پکار حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔

میں نے کانسٹیبل حکم داد کی معیت میں دونوں ماں بیٹے کو ان کے گھر روانہ کر دیا۔ پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر چاچا اللہ دتا کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں اس کردار اللہ دتا کے بارے میں فی الحال زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میری معلومات وہیں تک محدود تھیں جہاں تک قیصر عرف کیسو نے مجھے بتایا تھا مثلاً یہ کہ وہ دبلا پتلا اور لمبا تڑنگا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ اس کے بالائی ہونٹ پر زخم کا نشان تھا۔ گاؤں میں سب لوگ اسے چاچا اللہ دتا کہہ کر پکارتے تھے اور...... یہ کہ وہ ٹیوب ویل اور باغ کے درمیان واقع ایک گھر میں رہتا تھا، وغیرہ...... وغیرہ!

قیصر کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں میرے ذہن میں اللہ دتا کا ایک ہیولا سا بن گیا تھا لیکن اس ہیولے سے بھی زیادہ اہم وہ سنسنی خیز خیالات تھے جو اللہ دتا کے عزائم سے متعلق تھے۔ اس نے آخر کس مقصد سے کیسو کو وہ احمقانہ کام سونپا تھا۔ بہ ظاہر احمقانہ نظر آنے والے اس کام کے پیچھے یقیناً اللہ دتا کا کوئی گہرا مقصد چھپا ہوا تھا اور مجھے اسی اہم مقصد کو کھوج کر نکالنا تھا۔

میرا ذہن اگرچہ اللہ دتا کے عزائم کے حوالے سے کلیئر نہیں تھا لیکن ایک بات تو طے تھی...... اور وہ یہ کہ اللہ دتا نہیں چاہتا تھا کہ بھوری بھینس کا دودھ نکالا جائے جبھی اس نے کیسو کو پیسوں کا لالچ دے کر اس عجیب و غریب مصروفیت میں ڈال دیا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اللہ دتا ایسا کیوں چاہتا تھا؟

اس سوال کے مختلف جواب میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ اللہ دتا کو یقیناً تین میں سے کسی ایک سے دشمنی تھی۔ نمبر ایک...... بھوری بھینس سے دشمنی!

جب کافی دنوں تک کسی دودھ دینے والے جانور کا دودھ نہ نکالا جائے تو نتیجے کے طور پر رفتہ رفتہ اس کا دودھ سوکھنے لگتا ہے۔ اللہ دتا چاہتا تھا کہ بھوری بھینس کا دودھ سوکھ جائے اور اس کی قدر و قیمت دو کوڑی کی نہ رہے۔

نمبر دو...... عنایت سے دشمنی! اللہ دتا کی ہدایت پر کیسو جو حرکت کر رہا تھا اس کے نتیجے میں عنایت کو بھوری بھینس کا دودھ نکالنے میں ناکامی کا سامنا ہو رہا تھا اور اس ناکامی پر عنایت کو چودھری ارشاد کی جھڑکیاں سننا پڑ رہی تھیں۔ اللہ دتا، عنایت کو ذلیل و خوار کرنا چاہتا تھا۔

نمبر تین...... نورین سے دشمنی! چودھری ارشاد نے وہ بھوری بھینس خاص طور پر اپنی نئی نویلی دلہن الہڑ مٹیار نورین کے لیے خریدی تھی۔ نورین کو دودھ پینے کا اور بھوری بھینس کو دودھ دینے کا بہت شوق تھا لیکن ان دس بارہ دنوں میں بدقسمتی سے بھوری بھینس کے دودھ کی ایک بوند بھی نورین کے حلق سے نیچے نہیں اتری تھی۔ اللہ دتا نہیں چاہتا تھا کہ بھوری بھینس کا دودھ، نورین کے شکم میں اترے۔

ان تینوں اسباب میں سے کوئی ایک تھا یا پھر کوئی چوتھی وجہ تھی، بہرحال یہ جاننا زیادہ ضروری تھا کہ اللہ دتا آخر ایسا چاہتا کیوں تھا؟

اس ”کیوں“ کا جواب تلاش کرنے کے لیے میں نے اپنے ذہن کو مامور کر دیا اور تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں آ گیا جو تھانے کے عقبی حصے میں بنا ہوا تھا۔

☆☆☆

رات کو میں دیر تک چاچا اللہ دتا کے بارے میں سوچتا رہا اور اپنے ذہن میں ایک خاص پروگرام ترتیب دے کر سو گیا کہ اگلی صبح مجھے کون کون سے کام سرانجام دینا ہیں۔

سوچنا انسان کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کسی انسان کی سوچ پر پابندی عائد نہیں کر سکتے لیکن اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ انسان جیسا سوچے، عملاً ویسا پیش بھی آ جائے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اگلی صبح میرے پروگرام کا سوا ستیاناس ہو گیا تھا۔ میں ناشتے کے بعد حسب معمول تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو ایک بری خبر میری منتظر تھی۔

ایک کانسٹیبل نے مجھے بتایا۔ ”ملک صاحب! موضع فتح پور میں رات ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا ہے۔“

”کیسا واقعہ خادم حسین؟“ میں نے چونک کر اطلاع دینے والے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ اس کی بات سن کر میرا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔

”وہ چودھری صاحب کی بیوی ہے نا......؟“ کانسٹیبل نے بتانا شروع کیا۔

”کون سی بیوی؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر سوال کر ڈالا۔ میرے لہجے میں حد درجہ اضطرار بھرا ہوا تھا۔ ”چھوٹی یا بڑی......؟“

”میں چھوٹی بیوی کی بات کر رہا ہوں ملک صاحب......“ اس نے جواب دیا۔ ”جس کا نام نورین ہے اور جو......“

میں نے ایک بار پھر قطع کلامی کی اور پوچھا۔ ”خادم حسین! چھوٹی چودھرائن نورین کو کیا ہو گیا ہے......؟“

”آج رات کے آخری پہر چھوٹی چودھرائن فوت ہو گئی ہے۔“ خادم حسین نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

”کیا......؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

کانسٹیبل خادم حسین کا تعلق موضع فتح پور ہی سے تھا لہٰذا اس کی اطلاع کو مبنی بر صداقت ہی تصور کیا جانا چاہیے تھا۔ وہ روزانہ صبح ڈیوٹی کرنے تھانے آتا تھا اور رات کو ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد واپس اپنے گھر چلا جاتا تھا۔

میرے ”کیا؟“ کے جواب میں اس نے بتایا۔ ”جی ملک صاحب! مجھے بھی یہ خبر صبح ہی ملی ہے۔ میں ناشتا کر رہا تھا کہ پتا چلا، حویلی میں چھوٹی چودھرائن جی کا انتقال ہو گیا ہے۔“

”لیکن یہ ہوا کیسے؟“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”زیادہ تفصیلات کا تو مجھے بھی پتا نہیں ہے جناب۔“ خادم حسین نے کہا۔ ”میں نے ناشتا ختم کیا اور ڈیوٹی پر چلا آیا ہوں۔“

”تفصیلات کا اگر تمہیں علم نہیں ہے تو فوراً جا کر پتا لگاؤ۔“ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”مجھے مکمل رپورٹ چاہیے...... جلد از جلد......!“

وہ مجھے سیلوٹ کر کے کمرے سے نکل گیا۔

یہ عجیب واہیات صورت حال سامنے آئی تھی۔ میں نے تو سوچا ہی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو جائے گا اور نہ ہی چودھری ارشاد نے کبھی خواب و خیال میں اس بارے میں سوچا ہو گا۔

وہ پچھلے کچھ عرصے سے کتنا خوش تھا۔ اس نے جس تمنا کو پورا کرنے کے لیے بڑھاپے میں دوسری شادی کا فیصلہ کیا تھا اس کی تکمیل کے واضح آثار نمودار ہو گئے تھے۔ چھوٹی چودھرائن نہ صرف یہ کہ امید سے ہو گئی تھی بلکہ تجربہ کار دائی صفیہ نے یہ فتویٰ بھی دے دیا تھا کہ نورین انشاء اللہ اولاد نرینہ کو جنم دے گی۔

چودھری ارشاد کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اسے اپنا نام لیوا اور جائداد کا اصلی وارث ملنے والا تھا کہ اچانک وہ شاخ ہی ٹوٹ گئی تھی جس پر فصل امید بہار دکھانے والی تھی۔ اس واقعے نے یقیناً چودھری کو توڑ کر رکھ دیا ہو گا۔

ایک گھنٹے کے بعد خادم حسین واپس آ گیا اور اس نے آ کر بتایا کہ چھوٹی چودھرائن کے پیٹ میں آدھی رات کو شدید نوعیت کا درد اٹھا تھا۔ درد کی شدت اس درجے کی تھی کہ وہ پیٹ پکڑ کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ اس صورت حال نے حویلی اور اس کے مکینوں کو حد درجہ پریشان کر دیا تھا۔ چودھری نے فوری طور پر ایک بندہ حکیم جی کی طرف دوڑایا اور دوسرا صفیہ دائی کی جانب۔ یہ دونوں شخصیات موضع فتح پور ہی میں رہتی تھیں۔ دونوں چند منٹ میں حویلی کے اندر تھے۔

پہلے صفیہ دائی حویلی میں پہنچی تھی۔ اس نے تکلیف سے تڑپتی ہوئی نورین کو سیدھا کر کے اس کا طبی معائنہ شروع کر دیا۔ سیدھا کرنے کے باوجود بھی چھوٹی چودھرائن کے دونوں ہاتھ اس کے پیٹ پر ہی تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے شکم میں بڑی طوفانی نوعیت کی تکلیف تھی۔

نورین کی یہ حالت برقرار رہی تو دائی کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس کو ہوا کیا ہے۔ رات کو وہ چودھرائن کو بھلی چنگی حویلی میں چھوڑ کر گئی تھی اور اب اس کی کیفیت ہی بدلی ہوئی تھی۔

اسی دوران میں حکیم جی بھی حویلی پہنچ گئے۔ ان کی ماہرانہ نگاہ نے نورین کو دیکھتے ہی کچھ اہم اندازے قائم کر لیے۔ وہ اس کی نبض تھام کر بیٹھ گئے اور اہل خانہ سے سوال و جواب شروع کر دیے۔

”چودھرائن جی نے رات کو کھانے میں کیا کھایا تھا؟“ انہیں بتایا گیا۔ ”آلو بینگن کا سالن اور چاول۔ اس کے ساتھ اچار بھی تھا۔“

”اچار کے علاوہ؟“ حکیم جی نے پوچھا۔

”اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“

”دودھ وغیرہ تو چاول میں نہیں ڈالا گیا تھا؟“

”جی بالکل نہیں...... لیکن......!“

”لیکن کیا؟“ حکیم جی نے چونک کر دیکھا۔

”چودھرائن جی کو دودھ بہت پسند ہے۔“ چودھری ارشاد نے بتایا۔ ”رات کو سونے سے پہلے اس نے دودھ کا بھرا ہوا گلاس پیا تھا۔“

آلو بادی، بینگن بادی، دودھ بادی، اچار ترش تر......“ وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ”بہت ساری مضر صحت چیزیں ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں۔ یہ ساری خرابی اسی وجہ سے ہے۔“

”حکیم جی! خرابی کسی بھی وجہ سے ہے لیکن آپ چودھرائن جی کو کوئی دوائی وغیرہ تو دیں۔“ چودھری ارشاد نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ”دیکھیں نا...... تکلیف کی شدت سے بے چاری کس طرح تڑپ رہی ہے۔“

”مجھے چودھرائن جی کی کیفیت کا اچھی طرح اندازہ ہے چودھری صاحب!“ حکیم جی اپنا بکس کھولتے ہوئے بولے۔ ”میں ابھی ان کو ایک ایسی دوا چٹاتا ہوں کہ دیکھتے ہی دیکھتے پیٹ کا درد غائب ہو جائے گا۔ آپ ایک کام کریں......“

”کیا کام......؟“ چودھری نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”حویلی کے باورچی خانے میں اگر کوئی لیموں رکھا ہو تو لے آئیں۔ لیموں نہ ہو تو پھر ادرک کا ایک ٹکڑا منگوا لیں۔“ حکیم جی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور اس کے ساتھ ہی ایک چھری بھی......“

چند سیکنڈ میں چھری کے ہمراہ لیموں اور ادرک دونوں چیزیں حکیم جی کو مہیا کر دی گئیں۔ حکیم جی نے چھری کی مدد سے لیموں کو دولخت کیا پھر اپنے بیگ نما بکس میں سے ایک نیالا سا سفوف نکال کر اسے لیموں پر چھڑکا اور اس سفوف زدہ لیموں کو چودھرائن کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ چاٹ لو بیٹا...... ابھی تمہاری تکلیف رفع ہو جائے گی۔“

چودھری کی بیوی کا درد کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ وہ اس حالت میں نہیں تھی کہ خود اپنے ہاتھ سے پکڑ کر لیموں کو چاٹ سکتی۔ اس وقت وہاں حویلی کے تمام وسنیک موجود تھے۔ کیا ملازمین، کیا مالکان...... ہر بندہ سخت پریشان اور تشویش میں مبتلا تھا۔ صفیہ دائی نے فوراً ہاتھ بڑھا کر حکیم جی کے ہاتھ سے لیموں کا مذکورہ ٹکڑا لے لیا اور امداد طلب نظر سے چودھری کی طرف دیکھا۔

چودھری ارشاد جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے چودھرائن کا سر اپنی گود میں رکھ لیا پھر صفیہ دائی کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”میں اس کا منہ کھول رہا ہوں۔ تم اس کی زبان سے لیموں لگا دینا۔“

”میں ابھی زندہ ہوں چودھری صاحب!“ نورین نے تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے کہا۔ ”لائیں...... لیموں مجھے پکڑائیں۔ میں خود ہی چاٹ لوں گی۔“

حکیم نے نورین کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، یہ زیادہ ٹھیک ہے۔ لیموں چودھرائن جی کو دے دیں۔“

فوری طور پر یہی کیا گیا۔ نورین نے لیموں کا ادھ کٹا ٹکڑا اپنے ہاتھ میں لے کر منہ کی جانب بڑھایا۔ چودھری ارشاد نے پوری طرح اسے سہارا دے رکھا تھا لیکن اس سے پہلے کہ نورین اس لیموں کو زبان تک پہنچا کر چاٹ پاتی، ایک عجیب اور ہولناک واقعہ رونما ہوا۔

نورین کے بدن نے ایک خطرناک جھٹکا کھایا اور اگلے ہی لمحے اس نے ایک بڑی قے کر دی۔ سرخ سرخ...... خون آلود قے...... بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ قے نہ ہو، باقاعدہ خون کا اخراج الٹی کی صورت ہوا ہو۔

نورین اور چودھری کا لباس خون خون ہو گیا۔ اس قے کے چھینٹے صفیہ کے کپڑوں اور بستر پر بھی گرے تھے الغرض، جو بھی شے اس کی لپیٹ میں آئی خون رنگ ہو گئی...... حکیم جی نفی میں گردن ہلاتے ہوئے ایک ہی جملہ دہرائے جا رہے تھے۔

”یہ آلو بینگن اور دودھ تک محدود نہیں ہے۔ مجھے تو یہ کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے۔“

”کیا معاملہ لگتا ہے حکیم جی......؟“ چودھری نے فکرمندی سے پوچھا۔

”چودھرائن جی کے پیٹ میں خوراک کے ساتھ کوئی زہریلی شے بھی چلی گئی ہے۔“ حکیم جی تشویش بھرے لہجے

میں وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''یہ آثار تو ٹھیک نہیں ہیں......''

''کچھ کریں حکیم جی......'' چودھری بے بسی کے عالم میں چلایا۔ ''چودھرائن جی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے پیٹ میں میرا بچہ ہے۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو میری دنیا میں اندھیرا چھا جائے گا۔''

حکیم جی نورین کی نبض پکڑ کر بیٹھ گئے اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں کوشش کرتا ہوں۔ آگے اللہ مالک ہے۔''

''کریں...... کریں...... جو بھی کوشش کرنا ہے، فوراً کریں۔'' چودھری نے اصراری انداز میں کہا۔ ''لیکن چودھرائن جی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔''

''اس کی نبض ڈوب رہی ہے چودھری صاحب!'' حکیم جی بے حد گھبرائے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''اللہ خیر کرے......!''

مگر اللہ نے اس مرحلے پر خیر نہیں کی یا یوں سمجھ لیں کہ اس وقت جو واقعہ پیش آیا، وہ چودھری ارشاد کی نظر میں، خیر کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ نورین نے خون کی مزید ایک قے کی اور اس کا بدن ٹھنڈا ٹھار ہوگیا۔ وہ ختم ہوگئی تھی۔ اور ظاہر ہے، اس کے پیٹ میں موجود چودھری کی اولادِ نرینہ بھی نورین کے ساتھ ہی اس دنیا میں آنکھ کھولنے سے پہلے اس دنیا کی طرف چلی گئی تھی۔

حکیم جی نے مایوسی بھرے انداز میں گردن جھکا دی۔

کانسٹیبل نے بڑی تفصیل سے نورین کی موت کی منظرکشی کی تو میں بھی پلک جھپکتے میں اسی نتیجے پر پہنچا جہاں حکیم جی پہنچے تھے یعنی نورین کی موت کسی زہریلی شے کے سبب واقع ہوئی تھی۔ خون کی الٹیاں کر کے جان سے ہاتھ دھو بیٹھنا اسی امر کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ مرنے والی کو زہر دیا گیا تھا۔

حکیم جی تو ایک طبیب تھے، ایک معالج تھے لہٰذا نورین کی موت کی درست ''تشخیص'' کر کے وہ ایک طرف چپ ہو کر بیٹھ گئے تھے لیکن میں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ میں پولیس کا ایک اہم اور ذمے دار آفیسر تھا۔ قانون کا پاس اور عمل داری میرے فرائض کا حصہ تھا لہٰذا میں بھلا کیسے خاموش ہو کر بیٹھ جاتا...... یہ وقت تو میرے سرگرم ہونے کا تھا۔ اگر نورین کو زہر دیا گیا تھا تو سیدھی سیدھی یہ قتل کی ایک واردات تھی۔

''خادم حسین!'' میں نے کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تیاری کرو۔ ہم ابھی اور اسی وقت چودھری کی حویلی جارہے ہیں۔''

''اوکے سر!'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

☆☆☆

حویلی کسی ماتم کدہ کا منظر پیش کررہی تھی۔

چودھری ارشاد کی پہلی بیوی سے چار اولادیں پیدا ہوئی تھیں جن میں سے صرف ایک پہلوٹھی کی بچی نادرہ عرف رانی زندہ تھی۔ اس کے بعد پیدا ہونے والے چودھری قدیر، چودھری نعیم اور چودھری سلطان اپنی اپنی باری پر زندگی کا ایک سال بھی پورا کرنے سے پہلے ہی راہیٔ عدم ہوگئے تھے۔ تینوں بیٹوں کی موت اس کے سینے کے داغ بن کر تکلیف اور اذیت کا سامان پیدا کرتے رہتے تھے۔ اس کے بعد نور جہاں کے بطن سے پھر کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔

چودھری کو بیٹے کی خواہش تھی۔ اسے اپنی جائداد کا وارث چاہیے تھا۔ ایک ایسا سپوت جو اس کی نسل کو آگے بڑھانے کا سبب بنے لیکن نور جہاں کی طرف ناامیدی اور مایوسی کی جھنڈی لہراتی رہتی تھی لہٰذا مجبوراً اس نے بڑھاپے میں دوسری شادی کرلی تھی کہ اگر مقدر میں اولادِ نرینہ ہے تو اس کی جانب سے کوشش اور تگ و دو میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

چودھری کا، دوسری شادی کا فیصلہ بڑا کامیاب رہا تھا، چھوٹی چودھرائن نورین نے اپنے حسن اور جوبن سے نہ صرف یہ کہ چودھری کی خلوت کو جگمگا دیا تھا بلکہ اس کی اولادِ نرینہ کی خواہشِ دیرینہ کی تکمیل کا باعث بھی بنتے جارہی تھی۔ ایک ماہر دائی صفیہ نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ نورین چودھری کے بیٹے کو جنم دے گی۔

اس خوش خبری نے چودھری ارشاد کے ارمانوں اور امنگوں کو بے طرح رقص کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس کی مسرتیں اور خوشیاں ابھی بالغ بھی نہیں ہونے پائی تھیں کہ سب کچھ پانی کے بلبلے کے مانند ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ گیا تھا۔

اس وقت پوری حویلی میں سب سے زیادہ سوگوار چودھری ارشاد ہی تھا لہٰذا میں اسی کے پاس جا بیٹھا۔ ہماری پہلے بھی ملاقات تھی اور دونوں ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف بھی تھے۔ میں نے چھوٹی چودھرائن کی موت پر دلی صدمے کا اظہار کرتے ہوئے مناسب الفاظ میں تعزیت کر دی پھر پوچھا۔

''چودھری صاحب! چودھرائن جی کی تدفین کا کیا وقت رکھا ہے؟''

''ظہر اور عصر کی نماز کے بیچ'' اس نے رنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''میں اس وقت چودھرائن جی کی صفِ ماتم پر بیٹھا ہوا ہوں اس لیے یہاں بیٹھ کر تفصیلی باتیں کرنا

مناسب نہیں ہوگا۔ کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے تنہائی میں مل سکتے ہیں......؟''

اس نے چونک کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور سرگوشیانہ انداز میں بولا۔ ''ملک صاحب! خیریت تو ہے نا......؟''

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''بس، سمجھ لیں کہ خیریت ہی نہیں ہے چودھری صاحب!''

اس کی آواز بھیگ گئی، ٹوٹے ہوئے لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''میں اس وقت جتنی بڑی قیامت سے گزر رہا ہوں، کیا اس سے زیادہ بری خبر ہوسکتی ہے کوئی......؟''

''جی چودھری صاحب!'' میں نے بھی جواباً سرگوشیانہ انداز ہی اختیار کیا۔ ''میں آپ سے جو بات کرنا چاہتا ہوں اس کا تعلق چودھرائن جی کی المناک موت کی حقیقت سے ہے اور...... یہ گفتگو صفِ ماتم پر بیٹھ کر سب کے سامنے نہیں ہوسکتی۔''

''موت کی حقیقت......؟'' وہ بدکے ہوئے انداز میں بولا۔

مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ میری بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا تاہم اس نے چہرے کے تاثرات سے یہی ظاہر کیا کہ میری بات اس کے پلے نہیں پڑی تھی۔

میں نے ایک چال چلی۔ ''چودھری صاحب! آپ کی حویلی میں قدم رکھنے سے پہلے میں حکیم جی سے ایک بھرپور ملاقات کرچکا ہوں۔ ہم نے چودھرائن جی کی موت پر ہی بات کی تھی۔''

میں حکیم جی سے قطعاً نہیں ملا تھا تاہم چودھری میرے داؤ میں آگیا اور جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

''ملک صاحب! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں اس وقت کتنا دکھی ہوں؟''

''کیوں نہیں چودھری صاحب!'' میں نے دل جوئی کرنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھ سے زیادہ یہ بات اور کون جان سکتا ہے۔ میں آپ کے تمام تر حالات سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

''پھر آپ مجھ پر ایک مہربانی کریں ملک صاحب!'' وہ التجا ریز لہجے میں بولا۔ ''ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔''

''بعد میں کب چودھری صاحب؟''

''نورین کی تدفین کے بعد......''

''پھر کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب ملک صاحب......؟''

''میں آپ سے جو سنجیدہ بات کرنے والا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا تعلق چودھرائن جی کی غیر طبعی موت سے ہے۔ جب موت غیر طبعی واقع ہوئی ہے تو پھر بات چیت تدفین سے پہلے ہی ہوجانا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ بعدازاں چودھرائن جی کی قبر کو کھود کر......''

''ٹھیک ہے ملک صاحب......!'' وہ ہتھیار پھینکتے ہوئے بولا۔ ''آئیں، ہم اندر کسی کمرے میں جاکر بیٹھتے ہیں۔''

ہم دونوں کے بعد دیگرے نورین کی صفِ ماتم سے اٹھے پھر میں چودھری کی رہنمائی میں چلتے ہوئے ایک ایسے کمرے میں پہنچا جو خواب گاہ کا منظر پیش کرتا تھا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ متوفی نورین اور چودھری ارشاد کا بیڈ روم تھا۔ جب ہم آرام سے بیٹھ چکے تو میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''چودھری صاحب! یہ ایسا موقع نہیں ہے کہ میں خواہ مخواہ بات کو گھما پھرا کر آپ کا اور اپنا وقت برباد کروں لہٰذا مجھے جو کچھ کہنا ہے، صاف اور دوٹوک انداز میں کہہ رہا ہوں۔''

''میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

یہ ایک حقیقت تھی کہ میری ابھی تک حکیم جی سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن باہر صفِ ماتم پر بیٹھے ہوئے کانسٹیبل خادم حسین نے ایسے جامع الفاظ میں نورین کی موت کا منظر کھینچا تھا کہ اس سلسلے میں مجھے کسی سے کوئی تفصیل حاصل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

میں نے نہایت ہی مختصر مگر پُراثر الفاظ میں چودھری ارشاد کو اپنے حتمی اور تحقیقاتی خیالات سے آگاہ کیا۔ میرا بیان اتنا جامع اور مدلل تھا کہ چودھری کے پاس اختلاف یا انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ وہ کوئی کوڑھ مغز اور بددماغ چودھری نہیں تھا جو خواہ مخواہ کی کج بحثی پر اتر آتا۔ میں جب سے اس تھانے میں تعینات تھا، میں نے چودھری ارشاد کو ایک دانا بینا اور زیرک شخص پایا تھا۔ حالیہ واقعے کی تہ میں تو وہ بھی پوری طرح اترا بیٹھا تھا لیکن اظہار سے ڈرتا تھا۔ یہ اس کی بزدلی نہیں بلکہ مصلحت کوشی تھی۔ جب میں نے تمام تر حقیقت اس کے گوش گزار کردی تو اس نے شکستہ لہجے میں پوچھا۔

''پھر آپ کا کیا ارادہ ہے ملک صاحب......؟''

میں نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کردیا۔

وہ خوشامدانہ انداز میں بولا۔ ''ملک صاحب! چھوٹی

چودھرائن بڑی اذیت اٹھانے کے بعد موت کے منہ میں گئی ہے۔ اب اس کی لاش کی چیر پھاڑ......'' وہ جھرجھری لے کر خاموش ہوگیا۔

میں نے کہا۔ ''چودھرائن جی نے وہ تکلیف اور اذیت اس لیے سہی تھی کہ اس وقت ان کے بدن میں جان موجود تھی لیکن اب جو کچھ بھی ہوگا وہ ایک مردہ جسم...... ایک لاش کے ساتھ ہوگا لہٰذا آپ اس سلسلے میں قطعاً پریشان نہ ہوں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ چودھرائن جی کی موت کی حقیقت کو کھول دے گی۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ویسے مجھے تو پورا یقین ہے، چودھرائن جی کو زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ کیا آپ اپنی چہیتی بیوی کے قاتل کو یونہی چھوڑ دیں گے...... وہ بیوی جو آپ کے لیے جائداد کا وارث پیدا کرنے والی تھی...... آپ کی نسل کو آگے بڑھانے والی تھی......؟''

میرے ان جذباتی ڈائیلاگ نے چودھری کی آنکھوں سے آنسو جاری کر دیے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''ملک صاحب! سب کچھ ختم ہوگیا...... نہ نورین زندہ رہی اور نہ ہی میری نسل کا چراغ روشن کرنے والا وہ بچہ جو اس کی کوکھ میں اپنی زندگی کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا۔ میری تو دنیا ہی لٹ گئی۔''

میں تھوڑی دیر تک اسے سینے سے لگا کر تسلی دلاسا دیتا رہا اور اس کے کان میں سمجھانے کا عمل بھی جاری رکھا۔ بالآخر میری بات نے اس مرد معقول کی عقل میں جگہ بنالی اور وہ مجھ سے تعاون کے لیے تیار ہوگیا۔ بس، میرے لیے اتنا اشارہ ہی کافی تھا۔

میں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔

چھوٹی چودھرائن کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوانے سے پہلے میں نے کچن والی کارروائی کو نمٹانا زیادہ ضروری سمجھا اور چودھری سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ خاموشی سے تماشا دیکھتا رہے۔ جو بھی ہوگا، اس کے حق میں بہتر ہی ہوگا۔ اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

عموماً قتل کی واردات کے سلسلے میں، واقعاتی شہادتیں بعد میں تلاش کی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے لاش کا معائنہ کیا جاتا ہے اور اسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے بعد دیگر کارروائی کی جاتی ہے لیکن یہاں روایت کے برعکس ہو رہا تھا اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔

جب میں کانسٹیبل خادم حسین کے ساتھ چودھری کی حویلی پہنچا تھا تو اس وقت تک حویلی کے اندر یہی تاثر پایا جاتا تھا کہ چھوٹی چودھرائن خون کی الٹیاں کرتے ہوئے موت کے منہ میں چلی گئی ہے اور اب نماز ظہر کے بعد اس کی نماز جنازہ ادا کی جائے گی۔ حویلی کے اندر تعزیت کے لیے آنے والے افراد کا ہجوم جمع تھا جن میں گاؤں والوں کے علاوہ چودھری ارشاد کے رشتے داروں کی ایک بڑی تعداد بھی موجود تھی جو ظہر اور عصر کے درمیان چودھرائن جی کی تدفین کا ذہن بنائے بیٹھے تھے۔ اب اگر اچانک انہیں پتا چلتا کہ حویلی میں درحقیقت قتل کی ایک واردات ہوئی ہے اور چودھرائن نورین کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوایا جا رہا ہے تو یقیناً وہاں ایک بھگدڑ سی مچ جاتی جس سے پولیس کو کارروائی میں مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔

میرے اس فوری فیصلے کا ایک اور تکنیکی پہلو بھی تھا۔ اگر حویلی کے اندر یہ خبر عام ہو جاتی کہ پولیس چودھرائن نورین کی لاش کو قتل کے شبہے میں پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھیج رہی ہے تو کچن کی متوقع شہادتیں ضائع کر دیے جانے کے روشن امکانات تھے۔ اگر نورین کا قاتل اسی حویلی سے تعلق رکھتا تھا اور جیسا کہ مجھے یقین تھا...... تو وہ واقعاتی شہادتوں کو میرے ہاتھ نہ لگنے دیتا۔

یہ بات روز روشن کی طرح کھل کر سامنے آ چکی تھی کہ متوفی چودھرائن نے رات کو آلو بینگن، چاول اور اچار وغیرہ کھائے تھے یا پھر سونے سے پہلے دودھ کا ایک گلاس پیا تھا۔ یہ تمام ایسی اشیا تھیں کہ جن کی شکم کشتی سے پیٹ کے اندر بہت زیادہ گیس بن سکتی تھی اور یہ گیس تیزابیت، سینے کی جلن اور زیادہ سے زیادہ معدے کا درد جگا سکتی تھی۔ اس بات کے قطعاً کوئی امکانات نہیں تھے کہ اس خوراک کے نتیجے میں خون کی الٹیاں جاری ہو جائیں اور وہ بھی ایسی کہ اس سے انسان کی فوری موت بھی واقع ہو جائے۔

یقیناً چھوٹی چودھرائن کو کوئی خطرناک زہر دیا گیا تھا۔ یہ دہرے قتل کی ایک سنسنی خیز واردات تھی۔ نورین کے پیٹ میں چودھری ارشاد کا بیٹا تھا یا بیٹی اس بحث میں پڑے بغیر یہ تو وثوق سے کہا جا سکتا تھا کہ وہاں ایک زندگی اپنے مخصوص مدارج طے کر رہی تھی۔

کچن کی تمام تر کارروائی میں مجھے ذرا برابر بھی کامیابی نہ ہوئی۔ رات کو تیار ہونے والا کھانا ختم ہو چکا تھا اور تمام تر برتن بھانڈے مانجھ دھو کر ایک طرف رکھ دیے گئے تھے۔ اب مجھے کسی بدنظمی یا افراتفری کی پروا نہیں تھی۔

رات کو جب چھوٹی چودھرائن نے موت کو گلے لگایا تو حویلی کے تمام افراد بہ شمول دائی صفیہ اور حکیم جی وہاں موجود تھے اور سب کے سب اس بات کے گواہ تھے کہ نورین نے

خون کی قے کرتے ہوئے جان دی تھی۔ میرے لیے بس اتنا سہارا ہی کافی تھا۔

میں نے فوری طور پر نورین کی لاش کا سرسری سا معائنہ کیا پھر اسے خادم حسین کی نگرانی میں پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوا دیا۔ اس کے بعد میں حویلی کی اندرونی کارروائی میں مصروف ہوگیا۔

میں نے چودھری ارشاد سے پوچھا۔ ''گزشتہ رات آپ کی حویلی میں کل کتنے افراد موجود تھے؟''

''میں...... بڑی چودھرائن، چھوٹی چودھرائن......'' اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''اور چھ ملازم۔''

''ملازمین کی تفصیل کیا ہے چودھری صاحب؟''

''دو سمجھ دار عورتیں تو دونوں چودھرائنوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔'' اس نے بتایا ''نور جہاں کی خدمت کے لیے جیواں ماسی مخصوص ہے اور نورین کی دیکھ بھال کے لیے چاچی بسم اللہ...... ان کے علاوہ باقی چاروں ملازم مرد ہیں۔''

''باورچی خانے میں کھانا وغیرہ کون پکاتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کھانا پکانے کی ذمے داری تو جیواں ماسی کی ہے۔'' چودھری نے جواب دیا۔ ''لیکن چاچی بسم اللہ بھی اس کی مدد کرتی ہے۔ اس کے علاوہ......'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''ویسے دونوں بیویاں بھی کچھ نہ کچھ پکاتی رہتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''چودھری صاحب! اب اس بحث میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ چھوٹی چودھرائن کے پیٹ میں آپ کی اولاد نرینہ تھی یا اولاد زرینہ، وہ جو کچھ بھی تھا، چودھرائن جی کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''جی نہیں...... آپ ایک حقیقت بیان کر رہے ہیں۔''

''اور یہ بھی طے ہے کہ چودھرائن جی اور ان کے پیٹ میں پلنے والی ننھی منی زندگی کو زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔'' میں نے بہ دستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''حکیم جی ان کی زہریلی موت کی تصدیق کر چکے ہیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دے گی۔ میری طرح آپ بھی یہی چاہتے ہوں گے کہ چھوٹی چودھرائن کا قاتل نہ صرف یہ کہ بے نقاب ہو بلکہ اسے عبرت ناک سزا بھی ملے...... آپ چاہتے ہیں نا؟''

میں نے بات ختم کر کے سوالیہ نظر سے چودھری ارشاد کی طرف دیکھا تو وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''جی...... جی بالکل......''

''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ چودھرائن نورین کے قاتل کو میں بہت جلد آپ کی نگاہ کے سامنے لے آؤں گا۔'' میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''لیکن اس کٹھن کام کے لیے مجھے آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ تعاون کریں گے نا؟''

''تعاون نہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''بتائیں، آپ کو مجھ سے کس نوعیت کا تعاون چاہیے۔''

''میں جو بھی سوال آپ سے کروں اس کا سچا اور کھرا جواب چاہیے مجھے۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں تفتیش کے نام پر جو کچھ بھی کرنا چاہوں اس کے راستے میں آپ کوئی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''بس، تو پھر سمجھیں کہ چھوٹی چودھرائن نورین کا قاتل قانون کی گرفت میں آ چکا......!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

چودھری ارشاد نے زور دے کر کہا۔ ''چودھرائن اور میرے بچے کا قاتل......!''

''جی ہاں...... دونوں، ماں بچے کا قاتل۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''میرا یہی مقصد تھا۔''

وہ منتظر نظر سے مجھے دیکھنے لگا کہ میں آگے کیا کہتا ہوں، میرے ذہن میں تفتیشی نقشہ بالکل واضح اور دوٹوک تھا۔ میں نے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے کہا۔

''چودھری صاحب! یہ تو آپ مانیں گے نا کہ ان دنوں آپ چھوٹی چودھرائن کی حد سے بڑھ کر دیکھ بھال اور نگہداشت کر رہے تھے اور انہیں گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں بھی ہاتھ نہیں لگانے دیتے تھے تاکہ انہیں زیادہ سے زیادہ آرام مل سکے؟''

''جی ہاں، ملک صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

''چودھری صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹی چودھرائن جی نے پچھلی رات آلو بینگن، چاول، اچار وغیرہ کھائے تھے اور سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ پیا تھا اور یہ تمام چیزیں باورچی خانے میں تیار ہو کر ان تک پہنچی تھیں؟''

''جی، بالکل......!'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''اور انہی چیزوں میں سے کسی میں زہر ملا ہوا تھا۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''جو آپ کی چھوٹی بیوی اور

ہونے والے بچے کی موت کا سبب بنا۔“

”لیکن کھانا تو ہم سب نے وہی کھایا تھا۔“ وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”پھر چودھرائن ہی زہریلی خوراک کا نشانہ کیوں بنی؟“

”یہ ایک اہم سوال ہے چودھری صاحب اور اس کا جواب بھی ہے میرے پاس۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ قاتل بہت ہی چالاک اور عیار ہے۔ چودھرائن جی کی موت کے فوراً بعد باورچی خانے میں سے رات کے کھانے کے حوالے سے تمام ثبوت ختم کر دیے گئے اور تمام کے تمام برتن بھی مانجھ دھو کر رکھ دیے گئے تاکہ بعد ازاں پولیس کی کارروائی کا راستہ بند کیا جا سکے۔ اگر رات کے کھانے کا بچا کھچا کچھ حصہ میرے ہاتھ لگ جاتا تو میں اس کا لیبارٹری ٹیسٹ کرا کے حقیقت حال تک پہنچ سکتا تھا۔ بہرحال......“ میں نے لمحاتی توقف کرتے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اب میں آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔ عین ممکن ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا کہ...... چودھرائن جی نے رات سونے سے پہلے دودھ کا جو گلاس پیا تھا، اس میں زہر ملایا گیا ہو۔“

”یعنی ......یعنی آپ کا زور اس بات پر ہے کہ چودھرائن کا قاتل میری حویلی ہی کے اندر موجود ہے......؟“ چودھری نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”جی ہاں!“ میں نے پورے تیقن کے ساتھ کہا۔ ”آپ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق، پچھلی رات حویلی کے اندر دائی صفیہ، حکیم جی کے علاوہ آپ، بڑی چودھرائن، چھوٹی چودھرائن، نور جہاں کی خادمہ جیواں ماسی، نورین کی خادمہ چاچی بسم اللہ اور چار مرد ملازم موجود تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟“

”آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں ملک صاحب!“ اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

”صفیہ اور حکیم جی کا براہ راست حویلی سے کوئی تعلق نہیں اور ان دونوں کو چھوٹی چودھرائن کی طبیعت خراب ہونے کے بعد ہی بلایا گیا تھا لہٰذا یہ دونوں شک کے دائرے میں نہیں آتے۔ اسی طرح جان کی بازی ہار جانے والی چھوٹی چودھرائن نورین کو بھی مشکوک افراد کی فہرست سے خارج کر دیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ نے جن چار گھریلو مرد ملازموں کا ذکر کیا ہے ان کا بھی باورچی خانے سے کوئی تعلق ناتا نہیں چنانچہ ہم ان کے ناموں پر بھی لکیر کھینچ دیتے ہیں۔

باقی بچے آپ، آپ کی بڑی بیگم چودھرائن نور جہاں، جیواں ماسی اور چاچی بسم اللہ......!“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”تو آپ کا مطلب ہے، ہم چاروں میں سے کسی نے چھوٹی چودھرائن کو زہر دیا ہے؟“

”چاروں نہیں...... تینوں میں سے کسی ایک نے!“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”میں سمجھا نہیں ملک صاحب؟“ وہ تعجب خیز نظر سے مجھے تکنے لگا۔

”میں نے آپ کو بھی اس فہرست سے خارج کر دیا ہے چودھری صاحب!“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”چودھرائن نورین اور اس کے پیٹ میں نمو پانے والے معصوم بچے کے حوالے سے میں آپ کی سنجیدگی اور خوشی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ اپنی خوشیوں کو آگ لگانے کے لیے اس قسم کی گھناؤنی حرکت کر ہی نہیں سکتے۔“

”تو...... آپ کا مطلب ہے...... نور جہاں، جیواں، بسم اللہ میں سے کسی نے نورین کو زہر دے کر زچہ و بچہ کو قتل کیا ہے......؟“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بھری ہوئی آواز میں بولا۔

”جی ہاں، میرا مطلب یہی ہے۔“ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ”مجھے یقین ہے، پوسٹ مارٹم رپورٹ اور میری تفتیش کی تکمیل بھی اسی نتیجے پر پہنچے گی جو رائے میں نے حالات و واقعات کی روشنی میں قائم کی ہے۔“

”لیکن جیواں اور بسم اللہ تو سالہا سال کی آزمائی ہوئی اور قابل بھروسا ملازمائیں ہیں۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور میں سمجھتا ہوں، نور جہاں بھی ایسی گری ہوئی حرکت نہیں کر سکتی۔“

”کون کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا، اس کا فیصلہ بہت جلد ہو جائے گا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن ایک بات ذہن میں رکھیں چودھری صاحب کہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔ اس دہرے قتل کی واردات میں میرا شک تین افراد پر آ رک گیا ہے۔ نمبر ایک، آپ کی بڑی بیگم چودھرائن نور جہاں۔ نمبر دو، نور جہاں کی خادمہ جیواں ماسی اور نمبر تین، چھوٹی چودھرائن کی خادمہ چاچی بسم اللہ لہٰذا......“ میں نے لمحات کا توقف کرنے کے بعد گہری نظر سے چودھری کی آنکھوں میں دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”لہٰذا میں ان تین افراد سے کڑی پوچھ گچھ کرنا چاہ

ہوں اور آپ اس سلسلے میں مجھ سے بھرپور تعاون کریں گے۔“

”جی ضرور کروں گا تعاون۔“ وہ آمادگی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

”ہم اس نتیجے پر تو پہنچ ہی چکے ہیں کہ زہر باورچی خانے سے سفر کر کے چھوٹی چودھرائن کے معدے تک پہنچا تھا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور آپ کے مطابق، کھانا پکانے کی ذمے داری جیواں ماسی کی ہے اور اس کام میں بسم اللہ چاچی اس کی مدد کرتی ہے اور...... آپ کی بیویاں بھی کچھ نہ کچھ پکاتی رہتی ہیں۔ حالات و واقعات کی رو سے چھوٹی چودھرائن نے گزشتہ رات باورچی خانے میں کچھ نہیں پکایا ہوگا کیونکہ آپ آج کل انہیں زیادہ سے زیادہ آرام دینے کی کوشش میں رہتے تھے۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کی بڑی بیگم چودھرائن نور جہاں نے پچھلی رات باورچی خانے میں جیواں ماسی کی کوئی مدد کی تھی؟“

”میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا جناب۔“ وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ”میں چودھرائن سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔“

بات ختم کر کے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ”آپ ضرور چودھرائن جی سے یہ سوال کریں اور اس کے ساتھ ہی دونوں گھریلو ملازماؤں کو بھی میرے پاس بھیج دیں تاکہ میں ان سے پوچھ گچھ کر سکوں۔“

”جی بہت بہتر......“ وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا اور ایک ادھیڑ عمر عورت کو میرے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ ”ملک صاحب! یہ چاچی بسم اللہ ہے۔ آپ اس سے بات چیت کریں، میں ابھی آتا ہوں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور بسم اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ عام سی شکل و صورت کی مالک ایک ادھیڑ عمر ملازمہ تھی۔ میں نے لگ بھگ دس منٹ تک چاچی بسم اللہ کا انٹرویو کیا اور ہر زاویے سے سوالات کیے اور وہ مجھے اس گمبھیر معاملے میں بے قصور نظر آئی۔ دلوں کا حال تو اللہ جانتا ہے۔ یہ رائے میں نے اپنے تجربے کی بنیاد پر قائم کی ہے۔

چاچی بسم اللہ کے مطابق، گزشتہ رات کھانا جیواں ماسی نے بنایا تھا اور اس کام میں اس نے جیواں کی مدد کی تھی۔ جیواں نے بڑی چودھرائن کے لیے اور بسم اللہ نے چھوٹی چودھرائن کے لیے کھانا چنا تھا۔ چودھری ارشاد نے بھی چھوٹی چودھرائن کے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے بعد انہوں نے برتن سمیٹے اور باورچی خانے میں بیٹھ کر دونوں نے خود بھی کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد چاچی بسم اللہ چھوٹی چودھرائن کی پکار پر اس کے کمرے میں چلی گئی تھی اور جیواں ماسی برتن دھونے میں لگ گئی تھی۔

”اور دودھ...... دودھ والا گلاس تم نے کب چھوٹی چودھرائن کو دیا تھا؟“ وہ لمحے بھر کے لیے خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا۔

”کھانے کے کوئی آدھا گھنٹا بعد۔“ اس نے بتایا۔ ”چھوٹی بی بی جی کو کھانے کے بعد نیند آنے لگی تھی اور چودھری صاحب نے مجھے دودھ لانے کو کہا تھا۔“

”تو دودھ والا گلاس تم خود باورچی خانے سے لے کر آئی تھیں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی...... روزانہ میں ہی لے کر آتی ہوں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”جب تم چھوٹی چودھرائن کے لیے دودھ کا گلاس لینے باورچی خانے میں پہنچیں تو کیا جیواں ماسی ابھی تک وہیں موجود تھی؟“

میرا فوکس لامحالہ دودھ والے گلاس پر ہو گیا تھا کیونکہ اس رات حویلی کے باورچی خانے میں جو کھانا پکا تھا وہ تو وہاں موجود تمام افراد نے کھایا تھا اور کسی کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ یہ واضح اشارہ تھا کہ وہ کھانا زہریلا نہیں تھا لہٰذا اس سنگین واقعے کے سلسلے میں تان دودھ والے گلاس پر ہی آ کر ٹوٹی تھی۔

بسم اللہ ماسی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”جی ہاں...... جیواں باورچی خانے میں موجود تھی بلکہ وہ کام ختم کر کے وہاں سے جانے ہی والی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا تھا...... میں نے چودھرائن جی کے لیے دودھ نکال دیا ہے۔“

”تو کیا روزانہ جیواں ہی چھوٹی چودھرائن کے لیے دودھ نکالا کرتی تھی؟“ میں نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”یہ ڈیوٹی تو میری تھی اور روزانہ میں ہی بی بی جی کے لیے گلاس میں دودھ ڈال کر لے جایا کرتی تھی مگر کبھی کبھار جیواں بھی گلاس میں دودھ ڈال دیا کرتی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن باورچی خانے سے بی بی جی کے کمرے تک دودھ والا گلاس میں ہی لے کر جایا کرتی تھی۔“

”ٹھیک ہے“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”پچھلی رات تم نے چھوٹی چودھرائن کو دودھ پلانے کے بعد گلاس کہاں رکھا تھا؟“

”جب بی بی جی نے خالی گلاس مجھے واپس کیا تو میں اسے باورچی خانے میں چھوڑنے گئی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”جیواں چونکہ سارے برتن دھو کر بڑی بی بی جی کے کمرے میں جا چکی تھی اس لیے میں نے خود ہی وہ گلاس دھو کر رکھ دیا تھا۔“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”جب سے چھوٹی بی بی امید سے ہوئی تھیں، چودھری صاحب نے میری ڈیوٹی انہی کے ساتھ لگا دی تھی۔ اب باورچی خانے میں، میں برائے نام ہی کام کرتی تھی ورنہ کھانا پکانے اور برتن دھونے میں پہلے میں جیواں کا بھرپور ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔“

ادھر بسم اللہ چاچی کی بات ختم ہوئی ادھر چودھری نمودار ہوا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا نظر آتا تھا۔ گزشتہ رات حویلی میں جتنا بڑا واقعہ پیش آیا تھا اس نے چودھری ارشاد کو اندر باہر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا لیکن اس وقت مجھے چودھری کے چہرے پر جو گھبراہٹ دکھائی دی تھی وہ بڑی اہم نوعیت کی تھی۔

چودھری پر نگاہ پڑتے ہی چاچی بسم اللہ یکلخت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چودھری اسی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”نور جہاں کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے اور جیواں ماسی کہیں نظر نہیں آ رہی۔ تمہیں کچھ پتا ہے اس کا؟“

”جی چودھری صاحب!“ بسم اللہ نے بڑے اطمینان سے گردن ہلائی۔ ”میرے یہاں آنے سے دس منٹ پہلے وہ حویلی سے باہر گئی تھی اور کہا تھا کہ تھوڑی دیر میں واپس آجائے گی۔“

”اس نے کچھ بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے......؟“ چودھری نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”کہہ رہی تھی، ذرا گھر سے ہو کر آ رہی ہوں۔“ بسم اللہ نے بتایا۔ ”جب تک حویلی کے کام کو میں سنبھالوں۔ کیا بڑی بی بی جی کو بتا کر نہیں گئی......؟“

چودھری ارشاد نے بسم اللہ کے سوال کا جواب دینا مناسب خیال نہ کیا اور تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”تم فوراً نور جہاں کے پاس جاؤ۔ میں کسی بندے کو بھیج کر جیواں کو بلاتا ہوں۔“

بسم اللہ چاچی فوراً سے پیشتر وہاں سے کھسک لی۔ میں نے چودھری سے پوچھا۔ ”چودھری صاحب! بڑی چودھرائن کو کیا ہوا ہے؟“

”میں سمجھتا ہوں، حویلی کے سوگوار ماحول نے اس بے چاری کے اعصاب پر گہرا اثر ڈالا ہے۔“ وہ تشویش بھرے انداز میں بولا۔ ”آپ بیٹھیں، میں کسی بندے کو جیواں کی طرف بھیج کر آپ کے پاس آتا...... بلکہ آپ اگر مناسب سمجھیں تو اس تفتیشی کارروائی کو کل پر رکھ لیں۔ آپ خود بھی دیکھ رہے ہیں کہ حویلی میں کیا افراتفری مچی ہوئی ہے۔“

”چودھری صاحب! میں آپ کے حالات اور مجبوریوں کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور دوسری طرف میں بھی قانونی تقاضوں کے سامنے مجبور ہوں۔ بہرحال، آپ اپنی بڑی بیگم کا خیال رکھیں۔ میں شام میں آپ کی حویلی کا چکر لگا لوں گا۔“ بات ختم کرتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بڑی مہربانی آپ کی ملک صاحب۔“ وہ تشکرانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آئیں، میں آپ کو حویلی کے گیٹ تک چھوڑ دیتا ہوں۔“

ہم دونوں پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے حویلی کے اندرونی حصے سے باہر نکلے تو ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھ لیا۔ ”چودھری صاحب! جیواں ماسی تو سالہا سال سے بڑی چودھرائن کی خدمت میں ہے اور وہ دن رات حویلی ہی میں رہتی ہے۔ ایسا ہی ہے نا......؟“

”جی...... جی ہاں......“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

”پھر...... بسم اللہ سے کیوں کہہ رہی تھی کہ...... وہ ذرا گھر سے ہو کر آ رہی ہے۔“ میں نے اپنی الجھن بیان کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا حویلی سے باہر بھی اس کا کوئی گھر ہے؟“

”اس کا نہیں، اس کے بھائی کا گھر ہے۔“ چودھری نے بیزاری سے جواب دیا۔ ”وہ کبھی کبھار اللہ دتا سے ملنے چلی جاتی ہے مگر آج تو اسے حویلی سے بالکل باہر قدم نہیں نکالنا چاہیے تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ پچھلی رات سے حویلی پر کیا قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔“

”اللہ دتا......“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ نے جیواں کے بھائی کا نام اللہ دتا ہی بتایا ہے نا......؟“

”ہاں، ہاں...... کیوں، کیا ہوا؟“ چودھری حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ وہی اللہ دتا ہے نا......“ میں گویا کسی غیبی قوت کے زیرِ اثر بولتا چلا گیا۔ ”جسے گاؤں والے چاچا اللہ دتا کہتے ہیں۔ اس کا گھر ٹیوب ویل اور باغ کے درمیان واقع ہے اور اس اللہ دتا کی کوئی اولاد بھی نہیں۔ وہ دبلا پتلا اور دراز قد والا ہے۔ رنگت گہری سانولی اور ہاتھ پاؤں بڑے۔ اس کے

بالائی ہونٹ پر زخم کا نشان بھی ہے......"

"آپ ماسی جیواں کے بھائی اللہ دتا ہی کا حلیہ اور تفصیل بیان کررہے ہیں۔" چودھری کی حیرت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ "مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ اچانک آپ اللہ دتا جیسے فضول آدمی میں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لینے لگے ہیں؟"

"اچانک نہیں چودھری صاحب!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "بلکہ میں گزشتہ شام ہی سے اس کالیا اللہ دتا میں دلچسپی لے رہا ہوں اور......" لمحاتی توقف کرکے میں نے ڈرامائی انداز میں اضافہ کیا۔

"اور آپ اسے فضول آدمی نہ کہیں۔ میں اسی مفید آدمی کی مدد سے چھوٹی چودھرائن کے قاتل تک رسائی حاصل کروں گا۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں ملک صاحب!" وہ الجھن بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔

"آئیں، میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔" میں نے چودھری کا ہاتھ پکڑ کر حویلی سے باہر لاتے ہوئے کہا۔ "جیواں کو بلانے کے لیے کسی آدمی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں اللہ دتا کے گھر جارہے ہیں۔"

چودھری ارشاد ہکا بکا مجھے دیکھتا چلا گیا تاہم اس نے اللہ دتا کے گھر جانے میں کوئی اعتراض نہیں کیا۔

☆☆☆

اسی رات میں ایک مرتبہ پھر چودھری ارشاد کی حویلی میں بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلی رات اس حویلی پر جو قیامت ٹوٹی تھی اس کی تباہ کاری اور ہلاکت خیزی سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا تھا لیکن آج دن بھر کی میری کارروائی نے جو طوفان اٹھائے تھے وہ بھی بڑی اہمیت کے حامل تھے۔

گزشتہ روز میں نے قیصر عرف کیسو نامی جس دبلے پتلے بچے کو بہلا پھسلا کر بہت سی کام کی باتیں معلوم کی تھیں اسی نے انکشاف کیا تھا کہ اللہ دتا نامی ایک سیاہ رو شخص نے اسے بھینس کو تنگ کرنے کا کام سونپا تھا پھر اس سے پہلے کہ میں اللہ دتا کی چیکنگ کے بعد یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ اس نامراد کو چودھری ارشاد کی بھوری بھینس سے کیا دشمنی تھی، چودھری کی حویلی میں چھوٹی چودھرائن کو پیش آنے والا واقعہ سامنے آگیا تھا اور میں اللہ دتا کو بھول کر حویلی کے معاملات میں مصروف ہوگیا تھا اور جب اسی تفتیش میں اللہ دتا کا نام سامنے آیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے چودھری کی موجودگی میں جب اللہ دتا سے بھوری بھینس اور کیسو والے واقعے پر سوال وجواب کیے تو اس نے جیواں ماسی کا نام لیا کہ یہ سب کچھ اس نے اپنی بہن کے کہنے پر کیا تھا۔ علاوہ ازیں جب میں نے اللہ دتا پر سختی کی تو اس نے یہ بھی بتا دیا کہ جیواں ماسی کی فرمائش پر اس نے زہر بھی لا کر دیا تھا۔ تفتیش کا رخ جب جیواں ماسی کی طرف مڑا تو وہ زیادہ دیر تک مزاحمت پیش نہ کرسکی اور اس کی زبان سے بڑی چودھرائن نور جہاں کا نام پھسل گیا...... اس کے بعد کچھ سوچنے کچھ کہنے یا کچھ سننے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ آپ بڑی توجہ سے یہ کہانی پڑھتے چلے آرہے ہیں لہٰذا بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ نور جہاں نے یہ قدم کیوں اٹھایا تھا۔

میں نے قیصر عرف کیسو اور بھوری بھینس والے واقعے کی تفصیل سے چودھری ارشاد کو آگاہ کرنے کے بعد کہا۔ "اب تو بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی چودھری صاحب؟"

وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "واقعی...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ بچہ بڑا ہی کائیاں اور بدمعاش ہے۔ یہ انسان کی نہیں، کسی شیطان کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔"

"میں اسی شیطان کی اولاد کے توسط سے اصل مجرم تک پہنچا ہوں چودھری صاحب۔" میں نے بڑی رسان سے کہا۔ "تفتیشی معاملات میں بعض اوقات ایسا ہوجاتا ہے، ہم جا کہیں اور رہے ہوتے ہیں اور تفتیش ہماری انگلی پکڑ کر کہیں اور لے جاتی ہے۔ بہرحال، آپ کی بیوی اور اس کی کوکھ سے جنم لینے والے بچے کے قتل کا معما حل ہوچکا ہے۔"

"آہ......!" اس نے ایک افسردہ سی سانس خارج کی اور زخمی لہجے میں بولا۔ "نور جہاں کی جفا نے مجھے جو زخم دیے ہیں وہ کبھی بھر نہیں سکیں گے۔"

"جیواں اور اس کا سازشی بھائی اللہ دتا اس وقت میرے تھانے کی حوالات میں بند ہیں۔" میں نے اپنے فرائض سے مجبور ہوتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے جس اشارے پر یہ سب کچھ کیا، مجھے اس کی بھی ضرورت ہے تاکہ قانون کے تقاضے پورے ہوسکیں۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟"

چودھری ارشاد نے اپنی پگڑی اتار کر میرے پیروں پر رکھ دی اور رحم طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

وہ بڑے نازک لمحات تھے۔ ان کڑے آزمائشی لمحات میں، میں نے کیا فیصلہ کیا ہوگا؟...... ذہین قارئین اندازہ لگانے کی کوشش کریں!

(تحریر حُسام)

حسن کا جال... ماحول کی آزادی... اور عورت کی چال... جہاں اتنے ہنر یکجا ہوجائیں وہاں ایک تیر سے جانے کتنے شکار ممکن ہوجاتے ہیں۔ وہ جو بازی پہ بازی مات کیے جارہی تھی... وہ جو سانپوں کو پالتے پالتے خود بھی زہریلی ہوچکی تھی... بھلا کیسے کسی انسان سے دوستی نبھا سکتی تھی۔

...دار شخصیت کی مالک ایک حسینہ کی عیاریوں کا احوال

مات

بابر نعیم

ولی نے اپنے کاندھے پر رکھے بھاری بیگ کو دوسرے کاندھے پر رکھا اور بار میں داخل ہوگیا۔ دوپہر کے وقت وہاں بہت کم گاہک ہوتے تھے۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور بار کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا اور ذہن میں ابھی تک ڈکسن کے کہے ہوئے آخری الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے اپنے خالی ہاتھ کو فضا میں لہرایا جیسے ڈکسن کے منہ پر تھپڑ مار رہا ہو۔

"تمہاری نوکری ختم!" یہ الفاظ تیر کی طرح اس کے دل میں چبھ گئے۔ اول تو اس کی کوئی غلطی نہیں تھی اور اگر ایسی کوئی بات ہوتی تب بھی ڈکسن کو سب لوگوں بالخصوص، میری

کے سامنے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ میری کا خیال آتے ہی اس کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہو گیا۔ وہ خالی کیبنوں اور میزوں پر نظر ڈالتے ہوئے بار کاؤنٹر کے ساتھ رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھ گیا اور اس نے کندھے سے بیگ اتار کر اپنے قدموں کے آگے رکھ لیا، اس نے کاؤنٹر پر دو مرتبہ ہاتھ مارا۔ اس کے جواب میں سامنے والی الماریوں کے پیچھے کا دروازہ کھلا اور وہاں سے ایک شخص تولیے سے ہاتھ صاف کرتا ہوا برآمد ہوا۔ اس نے ولی کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا اور تمسخرانہ انداز میں بولا۔ ”تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

”وہی جو سب لینے آتے ہیں۔“ ولی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ سکے نکالے تو اس کا ہاتھ سیل فون سے ٹکرایا اور وہ سوچنے لگا کہ میری نے اب تک اس کا پیغام پڑھ لیا ہوگا۔

”تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔“ بارٹینڈر نے ولی کی سبز اور سنہری دھاریوں والی بنیان، سبز رنگ کی ہاف پینٹ اور چوکور سیاہ ہیٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس لباس میں سرکس کا مسخرا معلوم ہو رہا تھا۔ دراصل وہ جلدی میں اپنا لباس تبدیل کیے بغیر ہی وہاں سے بھاگ آیا تھا اور یقیناً ڈکسن کو بھی یہ حرکت پسند نہیں آئی ہوگی۔

ولی نے اپنا ہیٹ اتار کر بیگ پر رکھا اور بولا۔ ”مجھے ایک چھوٹا گلاس بیئر کا دے دو۔“

”پولیس والے یہاں سات بجے کے قریب آتے ہیں۔“ بارٹینڈر اسے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس بیگ میں کیا ہے؟“

ولی نے ایک طویل سانس لی۔ اس کے پاس ایک یا ڈیڑھ گھنٹا تھا۔ اس دوران اسے رات گزارنے کے لیے کوئی ایسا محفوظ ٹھکانا تلاش کرنا تھا جہاں کوئی اس سے بیگ کے بارے میں سوال نہ کرے جس میں کارنیوال کا سب سے پرکشش آئٹم رکھا ہوا تھا۔ یہ ایک قدیم انسانی ڈھانچا تھا جو ایک مخصوص میکنزم کے ذریعے تماشائیوں کو اپنی دلچسپ حرکات سے محظوظ کیا کرتا تھا جبکہ پسِ پردہ ڈوری ہلانے کی ذمے داری ولی کی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ڈینم بیگ پر ہاتھ پھیرا اور بارٹینڈر سے جان چھڑانے کے لیے بولا۔ ”تم کہہ سکتے ہو کہ اس میں میری سلامتی کا سامان ہے۔“

”خدا کرے کہ یہ تمہارے لیے مبارک ثابت ہو۔“ بارٹینڈر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور ایک چھوٹا سا گلاس اس کی جانب بڑھا دیا۔

☆☆☆

ڈکسن اپنے ٹرک کی چھت پر کھڑا ہوا قافلے میں شامل دوسری گاڑیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان میں سے ہر ایک پر سرخ اور سفید رنگوں سے اس کے کارنیوال کا نام ”ایجیڈ ریز“ لکھا ہوا تھا۔ اس نے کارنیوال میں کرتب دکھانے والوں کو خوش گپیاں اور قہقہے لگاتے دیکھا لیکن ان میں ولی نظر نہیں آیا، یقیناً وہ کہیں منہ چھپائے پڑا ہوگا۔ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”اب وہ کبھی میرے شو میں کام نہیں کرے گا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا اداکار سمجھنے لگا تھا جبکہ سب جانتے ہیں کہ اس کی حیثیت ایک بونے سے زیادہ نہیں تھی۔“

”یہ تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟“ ڈکسن کی بیوی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کھڑکی سے باہر سر نکالتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں کوئی! کیا تم مجھے کچھ رقم دے سکتی ہو اور یہ بھی دیکھ لینا کہ کنگ کارڈو کا ڈھانچا صحیح حالت میں ہے۔ ہمیں ناش ویلی کے چرچ کیمپ میں اس کی نمائش کرنا ہے۔“

کوئی ڈرائیونگ سیٹ سے اتر آئی اور اپنی گردن میں پڑی ہوئی چین میں سے ایک چابی نکالی اور ٹرک کے عقب میں منسلک خیمہ نما ٹرالر کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے اندر جا کر سب سے پہلے سانپ کے پنجرے دیکھے۔ یہ سب شو میں اس کے ساتھی تھے۔ اس نے بڑے پیار سے ایک بڑے سانپ کی چکنی جلد پر ہاتھ پھیرا جو شو کا سب سے پسندیدہ آئٹم تھا۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ سارے سانپ محفوظ اور صحیح سلامت تھے۔ پھر وہ بڑے بڑے بکسوں کے درمیان سے جگہ بناتے ہوئے جھک کر لانڈری بیگ تلاش کرنے لگی۔ اس نے دیکھا کہ سیف کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ اسی لمحے اس کے سیل فون پر ایک پیغام موصول ہوا۔ وہ تیزی سے نیچے اتری اور ڈکسن کا نام لے کر پکارتے ہوئے اس کی طرف دوڑی جو گیس اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ لگتا تھا جیسے ابھی گر پڑے گی۔ اس نے آگے بڑھ کر سنبھال لیا۔ کوئی ہانپتے ہوئے بولی۔ ”ہم لٹ گئے، تباہ ہو گئے۔ سب کچھ چلا گیا۔“

ڈکسن جانتا تھا کہ کوئی کو اپنے سانپوں سے بڑی محبت تھی اور وہ انہیں اپنا قیمتی اثاثہ سمجھتی تھی۔ اس لیے اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔ ”کیا ہوا، تم اپنے سانپوں سے محروم ہو گئیں؟“

”نہیں۔“ وہ اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”سارے پیسے اور کنگ کارڈو کا ڈھانچا غائب ہے۔“

”یہ اسی منحوس ولی کی حرکت ہے۔“ وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا۔ ”میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔“

☆☆☆

بار سے نکل کر ولی ایک بار پھر محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں چل پڑا۔ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا اور وہ زیادہ دیر بیگ کاندھے پر اٹھائے کسی مصروف شاہراہ پر نہیں چل سکتا تھا۔ کہیں بھی راستے میں کوئی پولیس والا اس کی تلاشی لے سکتا تھا۔ رقم اس نے اپنی بنیان کی اندرونی جیب میں رکھ لی تھی لیکن ان ہڈیوں کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک دو مرتبہ اسے خیال آیا کہ اس نے بلاوجہ ہی یہ ڈھول گلے میں ڈال لیا۔ اسے چاہیے تھا کہ رقم پر ہی اکتفا کر لیتا لیکن اس کا اصل مقصد ڈکسن کو پریشان کرنا تھا کیونکہ ان ہڈیوں کی اس کے نزدیک بڑی اہمیت تھی اور یہ تاریخی ڈھانچا اس کے شو کا خاص آئٹم تھا۔ ولی اگر کسی دوسرے شہر میں جا کر بیچتا تو اسے اچھی خاصی رقم مل سکتی تھی۔ اب اس کا رخ دریا کی طرف تھا جس کے کنارے اونچائی پر ایک طویل و عریض قطعہ پھیلا ہوا تھا اور اسی پر وہ پل واقع تھا جو شہر کے مشرقی اور مغربی حصوں کو ملاتا تھا۔ ولی نے رات گزارنے کے لیے پل کے نیچے ایک بنچ پر اپنا ٹھکانا بنا لیا۔

☆☆☆

ڈکسن نے پریشانی میں کافی کے تین کپ چڑھا لیے جبکہ کوئی اپنے عملے کو اس سنگین صورتِ حال سے آگاہ کر رہی تھی۔ اس نے انہیں بتا دیا کہ گزشتہ ہفتے شو سے ہونے والی کم آمدنی اور ڈھانچے کی چوری کے سبب تنخواہ کی ادائیگی میں تاخیر ہو سکتی ہے جبکہ ڈھانچے کی عدم موجودگی میں ان کے آنے والے شوز بھی متاثر ہوں گے۔ صرف کوئی کے سانپوں کی بدولت شو کو کامیاب نہیں بنایا جا سکتا۔ چار دن بعد انہیں بینک کو بھی قرض کی قسط ادا کرنی ہے۔ یہ سن کر ڈکسن نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور ولی کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ کوئی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور خیمے کے اندر لے آئی۔

”اپنے آپ پر قابو رکھو۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کے بغیر نا شویلا کا شو کس طرح ہوگا۔“

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اس ٹرپ کے اخراجات ادا کروں گی۔“

”تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟“ ڈکسن اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”تمہارے لیے یہ جاننا ضروری نہیں۔“ اس نے ڈکسن کو ایک کاغذ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا کام ولی کو تلاش کرنا ہے۔“

”یہ کیا ہے؟“ ڈکسن نے کاغذ پر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

”اس کاغذ پر اس پولیس سارجنٹ کا ای میل اور فون نمبر لکھا ہوا ہے جس کے ذمے گم شدہ افراد کی تلاش کا کام ہے، تمہیں ولی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانی ہے۔ انہیں بتانا کہ وہ تمہارا ہی پیارا کزن ہے جو کسی بات پر ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس نے کوئی چیز بھی چرائی ہے۔“

ڈکسن نے کافی کا آخری گھونٹ لیا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے لیکن ہم ٹرالر یہیں چھوڑ دیں گے اور تم اپنے سانپ بھی ساتھ لے کر نہیں جاؤ گی۔“

کوئی نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بیگ میں سے لپ اسٹک نکالی اور ہونٹوں پر پھیرنے لگی۔

ڈکسن بولا۔ ”تم جانتی ہو کہ میں اسے کتنا چاہتا تھا۔“

”اور میں بھی!“ کوئی معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

ولی نے بیگ اپنے کندھوں کے نیچے رکھا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہاں اس کے علاوہ بھی کئی بے گھر لوگ تھے جو شاید وہاں کے مستقل باسی تھے۔ ان کے خراٹوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں لیکن ایک ناگوار بو ان سب پر حاوی آ گئی۔ ولی نے جھک کر اپنے دائیں جانب دیکھا۔ سڑک سے آنے والی مدھم روشنی میں اسے ایک شخص کا ہیولا نظر آیا جو اس سے بہ مشکل تین فٹ کے فاصلے پر کھڑا کنکریٹ کی دیوار کے ساتھ پیشاب کر رہا تھا۔ ولی نے اسے دھتکارتے ہوئے کہا۔

”ہے۔ دفع ہو جاؤ، کہیں اور جا کر یہ شوق پورا کرو۔“

وہ شخص مڑا اور ولی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ تمہارا پیچھا کرتے ہوئے آ رہے ہیں۔ انہوں نے تمہیں دیکھ لیا ہے اور جانتے ہیں کہ تم یہاں چھپے ہوئے ہو۔“

ولی نے بیگ کو ذرا سا کھسکایا اور مٹھیاں بھینچتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اس شخص کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا لیکن اس کے الفاظ نے ولی کو بوکھلا دیا، وہ سوچنے لگا۔ ”کیا ڈکسن اسے تلاش کر سکتا ہے؟ کیا کوئی یہاں آ جائے گی؟“ وہ اس شخص کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں کہتا ہوں، یہاں سے چلے جاؤ۔“

”اسے روکو۔“ اس نے ولی کے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے خاموش کراؤ۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ یہ کہہ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی ولی کافی دیر تک وہاں کھڑا

رہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ دوبارہ نہ آجائے۔ جب وہ اندھیرے میں غائب ہوگیا تو ولی بھی اپنی جگہ پر دوبارہ لیٹ گیا لیکن اس کے کانوں میں اس شخص کے الفاظ گونج رہے تھے۔ یہ تو وہ بھی جانتا تھا کہ ڈکسن اور کوئنی اسے بڑی شدت سے تلاش کر رہے ہوں گے۔ ولی کو ان دونوں پر بہت غصہ آرہا تھا۔ ان لوگوں نے اس کی خدمات کا یہی صلہ دیا تھا۔ کوئی بہتر کام دینے کے بجائے ڈکسن نے اسے نوکری سے ہی نکال دیا اور کوئنی بھی منافق ثابت ہوئی۔ ایک رات کا مہمان بنا کر اس نے بھی نظریں پھیر لیں۔ وہ اس سے جھوٹ بولتے رہے کہ انہیں اس کارنیوال کو چلانے کے لیے ولی کی مدد کی ضرورت ہے لیکن وقت آنے پر اپنے وعدے سے مکر گئے۔ ولی کی تمام امیدیں خاک میں مل چکی تھیں اگر وہ انہیں یہ ڈھانچا اور پیسے واپس کر دے تب بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے۔ اس لیے انہیں ٹھیک ٹھاک سبق دینا بہت ضروری تھا۔ وہ رات گئے دیر تک جاگتا رہا۔ صبح سورج نکلنے سے کچھ پہلے اس کی آنکھ لگ گئی۔ سات بجے کے قریب وہ اٹھا تو اس کا بیگ غائب تھا۔

☆☆☆

ڈکسن اور کوئنی، ٹرک میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ انہیں پولیس والوں کے سامنے کیا کہانی بیان کرنی ہے۔ جب اس کہانی کا خاکہ مکمل ہوگیا تو ڈکسن بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، یہ کہانی ٹھیک رہے گی؟''

کوئنی نے سیل فون پر سے نظریں ہٹائیں اور بولی۔ ''ہاں، ہمیں اسی پلان پر عمل کرنا ہے لیکن ان پر یہ بالکل ظاہر نہیں ہونے دینا کہ تم ولی سے ناراض ہو۔ میں بھی اسے ایک پُرکشش پیشکش کروں گی۔''

وہ مسکرائی تو ڈکسن کو لگا جیسے یہ مسکراہٹ کسی کا دل نہیں موم کر سکے گی۔ وہ سانپوں کی ملکہ بن کر قصبوں اور چھوٹے شہروں کے شائقین کو تو محظوظ کر سکتی تھی لیکن ڈکسن کو یقین نہیں تھا کہ وہ کبھی کسی بڑے شہر میں اپنا شو کر سکیں گے۔ وہ ان قدیم دیہاتی میلوں، ٹھیلوں سے تنگ آچکا تھا اور کوئی بڑا کام کرنا چاہ رہا تھا۔ ناشویلا کا شو اس مقصد کی جانب پہلا قدم تھا۔

تین بجے شفٹ تبدیل ہوئی تو ان دونوں نے اس سارجنٹ کو عمارت کے اندر جاتے دیکھا جس کا پتا اور فون نمبر ان کے پاس تھا۔ کوئنی نے بے زاری سے ڈکسن کو دیکھا اور بولی۔ ''اگر تم اسے نوکری سے نہ نکالتے تو اس مصیبت کا سامنا کرنے سے بچ سکتے تھے۔''

''تم نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' ڈکسن محتاط انداز میں بولا۔ ''تمہیں پہلے ہی جان لینا چاہیے تھا کہ وہ تم سے مزید مطالبات بھی کر سکتا ہے۔''

کوئنی بوکھلا گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ڈکسن کو اس کے اور ولی کے درمیان تعلق کا علم ہوگیا ہوگا لیکن اس وقت وہ لڑنے کے موڈ میں نہیں تھی لہٰذا ایک ادا سے بولی۔ ''تمہیں شاید کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے دل میں تمہارے علاوہ کسی کے لیے جگہ نہیں ہے۔''

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تمہارے دل میں کون ہے۔'' ڈکسن طنز کرتے ہوئے بولا۔ ''میری نظریں تو ہمیشہ تمہارے والٹ پر رہتی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ ٹرک سے نیچے اتر گیا۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی سب لوگ اپنے اپنے کاموں کے لیے روانہ ہونے لگے۔ ولی اپنے بیگ کی تلاش میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ رہا تھا۔ پھر اس کی نظر اس شخص پر گئی جو رات کو اسے تنگ کرنے آیا تھا۔ وہ دریا کے کنارے کھڑا پانی میں تیرتے ہوئے بیگ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ولی کی کنپٹیاں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں اس نے فی الحال اس آدمی کو قتل کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا وہ تیزی سے پل کی سیڑھیوں کی طرف بھاگا لیکن جب وہ دوسری جانب پہنچا۔ ایک لڑکا اسکیٹنگ کرنے والا تختہ یعنی اسکیٹ بورڈ لیے ہوئے وہاں آیا اور اس نے پانی میں سے وہ بیگ نکال لیا۔

''ہے!'' ولی زور سے چلّایا۔ ''یہ بیگ میرا ہے۔''

لڑکے نے اس کی جانب دیکھا اور کندھے اچکا دیے۔ ولی تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ وہ جیسے ہی نیچے پہنچا۔ لڑکے نے اپنا تختہ زمین پر رکھا اور اس پر کھڑے ہوکر آگے کی طرف دھکیلنے لگا۔ ولی نے جھک کر اپنی سانس درست کی اور اس لڑکے کے پیچھے دوڑا لیکن اس کی ٹانگیں اسکیٹ بورڈ کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکیں۔ اس لڑکے کا رخ مونوملا ایونیو کی جانب تھا۔ ولی نے جلدی سے سڑک پار کی اور ایک بس میں سوار ہوگیا جو اسی جانب جارہی تھی۔ اس نے مشین میں سکے ڈالے اور ٹکٹ لینے کے بعد کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ لڑکا اسے نظر آگیا جو بڑی مہارت سے سڑک پر بنی ہوئی لین کے درمیان اسکیٹنگ کرتے ہوئے جنوب کی طرف جارہا تھا جبکہ بس اپنی مخصوص رفتار سے چلتی اور ہر اسٹاپ پر رکتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ راستے میں ایک جگہ ولی کی نظر ایک عمارت پر گئی جہاں پولیس اسٹیشن کا بورڈ لگا ہوا تھا اور اس سے

کچھ ہی فاصلے پر ایک جانا پہچانا ٹرک بھی کھڑا ہوا تھا ولی فوراً ہی سیٹ کے نیچے جھک گیا۔ پولیس اسٹیشن گزر جانے کے بعد اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، وہ لڑکا اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

ڈکسن کو گئے ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی اور کوئنی سوچ رہی تھی کہ اگر وہ چند منٹ تک واپس نہ آیا تو اسے مزید پارکنگ فیس ادا کرنا پڑے گی۔ اسی لمحے ڈکسن عمارت سے باہر آتا نظر آیا، وہ کافی غصے میں نظر آرہا تھا۔ وہ جلدی سے ٹرک میں بیٹھا اور کوئنی سے بولا۔ ''ہمیں جلدی سے نکل جانا چاہیے ورنہ پارکنگ والا لڑکا سر پر سوار ہوجائے گا۔''

کوئنی نے ریڈیو آن کردیا۔ وہ مقامی ریڈیو اسٹیشن سے خبریں سننا چاہ رہی تھی۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

ڈکسن بھناتے ہوئے بولا۔ ''ہم خود اسے تلاش کریں گے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''یہ کوئی عقل مندی کی بات نہ ہوگی۔'' وہ اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''ہمیں فی الحال اپنی چیزوں کو حاصل کرنے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ ولی سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں، وہ ایک بار پھر ہمارے لیے پہلے کی طرح کارآمد ہوسکتا ہے۔''

''ہمیں ساتھ رہتے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا ہے کوئنی؟'' ڈکسن نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں کب تک تمہاری وجہ سے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالتا رہوں گا لیکن اس بار تم نے مجھے بری طرح پھنسا دیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ ہم اس مصیبت سے بھی نکل جائیں گے۔'' کوئنی اطمینان سے بولی۔ ''پچھلی باتوں کو بھول جاؤ، تم نے میرے قیمتی پچیس سال چھین لیے اور کبھی نہ سوچا کہ میری بھی کچھ ضروریات ہیں۔ اگر میں نے ولی کے ساتھ مل کر شو کو بہتر انداز میں چلانے کی کوشش کی تو کیا برا کیا؟''

ڈکسن نے اسٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ مارا اور اپنی نشست سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں پھر اس کے کانوں میں سانپ کے پھنکارنے کی آواز آئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور کوئنی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ اس کے باوجود تم سانپ کو ساتھ لیے پھر رہی ہو۔''

کوئنی نے اپنا پرس تھپتھپایا اور بولی۔ ''میں صرف اپنا تحفظ چاہتی ہوں۔''

''تمہیں کس سے خطرہ ہے۔ مجھ سے یا ولی سے؟ میں قسم کھاتا ہوں......''

کوئنی نے اس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا اور بولی۔ ''قسم کھانے کی ضرورت نہیں، تم سے مجھے کیا خطرہ ہوسکتا ہے اور ولی میرے لیے ایک مردہ کردار ہے۔'' پھر وہ اپنا چہرہ اس کے قریب لاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اس احتیاط کے لیے معاف کردینا۔''

ڈکسن اس کی آنکھوں کے سحر میں کھو گیا لیکن یہ ایک وقتی کیفیت تھی۔ وہ ولی کو کبھی معاف نہیں کرسکتا تھا جو بیک وقت اس کا رقیب اور دشمن تھا۔ اس نے اپنے جبڑے بھینچ لیے اور دل ہی دل میں بولا۔ ''میں اسے مار ڈالوں گا اور کوئنی، تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' ایسا سوچتے ہوئے اسے کوئنی کے سانپوں سے کوئی خوف محسوس نہیں ہورہا تھا۔

☆☆☆

ولی ساؤتھ پارک کے بس اسٹاپ پر اتر گیا۔ وہ لڑکا ابھی وہاں نہیں پہنچا تھا۔ اب اس جگہ کافی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ شمال مشرقی کونے پر ایک تکونی عمارت تعمیر ہوچکی تھی جبکہ بس اسٹاپ کے سامنے والے گیس اسٹیشن کا سائن بورڈ بھی تبدیل ہوچکا تھا۔ مغربی کونے پر جہاں ولی کھڑا ہوا تھا، وہاں اب صرف ایک شراب خانہ اور گروسری اسٹور ہی نظر آرہا تھا۔ سامنے والی سڑک پر پرانے مکانوں کی ایک قطار تھی، ولی نے دیکھا کہ وہ لڑکا اسی سڑک پر جارہا تھا، ولی نے تیزی سے چوراہا پار کیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ لڑکا ایک بار پھر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا لیکن ولی کو زیادہ پریشانی نہیں ہوئی، اس سڑک پر واقع پہلے مکان کے لان میں ہی اسے وہ اسکیٹ بورڈ نظر آگیا جس پر اسکیٹنگ کرتے ہوئے وہ لڑکا یہاں تک پہنچا تھا۔ مکان کے اندر سے کسی کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔

''ڈینی، دیکھو میں کیا لے کر آیا ہوں۔''

دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو ولی آڑ میں ہوگیا۔ اس نے مکان کا نمبر ذہن نشین کرلیا پھر وہ گروسری اسٹور پر آیا۔ اس نے وہاں سے ایک گرم لبادہ، پانی کی دو بوتلیں اور اچھی خاصی مقدار میں کینڈی خرید لیں، پھر وہ لڑکے کے مکان کے سامنے ایک جھاڑی کے پیچھے دبک کر بیٹھ گیا۔ ان تیاریوں کے مکمل ہوجانے کے بعد اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ڈھانچا دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

سورج غروب ہوچکا تھا اور گھر کے افراد رات کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہاں سے برتنوں کے کھڑکنے اور لڑکوں کی پُرجوش گفتگو کی آواز آرہی تھی۔ اسے وہ

پہلی رات یاد آگئی جب ڈکسن اور کوئی اسے اپنے ساتھ لے گئے اور کھانا کھلایا تھا۔ ولی کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اور وہ جلد از جلد اپنا نقصان پورا کرنا چاہ رہا تھا۔ کھانے کے بعد اندر سے پورچ کی بتیاں بجھادی گئیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور لان پار کرتے ہوئے پورچ کے فرش پر رینگنے لگا۔ اس نے وہ گرم لبادہ اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اس نے سوچا کہ جیسے ہی یہ لوگ باہر آئیں گے، اپنی چیز حاصل کرنے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہ منصوبہ بناتے وقت اس کا ذہن پوری طرح چوکس تھا لیکن وہ یہ بھول گیا تھا کہ کوئی کا پیغام کسی بھی وقت آسکتا ہے۔ اس نے گھبرا کر میسیج کھولا اور اسے پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا۔ ”مجھ سے فوراً ملو۔ اس میں کوئی چال نہیں ہے، یقین کرو میں تمہاری ہوں۔“

رات بھر بارش ہونے کی وجہ سے کچی جگہ میں کیچڑ ہوگئی تھی۔ جہاں وہ چھپا ہوا تھا وہاں بارش سے بچنے کے لیے کوئی چھت یا سائبان نہیں تھا۔ اگر وہاں سے ہٹ جاتا تو مکان کی نگرانی نہیں ہوسکتی تھی۔ پوری رات بے آرامی سے گزری، صبح ہوتے ہوتے اس کی حالت غیر ہوچکی تھی اور بھوک سے اس کا برا حال ہورہا تھا۔ اس کے باوجود گھر کے دروازے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ خدا خدا کرکے ان لڑکوں کے والدین کام پر جانے کے لیے گھر سے نکلے تو ولی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے لیے ان لڑکوں سے نمٹنا نسبتاً آسان تھا۔ اس نے اپنے کان اسی جانب لگا دیے۔ ڈینی کے بولنے کی آواز آئی۔ ”یہ ڈھانچا تمہیں کہاں سے ملا۔ کسی نے تمہارا پیچھا تو نہیں کیا؟“

لڑکے نے بھائی کے سوال کو نظر انداز کردیا۔ شاید وہ ان ہڈیوں کو بیگ سے نکال کر دیکھ رہا تھا، ولی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ اس نے جیب سے ایک اور چاکلیٹ نکالی۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ دونوں لڑکے بھی کسی کام سے باہر جائیں تو وہ ان کی غیر موجودگی میں ڈھانچا لے کر فرار ہوجائے لیکن خراب موسم کی وجہ سے وہ دونوں گھر میں ہی رکے رہے۔ انتظار کرتے کرتے ولی بھی اونگھنے لگا۔ دوپہر تک اسے ہلکا سا بخار بھی ہوگیا۔ بھوک سے اس کی جان نکلی جارہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے کس طرح یہاں سے نکلے، اس نے جیب سے موبائل فون نکال کر ایک بار پھر کوئی کے پیغام کو پڑھا اور سوچنے لگا کہ کیا اس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے؟ رات ہوتے ہوتے وہ پوری طرح کوئی کے تصور میں کھوچکا تھا۔ اسے یوں لگا کہ وہ کارنیوال میں اس کے پارٹنر اور شوہر کے طور پر دوبارہ شمولیت اختیار کرچکا ہے لیکن ڈھانچے کا خیال آتے ہی وہ تصور کی دنیا سے باہر آگیا۔ ان سوچوں میں گم ہوکر وہ ان لڑکوں کو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب ڈینی کی نگاہ اس پر گئی، وہ کسی کام سے پورچ کی طرف آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بے اختیار چلّایا۔ ولی کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔

☆☆☆

پولیس کار نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ آفیسر نے زمین پر پڑے ہوئے چاکلیٹ کے ریپرز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم یہ بتانا پسند کروگے کہ یہاں چھپ کر تم کیا کررہے تھے؟“

ولی نے پولیس آفیسر کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور ان چار چہروں کی جانب دیکھنے لگا جو پورچ کی ریلنگ کے پیچھے کھڑے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے پھر اس نے لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اسی نے میرا بیگ چرایا ہے۔“

”کیا یہ سچ ہے؟“ پولیس آفیسر نے پوچھا تو لڑکا اپنے بھائی کے اور قریب ہوگیا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

”جاؤ، وہ بیگ لے کر آؤ۔“ باپ نے لڑکے کو حکم دیا۔ چند لمحوں بعد وہ لڑکا بیگ لے کر باہر آگیا۔

”یہ بیگ تمہارا ہے؟“ پولیس آفیسر نے ولی سے پوچھا تو اس نے اپنی گردن ہلا دی، آفیسر بولا۔ ”ٹھیک ہے تم ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو، باقی باتیں وہیں ہوں گی۔“

یہ کہہ کر اس نے ولی کا بازو پکڑا اور اپنے ساتھی کو بیگ لانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ پولیس کار میں بیٹھ گئے تو آفیسر نے پولیس اسٹیشن سے رابطہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سارجنٹ کو بتادینا کہ ہم نے گم شدہ لڑکے کو تلاش کرلیا ہے۔“

☆☆☆

ولی کو جس کمرے میں پوچھ گچھ کے لیے لایا گیا۔ اس کی دیواروں پر سلیٹی رنگ کیا گیا تھا۔ درمیان میں ایک لمبی سی میز اور چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے قدموں کے پاس ہی وہ بیگ بھی رکھا ہوا تھا لیکن اب ولی کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد یہ بیگ اس کے اصل مالک کے حوالے کردیا جائے گا۔ وہ وہاں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا۔ اس نے اپنا سر میز پر رکھا اور بازوؤں کا تکیہ بنا کر سو گیا۔

”ولی!“ ڈکسن کی خوشیوں بھری آواز سن کر وہ اٹھنے پر مجبور ہوگیا۔ ڈکسن نے اسے کرسی سے اٹھا کر گلے لگالیا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ خاموشی سے یہ بیگ اٹھا کر ہمارے ساتھ چل دو۔“

پولیس آفیسر کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس لیے یہ سرگوشی نہ سن سکا۔ اس نے ڈکسن سے پوچھا۔

”تمہیں اسی شخص کی تلاش تھی؟“

ڈکسن نے ایک بار پھر ولی کو گلے لگالیا اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، یہی ہمارا ولی ہے۔“ پھر اس نے ولی کے بکھرے ہوئے بال اس کے ماتھے سے ہٹائے اور بولا۔ ”ہم تمہارے لیے بہت پریشان ہورہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم خیریت سے ہو۔“

کوئی بھی وہاں آگئی۔ اس نے ولی کے الجھے ہوئے بال اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے کپڑے دیکھے تو اس کے چہرے پر خوشی اور افسوس کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے اور وہ بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ”بے چارا ولی!“

ولی کے لیے ان دونوں کا یہ رویہ غیر متوقع تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ڈکسن کی گرفت سے آزاد کرایا اور شرمندہ شرمندہ سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس جواب میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

پولیس آفیسر نے بیگ اٹھایا اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم بتاسکو گے کہ یہ ہڈیاں کس کی ہیں؟“

”کیوں نہیں!“ ڈکسن نے اپنی قمیص کی جیب سے خریداری کی ایک رسید نکالی اور اسے آفیسر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک کارنیوال کا مالک ہوں اور یہ ڈھانچا ہمارے شو کا سب سے پرکشش آئٹم ہے۔“

”اوہ، ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے رسید واپس کردی، پھر اس نے ولی سے پوچھا۔ ”تم کسی کو بتائے بغیر یہ بیگ لے کر کہاں غائب ہوگئے تھے؟“

ولی کے جواب دینے سے پہلے ڈکسن بول پڑا۔ ”جوانی میں ایسی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ دراصل اس نے مجھ سے ایک فرمائش کی تھی جو میں پوری نہ کرسکا۔ اس پر یہ اداس ہوکر چلا گیا اور جاتے جاتے مجھے تنگ کرنے کے لیے بیگ بھی ساتھ لے گیا۔ خیر، مجھے بیگ سے زیادہ اس کی فکر تھی، اب یہ مل گیا ہے تو میری پریشانی بھی دور ہوگئی ہے۔“

پولیس آفیسر نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے، اب تم جاسکتے ہو۔“ پھر وہ ولی سے مخاطب ہوکر بولا۔ ”آئندہ کوئی مسئلہ ہو تو سیدھے میرے پاس چلے آنا۔ میں تمہارے قیام اور طعام کا بہتر بندوبست کرسکوں گا۔“

☆☆☆

ایک طرف ڈکسن دوسری جانب کوئی اور درمیان میں ولی

بیگ پکڑے ٹرک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ڈکسن ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کوئی نے سہارا دے کر اسے ٹرک کے عقبی حصے میں چڑھایا اور اسے ڈکسن کا ایک رومال پکڑا دیا جس میں کوئی چیز لپٹی ہوئی تھی۔ ولی نے گردن جھکا کر یوں ظاہر کیا جیسے وہ سیٹ بیلٹ باندھ رہا ہے۔ اس رومال میں ایک تیز دھار چاقو لپٹا ہوا تھا جسے ولی نے بڑی ہوشیاری سے اپنی بنیان کے نیچے اڑس لیا۔ اس اثنا میں ڈکسن ٹرک اسٹارٹ کر چکا تھا۔ ولی کے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری کہ وہ پشت سے وار کر کے ڈکسن کے کندھے میں چاقو اتار دے۔

☆☆☆

ڈکسن نے دو بلاک کا فاصلہ طے کیا اور بائیں جانب موڑنے کے بعد ٹرک کو ایک گلی کے سرے پر کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے گردن موڑ کر ولی سے کہا۔ "نیچے اترو۔"

گلی پار کر کے وہ دونوں ایک میدان میں داخل ہوئے۔ ڈکسن نے اسے ایک جگہ رکنے کا اشارہ کیا اور اس سے تین فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو کر جیب سے اپنا پستول نکالتے ہوئے بولا۔

"میں نے تمہیں ایک موقع دیا تھا تاکہ تم زندگی میں کچھ کرنے کے قابل ہو جاؤ لیکن تم نے اس کا صلہ یہ دیا کہ میری بیوی پر ہی ڈورے ڈالنے لگے اور موقع ملتے ہی میری جمع پونجی اور سب سے قیمتی اثاثہ چرا لیا۔"

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہارے لیے کوئی کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، اسی لیے میں نے اسے تمہارے پاس چھوڑ دیا۔"

"کوئی میرے لیے ایک مستقل عذاب ہے اگر تم اسے لے جاتے تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہوتی لیکن یہ ڈھانچا میرے لیے آگے بڑھنے کا زینہ ہے۔ اس کے ذریعے میں لاکھوں کما سکتا ہوں۔"

"تم ایک ایک کر کے اپنے سب ساتھیوں سے محروم ہوتے جا رہے ہو۔" اس نے بیگ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم واقعی بہت بڑے احمق ہو۔"

"ہاں احمق ہوں، اسی لیے میرے ہاتھ میں یہ پستول نظر آ رہا ہے۔ لاؤ، میری رقم واپس کر دو۔"

"میں تمہاری دھمکی سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔" ولی چلّایا اور بنیان کے نیچے سے چاقو نکال کر اس کی نوک ڈکسن کے سینے پر رکھ دی۔

"یہ حرکت کر کے تم نے اپنے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔" اس نے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارا آخری وقت قریب آن پہنچا ہے۔"

اسی لمحے ولی کو اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ ڈکسن نے اس جانب دیکھا اور جھجک کر پیچھے ہٹا، کوئی مایوسی سے بولی۔ "کوئی بھی مجھے اپنانے کے لیے تیار نہیں۔"

ولی نے کوئی کی آواز سنی۔ وہ ان دونوں کو شطرنج کے پیادوں کی طرح استعمال کر رہی تھی۔ ولی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ڈکسن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ واقعی اب اس کے پاس کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ ڈکسن ایک قدم آگے بڑھا اور پستول اس کے سینے پر رکھ دیا۔ ولی لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا، پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ڈکسن پر چاقو کا وار کر دیا جس سے اس کا ایک بازو زخمی ہو گیا۔ ولی نے دوسرا وار کیا اور اس بار چاقو عین اس کی پسلی کے نیچے جا کر لگا۔ ڈکسن لڑکھڑایا پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے پستول سنبھالا اور فائر کر دیا۔ گولی ولی کے سر کے داہنے حصے کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ ڈکسن نے دوسرا فائر کیا۔ ولی نے سر کو جھٹکا دیا اور اپنے ہاتھ دونوں کانوں پر رکھتے ہوئے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ ڈکسن نے اپنی پسلیوں کے نیچے سے چاقو نکالنے کی کوشش کی۔ وہ ایک بار پھر لڑکھڑایا اور ولی کے برابر ہی زمین پر گر گیا۔ اس کی ٹھوکر سے بیگ کھل گیا اور تمام ہڈیاں زمین پر بکھر گئیں۔

کوئی ایک کوڑے کے ڈرم کے پیچھے سے نکل کر آئی۔ ڈکسن نے اسے دیکھ کر بازو اوپر اٹھایا جیسے اس کا سہارا لینا چاہ رہا ہو لیکن وہ بے نیازی سے ان دونوں کے گرد چکر لگاتی رہی۔ ہوا میں تیزی آ گئی تھی اور یہ کسی طوفان کی آمد کا پیش خیمہ تھی۔ اس نے مضبوطی سے شال کو اپنے گرد لپیٹا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، ڈکسن کا اٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔

کوئی نے شانے اچکائے اور زیرلب بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ "ڈکسن! تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مجھے سانپوں کو ساتھ لانے کی ضرورت نہیں تھی، تمہارے لیے تو یہ سنپولیا ہی کافی تھا۔"

اس نے جھک کر وہ تمام ہڈیاں سمیٹیں اور انہیں دوبارہ بیگ میں رکھ دیا پھر اس نے ولی کی جیب سے دو ہزار ڈالر نکالے اور انہیں اپنے پرس میں رکھ لیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ دور دور تک کسی فرد کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کے دونوں پیادوں کو مات ہو چکی تھی۔ اب اسے کسی تیسرے چہرے کی تلاش تھی۔

چوہے کی چوری

نجمہ مودی

چور کی چوری اور ہیرا پھیری ہو یا... چور سپاہی کا کھیل... پس منظر میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی واردات کارفرما رہتی ہے... چوری اور سینہ زوری اگرچہ ایک فن ہے مگر ہر کوئی اس میں ماہر نہیں ہوتا لیکن... نک ویلوٹ کو اس کھیل میں کوئی مات نہیں دے سکتا۔ اس کے کام کی خوبصورتی ہی اس کی مہارت تھی جو آنکھوں میں مرچ جھونک کر بھی مکھن سے بال کے مانند صاف بچ نکلتا تھا۔

چوہے کی چوری سے دو ہاتھیوں کی مات کا دلچسپ تماشا

"میں پیرس جا رہا ہوں۔" شام کے وقت برآمدے میں بیئر پیتے ہوئے نک ویلوٹ نے گلوریا کو مطلع کیا۔

گلوریا چونک اٹھی۔ "اوہ نک، کب جا رہے ہو؟"

"بس اس ہفتہ کے آخر تک۔ دراصل مجھے ایک فلمساز نے شمالی فرانس میں پلانٹ لوکیشن کی تلاش کا کام سونپا ہے۔ اس بات کا پورا پورا امکان ہے کہ آئندہ ہفتہ میں پیرس میں ہوں گا۔"

گلوریا نے بہ دستور دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "نک کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں؟ میں پیرس کبھی نہیں گئی، مجھے فرانس دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔" نک نے گلوریا

کا چہرہ دیکھا جو بچگانا شوق کے ساتھ نک کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک معصوم بچے کی طرح وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نک کو دیکھ رہی تھی۔

نک نے بڑے پیار سے جواب دیا۔ ”تم جانتی ہو گلوریا میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ میں بہت جلد واپس آجاؤں گا، ہمیشہ کی طرح۔ تم جانتی ہی ہو۔ ٹھیک ہے نا؟ میں تمہارے لیے بہترین خوشبو کا تحفہ لاؤں گا۔“

گلوریا کسی معصوم بچے کی طرح خوش ہوگئی۔ ”واقعی نک تم مجھے فرانسیسی خوشبو لا کر دو گے؟“

”یقیناً ڈیئر!“

گلوریا کو سمجھا بجھا کر نک نے پیرس میں پیش آنے والی اپنی متوقع مصروفیات پر سوچنا شروع کر دیا۔

اس مرتبہ نک کے پاس ڈاک کے ذریعے کام آیا تھا۔ بیس ہزار ڈالرز کے مصدقہ چیک کے ساتھ نک سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ پیرس میں بننے والی امریکی فلمساز کی ایک فلم ”اپنی لورز“ میں بطور معاون اداکار استعمال ہونے والا ایک کھلونا چوہا چوری کرے۔ اس کھلونے کی قیمت صرف 98 سینٹ تھی۔ نک کو مزید ہدایت دی گئی تھی کہ یہ چوری پیر، یکم اگست سے پہلے پہلے ہوجانی چاہیے۔ نک کی خدمات حاصل کرنے والے کسی بے۔ آرشیڈ نے اپنے ہدایت نامے میں لکھا تھا کہ جونہی نک مطلوبہ چوہا حاصل کرلے وہ ایمپائر ہوٹل میں اپنے کمرے میں مزید ہدایات کا انتظار بھی کرے کہ اس کھلونے کا کیا کرنا ہے؟ آخر میں لکھا تھا کہ اس کے معاوضے کی پوری رقم کا چیک منسلک کیا جارہا ہے۔ خط اور چیک پر ایک ہی شخص بے۔ آرشیڈ کے دستخط تھے۔ اس چیک اور خط کے ساتھ مطلوبہ کھلونے چوہے کی ایک تصویر بھی تھی جو کسی جاپانی کمپنی کے کھلونوں کے کیٹلاگ سے کاٹی گئی تھی۔ یہ کھلونا چوہا کسی دھات کا بنا ہوا تقریباً چار انچ لمبا تھا جو چابی بھرنے کے بعد ایک دائرے میں گھومتا تھا۔ امریکا میں اس کی خوردہ قیمت 98 سینٹ تھی۔

نک نے ایک بار بیس ہزار ڈالرز کے بینک سے مصدقہ چیک اور 98 سینٹ مالیتی کھلونے کی تصویر دیکھی اور سوچنے لگا۔ 98 سینٹ کی خاطر بیس ہزار ڈالرز؟ اس نے تعجب سے شانے اچکائے اور کاغذات اپنی جیب میں ڈال لیے۔

نک اپنا کاروبار بذریعہ ڈاک نہیں کرتا تھا لیکن اس مخصوص معاملے میں اس نے وقتی طور پر اپنے اصول کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ یہ نیا کام اسے پوسٹ بکس نمبر کے ذریعے پہنچا تھا جو غالباً مسٹر آرشیڈ کو نک کے کسی مطمئن سابق گاہک نے فراہم کیا ہوگا۔ اس خط پر بھیجنے والے کا پتا بھی تحریر نہیں تھا۔ لہٰذا نک مجبور تھا کہ وہ چیک اور کام دونوں قبول کرلے۔ بصورت دیگر وہ کس پتے پر چیک واپس روانہ کرتا؟ نک کا یہ بھی ایک اصول تھا کہ وہ بغیر کام پورا کیے فیس وصول نہیں کرتا تھا اور چوری بھی وہ ہمیشہ ایسی عجیب و غریب چیزوں کی کرتا تھا جن کی کوئی قیمت نہ ہو۔ جیسے ایک بار اس نے ایک سوئمنگ پول کا سارا پانی چوری کرلیا تھا یا ایک باسکٹ بال ٹیم مع منیجر اور متعلقہ سازوسامان کے چوری کرلی تھی۔ ایک بار تو اس نے چڑیا گھر سے ایک زندہ چیتا پار کر دیا تھا۔ اب اس کے سامنے ایک 98 سینٹ قیمتی کھلونا چوہا تھا جسے پیرس جا کر اڑانا تھا۔

نک ویلوٹ نیویارک میں جولائی کی شدید گرمی سے نکل کر بذریعہ طیارہ پیرس کے خنک ماحول میں پہنچ گیا۔ شہر میں گھوم پھر کر اس نے محسوس کیا کہ سڑکوں پر آمدورفت بہت کم ہے اور فرانسیسی آئندہ اگست میں ہونے والی سالانہ تعطیلات منانے کی تیاریوں میں ابھی سے مصروف تھے۔ فرانسیسی عام طور سے اگست کے مہینے کی گرمی سے بچنے کے لیے شمال کا رخ کرتے ہیں اور پیرس کو سیاحوں کے رحم و کرم پر چھوڑ جاتے ہیں۔ اس سال جولائی سے ہی پیرس کی روایتی رونق کم ہونا شروع ہوگئی تھی۔ نک بہت خوش تھا۔ وہ دریائے سین کے بائیں کنارے والی ریلنگ کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کا لطف اٹھا رہا تھا جہاں کبھی گرمی نہیں ہوتی۔ وہ جمعہ کو پیرس پہنچا تھا اور اگلے دن ہفتہ تک اس نے اس امریکی کمپنی کے بارے میں تمام ضروری معلومات حاصل کرلی تھیں جس کے قبضے میں اس کی مطلوبہ شے تھی، کھلونا چوہا جو اس امریکی فلم میں ہیروئن کے معاون اداکار کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس فلم کا فلمساز آرچ فلیمنگ تھا اور ہدایت کار ایک کینیڈین نوجوان لی فٹ رائٹ تھا۔ ہالی وڈ کی نئی ابھرتی ہوئی کمسن اداکارہ کیرول ینگ اس فلم کی ہیروئن تھی جسے ہالی وڈ کے روایتی فلمی پریس نے شہرت کے آسمان پر پہنچا رکھا تھا لیکن نک کی توجہ سب سے زیادہ جس نام نے اپنی طرف مبذول کرائی تھی، وہ تھی میری کارٹر جو اس فلم میں کام آنے والے جملہ سازوسامان، ملبوسات وغیرہ کی انچارج تھی۔

سنیچر کی شام کو ہی نک نے میری کارٹر سے ملنے کا ارادہ کیا۔ وہ مونٹ مارٹری کے علاقے میں ایک فیشن ایبل ریسٹورنٹ میں پہنچا جہاں میری فلم میں کام کرنے والے دیگر اداکاروں کے ساتھ رات کا کھانا کھا رہی تھی۔ اس کی عمر 35، 36 برس ہوگی۔ وہ نک سے کچھ ہی چھوٹی رہی ہوگی۔ اس کے بھرپور شباب کے زمانے کی نشانیاں اب بھی اس کے خوبصورت جسم اور چہرے پر موجود تھیں۔ نک نے جونہی دیکھا

کہ وہ اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر بار کاؤنٹر پر پہنچی ہے، وہ بھی غیر محسوس انداز میں اس کے قریب ایک اسٹول پر جا بیٹھا۔ کسی شوقین فلم بین کے انداز میں نک نے میری سے پوچھا۔

”کیا آپ بھی اس فلم میں کام کر رہی ہیں؟“

میری کارٹر مسکراتے ہوئے نک کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”نہیں۔ مگر تمہیں کیا دلچسپی ہے؟“

نک بھی جواباً مسکرایا اور اپنا لائٹر جلا کر شعلہ اس کی سگریٹ کی طرف بڑھا دیا۔

”آپ کی پارٹی میں، میں کیرول ینگ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔“

”ہاں وہ بہت خوبصورت لڑکی ہے۔“ میری نے جواب میں کہا۔

”یقیناً اس کا مستقبل بہت شاندار ہے۔“ نک نے تبصرہ کیا۔

”یہ لڑکی آرچ پروڈکشن کے لیے سونے کی کان ثابت ہوگی اور ایک دن ہالی وڈ کی سب سے مقبول ہیروئن بن جائے گی۔“

”کیا تم اس کے ساتھ کام کرتی ہو؟“

”ایک طرح سے ایسا کہہ سکتے ہو۔ میں سازوسامان کی انچارج ہوں۔ اسکرین پر تو نہیں آتی لیکن میرا نام کریڈٹ لسٹ میں ضرور آتا ہے۔ میں کسی زمانے میں پیراماؤنٹ میں اسکرپٹ گرل بھی رہ چکی ہوں۔“ میری نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”تم خود بھی اسکرین پر آتی رہی ہوگی؟“ نک، میری کی اچھی طرح چاپلوسی کرنے کے موڈ میں تھا۔

میری مسکرائی اور کہنے لگی۔ ”جب میں 22 سال کی الھڑ دوشیزہ تھی اس وقت ہالی وڈ کی ایک بہت مشہور میوزیکل پکچر میں، میں نے کام کیا تھا۔ میرا رول پورے 35 سیکنڈ کا تھا۔“

نک نے میری کے لیے ایک پیگ کا آرڈر دیا اور تاخیر سے اپنا تعارف کرایا۔

”میرا نام نک ویلوٹ ہے۔ میں انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کا کام کرتا ہوں اور پلانٹ سائٹ کی تلاش میں ماہر ہوں۔“

”تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی مسٹر ویلوٹ۔“ میری نے پیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں بہت صاف گو لڑکی ہوں مسٹر ویلوٹ، اب مزید ڈرنک میرے لیے نہ منگوانا، بس اتنا ہی کافی ہے۔“

نک مسکرایا اور کہنے لگا۔ ”ٹھیک ہے۔ پھر تھوڑی دیر بات چیت کرو۔ میں یہاں تنہا امریکی ہوں، لیکن یقین کرو میرے ارادے برے نہیں ہیں۔“

”خوب۔ اب ہم ایک دوسرے کو سمجھ گئے۔“ میری نے جواب میں کہا۔

میری کے ساتھی ریسٹورنٹ سے رخصت ہو رہے تھے۔ وہ اٹھی اور ان سے چند باتیں کر کے پھر واپس نک کے ساتھ والے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ جتنی دیر میری اپنی پارٹی سے بات کرتی رہی نک، کیرول ینگ کو گھورتا رہا جو نہایت خوبصورت نظر آرہی تھی۔ اپنی جانب نک کو اتنی محویت سے گھورتے دیکھ کر کیرول ینگ نے اپنا رخ تبدیل کرلیا۔ اس کے ساتھ ایک پختہ عمر کا آدمی تھا جس کے بارے میں نک کا خیال تھا کہ وہ فلم کا ہدایت کار یا فلمساز ہوگا۔

واپس آکر میری نے نک کو بتایا کہ اس کے ساتھی کسی دوسری بار میں گئے ہیں لیکن وہ نک کو کمپنی دینے کے خیال سے اس کے ساتھ ٹھہر گئی ہے یوں بھی وہ جلدی گھر جانا چاہتی ہے۔

”گھر؟“ نک نے حیرانی سے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے اپنے ہوٹل!“ میری نے وضاحت کی۔ ”مجھے صبح ساڑھے چھ بجے کام شروع کر دینا ہوتا ہے۔“

”فلم کیسی بن رہی ہے؟“ نک نے پوچھا۔

”بہت اچھی اور اب تو اس کے خدوخال واضح ہونے لگے ہیں۔“ میری نے جواب میں بتایا۔

”مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ تمہاری فلم ہے کس کے بارے میں۔“ نک نے میری سے کریدنے کی خاطر پوچھا۔

”تمہیں لِلی یاد ہے؟ پندرہ سال پہلے اس نام کی ایک فلم بنی تھی اور زبردست ہٹ ہوئی تھی۔ یہ فلم بھی بس اسی سے ملتی جلتی ہے۔ ایک لڑکی کی کہانی جو پیرس میں تنہا پلتی بڑھتی ہے۔ اس کا کوئی دوست، کوئی رشتہ دار نہیں ہوتا۔ نوعمری میں اس کے پاس ایک مشینی چوہا ہوتا ہے جو چابی بھرنے پر ایک دائرے میں چکر لگاتا ہے۔ بس وہ اس کھلونے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ ہمارے ہدایت کار کا خیال ہے کہ یہ کھلونا چوہا جدید زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔“

”کیرول ینگ فلم میں تنہا لڑکی کا کردار ادا کر رہی ہے؟“ نک نے پوچھا۔

”ہاں۔ وہ جب نئی نئی آئی تھی تو اس کی عمر بہ مشکل 16 سال کی تھی اور اب تو وہ ہالی وڈ کے گھاگ لوگوں میں رہ کر خوب تجربہ کار ہوچکی ہے۔“ میری نے بتایا۔

”وہ اس فلم میں کھلونے چوہے سے کھیلتی ہے۔“ نک نے پھر کریدا اور جواب میں میری نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم لوگ کہاں شوٹنگ کر رہے ہو؟" نک نے سوال کیا۔

"شہر سے باہر ایک ساؤنڈ اسٹیج پر۔ ہم نے اسٹیج کو مالکان سے کرائے پر لے لیا ہے لیکن ہم لوگوں نے ایفل ٹاور کے آس پاس اور پیرس کے دیگر مقامات کی بھی شوٹنگ کی ہے لیکن زیادہ تر کام وہیں اسٹیج پر کیا گیا ہے، تین ہفتوں کے اندر اندر ہمارا یونٹ واپس ہالی وڈ پہنچ جائے گا جہاں انڈور شوٹنگ کر کے فلم مکمل کر لے گا۔"

"تمہارے پاس فلم کا ساز و سامان وغیرہ رکھنے کے لیے کوئی بڑا کمرا ہوگا اور تم اس کی انچارج ہوگی؟" نک نے اپنے مطلب کا سوال داغا۔

"بالکل، اسی تھیٹر میں ایک کمرا میری تحویل میں ہے جہاں تمام ضروری سامان مجھے مقفل کر کے حفاظت سے رکھنا پڑتا ہے۔ حالانکہ وہاں چوکیدار بھی ہیں اور چوری کے خلاف برقی الارم کا نظام بھی موجود ہے مگر ہم لوگوں کے پاس ایسی کوئی قیمتی چیز نہیں ہے جس کی چوری کا ڈر ہو۔"

پھر میری تفصیل سے بتانے لگی۔ "اس جگہ روشنی کا بھی بڑا معقول انتظام ہے، بڑی بڑی سرچ لائٹس موجود ہیں جو ایک بٹن دباتے ہی روشنی کا سیلاب لے آتی ہیں۔ اس کے علاوہ قدرتی روشنی بھی کافی ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو جب موسم خراب ہوتا ہے تو ہمیں ان روشنیوں کو کور کرنے کے لیے خصوصی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اس تھیٹر میں چھوٹے چھوٹے بغیر چھت کے کمرے بھی ہیں جو ڈریسنگ روم اور سپلائی روم کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ہم نے ہیروئن کیرول ینگ کے ڈریسنگ روم پر خاص طور سے کینوس ڈلوا دیا ہے تاکہ پیشہ ور فوٹوگرافر اس کی برہنہ تصویریں نہ اتار سکیں۔"

نک نے بڑی دلچسپی کے ساتھ میری کی باتیں سنیں اور کہنے لگا۔ "میں کسی وقت خود آ کر یہ تمام دلچسپیاں دیکھوں گا۔"

میری نے چونک کر نک کو دیکھا اور توقع کے خلاف اسے بتانے لگی۔

"ہمارا فلم ساز فضول آدمیوں کے سیٹ پر آنے کے سخت خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے ہم پہلے ہی اپنے پروگرام میں کافی لیٹ ہو چکے ہیں اس لیے شوٹنگ کے دوران مہمانوں کا ہرگز استقبال نہ کیا جائے۔ اس طرح کام میں حرج ہو جاتا ہے۔"

نک نے اپنے گلاس سے چسکی لی اور میری سے پوچھا۔

"ایک اور ڈرنک کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

لیکن میری نے سختی سے منع کر دیا۔ "اب میں اپنے ہوٹل جاؤں گی۔ حالانکہ تم سے باتیں کرنا بہت دلچسپ معلوم ہو رہا ہے لیکن اب میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔" پھر اس نے نک کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کہیں تم کسی اخبار کے رپورٹر تو نہیں ہو؟"

نک ہنسا۔ "کیا میں تمہیں رپورٹر نظر آتا ہوں۔ میں نے تو ویسے ہی کہا تھا کہ کسی وقت آ کر شوٹنگ دیکھوں گا۔"

اور میری مطمئن ہو گئی۔ نک نے میری سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر لینے کی دھن میں ایک نیا سوال کر دیا۔

"میری! کیا تم فلم بزنس سے وابستہ ایک شخص جے۔ آرشیڈ نامی سے واقف ہو؟"

"جیسن، جیسن آرشیڈ۔ کیا تم اس شخص سے واقف ہو؟"

"نہیں۔ میں نے اس کا نام کہیں سنا تھا۔" نک نے بھولپن سے کہا۔

"مائی گاڈ۔ وہ تو بڑا خطرناک ہے۔ اس نے مسٹر آرچ کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس فلم کی کہانی دراصل اس نے لکھی تھی جسے آرچ نے چرا لیا ہے۔ یہ شخص بہت بدمعاش ہے۔"

"کیا وہ پیرس میں موجود ہے؟" نک نے پوچھا۔

میری نے اٹھنے کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے وہ یہاں نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ "مسٹر ویلیٹ تمہاری ڈرنک کا بہت بہت شکریہ۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔" نک اسے ریسٹورنٹ کے دروازے تک چھوڑنے آیا اور اس وقت تک دروازے پر کھڑا رہا جب تک وہ اپنے ہوٹل جانے کے لیے ٹیکسی میں نہ بیٹھ گئی۔

نک تھوڑی دیر دریا کے کنارے مٹرگشت کرتا رہا اور اس مشکی چوہے کے بارے میں سوچتا رہا جسے اسے چرانا تھا۔

نک کو پتا چل گیا تھا کہ ساؤنڈ اسٹیج جہاں اس کی مطلوبہ شے موجود ہے، ایک بڑی بلڈنگ ہے جہاں برقی الارم بھی ہے اور چوکیدار بھی۔ وہ ایسا طریقہ تلاش کرنے کی فکر میں تھا کہ چوکیدار سے بھی آمنا سامنا نہ ہو اور برقی الارم بھی بے کار ہو جائے۔ بہ ظاہر یہ کام بہت مشکل معلوم ہو رہا تھا۔

نک آدھی رات ہوتے ہوتے ساؤنڈ اسٹیج بلڈنگ پہنچ گیا۔ تھوڑی ہی دقت سے وہ بلڈنگ کی چھت پر بھی پہنچ گیا۔ نک نے اسکائی لائٹ شیشے سے نیچے جھانک کر دیکھا تو گہری تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کمرا کس جانب ہے جہاں فلم سے متعلق ساز و سامان کی تفصیل

ہے۔ سوچتے سوچتے اس نے اسکائی لائٹ شیشے پر طبع آزمائی کا فیصلہ کیا۔ یہ شیشہ جو پورے اسٹیج پر آسمان کی طرح چھایا ہوا تھا، بے شمار مربع ٹکڑوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا اور ہر مربع کے چاروں طرف دھات کا بارڈر تھا جس میں برقی رو تھی اور وہ برقی الارم کے مرکزی نظام سے منسلک تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ اس شیشے کا ایک مربع ہٹانے کی کوشش کرے گا تو الارم بج اٹھے گا۔ وہ سمجھ گیا کہ چھت کے ذریعے اس کا داخلہ ممکن نہیں، تاہم اس نے ایک تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے جیب سے شیشہ کاٹنے والا چاقو نکالا اور بڑی احتیاط سے صرف ایک انچ قطر میں شیشہ کاٹ کر سوراخ کر دیا۔ پھر اس نے جیب سے ایک چھوٹا سا بال بیرنگ نکالا اور اس سوراخ کے ذریعے پھینک دیا جب تک نیچے سے اس کے گرنے کی آواز نہیں آگئی، نک سانس روکے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اس کی توقع کے عین مطابق جونہی بال بیرنگ نیچے فرش سے ٹکرایا۔ ایک آواز پیدا ہوئی اور فوراً پوری بلڈنگ روشنی سے نہا گئی اور چوکیدار چاروں طرف گھوم پھر کر آواز کا سراغ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

نک کی خوش قسمتی سے اوپر شیشے میں سوراخ بہت چھوٹا تھا اور بال بیرنگ گرتے ہی کسی کونے کھدرے میں لڑھک گیا تھا جس کی وجہ سے چوکیدار باوجود کوشش کے کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ جتنی دیر چوکیدار دائیں بائیں، آگے پیچھے آواز کے سراغ میں بھٹکتا رہا۔ اتنی دیر میں نک نے تیز روشنی میں نیچے کا سارا منظر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تاکہ جب دوبارہ تاریکی چھا جائے تو وہ اندازے سے اپنا کام کر سکے۔ چوکیدار نے مین سوئچ آف کر دیا اور بڑبڑاتا ہوا واپس اپنے ٹھکانے پر چلا گیا۔

نک نے چالیس فٹ نیچے دیکھنے کی کوشش کی جہاں پھر گہری تاریکی چھا گئی تھی۔ تھوڑی دیر چھت پر بیٹھا وہ کوئی ترکیب سوچتا رہا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے کینوس کی عارضی چھت سے ڈھکا ہوا ہیروئن کا ڈریسنگ روم بھی دیکھ لیا تھا اور چھوٹے چھوٹے کمروں کی قطار میں بغیر چھت کا آخری کمرا بھی دیکھ لیا جو فلمی ساز و سامان سے بھرا ہوا اور مقفل تھا۔ اوپر اسے کوئی امید نظر نہ آئی تو واپس نیچے اتر گیا۔ زمین پر واپس پہنچ کر نک نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو آدھے بلاک کے فاصلے پر اسے پبلک ٹیلی فون کی روشنی نظر آئی۔ وہ ساؤنڈ اسٹیج کی چھت پر رسی لٹکتی چھوڑ کر ٹیلی فون کی طرف چل دیا جہاں پہنچ کر اسے ساؤنڈ اسٹیج کا فون نمبر ڈائریکٹری سے مل گیا۔

”ہیلو؟“ نک نے نمبر ملایا تو جواب میں چوکیدار کی خمار آلود آواز آئی۔

”میں لی فٹ رائٹ بول رہا ہوں۔ تم فوراً اسٹور روم میں جاؤ اور یقین کر کے مجھے فوراً بتاؤ کہ کھلونا چوہا اپنی جگہ ڈبے میں موجود ہے۔“

”کیا..... چوہا؟ میں نہیں جانتا کسی کھلونے چوہے کو۔“ چوکیدار نے جواب دیا۔

”سنو مسٹر، میں تم سے جو کہہ رہا ہوں کوئی مذاق کی بات نہیں ہے اگر تمہیں اپنی نوکری پیاری ہے تو جیسا کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔ فوراً اسٹور روم کو کھولو اور کھلونا چوہا تلاش کر کے یقین کرو کہ وہ موجود ہے۔ صبح اس کھلونے کے ساتھ ہیروئن کی شوٹنگ ہوئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کسی نے اسے غائب نہ کر دیا ہو۔ کیا تھوڑی دیر پہلے وہاں کوئی غیر معمولی بات ہوئی تھی؟“

چوکیدار کو صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا اور تھوڑی سی رد و کد کے بعد بالآخر وہ مان گیا اور فون ”ہولڈ“ کرا کے وہ اسٹور روم کی طرف چل دیا۔

نک ٹیلی فون بوتھ سے بھاگ کر فوراً واپس ہوا اور لٹکتی ہوئی رسی کے ذریعے دوبارہ چھت پر چڑھ گیا، نیچے ایک بار پھر روشنی کا سیلاب آیا ہوا تھا جس میں اس نے چوکیدار کو اسٹور روم میں چاروں طرف مختلف سامان کو ٹٹولتے ہوئے دیکھا۔ آخر کار چوکیدار نے ایک چوکور ڈبے کو تلاش کر لیا۔ ڈبے کا ڈھکنا کھول کر اس میں سے کھلونا چوہا نکالا۔ الٹ پلٹ کر غور سے اس کا معائنہ کیا اور پھر واپس ڈبے میں رکھ کر بغیر ڈھکنا بند کیے ایک میز پر رکھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر چوکیدار باہر نکلا۔ روشنی بند کی اور فون پر ”لی فٹ رائٹ“ کو یہ اطلاع دینے چلا گیا کہ مطلوبہ چوہا اپنی جگہ موجود ہے۔

اندھیرے سے آنکھیں مانوس ہوئیں تو نک پوری احتیاط سے شیشے کی چھت پر چلتے ہوئے اسٹور روم کے عین اوپر پہنچ گیا۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے جیبی ٹارچ جلا کر چالیس فٹ نیچے نظر ڈالی اور وہ عین چوہے کے اوپر پہنچ چکا تھا۔

نک نے ایک بار پھر ہیرے کی انی والا چاقو جیب سے نکالا اور مناسب جگہ دیکھ کر برقی الارم کا خیال رکھتے ہوئے شیشہ کاٹنا شروع کر دیا۔ اس نے ایک انچ قطر کا سوراخ کر کے مچھلی پکڑنے کی ڈوری کے سرے پر ایک طاقت ور مقناطیس باندھا اور نیچے عین چوہے کے اوپر لٹکا دیا۔ اسے توقع تھی کہ چوہا جس دھات کا بنا ہوا ہے اس میں لوہا بھی شامل ہوگا اور یوں وہ بڑی آسانی سے مقناطیس سے چپک کر اوپر کھینچا جا سکے گا لیکن اسے بڑی مایوسی ہوئی جب مقناطیس اور چوہے کا رابطہ نہیں ہو سکا۔ نک نے ڈوری واپس

کھینچ لی اور کچھ سوچ کر ایک ٹوتھ پیسٹ سے مشابہ ٹیوب جیب سے نکالی۔ جس میں کوئی لیس دار اور چپکنے والا مادہ بھرا ہوا تھا۔ ٹیوب دبا کر نک نے وہ مادہ مقناطیس کے اوپر کافی مقدار میں لگا دیا اور دوبارہ نیچے لٹکا دیا۔

آخر کار وہ کامیاب ہو گیا۔ مچھلی پھنس گئی اور نک نے ڈوری اوپر کھینچ لی۔ جب مقناطیس اور لیس دار مادے سے چپکا ہوا چوہا شیشے کی چھت تک پہنچا تو نک نے دیکھا کہ سوراخ چھوٹا ہے جس میں سے چوہا نہیں نکل سکتا۔ نک نے عین کامیابی کے..... موقعے پر ناکامی کے اس اچانک امکان پر سوچا اور ایک بار پھر شیشہ کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے سوراخ کا قطر اتنا بڑھا دیا کہ چوہا نکل سکے اور یوں چند ثانیوں بعد وہ کھلونا چوہا اس کے ہاتھ میں تھا جس کے لیے اس نے امریکا سے پیرس تک کا سفر کیا تھا اور بیس ہزار ڈالرز وصول کیے تھے۔

ہوٹل واپس پہنچ کر نک نے چوہے میں چابی بھری اور کافی کی ٹیبل پر اسے ایک مقررہ دائرے میں دوڑاتا رہا۔ وہ بہت خوش تھا۔ بیس ہزار ڈالرز حلال ہو گئے تھے جو ناکامی کی صورت میں اسے واپس کرنے پڑتے، کیونکہ نک کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ اگر وہ کسی کا کام نہ کر سکے تو معاوضہ واپس کر دیتا تھا۔

نک اپنے کام سے اتوار کی شب ہی فارغ ہو چکا تھا جبکہ آرشیڈ کی ہدایت تھی کہ پیر تک کھلونا چوری ہو جانا چاہیے۔ وہ اطمینان سے نرم گرم بستر پر پڑ کر سو گیا اور صبح اٹھ کر آرشیڈ کے پیغام کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے خط میں یہی لکھا تھا کہ چوہے کے بارے میں وہ خود نک کو اس کے ہوٹل میں ہدایت دے گا۔

سارا دن گزر گیا لیکن نک کو کوئی پیغام نہیں ملا۔ البتہ صبح کے اخبارات میں بڑی بڑی خبریں چھپی ہوئی تھیں کہ آرچ فلیمنگ فلم کمپنی کا کھلونا چوہا کسی نے شیشے کی چھت میں سوراخ کر کے چوری کر لیا ہے۔ یہ کھلونا چوہا چونکہ فلمبند کیا جا چکا ہے اس لیے اب فلم کی مزید فلم سازی اس وقت تک ممکن نہیں ہوگی جب تک کہ ایسا ہی دوسرا چوہا مہیا نہ ہو جائے لیکن اس ساخت کا کھلونا چوہا پیرس میں دستیاب نہیں تھا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ فلم کے فلم ساز نے نیویارک ٹیلی فون کر کے اپنے حصہ دار کو ہدایت کی ہے کہ فوراً بذریعہ طیارہ وہ دوسرا چوہا پیرس روانہ کرے۔ خبر کے آخر میں آرچ فلیمنگ کمپنی کے خراب مالی حالات کا بھی ذکر تھا اور لکھا تھا کہ اس کھلونا چوہے کی چوری کی وجہ سے کمپنی کو بہت نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔

جب شام تک نک کو کوئی پیغام نہیں ملا تو اس نے اگلے دن واپس روانگی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا خیال تھا کہ چوبیس گھنٹے کا انتظار کافی ہے۔ اخباری اطلاعات سے آرشیڈ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ چوہا چوری کیا جا چکا ہے۔ اگلے دن نک نے صبح سویرے پہلا کام یہ کیا کہ مسروقہ چوہے کو ہوٹل کے کمرے میں موجود ٹیلی وژن کے اندر چھپا دیا اور اپنا مختصر سامان سمیٹ کر ہوٹل کا حساب بے باق کر کے باہر نکل آیا۔ ابھی وہ کسی ٹیکسی کے ذریعے ایرپورٹ جانے کا پروگرام ہی بنا رہا تھا کہ پیرس پولیس کے دو افسروں نے اسے اپنے شناختی کارڈ دکھائے اور پولیس اسٹیشن لے گئے۔

نک کے لیے یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا۔ وہ پولیس سے نمٹنا خوب جانتا تھا۔ پولیس اسٹیشن پہنچ کر اسے ایک کرسی دی گئی اور پیرس پولیس کے ایک انسپکٹر نے اس سے سوالات کرنے شروع کیے۔

”مسٹر ویلوٹ۔ وہ کھلونا چوہا کہاں ہے؟“

”کیسا چوہا؟ میں کسی چوہے کے بارے میں نہیں جانتا۔“ نک نے کورا جواب دیا۔

”دیکھو مسٹر، ہمیں ایک گمنام خط ملا ہے جس میں مطلع کیا گیا ہے کہ کسی جے آرشیڈ نے وہ کھلونا چوہا چوری کرانے کے لیے تمہاری خدمات حاصل کی ہیں۔“

”اگر ایسا ہے تو یہ ثابت کرنا بھی تمہارا کام ہے کہ وہ چوہا میں نے ہی چوری کیا ہے؟ کیا تمہیں میرے قبضے سے وہ چوہا مل گیا ہے؟“

پولیس انسپکٹر جس کا نام فلپ تھا اور خاصا معقول آدمی تھا کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”یہ درست ہے ہمیں تمہارے قبضے سے وہ چوہا نہیں ملا ہے۔ چلو میرے ساتھ ہم ساؤنڈ اسٹیج چلتے ہیں اور آرچ سے بات کرتے ہیں کہ وہ تمہارے خلاف الزام پر کتنا زور دیتا ہے۔ میں اس پانچ فرانک کے چوہے کی چوری کی خاطر پولیس کے محکمے کو تضحیک کا نشانہ نہیں بنوا سکتا۔“

اس مرتبہ نک ساؤنڈ اسٹیج کی عمارت میں باقاعدہ دروازے کے ذریعے داخل ہوا جہاں ”اپنی لورز“ کا پورا فلم یونٹ موجود تھا اور چوہے کی چوری پر بحث میں مصروف تھا۔ نک نے اس مجمع میں کیرول ینگ کو فوراً پہچان لیا حالانکہ وہ ایک دیہاتی لڑکی کے گیٹ اپ میں تھی اور اس کے بالوں کا اسٹائل بھی بالکل مختلف تھا۔ میری کارنز البتہ اسے آس پاس کہیں نظر نہیں آئی جس سے نک کو تھوڑا سا اطمینان ہوا۔

ایک بھورے بالوں والے معمر شخص نے آگے بڑھ کر انسپکٹر سے پوچھا۔

”کیا یہی وہ شخص ہے انسپکٹر!“

”جی ہاں مسٹر آرچ، یہ مسٹر نک ویلوٹ ہیں۔“

فلم پروڈیوسر آرچر، نک کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اس بدمعاش آرشیڈ نے تمہیں معاوضہ دے کر چوہا چوری کرنے پر مقرر کیا تھا۔ کیوں مسٹر نک؟''

''میں آج تک کسی مسٹر آرشیڈ سے نہیں ملا۔'' نک نے پوری سچائی سے جواب دیا۔ ان لوگوں کو گفتگو کرتے دیکھ کر ہدایت کار لی فٹ رائٹ بھی وہیں آ گیا اور پروڈیوسر آرچر سے کہنے لگا۔ ''اگر آپ شیڈول کے مطابق فلم بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں فوراً فلم بندی شروع کر دینی چاہیے مسٹر آرچر!''

ہدایت کار کے پیچھے ہی میری کارز بھی کسی عقبی کمرے سے برآمد ہو کر ان لوگوں کے پاس آ کھڑی ہوئی اور نک کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گئی لیکن فوراً اس نے نک کو نظرانداز کر کے آرچر کو مخاطب کیا۔

''ہم چوہے کا سین فلم بند کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ کیا دوسرا کھلونا پہنچ گیا ہے؟'' آرچر نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک قریبی کمرے میں چلا گیا۔ وہ چند لمحوں میں ہی ایک پیکٹ ہاتھ میں لیے واپس ہوا۔ ''فلیمنگ نے اسے پہلی پرواز سے روانہ کر دیا ہے یہ لو۔ یہ موجود ہے۔''

پیکٹ اچھی طرح پیک تھا جسے لینے کے لیے میری نے ہاتھ بڑھایا، آرچر نے اسے پیکٹ نہیں دیا اور ''ٹھہرو'' کہہ کر ہدایت کار سے بولا۔ ''لی! کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس پیکٹ کو خود کیرول ینگ کھولے اور کھولتے ہوئے اس کی تصویریں بنائی جائیں۔ چوہے کی چوری کی خبریں چونکہ بڑی نمایاں شائع ہوئی ہیں اس لیے اس دوسرے چوہے کی آمد اور فلم میں اس کے استعمال سے قبل ہیروئن کے ساتھ اس کی تصویروں سے بڑی زبردست پبلسٹی ہوگی۔ ویسے بھی فلم کی کہانی کے مطابق یہ کھلونا اس کا ہے۔''

ہدایت کار نے کسی کو ہدایت کی اور فوراً ہی ایک کیمرا مہیا ہو گیا۔ ان انتظامات کے دوران تقریباً ہر شخص وہاں نک کی موجودگی کو بھول گیا۔ نک کے پاس سنہری موقع تھا کہ وہ خاموشی سے کھسک جائے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ کیرول ینگ کو وہ پیکٹ کھولتے ہوئے غور سے دیکھتا رہا۔ آرچر نے کیمرا بوائے سے کہا کہ وہ کیرول کی تصویریں بنائے، اتنے میں وہ ایک ضروری فون کر کے آتا ہے۔ یہ کہہ کر آرچر تیزی سے ایک کمرے میں چلا گیا۔

انسپکٹر فلپ جو اس تماشے سے بیزار نظر آ رہا تھا۔ وہاں موجود لوگوں سے پوچھنے لگا۔ ''مجھے بتایا جائے کہ تم لوگ چوری کے الزام پر زور دو گے یا نہیں؟ تاکہ میں ویسا ہی کروں۔ مسٹر نک ویلوٹ بھی خوامخواہ پریشان ہیں۔''

نک بہ دستور کیرول کی طرف متوجہ تھا جس نے پیکٹ پر لپٹے ہوئے تمام کاغذ اتار دیے تھے اور اب آخری تہ اتار کر ڈبا کھولنے ہی والی تھی کہ اچانک نک نے اس پر چھلانگ لگا دی اور نوجوان لڑکی کے ہاتھ سے ڈبا چھین کر دور اچھال دیا۔ انسپکٹر فلپ نے فوراً ریوالور نکال لیا اور کیرول چلانے لگی۔ چیخ و پکار سن کر آرچر کمرے سے واپس نکل آیا اور دروازے کے قریب کھڑے ہو کر حالات کا مشاہدہ کرنے لگا اور فوراً واپس کمرے میں چلا گیا۔

''کوئی اس پیکٹ کو ہاتھ نہ لگائے۔'' نک نے بلند آواز میں سب کو خبردار کیا۔ ''اس میں بم بھی ہو سکتا ہے۔''

☆☆☆

اور تھوڑی دیر بعد ہی انسپکٹر فلپ سب کو بتا رہا تھا۔ ''مسٹر نک کا خیال سو فیصدی درست تھا۔ اس ڈبے میں بم تھا جو ڈھکنا کھلنے کے دو سیکنڈ کے اندر پھٹ جاتا۔''

پھر وہ نک کی طرف متوجہ ہوا۔ ''آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ اس ڈبے میں بم بند ہے مسٹر نک کیا آپ ہمیں بتائیں گے؟''

نک نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر آرام سے کھڑا ہو گیا۔

''یہ معاملہ ذرا سی عقل کا ہے۔ میں نے ڈبے پر موجود ڈاک کی مہروں پر جب ذرا سا غور کیا تو پتا چلا کہ کسٹم کی کوئی مہر موجود نہیں ہے جس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ پیکٹ امریکا سے فرانس نہیں پہنچا بلکہ یہیں سے بھیجا گیا ہے۔ ایک امکان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اسے پراسرار مسٹر جیسن آرشیڈ نے آرچر کو ہلاک کرنے کے لیے بھیجا ہو جیسا کہ افواہ ہے کہ وہ اس کا جانی دشمن ہے۔''

''کیرول بال بال بچ گئی، ورنہ ہلاک ہو جاتی۔'' آرچر نے لقمہ دیا۔

انسپکٹر فلپ نے نک کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے شک ہے مسٹر نک کہ تم ایک ممکنہ اقدام قتل کے واقعہ میں بالواسطہ طور پر ملوث ہو گئے ہو۔''

نک مسکرایا۔ ''میرا خیال ہے انسپکٹر فلپ کہ تمہیں میرے خلاف کوئی بھی الزام ثابت کرنے میں بڑی دشواری پیش آئے گی۔ خواہ مسٹر آرچر اپنے لگائے ہوئے الزام پر کتنا ہی زور دیں۔''

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔'' آرچر نے چونک کر نک سے پوچھا۔

''میں آپ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں مسٹر آرچر!'' نک نے بڑے اعتماد کے ساتھ آرچر کی طرف ایک قدم بڑھا کر کہا۔

آرچر بہت ناراض نظر آ رہا تھا۔ جز بز سا ہوا۔ پھر نک کو لے کر ایک قریبی کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''مسٹر نک! اب بتاؤ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

''میں زیادہ وقت نہیں لوں گا مسٹر آرچر۔'' نک نے آرچر کی پیش کی ہوئی کرسی نظرانداز کرتے ہوئے کھڑے کھڑے کہنا شروع کیا۔

''کسی نے پیرس پولیس کو گمنام خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ آرشیڈ نے کھلونا چوہا چوری کرنے کے لیے میری خدمات بھاری معاوضہ ادا کر کے حاصل کی ہیں۔ لیکن میری خدمات حاصل کرنے والا اور پھر پیرس پولیس کو گمنام خط بھیجنے والا آرشیڈ ہرگز نہیں ہے۔ اس سارے پراسرار معاملے میں صرف اس غریب کا نام استعمال کیا گیا ہے اور بس۔''

''کیا مطلب؟'' آرچر نے غرا کر سوال کیا۔

''جی مسٹر آرچر یہ بات حقیقت ہے کہ اس پلان کا خالق آرشیڈ ہرگز نہیں ہے۔ اس بے چارے کو اس بارے میں کچھ پتا ہی نہیں کہ اس کا نام اور تم لوگوں سے اس کی مبینہ مخالفت کو کس طرح استعمال کر لیا گیا ہے۔ اب سنو! تم نے اپنے پارٹنر فلیمنگ کو نیویارک ٹیلی فون کیا کہ بذریعہ طیارہ دوسرا کھلونا چوہا روانہ کر دے اور بقول تمہارے اس نے روانہ بھی کر دیا اور وہ اتنی جلد یہاں پہنچ بھی گیا جبکہ یہ بات زیادہ منطقی ہوتی کہ تم لوگ یہاں سے واپس ہالی وڈ چلے جاتے اور چوہے کا بقیہ کام وہیں فلمبند کر لیتے۔ تم نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا اس لیے کہ تمہیں معلوم تھا کہ...... چوہے کی چوری کے بعد تمہیں کیا کچھ کرنا ہے۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے خود اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے لیے بم کا پیکٹ منگوایا؟''

''قطعی نہیں۔ تم نے کیرول ینگ کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔''

''کیا پاگل پن کی بات ہے؟'' آرچر نروس ہونے لگا۔

''مسٹر آرچر بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ میں کہہ رہا ہوں...... بلکہ یہی بے چاری کیرول جو ابھرتی ہوئی اداکارہ ضرور ہے لیکن ابھی شہرت کی اتنی بلندی پر نہیں پہنچی ہے کہ بڑی بڑی اسٹارز کے مانند خود اپنے اخراجات برداشت کر سکے۔ وہ تمہارے رحم و کرم پر ہے۔ تم نے کیرول ینگ کے لیے بھاری مالیت کی بیمہ پالیسی لی ہوگی۔ فرانس میں شوٹنگ کے دوران ہر قسم کے حادثے کے خلاف ہو سکتا ہے اس پالیسی کی مالیت دس لاکھ ڈالرز ہو۔ ایسی صورت میں مردہ کیرول ینگ یا بری طرح زخمی تمہارے لیے زندہ اور صحت مند کیرول سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتی۔ تمہاری مکمل فلم تمہیں اتنا منافع نہ دے سکتی جتنا کیرول کی بیمہ پالیسی تمہیں دے سکتی ہے۔ دس لاکھ ڈالرز آرچر فلیمنگ پروڈکشن کا موجودہ مالی بحران ختم کر سکتے تھے۔''

''کیا تم اپنی اس بکواس کا ایک لفظ بھی ثابت کر سکتے ہو؟'' آرچر نے غضب ناک ہو کر نک سے پوچھا۔

''مسٹر آرچر! ایک درجن سے زائد افراد نے ابھی دیکھا ہے کہ تم نے پیکٹ کیرول ینگ کے ہاتھ میں تھمایا اور خود فون کرنے کے بہانے ممکنہ جائے واردات سے دور چلے گئے۔ مسٹر آرچر تم کسے فون کرنے گئے تھے۔ غالباً نیویارک اپنے پارٹنر کو۔ یہ بتانے کے لیے کہ تمہارا منصوبہ کامیاب ہو گیا ہے اور اب تمہاری کمپنی بہت جلد مالی مشکلات پر قابو پا لے گی۔''

آرچر نے گھبراہٹ میں نک سے سوال کیا۔ ''آخر تم چاہتے کیا ہو؟''

''میں چاہتا ہوں کہ میں تمہیں مسروقہ کھلونا چوہا دوبارہ بیس ہزار ڈالرز میں فروخت کر دوں۔''

''وہ کیوں آخر؟''

''بس بس مسٹر آرچر زیادہ بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارے سامنے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ سمجھ گئے...... اور ہاں، کان کھول کر سن لو...... فرانس میں قیام کے دوران کیرول ینگ کو ذرا سا بھی نقصان پہنچا، خواہ وہ معمولی سا زخم ہی کیوں نہ ہو۔ پھر نتائج کے تم خود ذمے دار ہو گے۔ اچھی طرح سوچ لو۔ ایسی صورت میں ہو سکتا ہے تمہارے سامنے یہ راستہ بھی نہ رہ جائے جو میں نے تجویز کیا ہے۔''

آرچر نے ہتھیار ڈال دیے۔

☆☆☆

اس شام جب ویلوٹ ایئرپورٹ پر پہنچا تو طیارے میں سوار ہونے سے قبل اسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ بھاگا بھاگا ایئرپورٹ کی ڈیوٹی فری گفٹ شاپ پر پہنچا اور...... وہاں سے بہترین فرانسیسی خوشبو کی دو مہنگی بوتلیں خرید لیں...... اس لیے کہ وہ اس وقت بے تاج بادشاہ بنا ہوا تھا اور بہ آسانی ان کی قیمت ادا کر سکتا تھا۔ آخر گلوریا سے کیا ہوا وعدہ بھی تو پورا کرنا تھا اور وعدے پر قائم رہنا نک کا ایک اور اصول تھا۔

محفلِ شعر و سخن

❁ آمنہ نجم......میلسی

جس پہ سے ہر رنگ وصل کے گزریں لوگ
ہم تو قائل دل سے ایسے پل کے ہیں

❁ مسز ضیاالقمر سلطان......دتی نمبی ساہیوال

ایک تو خواب لیے پھرتے ہو گلیوں گلیوں
اس پہ تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ
ہم کو اس شہر میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو چن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

❁ حمدان ناصر......صدر، کراچی

دیر و کعبہ میں ڈھونڈتا ہے کیا
دیکھ دل میں کہ بس یہیں کچھ ہے

❁ طاہرہ یاسمین......ضلع سرگودھا

توڑ گیا وہ ہم سے ہر تعلق فقط اتنا کہہ کر
کہ اجڑے ہوئے لوگوں میں ہم بسا نہیں کرتے

❁ خواجہ مدنی......چوک ظاہر پیر

یہاں غمگین مت ہونا کوئی جو بھول جائے تو
یہاں رب کو بھی سب وقتِ ضرورت یاد کرتے ہیں

❁ مرزا طاہر الدین بیگ......میرپور خاص

کیا ہوا نے کہا پرندوں سے
اڑ گئے اپنے آشیانوں سے
ابر برسا کیا سمندر پہ
دھول اڑتی رہی مکانوں سے

❁ شوکت علی......گلبرگ، لاہور

تلاش عیب سے میری ذات کو نہ کر داغ دار
فقط اتنا ہی کہہ دے ترے قابل نہیں ہوں میں

❁ احمر علی......گوجرانوالہ

ہر ذرے کے دل میں ہے کہ صحرا بن جائے
ہر قطرے کی آرزو ہے کہ دریا بن جائے
دریاؤں کے دل میں کیا ہے، کیا ہے صحرا کی طلب
یہ جان لے آدمی تو جانے کیا کیا بن جائے

❁ رانا حبیب الرحمٰن......سینٹرل جیل، لاہور

سدا خوش رکھنا میرے خدا اس کو
تیرے فرشتے بھی دیں دعا اس کو

❁ سعدیہ بخاری......اٹک

کرے گا دونوں کا چاک پردہ رہے گا دونوں کو کرکے رسوا
یہ شورشیں ذوقِ دید میرا یہ اہتمامِ حجاب تیرا

❁ امیر علی......کھوکھراپار، کراچی

پہلے نصابِ عدل ہوا ہم سے انتساب
پھر یوں ہوا کہ قتل بھی ہم کر دیے گئے
پہلے لہولہان کیا ہم کو شہر نے
پھر پیرہن ہمارے علم کر دیے گئے

❁ عمران ارشاد......میرواہ گورچانی، میرپور خاص

یہ بھی اچھا ہے صرف سنتا ہے
دل اگر بولتا تو قیامت ہوتی

❁ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی

بازی لگا کے، جان کو ہارے چلے گئے
بارِ گراں تھا سر سے اتارے چلے گئے
محفل میں ان کی بیٹھ کے ہنس بولتے رہے
جب وہ گئے تو ہوش ہمارے چلے گئے

❁ جعفر حسین......تحصیل بھوآنہ ضلع چنیوٹ

میں جو بدلوں تو تغیر ہے میری ذات تلک
تو جو بدلے تو شب و روز بدل جاتے ہیں

❁ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی

جو ادھر جارہا ہے وہی مجھ پہ مہربان ہے
کبھی آگ پاسبان ہے کبھی دھوپ سائبان ہے

❁ سردار ظفر اقبال وڑائچ......خانیوال

یاد رکھو تو دل کے پاس ہیں ہم
بھول جاؤ تو فاصلے ہیں بہت!

❁ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ سٹی

ختم تو نہیں بغاوت فقط آدم پہ نہ کر
اب کسی اور بھی مخلوق کو جنت سے نکال

❁ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر......تتی ہنڈی سکھیکی

کوئی چراغ تو آندھی سے بچ کے نکلے گا
جلا دیے ہیں بہت سے دیے ہوا کے لیے

❁ قاری محمد رمضان حسرت......نورپور تھل، خوشاب

آنکھوں کو اشک آہ کو تاثیر دے گیا
اک شخص ہم کو درد کی جاگیر دے گیا

❁ سائرہ اینڈ عاصمہ......کھاناں

نہ ٹوٹنے کی جسارت میں ٹوٹ جاتے ہیں
تعلقات حفاظت میں ٹوٹ جاتے ہیں

❁ ڈاکٹر وسیم خالق کھیاں......گجرات

جب بھی کوئی پوچھتا ہے معانی وفاداری
ہم سب کچھ بھول کر تیری ہی مثال دیا کرتے ہیں

❁ نذیر احمد بزمی......دھریجہ نگر

بڑی دلچسپ منزل ہے کہ موسم پر رقابت ہے
انہیں نفرت دسمبر سے مجھے الفت دسمبر سے

❁ ملک الطاف حسین کھیلنگ......مظفرگڑھ

ہے شوق اور ضبطِ شوق میں دن رات کشمکش
دل مجھ کو میں ہوں دل کو پریشاں کیے ہوئے

❁ علی عمران......نوشہرہ

میں نے کہا جو بزم میں شب اپنا سوزِ دل
بے اختیار شمع کے آنسو نکل پڑے
شب نالہ کرتے ڈرتے ہیں ہم کوئے یار میں
ایسا نہ ہو کہ نیند میں اس کی خلل پڑے

❁ محبوب علی......کینیڈا

محبت کیا ہے تاثیرِ محبت کس کو کہتے ہیں
تیرا مجبور کر دینا میرا مجبور ہو جانا

❁ احمد حسن عرضی......قبولہ شریف

میں ترے ہونٹ کے جس تل کو بہت چومتا تھا
اب وہ خوابوں میں چمکتا ہے ستارے کی طرح

❁ ڈاکٹر ایچ اے لطیف......فقیروالی

بے فائدہ ہے زیست میں احباب کا ہجوم یارو
مل جائے وفادار تو ایک شخص ہی بہت ہے

❁ مریم متین......ٹیکساس، یو ایس اے

جہاں بھی رہنا خوشبو بن کر رہنا بھول نہ جانا
دل بھی اک چھوٹا سا گھر ہے اپنا بھول نہ جانا

❁ خرم......فیصل آباد

کاٹتے دن ہیں جو ہم باعثِ غم گن گن کر
شب بھی کرتے ہیں بسر تاروں کو ہم گن گن کر
کوئے جاناں کی زمیں اپنے پکڑتی ہے پاؤں
ہم ظفر اس لیے رکھتے ہیں قدم گن گن کر

❁ ارحم علی......کراچی

کوئی رستہ نہیں دھرتی پہ تمنا جیسا
کوئی بستی نہیں دنیا میں خیالوں جیسی

❁ اسامہ بن سعید......کراچی

دریا میں یوں تو ہوتے ہیں قطرے ہی قطرے سب
قطرہ وہی ہے جس میں کہ دریا دکھائی دے

❁ شیث سجاد......الخبر، سعودی عرب

تلخ لفظوں کو لبوں تک نہیں آنے دیتا
تیر چڑھتے ہیں کمانوں پہ تو چل جاتے ہیں

❁ فاطمہ بنت نجم......میلسی

اب تو حق بات بھی کہتے ہیں تو یہ سوچتے ہیں
ہم نے ناحق ہی کشادہ لبِ اظہار کیا

❁ عبداللہ......ملتان

آؤ ملو ہم سے، ہمیں دیکھو، ہمیں سن لو
کچھ روز میں ہم لوگ پرانے نہ رہیں گے

❁ سمیع خاور......کراچی

اتر رہا ہوں زمیں پر حروف بن بن کر
کہیں نہ میں بھی مقدس کتاب بن جاؤں

❁ عمیر منہاس..... گلشن اقبال، کراچی
کر گئے سارے جہاں کو روشن
اپنی ہی آگ میں جلتے جلتے

❁ عزیر احمد..... عظیم پورہ، کراچی
پیار کی راہ میں مرنا مشکل
کہنا آسان ہے، کرنا مشکل

❁ شعیل متین..... ڈیلاس، یو ایس اے
روز کہتے ہیں کہ دل آج تو دے دو ہم کو
روز کہتا ہوں کہ سرکار کہاں سے لاؤں

❁ امتیاز احمد..... ملیر ہالٹ، کراچی
خیر مانگوں کیوں نہ اپنے شہر کی
شہر کی گلیوں میں میرا گھر بھی ہے

❁ اسریٰ بنت متین..... ٹیکساس، یو ایس اے
ہم اس سے دور ہیں کوسوں مگر قسم لے لو
جو ایک پل بھی لگاتے ہوں ایک پھیرے میں

❁ حذیفہ بن اکرم..... کراچی
جنگ میں ہوگا لاکھ یہ جائز لیکن عشق میں تو
آگے بڑھ کر پیچھے ہٹنا اچھی بات نہیں

❁ محمد اقبال..... کورنگی، کراچی
صرف کہنے سے زمیں کیا آسماں ہوجائے گی
کچھ نہیں ہوگا زمیں کو آسماں کہتے رہو

❁ عمران کھتری..... کراچی
تری اس بے وفائی پر فدا ہوتی ہے جان اپنی
خدا جانے اگر تجھ میں وفا ہوتی تو کیا ہوتا

❁ مولا بخش..... میرپور ساکرو
ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

❁ محمد سلیم..... ملیر کراچی
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

❁ ذوالقرنین..... سیالکوٹ
ڈرتا ہوں جل نہ جائے کہیں خیمۂ فلک
اے آہِ سوز ناک نہ ہو تو بلند بس

❁ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
اس بے وفا نے ہم کو کبھی یاد کر لیا
ایسا ہمارے علم میں کوئی واقعہ نہیں

❁ ارسلا فضل..... روہڑی
امید و مسرت کا شجر دور بہت تھا
اس گہرے سمندر میں گُہر دور بہت تھا

❁ عدنان صدیقی..... ملتان
چمن میں جب بہار آتی ہے اور غنچے چٹکتے ہیں
تو حسرت سے اسیرانِ قفس کیا کیا پھڑکتے ہیں

❁ محمد عزیز..... کراچی
کیوں لگاتے دل کسی سے ہم اگر یہ جانتے
جان کے پیچھے بلا اِک اس قدر لگ جائے گی

❁ تنزیل..... ٹاور، کراچی
لختِ دل آنسوؤں کی رو میں چلے آتے ہیں
کیا تماشا ہے کہ یاں بہتی ہے سیلاب میں آگ

❁ نہال ہاشمی..... فیصل آباد
کیا کبھی بات ہم نے تم سے خلاف
روٹھ جانے کی باتیں اور ہی ہیں

❁ عبدالواسع..... ماڈل کالونی، کراچی
کرو وہی کہ جو کرنا ہے آپ کو منظور
مگر سنا تو کرو تم کسی غریب کی بات

❁ ذیشان منہاس..... گلشن اقبال، کراچی
میں نے دیا تھا دل انہیں دلدار جان کر
وہ میرے دل کو لے کے دل آزار بن گئے

❁ سدرہ منیر..... شیخوپورہ
توڑی مریضِ غم نے ترے اس طرح سے جان
گھبرا کے غمگسار سرہانے سے اٹھ گئے

کوپن برائے شمارہ مارچ 2012

محفلِ شعر و سخن

نام : --

پتا : --

نایاب تحفہ

ثمر عباس

انسان بڑی سے بڑی الجھن کو سلجھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ خودکسی نفسیاتی الجھاؤ کا شکار نہ ہو... ورنہ زندگی پنجرے میں قید اس پرندے کے مانند گزرتی ہے جو خیالات کی پرواز کے ذریعے آسمان کی بلندیوں کو تو چھو سکتا ہے مگر پیروں کو زمین سے جدا نہیں کر پاتا۔ وہ جو مسیحا بن کر اس کے تعاقب میں تھی بالآخر اس کی الجھی ڈور کو سلجھاتے سلجھاتے خود ہی الجھ بیٹھی۔

زندگی کے کینوس پر رنگ بھرنے والے ایک مصور کا اچھوتا خیال

میری کے بارے میں سبھی لوگوں کا خیال تھا کہ اسے قدرت نے مصوری کی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ بچپن میں جب بھی پنسل سے کاغذ، دیوار، پرانے لفافوں یا کسی بھی جگہ پر آڑی ترچھی لکیر کھینچتی تو اس میں کوئی ایسی بات ضرور ہوتی جو دیکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی اور ہر کوئی اس کے آرٹ کے تعریفیں کرنے لگ جاتا۔ میری کے والدین نے بھی جلد ہی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ وہ پیدائشی آرٹسٹ ہے۔ چنانچہ وہ قدم قدم پر اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔

وہ اسے اپنے ساتھ بازار لے کر جاتے تاکہ وہ اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق مصوری کا سامان خرید سکے۔ میری ان کی اکلوتی اولاد تھی اس لیے وہ اس کی ہر خواہش کو پوری کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ویسے بھی میری کے باپ کا خیال تھا کہ میری کے شوق پر جو کچھ خرچ ہو رہا ہے وہ ایک طرح کی سرمایہ کاری ہے۔ کون جانتا ہے کہ وہ مستقبل میں کتنا نام پیدا کرے گی۔ بڑے مصوروں کی پینٹنگز ہزاروں پاؤنڈز میں فروخت ہوتی ہیں۔ اگر میری اسی طرح آگے بڑھتی رہی تو ایک دن یہی تصویریں اس کا سرمایہ ہوں گی۔ میری کے بنائے ہوئے کرسمس اور سالگرہ کے کارڈز، دکانوں پر ملنے والے کارڈز سے بدرجہا بہتر تھے اور اس کے سبھی دوست اور ملنے والے میری کے بنائے ہوئے کارڈز کو ترجیح دیتے تھے۔

آہستہ آہستہ میری کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ دو تین پڑوسیوں نے تو اس کی بنائی ہوئی تصویریں فریم کروا کر اپنے گھروں میں آویزاں کرلیں۔ اسکول میں بھی میری کی آرٹ ٹیچر نے اس کی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں مقامی اور علاقائی مقابلوں میں بھیجی جانے لگیں اور ان میں سے کئی ایک پر اسے پہلا انعام بھی ملا۔ آرٹ کالج میں بھی میری کی سرگرمیاں جاری رہیں لیکن بدقسمتی سے یہاں اسے زیادہ پذیرائی نہ مل سکی۔ زمانہ بدل رہا تھا اور نوے کی دہائی میں پاپ اسٹارز اور سمندر کے کنارے شراب پی کر غل غپاڑہ کرنے والے نوجوانوں کو میڈیا کی جانب سے زیادہ کوریج ملنے لگی۔ میری اس ماحول میں خود کو اجنبی سمجھنے لگی۔ سب جانتے تھے کہ وہ ایک اچھی آرٹسٹ ہے لیکن اس کے باوجود اسے بورنگ، ڈل اور مضافات میں رہنے والی لڑکی کے طور پر ٹریٹ کیا جاتا تھا۔

میری بیس سال کی تھی کہ اس کی ملاقات اسٹیو سے ہوئی جو گھروں اور دفتروں کی آرائش کا کام کرتا تھا اور اس کے ایک سال بعد وہ اسٹیو کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں منتقل ہوگئی کیونکہ وہ دونوں اپنی مشترکہ آمدنی سے اتنا بڑا گھر ہی افورڈ کرسکتے تھے۔ اسٹیو اپنا کام کرتا تھا جبکہ میری نے مقامی آرٹ شاپ میں سیلز اسسٹنٹ کی ملازمت کرلی تھی۔ وہ اب بھی پینٹنگ کرتی تھی۔ ان کے مالی حالات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے اور اخراجات بڑھتے جارہے تھے۔ اس مرحلے پر اسٹیو نے تجویز پیش کی کہ میری کوئی پارٹ ٹائم ملازمت کرلے۔ اس نے مقامی اخبار میں شائع ہونے والے ایک اشتہار کی جانب میری کی توجہ دلائی جس میں قیدیوں کی مدد کرنے کے لیے ایسے لوگوں سے درخواستیں طلب کی گئی تھیں جو مصوری سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ ویسے بھی میری اپنی موجودہ ملازمت سے اکتاہٹ محسوس کرنے لگی تھی جس میں سارا دن اسے رنگین پنسلیں اور واٹر کلر سیٹ بیچنا ہوتے تھے۔ اس اشتہار کو دیکھنے کے بعد وہ سوچنے لگی کہ شاید اس طرح وہ اپنی صلاحیتوں کو بہتر انداز میں استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اضافی آمدنی بھی حاصل کرسکے۔

اس نے دوسرے دن ہی اس ملازمت کے لیے درخواست دے دی اور ایک مختصر انٹرویو کے بعد اسے منتخب کرلیا گیا۔ چھ مہینے کی ٹریننگ کے بعد اسے قریبی جیل میں وزیٹنگ آرٹ تھراپسٹ کی حیثیت سے تعینات کردیا گیا۔ بیری فیلڈ، عورتوں کی جیل تھی جہاں جانے میں اسے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا۔ وہاں ایسی عورتوں کو رکھا جاتا تھا جو اپنی قید کے آخری ایام گزار رہی تھیں۔ میری کو وہ جگہ خطرناک ہونے کے ساتھ ساتھ کافی پرکشش محسوس ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ نئی ملازمت میں اسے کچھ سیکھنے کے ساتھ ساتھ قیدی عورتوں کی مدد کرنے کا بھی موقع ملے گا۔

ابتدائی چند دنوں میں اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ میری کی کلاس میں قیدی عورتوں سے زیادہ جمائیاں لیتی ہوئی جیل کی وارڈنز تھیں۔ تاہم اس کی کوشش ہوتی کہ وہ ان سے باتیں کرتے وقت اپنے آپ کو پرسکون رکھے۔ ٹریننگ کے دوران اس کے انسٹرکٹر نے کہا تھا۔ ”ہمیں قیدیوں کی بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش نہیں کرنی بلکہ تجرباتی علاج کے ذریعے انہیں جذبات، محسوسات اور خوف کے اظہار پر مائل کرنا ہے۔“

”لیکن اگر وہ صرف تصویریں بنانا چاہیں تو کیا ہم انہیں منع کردیں؟“ میری نے پوچھا تھا۔

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”فرض کریں کہ ان میں کچھ واقعی بہت اچھی آرٹسٹ ہوں اور دوبارہ اپنا شوق پورا کرنا چاہیں تو؟“

انسٹرکٹر نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کبھی کبھی اسٹیو دیکھا کرتا تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ کوئی ایسی بات پوچھتی جو خود اسے پریشان کررہی ہو۔

”مائی ڈیئر!“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ یہ لوگ قانون شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انہیں سزا کے طور پر جیل میں رکھا گیا ہے۔ ہم نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا ٹھیکا نہیں لیا ہوا۔“

دوسرا سیشن زیادہ کارآمد ثابت ہوا۔ جب قیدی عورتوں کو معلوم ہوا کہ انہیں روزمرہ کے معمولات سے ہٹ کر

پینٹنگ کے بارے میں بتایا جائے گا تو انہوں نے اسے ایک اچھی خبر سمجھ کر دلچسپی کا اظہار کیا۔ بدھ کی سہ پہر جب میری مخصوص کمرے میں پہنچی تو وہاں گیارہ نئی قیدی عورتیں نظر آئیں۔ وہ سب دو دو کی ٹولیوں میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہی میں ایمی مورگن بھی شامل تھی جس نے کسی کا ساتھ گوارا نہ کیا اور سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں اکیلی بیٹھی نظر آئی۔

میری نے اپنا تعارف کروانے کے بعد ان کلاسوں کا مقصد بیان کیا۔ قیدی عورتیں بڑے غور اور دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں لیکن ایمی مورگن کی آنکھوں میں ایسا تاثر تھا جیسے کہہ رہی ہو۔ ”مجھ سے دور رہنا۔“ میری نے پنسل اسکیچ سے ابتدا کی اور انہیں اس کے ابتدائی اصول بتائے لیکن ایمی مورگن دور بیٹھی اپنی تصویر بنانے میں مصروف رہی۔ وہ اپنے ساتھ رنگ بھی لائی تھی۔ جب کبھی میری اس کے پاس جاتی تو وہ اسے بری طرح گھورنے لگتی۔ اس کی نگاہوں سے ایسا ہی پیغام ملتا تھا جیسے وہ اسے دور رہنے کے لیے کہہ رہی ہو۔

سیشن کے خاتمے پر چیف وارڈن نے اس سے خاص طور پر ایمی کے بارے میں پوچھا تو میری کچھ توقف کے بعد بولی۔ ”مجھے تو وہ کافی خوف زدہ نظر آئی۔ کیا وہ ایسی ہی بے ضرر ہے؟“

”کیا کہہ رہی ہو؟“ وارڈن مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ہاں، وہ ایسی ہی دکھائی دیتی ہے۔ اپنے آپ میں مگن رہنے والی۔ دوسروں سے بات نہیں کرتی اور اپنی کوٹھری میں ہی رہتی ہے۔ اس کا زیادہ وقت تصویریں بنانے میں گزرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کلاس میں چلی آئی۔“

”اس کا جرم کیا تھا؟“ میری نے جاننا چاہا۔

”اس نے ایک نہیں دو قتل کیے ہیں۔“ وارڈن نے جواب دیا۔

میری کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔ ”دو قتل؟“

”ہاں! اس نے اپنے شوہر اور بہن کا قتل کیا ہے۔“

”مگر کیوں؟“ میری کی سمجھ میں نہ آیا کہ کوئی عورت اپنی بہن کو بھی قتل کرسکتی ہے۔

وارڈن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بھی اس پر یقین نہیں کرسکتا مگر یہ حقیقت ہے۔ ایک دن وہ کام سے واپس آئی تو اس نے ان دونوں کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ لیا۔ اس نے انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا اور ان پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ وہ دونوں ہی ہلاک ہوگئے اور مکان بھی شعلوں کی زد میں آگیا۔“

”اوہ میرے خدا!“ میری کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

”پھر وہ سیدھی پولیس کے پاس گئی اور اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔ یہ واقعہ ستر کی دہائی کے شروع میں پیش آیا تھا اور اس کی کافی شہرت ہوئی تھی۔“

”گویا میری پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔“ میری نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ اسے متلی سی محسوس ہونے لگی۔ اس عورت کے بارے میں یہ سب جان کر وہ بہت خوف زدہ ہوگئی تھی۔

”اسے دو مرتبہ عمر قید کی سزا سنائی گئی۔“ وارڈن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے پندرہ سال اس نے نفسیاتی اسپتال میں گزارے پھر دس سال کے لیے دوسری جیل بھیج دیا گیا اور اب یہ ہمارے پاس ہے۔ اس کے بارے میں سمجھا جارہا ہے کہ اب وہ مزید کسی کے لیے خطرہ نہیں ہے۔ اس لیے حکام بالا چاہتے ہیں کہ وہ زندگی کے آخری ایام کسی بہتر ماحول میں گزارے۔“

”اس بات سے کیا مطلب ہے کہ یہ مزید کسی کے لیے خطرہ نہیں ہے؟“ میری نے پوچھا۔

”پچھلی جیل میں اس کا برتاؤ بہت اچھا رہا۔ دس سال کے دوران اس نے کسی کو پریشان نہیں کیا اور نہ ہی کوئی مسئلہ کھڑا کیا۔ بس خاموشی سے پینٹنگ کرتی رہتی ہے۔“ یہ کہہ کر وارڈن دروازے تک گئی پھر پلٹ کر بولی۔ ”اب اپنی کی قسمت میں یہی منحوس تصویر رہ گئی ہے۔“

”اس تصویر میں ایسی کیا خاص بات ہے جو اس نے مجھے بھی نہیں دیکھنے دی۔“ میری نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”اسے تم پر بھروسا نہیں ہے۔ وہ تقریباً ستر سال کی ہوگئی ہے اور زندگی کے آخری پچیس سال اس نے جیل کی چار دیواری کے اندر گزارے ہیں۔ اس لیے وہ تمہیں اتنی آسانی سے اپنی عزیز ترین شے کے نزدیک نہیں آنے دے گی۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ اس تصویر کو اس وقت سے اپنے ساتھ لیے پھر رہی ہے جب وہ ریمانڈ پر تھی۔ لگتا ہے کہ اب یہ تصویر اس کے وجود کا حصہ بن گئی ہے۔ تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ شاید کسی روز وہ تمہیں یہ تصویر دکھانے پر آمادہ ہوجائے۔“

☆☆☆

جب میری گھر واپس آئی تو اسٹیو، ٹی وی پر کوئی میچ دیکھ رہا تھا۔ رات کے کھانے کے دوران میری نے اسے ایمی کے بارے میں بتایا۔ میری کا خیال تھا کہ وہ سرسری انداز

میں اس کی بات سننے کے بعد دوبارہ میچ دیکھنے میں مصروف ہو جائے گا لیکن اس کے برعکس وہ کمپیوٹر آن کر کے بیٹھ گیا اور تقریباً ایک گھنٹے تک انٹرنیٹ پر کام کرتا رہا۔ اس دوران میری گھر کے بقیہ کام نمٹانے میں مصروف ہو گئی، اچانک ہی اسٹیو نے نعرہ لگایا۔ ''گوچا! یہ رہی اینی مورگن۔''

میری نے کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جما دیں۔ ایک پرانی ویب سائٹ کے نیوز آرٹیکل میں دبلی پتلی اور جوان اینی کی تصویر نظر آرہی تھی جو عدالت سے سزا سننے کے بعد دروازے پر کھڑی پولیس کار کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے اردگرد پریس فوٹوگرافرز اور رپورٹرز کا ہجوم تھا۔

اسٹیو نے پورا آرٹیکل پڑھنے کے بعد منہ سے سیٹی کی آواز نکالی اور میری کی طرف گھومتے ہوئے بولا۔ ''سمجھو کہ ہمیں خزانہ مل گیا۔ اس سے اچھا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔''

میری نے ایک کرسی گھسیٹی اور اس کے برابر بیٹھ کر دلچسپی سے اس کی باتیں سننے لگی۔

''اس آرٹیکل میں اینی مورگن کے بارے میں انتہائی حیرت انگیز باتیں لکھی گئی ہیں۔'' اسٹیو پرجوش انداز میں بولا۔ ''مقدمے کی سماعت کرنے والے جج کا کہنا ہے کہ اس نے اپنے کیریئر میں ایسی سرد مزاج اور بے حس عورت نہیں دیکھی جو اپنا دفاع بھی ڈھنگ سے نہ کر سکے۔ وہ ڈربی شائر کی ایک بڑی حویلی میں صفائی کا کام کرتی تھی لیکن کئی سال گزر جانے کے باوجود بھی اس کے مالک نے کبھی اس کے کام کی تعریف نہیں کی۔ پھر ایک دن جب وہ ڈیوٹی ختم کر کے واپس آئی تو......''

''تو اس نے شوہر کو اپنی بہن کے ساتھ......'' میری نے تلخی سے کہا۔

''تمہیں اس عورت سے اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے؟'' اسٹیو اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''یہاں ہزاروں لاکھوں مرد ایسا کرتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ انہیں قتل کر کے مکان کو آگ لگا دی جائے۔ اس آرٹیکل میں لکھا ہے کہ اس نے بھاری ہتھوڑے سے ان کے سروں پر ضرب لگائی اور پھر مکان کو آگ لگا دی۔ اس سے زیادہ پاگل پن اور کیا ہو سکتا ہے۔''

''لیکن اب وہ پاگل نہیں رہی، بس تصویر بناتی رہتی ہے۔''

''ایک اور خاص بات سنو۔'' اسٹیو نے کہا۔ ''اس کا شوہر خاصا کنجوس تھا اور اس وجہ سے لوگ اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ جانتی ہو وہ اپنی دولت کہاں چھپا کر رکھتا تھا؟''

''بستر کے نیچے؟''

''تم تو بہت جلدی سمجھ گئیں۔'' اسٹیو نے ستائشی انداز میں اسے دیکھا۔ ''ہاں، اس کی ساری جمع پونجی ایک پرانے سوٹ کیس میں محفوظ تھی اور وہ سوٹ کیس بستر کے نیچے رکھا ہوا تھا جس میں دو چار نہیں بلکہ ہزاروں پاؤنڈز تھے اور اس کا اعتراف اینی نے عدالت میں بھی کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب وہ کام سے واپس آئی تو اس نے اپنے شوہر اور بہن کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر قتل کر دیا اور انہیں آگ لگا دی پھر وہ دوبارہ حویلی گئی اور وہاں پولیس والے کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا، کیا یہ اس کا پاگل پن نہیں تھا؟''

''شاید وہ جانتی تھی کہ بہت جلد پکڑی جائے گی۔ لہٰذا وہ قانون سے بچ کر کہاں جاتی۔ اسی لیے اس نے بہ آسانی اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔''

''لیکن تحقیقاتی ٹیم جب تباہ شدہ مکان کا جائزہ لینے پہنچی تو انہوں نے وہاں کچھ اور ہی منظر دیکھا۔'' اسٹیو نے اپنی بات میں سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ میری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس کندھے اچکا کر رہ گئی۔

''انہیں بستر کے نیچے ادھ جلا سوٹ کیس مل گیا۔ جس کے اندر اور باہر اخبار کے کٹے ہوئے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ جنہیں بڑی صفائی سے دس پاؤنڈز کے سائز میں کاٹ کر بنڈلوں کی شکل دے دی گئی تھی۔''

''میں تمہاری بات نہیں سمجھی؟''

اسٹیو نے ماتھے پر ہاتھ مارا اور جھنجلاتے ہوئے بولا۔ ''خدا کی پناہ، تم کتنی کند ذہن ہو، اتنی معمولی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ میری نے ان دونوں کو قتل کرنے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ اس نے سوٹ کیس میں سے رقم نکال کر اس کی جگہ اخبار کے کٹے ہوئے ٹکڑے رکھ دیے۔ اس کا خیال تھا کہ آگ میں یہ سب کچھ جل جائے گا لیکن فائر بریگیڈ والے آگ بجھانے میں جلد ہی کامیاب ہو گئے اور اس طرح سوٹ کیس کے ساتھ ساتھ کچھ کاغذ کے ٹکڑے بھی جلنے سے بچ گئے۔ اینی نے وہ ساری رقم سمیٹی اور اسے کسی محفوظ جگہ پر چھپانے کے بعد پولیس کے سامنے اعتراف جرم کر لیا۔''

میری سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن مقدمے کی سماعت کے دوران اس رقم کا سوال بھی اٹھا ہوگا۔ تمہارے کہنے کے مطابق اس نے ہر ایک کو اس بارے میں بتا دیا تھا۔ اس نے انہیں قتل کرنے اور گھر کو آگ لگانے کا بھی اعتراف کر لیا لیکن اس سوال کا جواب کیا دیا ہوگا کہ یہ رقم اخبار کے ٹکڑوں میں کیسے تبدیل ہو گئی؟''

''اس کا کہنا تھا کہ اس کا شوہر بہت شکی مزاج اور وہمی تھا اسی لیے اس نے رقم کسی اور جگہ چھپا دی ہوگی۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ اس رقم کا بڑا حصہ اس کی بہن پر بھی خرچ کر رہا تھا۔''

''لیکن اس کے شوہر کو اخبار کے کٹے ہوئے ٹکڑے رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ وہ ایسا کیے بغیر بھی اپنی رقم کسی اور جگہ محفوظ کر سکتا تھا؟''

''تم جرح بہت کرتی ہو۔'' اسٹیو نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''جب مجرم اپنے جرم کا اعتراف کر لے تو عدالت ضمنی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیتی۔ تم صرف یہ سوچو کہ اس نے مکان کو آگ کیوں لگائی۔ وہ اس کے بغیر بھی ان دونوں کے قتل کا اعتراف کر سکتی تھی۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی کہ وہ سوٹ کیس جل جائے اور بہ ظاہر یہی معلوم ہو کہ اس میں رکھی ہوئی رقم بھی شعلوں کی نذر ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اعتراف جرم کرنے کے بعد اسے زیادہ سے زیادہ دس سال کی سزا ہوگی اور جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ اس رقم کے سہارے آرام دہ زندگی گزار سکے گی۔''

''دیکھنے میں تو وہ بہت سیدھی اور معصوم لگتی ہے، اس سے اتنی ہوشیاری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔'' میری نے بھولپن سے کہا۔

اسٹیو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میری کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بولا۔ ''اسے عمر قید کی سزا سنائی گئی ہے اور اس کا بہت کم امکان ہے کہ وہ اپنی زندگی میں جیل سے باہر آسکے۔ اس لیے یہ رقم اس کے لیے بے کار ہے۔ البتہ اگر تم چاہو تو ہم اس کے مالک بن سکتے ہیں۔ تم کسی طرح معلوم کر لو کہ اس نے یہ رقم کہاں چھپائی تھی؟''

وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا؟''

''اب وہ تمہاری اسٹوڈنٹ ہے۔ اس پر ظاہر کرو کہ وہ تمہاری سب سے زیادہ چہیتی شاگرد ہے۔ اس کا دل جیتنے اور اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اسے خود سے اتنا قریب کر لو کہ وہ یہ راز تمہارے سامنے بیان کر دے۔''

میری کا سر گھومنے لگا۔ اسے یہ سب انتہائی نامعقول لگ رہا تھا۔ اس نے بے چارگی سے کہا۔ ''اسٹیو! میں اس سے صرف ایک بار ملی ہوں اور نہیں سمجھتی کہ وہ مجھ پر اس حد تک اعتبار کرنے لگے گی۔ ویسے بھی یہ اخلاقی اور پیشہ ورانہ لحاظ سے غلط ہے۔ میں اپنی پوزیشن کو دوسروں کے راز جاننے کے لیے استعمال نہیں کر سکتی۔ یہ غیر اخلاقی عمل ہوگا اور مجھے سزا بھی ہو سکتی ہے۔''

''شاید۔'' اسٹیو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر تم اس سے یہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

میری نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''تم کیا سمجھتے ہو کہ اینی مورگن اتنی ہی بے وقوف ہے۔ جس رقم کی خاطر اس نے اپنے گھر کو آگ لگائی۔ اس کے بارے میں مجھے بتا دے گی کہ کہاں چھپا رکھی ہے۔ پھر ہم وہاں جا کر وہ رقم حاصل کر لیں گے۔ یہ انتہائی مہمل سی بات ہے۔ وہ نوٹ پچیس سال پرانے ہیں اور اب تبدیل ہو چکے ہیں۔ اگر وہ رقم ہمیں مل گئی تب بھی کسی کام کی نہیں ہوگی۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم اسے خرچ کر سکیں گے؟''

اسٹیو نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے کہ ہم وہ رقم خرچ نہیں کر سکتے لیکن یہی کہانی اگر کسی اخبار کو بیچ دی جائے تو ہزاروں پاؤنڈز مل سکتے ہیں۔ جب ہم اس رقم کی تلاش میں اس جگہ کی کھدائی کریں گے تو اس منظر کو ٹی وی کیمرے شوٹ کر رہے ہوں گے۔ کوئی فلم ساز اس پر فلم بھی بنا سکتا ہے۔ بس تمہیں تھوڑی سی ہمت کرنے کی ضرورت ہے پھر ہمیں لکھ پتی بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

☆☆☆

گو کہ میری کو اس پلان سے اتفاق نہیں تھا لیکن اگلی بدھ کی دوپہر وہ اس حوالے سے خاصی مضطرب اور متجسس تھی۔ اینی مورگن حسب معمول سب سے الگ تھلگ کونے کی میز پر بیٹھی وہی تصویر بنا رہی تھی۔

''جب سے جیل میں آئی ہے، یہی کر رہی ہے۔'' وارڈن نے اسے مطلع کیا۔ ''پہلے تصویر بناتی ہے پھر سفید رنگ پھیر کر اسے مٹا دیتی ہے اور اس کی جگہ دوبارہ تصویر بنانا شروع کر دیتی ہے۔ جہاں تک میرے علم میں ہے اس نے آج تک دوسرا کینوس استعمال نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ نفسیاتی اسپتال میں اسے یہی ایک کینوس دیا گیا تھا اور اب وہ اس کی عادی ہو چکی ہے، اس لیے اسی کینوس کو بار بار استعمال کرتی رہتی ہے۔''

کچھ ہفتے گزرنے کے بعد میری اور اینی کے درمیان فاصلے کم ہونے لگے۔ میری نے محسوس کیا کہ اینی کسی حد تک اسے برداشت کرنے لگی ہے تاہم اب بھی اس نے ایک حد تک اس تعلق پر کنٹرول کر رکھا تھا۔ وارڈن نے بھی اس رویے کو محسوس کیا اور ایک دن اینی سے کہنے لگی۔ ''لگتا ہے کہ وہ تم پر تھوڑا بہت بھروسا کرنے لگی ہے۔ ہم میں سے شاید ہی

کوئی اس کے اتنا قریب ہوسکا ہو، ورنہ وہ تو کسی کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتی۔ میری نظر میں تو یہ تمہارے لیے ایک تحفہ ہے مس کولنز!"

یہ الفاظ سننے کے بعد میری اپنے آپ کو زیادہ بااختیار سمجھنے لگی اور اسے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ اب وہ اس عورت سے چھ فٹ کے فاصلے سے بات کرسکتی تھی۔ ورنہ اس کے جرم کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے سبھی اس سے خوف زدہ تھے اور دور رہنے میں ہی عافیت سمجھتے تھے لیکن ابھی تک اس کے بارے میں بہت سی باتیں واضح نہیں تھیں۔ مثلاً یہ کہ وہ کسی شور شرابے کو خاطر میں لائے بغیر پینٹنگ کرتی رہتی اور کئی سالوں سے ایک ہی کینوس استعمال کر رہی تھی جس پر بار بار سفید رنگ پھیرنے سے ایک انچ موٹی تہ جم چکی تھی۔ وہ ایک تصویر بناتی اور جب اسے اس کے مکمل ہوجانے کا یقین ہوجاتا تو اس پر سفید رنگ پھیرنے کے بعد دوبارہ تصویر بنانا شروع کردیتی۔ میری نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یہ راز جان کر رہے گی۔

اس پینٹنگ کے بارے میں اسٹیو کا اپنا ایک نظریہ تھا۔ اس کے خیال میں اپنی مورگن کسی وہم کے زیرِ اثر تھی اور اسے یقین تھا کہ اس تصویر میں ہی ان کی خوش قسمتی چھپی ہوئی ہے۔

"ذرا سوچو۔" اس نے میری کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "ایک ہی کینوس پر بار بار تصویر بنانے کا کیا مقصد ہوسکتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی ایک طرح کا اعتراف لگتا ہے۔ شاید اس تصویر سے ہی یہ اشارہ مل سکے کہ وہ رقم کہاں چھپائی گئی ہے؟"

میری اس کے اندازے اور مفروضے سن سن کر تنگ آچکی تھی۔ اس لیے جل کر بولی۔ "شاید وہ اس طرح لطف اندوز ہوتی ہوگی۔"

"لیکن ایک ہی کینوس پر بار بار پینٹ کرنا کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم وہ تصویر کسی بہانے سے گھر لے آؤ۔"

"کیا؟" وہ چونکتے ہوئے بولی۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟"

"تم کوئی بھی بہانہ کرسکتی ہو۔ مثلاً یہ کہ کسی کورس یا نمائش کے لیے تمہیں اس تصویر کی ضرورت ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس سے ہمیں کوئی نہ کوئی اشارہ ضرور مل سکتا ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میری نے قطعی لہجے میں کہا۔ "وہ ہر وقت اس کینوس کو اپنے ساتھ رکھتی ہے یہاں تک کہ کلاس ختم ہوجانے کے بعد کوٹھری میں بھی ساتھ ہی لے جاتی ہے۔"

"اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تصویر میں کوئی راز چھپا ہوا ہے۔ میری، اچھی لڑکیوں کی طرح یہ پینٹنگ حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ہم اسے اخبارات کو بیچ دیں گے۔ ان کے پاس ایسے انفرا ریڈ کیمرے ہیں جو رنگوں کی تہ کے نیچے چھپے ہوئے نقوش کی تصویر بھی لے سکتے ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا۔ ہماری قسمت بدل جائے گی۔"

"نہیں۔ یہ اس کی ذاتی ملکیت ہے۔" میری نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اور ہمارے لیے بہتر زندگی گزارنے کا ٹکٹ۔ تمہیں بس اتنا یاد رکھنا چاہیے۔"

☆☆☆

گیارہ ہفتے بعد برف پگھلنے کے آثار نظر آنے لگے جب ایک خوش گوار بدھ کی سہ پہر اپنی مورگن نے پہلی بار اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم اس کام سے لطف اندوز ہوتی ہو مس کولنز؟"

میری کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس عورت نے نہ صرف اسے مخاطب کیا تھا بلکہ اس کی آواز میں بھی نرمی اور شائستگی تھی۔

"ہاں۔" اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔

"خود بھی تصویریں بناتی ہو؟"

"ہاں۔ جب بھی وقت مل جائے۔"

یہ جملہ سن کر اپنی مورگن مسکرا دی اور بولی۔ "میرے پاس بہت وقت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بڑی احتیاط سے اپنے رنگ، برش اور دوسری چیزیں اکٹھی کیں، کینوس اٹھایا اور کوٹھری کی جانب چل دی۔

چند ہفتوں کے اندر میری اور اپنی کی دوستی میں کچھ اور اضافہ ہوگیا جس پر دوسری قیدی عورتوں اور جیل کے اسٹاف کو بھی حیرت ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ میری کلاس ختم ہونے کے بعد اپنی کی کوٹھری میں بھی جانے لگی۔ وہ میری سے اس کے بچپن، گھریلو زندگی اور اسٹیو کے ساتھ تعلقات کے بارے میں سوالات کرتی رہتی، گو کہ اس دوران کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوتا اور وہاں ایک پہرے دار بھی موجود ہوتا تھا۔ اس کے باوجود میری کو کبھی کبھی اس سے خوف محسوس ہونے لگتا۔ اسے حیرت تھی کہ جیل انتظامیہ نے اسے اپنی کی کوٹھری میں جانے اور اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے کی اجازت کیوں دے دی۔

اس کی وجہ بھی بہت جلد معلوم ہوگئی جب ایک دن جیل کے گورنر نے اسے بتایا۔ "اپنی کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ نہ کوئی دوست اور نہ کوئی رشتے دار۔ کوئی اس سے ملنے نہیں آتا۔

ویسے بھی اس سال کے آخر میں وہ پیرول پر رہا ہو جائے گی البتہ ہمیں اس کی صحت کے بارے میں فکر رہتی ہے۔"

"اوہ!" میری چونک پڑی۔ یہ انکشاف اس کے لیے بھی نیا تھا۔

"گزشتہ برس اسے دو مرتبہ دل کا دورہ پڑا۔ اسے وزن کم کرنے کا مشورہ دیا گیا لیکن اس نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اسے اپنی صحت کی بالکل پروا نہیں ہے۔ ویسے تو تمہارا اس کی کوٹھری میں جانا عجیب سا لگتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اپنی کو ہفتے میں ایک بار اپنی کسی دوست کے ساتھ چائے پینے کا حق ہے۔ تم کیا کہتی ہو؟"

میری کو یہ جان کر بہت صدمہ ہوا کہ اپنی دل کی مریضہ ہے البتہ وہ اپنے دل میں اس کے لیے ہمدردی محسوس کرنے لگی۔

کچھ ہی دن بعد اسٹیو سے اس کا زبردست جھگڑا ہو گیا۔ وہ جو کچھ چاہ رہا تھا میری اس کے لیے تیار نہ تھی۔ اس نے اسٹیو کو اپنی کی صحت کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی جس سے اسے تکلیف پہنچے۔ اس پر اسٹیو ناراض ہو گیا اور گھر چھوڑنے کی دھمکی دے دی۔ میری پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ اس نے سکون محسوس کیا کہ یہ ناکارہ شخص اس کی زندگی سے چلا جائے گا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جانے کے بعد بھی وہ بار بار اسے ڈسٹرب کرتا رہے گا۔

دوسری بار جب وہ اپنی سے ملی تو اس نے اسے اسٹیو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا کہ اس نے کس طرح اس کے جرم کی چھان بین کی اور اب وہ یہ جاننا چاہ رہا ہے کہ اپنی نے وہ رقم کہاں چھپا رکھی ہے۔ اس نے غصے میں آ کر اپنی کو یہ بھی بتا دیا کہ اسٹیو یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کا کینوس چرا لیا جائے۔

اپنی نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ "کیا واقعی وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں نے وہ رقم کہیں چھپا رکھی ہے؟"

میری نے سر ہلایا اور بولی۔ "ہاں! وہ بہت لالچی شخص ہے اور اس کی نظر ہمیشہ دوسروں کی جیب پر رہتی ہے۔"

دونوں کچھ دیر خاموش رہیں۔ میری کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اگلا سوال کیا کرے۔ اپنی اس کی جھجک کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔ "تم کچھ پوچھنا چاہو گی مس کولنز!"

میری ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "انہیں قتل کر دینے کے بعد تم واپس کیوں آ گئی تھیں؟"

اپنی مسکرائی جیسے پرانی باتوں کو یکجا کر رہی ہو پھر بولی۔ "اس کانسٹیبل سے ملنے جو وہاں موجود ہوتا تھا کیونکہ مجھے کسی نہ کسی کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف تو کرنا ہی تھا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک نظر اپنے کینوس پر ڈالی اور میری سے بولی۔ "مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ اگر تمہیں موقع ملا تو تم دوبارہ پینٹنگ شروع کر دو گی۔"

میری کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس بات کا اس کے سوال سے کیا تعلق ہے لیکن اپنی کا دل رکھنے کی خاطر بولی۔ "میں خود بھی یہی چاہتی ہوں لیکن..."

اپنی نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور بولی۔ "لیکن ویکن کچھ نہیں مس کولنز۔ میں نے اپنی ساری زندگی اسی لیکن کے سہارے گزاری ہے اور ہمیشہ اس کی قیمت ادا کرتی رہی ہوں۔ اسی لیے میں تمہارے منہ سے وہ جملہ سننا چاہتی ہوں جس میں لیکن نہ آئے۔"

میری نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اگر مجھے موقع ملا تو میں پینٹنگ کے علاوہ کوئی کام نہ کرتی۔"

بوڑھی عورت نے سر ہلایا اور اچانک ہی اس کی آنکھیں تھکی تھکی اور بوجھل نظر آنے لگیں لیکن ان میں ایک ایسی چمک تھی جو میری نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

تین دن بعد اپنی مورگن کا انتقال ہو گیا۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔ شاید زندگی کا بوجھ اٹھانا اس کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ اس کے بستر کے سرہانے سائڈ ٹیبل پر وہ کینوس اور ایک بند لفافہ رکھا تھا جس پر مس کولنز تحریر تھا۔ اپنی کی تدفین کے بعد یہ دونوں چیزیں جیل کے گورنر نے میری کے حوالے کر دیں۔

"یہ کینوس اس کی جانب سے تمہارے لیے ایک تحفہ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم اس کا کیا کرو گی لیکن اس کی نظر میں تم ہی اس کی حق دار تھیں۔" گورنر نے دونوں چیزیں اسے دیتے ہوئے کہا۔

میری نے وہ قیمتی کینوس اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک نظر اس پر ڈالی۔ وہ ایک نامکمل تصویر تھی جس میں سورج کی روشنی کو پھیلتے دکھایا گیا تھا اور اس کے نیچے لکھا تھا۔ "تحفہ میری کے لیے، اپنی کی جانب سے۔"

گھر آنے کے بعد میری نے وہ کینوس احتیاط سے مینٹل پیس پر رکھ دیا اور لفافہ کھول کر اس میں رکھا ہوا خط پڑھنے لگی۔

"ڈیئر مس کولنز!

اس خط کے ساتھ تمہیں وہ تصویر بھی مل جائے گی جو کہ تمہارے سابق بوائے فرینڈ کو بڑی آرزو تھی اور تمہارے سوالوں کا جواب بھی مل جائے گا جو وہ جاننا چاہتا تھا کہ میں

اعتراف کرنا عجیب سا لگتا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ اس نے بہت کچھ ٹھیک ٹھیک معلوم کر لیا تھا۔ شوہر اور بہن کو قتل کرنے کے بعد میں نے بستر کے نیچے رکھے ہوئے سوٹ کیس سے وہ رقم نکالی اور آگ لگانے سے پہلے اس کی جگہ اخبار کے کٹے ہوئے ٹکڑے رکھ دیے۔ اس کے بعد میں واپس حویلی کی جانب چلی گئی، تمہارے بوائے فرینڈ کا خیال تھا کہ میرے وہاں جانے کا مقصد اس رقم کو کسی جگہ چھپانا یا دفن کرنا تھا جبکہ میں یہ رقم اس حویلی کی مالکن کو دینے گئی تھی جسے اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ شاید کوئی بھی اس پر یقین نہ کرے کہ اتنی عالیشان حویلی کی مالکن کو بھی پیسوں کی ضرورت ہو سکتی ہے لیکن بڑے گھر میں رہنے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے مکینوں کے پاس بہت ساری دولت ہو یا ان کا کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی ہو۔ اس عورت کو حویلی سے جذباتی لگاؤ تھا۔ اس لیے وہ اسے بیچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن اپنی گزر اوقات کے لیے نادر و نایاب اشیا اور پرانی تصویریں بیچنے پر مجبور تھی۔ میں نے خوشی خوشی وہ رقم اس کے حوالے کی اور بتا دیا کہ مجھ سے کیا جرم سرزد ہوا ہے گو کہ اسے یہ جان کر صدمہ ہوا لیکن اس نے ہچکچاتے ہوئے وہ پیسے لے لیے۔ مجبوری انسان سے سب کچھ کروا دیتی ہے۔ یہ بات صرف ہم دونوں کے درمیان تھی اور میں سمجھ رہی تھی کہ آگ کے شعلے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ فائر بریگیڈ کی بروقت کارروائی سے اخبار کے کچھ ٹکڑے جلنے سے رہ جائیں گے۔

مقدمہ شروع ہونے سے پہلے جب میں ریمانڈ پر تھی۔ وہ شفیق اور مہربان عورت مجھ سے ملنے آئی اور اس نے مجھے یہ چھوٹا سا سفید بغیر فریم کا کینوس دیا جسے میں نے فوراً ہی پہچان لیا۔ یہ کینوس حویلی کے مرکزی ہال میں لگا ہوا تھا اور اس پر کسی کی نظر نہیں جاتی تھی لیکن یہ مجھے اس وقت سے ہی پسند تھا جب سے میں نے وہاں کام شروع کیا تھا۔ اس نے وہ کینوس وہاں سے اتار کر فریم سے علیحدہ کیا اور اس پر سفید رنگ کر کے مجھے تحفے کے طور پر دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے کچھ رنگ اور برش بھی دیے۔ جیل حکام کی نظر میں یہ ایک بے ضرر چیز تھی۔ اس لیے انہوں نے اسے ساتھ رکھنے کی اجازت دے دی۔ اسی روز سے میں نے اس پر تصویریں بنانا شروع کر دیں اور جب ایک تصویر مکمل ہو جاتی تو اس پر سفید رنگ پھیر کر دوسری تصویر شروع کر دیتی اور اب یہ آخری عجیب الخلقت تصویر تمہارے لیے چھوڑے جا رہی ہوں۔

شاید اس مہربان عورت کا خیال ہوگا کہ عدالت میرے اعتراف جرم کو دیکھتے ہوئے کم سزا تجویز کرے گی اور اس طرح میں مستقبل میں پینٹنگ جاری رکھ سکوں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھے دو مرتبہ عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ اس عورت کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو چکا ہے لیکن میں نے ہمیشہ اس کے دیے ہوئے قیمتی تحفے کو سینے سے لگا کر رکھا اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔

اب یہ کینوس تمہارا ہے۔ میرا وقت پورا ہو چکا۔ ممکن ہے کچھ لوگ اسے بزدلانہ فعل قرار دیں۔ شاید ان کا خیال درست ہو لیکن ہر شخص کے دل میں کوئی نہ کوئی خواہش ہوتی ہے۔ اسی طرح میں بھی اپنی زندگی کا خاتمہ چاہتی ہوں اس لیے اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانا میرا حق ہے۔ اسی طرح تمہاری بھی کوئی نہ کوئی خواہش ہو گی۔ تم چاہو تو اس کینوس کو اپنی پینٹنگ کے لیے استعمال کر سکتی ہو لیکن اپنے ایکس بوائے فرینڈ کے مشورے پر عمل کرنا بے سود ہو گا۔ اگر تم نے یہ کہانی اور تصویر اخبارات کو فروخت کر دی تو اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ کیونکہ وہ رقم کئی سال پہلے خرچ ہو چکی ہے۔

تم ضرور اس پولیس والے کے بارے میں جاننا چاہو گی جو اس حویلی میں موجود رہتا تھا اور میں کیوں اس سے ملنے کی خواہش مند تھی۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ ایک کانسٹیبل تھا۔ جان کانسٹیبل، جس کی تصویر حویلی کے مرکزی ہال میں لگی ہوئی تھی اور یہ وہی کینوس ہے جو میں نے تمہیں تحفے میں دیا ہے۔ اس کی تصویر روز اول سے ہی میرے دل پر نقش ہو گئی تھی اور میں اسی لیے رنگوں اور برش سے کھیلتی رہتی تھی کہ شاید کبھی نہ کبھی اس کی تصویر کو کینوس پر منتقل کر سکوں۔ میں اس پولیس والے سے محبت کرنے لگی تھی۔ اسی لیے اس کی تصویر کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کرنا ضروری سمجھا۔

کتنی عجیب بات ہے کہ جب ہم کسی تہ کو کھرچنا شروع کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نیچے کیا چھپا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہلکا سا تارپین کا تیل لگانے کے بعد تم اس کینوس کو دوبارہ استعمال کے قابل بنا سکتی ہو۔ گڈ لک میری۔

تمہاری اپنی مورگن"

میری نے وہ خط لفافے میں رکھا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مینٹل پیس تک گئی۔ اس نے وہ کینوس اپنے ہاتھ میں لیا اور غور سے اسے دیکھنے لگی۔ نہ جانے وہ اس کی تہ میں چھپی کس تصویر کو تلاش کر رہی تھی۔ پھر اس نے اس نایاب تحفے کو سینے سے لگا لیا۔ اپنے سے کبھی جدا نہ کرنے کے لیے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوب صورت وگل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

آخری قسط

اناڑی

قسمت کے پھیر میں الجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اسے دیارِ غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اسے پردیس راس آگیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد ... وہ لوٹا... تو ہنگامے اور شرارتیں اس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اس اناڑی کی طویل کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔ مگر بالآخر اس کی بکھرتی زندگی سمٹتی چلی گئی اور آخر میں اس کے مدمقابل کوئی نہ ٹھہر سکا۔

دورِ حاضر کے فتنوں اور حالات کی عکاس اس داستان رنگ برنگ کا اختتام
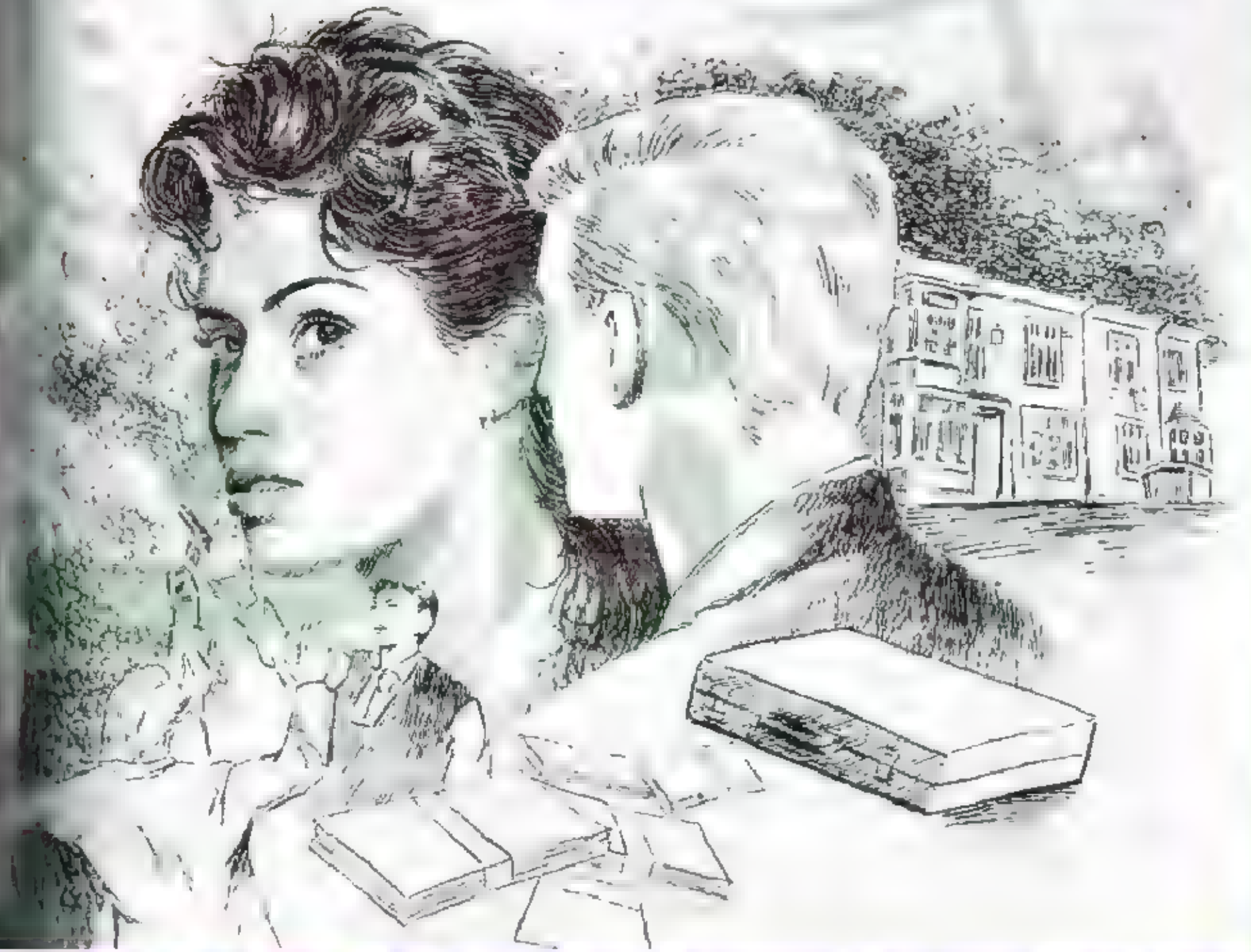
گزشتہ اقساط کا خلاصہ

گردوپیش کا احوال۔ منظر کشی کا کمال۔ ایک داستان لازوال، آج کے زندہ کرداروں کی حقیقی کہانی جسے احمد اقبال کی زمانہ شناس نگاہ اور سحر آفریں انداز تحریر نے تخلیق کیا۔

نئے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں انگریز فوج کو شاہ افغانستان کے لشکر نے ایک عبرت ناک شکست دی۔ بچ جانے والا واحد شخص ایک ڈاکٹر تھا جسے زخمی حالت میں میرے پردادا کے پردادا نے اپنی بیل گاڑی میں ڈال کر بہ حفاظت رہتاس کے قلعے میں انگریزی چھاؤنی تک پہنچادیا۔ انعام کے طور پر انگریز حاکم نے اجازت دی کہ وہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک جتنی زمین کا چکر اپنی بیل گاڑی دوڑا کے لگائیں گے وہ ان کے نام کردی جائے گی۔ یوں ست بدھائی کی ریاست وجود میں آئی۔ میرے آباو اجداد نواب کہلائے۔ ریاست کے چوتھے حکمران کو ایک فقیر کی بددعا لگی اور اس کے چھ جوان بیٹے باری باری مختلف حادثات کا شکار ہوکے مرگئے۔ آخری بیٹے کو باپ نے جان بچانے کے لیے سات سمندر پار لندن بھیج دیا لیکن کسی خرابی کے باعث جہاز بحرالکاہل میں گر گیا۔ باپ نے عالم دیوانگی میں اپنی تین بیویوں کو مارا اور پھر خودکشی کرلی ..... حویلی نصف صدی سے زیادہ عرصہ غیر آباد پڑی رہی۔ میرے والد لاہور کے ایک کالج سے ریٹائر ہوئے ..... میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں میرا تعلق ایک سیاسی تنظیم کے دہشت گردوں سے ہوگیا۔ میری زندگی بچانے کے لیے والد صاحب نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے بہانے امریکا بھیج دیا۔ ہارورڈ سے ایم بی اے کرنے کے بعد مجھے لندن میں لارڈ ارنسٹ کی بزنس فرم میں اعلیٰ عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا لیکن فرم کے مالک کی اکلوتی بیٹی ایلیشا مجھ پر فریفتہ ہوگئی اور اپنا نام تک بدل کر عائشہ بن گئی ..... مگر میں نے اسے ٹھکرادیا کیونکہ میں فریال کو چاہتا تھا۔ فریال پہلے ماڈل اور ایکٹریس تھی اور اپنی بے وقوفی کے باعث ایک عیاش اور شخص اور قلمساز چودھری سلطان سے منگنی بھی کر بیٹھی تھی ..... میں نے اور فریال نے چھ سال تک اس کی عداوت کا مقابلہ کیا۔ اچانک لندن میں مجھے ایک وکیل کے ذریعے اپنے کسی رشتے کے پردادا نے طلب کیا۔ وہ عمر کے آخری حصے میں تھے اور دماغ کے سوا ان کا سارا جسم مفلوج تھا ..... ان کی معلومات کے مطابق میں ان کا رشتے دار تھا۔ چنانچہ اپنی وصیت کی رو سے انہوں نے مجھے ست بدھائی کا وارث بنادیا۔ یہ وہی ساتویں بیٹے تھے جن کا جہاز لندن جاتے ہوئے سمندر میں گر گیا تھا ..... وہ بچ جانے والے واحد مسافر تھے جو بے ہوشی میں کسی تختے پر تیرتے ہوئے برطانیہ کے ساحل تک پہنچ گئے تھے۔ کسی سراغرساں ادارے کی مدد سے انہیں لندن میں میری موجودگی کا علم ہوا۔ لہٰذا وہ مجھے اپنا وارث مقرر کرکے مرگئے۔

اب مجھے لوٹ کے پاکستان جانا پڑا۔ ست بدھائی کی عالی شان مگر منحوس سمجھی جانے والی حویلی اور جاگیر ساٹھ ستر سال سے غیر آباد پڑی تھی۔ ریاست جی ٹی روڈ پر لاہور اور جہلم کے درمیان دینہ جانے والی سڑک پر رہتاس کے تاریخی قلعے کے کھنڈر سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی ..... حویلی کے تہ خانوں، بند تجوریوں اور مقفل الماریوں سے مجھے قیمتی ہیرے جواہرات، سونے چاندی کے زیور، برتن اور بیش بہا نوادرات کا، جن میں گاڑیاں بھی شامل تھیں، اتنا بڑا خزانہ ملا جس کی مالیت کروڑوں سے بڑھ کر اربوں تک پہنچ چکی تھی۔

اپنے چند دوستوں کی مکمل حمایت سے میں نے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے ایک پروگرام بنایا جس میں اسکول اور اسپتال قائم کرنے کے علاوہ جنگلات کا فروغ، فرنیچر بنانے اور ایکسپورٹ کرنا اور دریائے کیہان سے پن بجلی پیدا کرنے کا منصوبہ شامل تھا۔ مجھے دوستوں سے مدد اور لوگوں سے پذیرائی ملی لیکن علاقے کا چودھری چٹھی جاگیردار میرا دشمن ہوگیا۔ میری انسان دوستی اور غربا پروری کی شہرت پھیلی تو رانا کو اپنی صوبائی اسمبلی کی سیٹ خطرے میں نظر آنے لگی جسے وہ اپنا موروثی حق سمجھتا تھا۔ ابتدا میں شہر چھوڑ کر میرے ساتھ آنے والوں میں میرا ناسور صحافی دوست راجا اور اس کی منگیتر ڈاکٹر شہناز کے علاوہ میری چچازاد بہن رابعہ اور میرے والدین شامل تھے۔ پھر علاقے کا نامی گرامی ڈاکو میرا احسان مند اور دوست بن گیا۔ شاہی بادشاہ نے میرے کہنے سے فیصلہ کیا کہ معافی ملنے کے بعد ست بدھائی میں باعزت زندگی گزارے گا لیکن اس خفیہ پروگرام کی خبر دشمنوں کو مل گئی اور انہوں نے پولیس مقابلے کا ڈراما رچا کے سب کو راستے میں مار ڈالا ..... ڈمی شاہی بادشاہ کو اس کی بیوی گولی نکال کر لے گئی۔ شرعی قانون وراثت کے مطابق مجھ سے پہلے ریاست کے وارث میرے والد اور چچا ہی ہوتے لیکن مجھے وصیت کی رو سے مالک و مختار بنانے والا برطانوی شہری تھا اور خود میں نے برطانیہ میں قیام اور ملازمت کے دوران برطانوی شہریت حاصل کرلی تھی چنانچہ اس فیصلے کو پاکستان کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چچا اور چچی کی خواہش کے مطابق اگر میں ان کی اکلوتی بیٹی رابعہ سے شادی کرلیتا تو حق تلفی کا ازالہ ہوسکتا تھا لیکن میں فریال کے سوا کسی کو قبول نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے رابعہ کو بہن کا درجہ دیا اور وہ ست بدھائی میں میرے ساتھ رہی۔ اس نے محبت کی شادی میں دوبارہ دھوکا کھایا۔ بدقسمتی سے دھوکا دینے والے میرے دوست تھے۔ رفتہ رفتہ رابعہ بھی مجھے حق تلفی اور اپنے والدین کی موت کا ذمے دار سمجھنے لگی۔

حویلی میں آنے کے بعد میں نے ایک پرانے محافظ کی بیوی نورجہاں کو دیکھا جو درحقیقت اس کی داشتہ تھی۔ بردہ فروشی سے منشیات فروشی تک ہر کاروبار میں نورجہاں کو استعمال کرتا تھا۔ میں نے دنیا دیکھی تھی لیکن نورجہاں جیسی حسین عورت نہیں دیکھی ..... اس نے مجھ سے مراسم استوار کرنے میں جائز و ناجائز کو نہیں دیکھا۔ فریال سے محبت اور شادی کے عہد و پیمان کے باوجود میں نورجہاں کے جال میں بری طرح پھنس گیا۔ اس نے میرے لیے اپنے نام نہاد شوہر کو بھی قتل کردیا اور میں نے اسے قانون کی گرفت سے بچانے کے لیے دن رات ایک کردیے۔ فریال میرے ساتھ لندن، پیرس اور نیویارک جیسے شہروں کی چکاچوند والی زندگی کے خواب دیکھتی تھی۔ نورجہاں کے معاملے نے اسے جواز فراہم کردیا اور وہ لوٹ کر شوبزنس میں چلی گئی جہاں چودھری سلطان کے ذریعے اسے زبردست کامیابی ملی۔ موقع ملتے ہی اس نے چودھری سلطان کو قتل کرادیا اور اپنے اعلیٰ سطحی مراسم کے باعث قانون کی گرفت میں آنے سے بھی محفوظ رہی۔ نورجہاں نام نہاد شوہر کے قتل کے الزام سے بچنے کے لیے طویل عرصہ روپوش رہی۔ پھر ماہ نور بن گئی۔ ایک نئے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کا حصول مشکل نہ تھا۔ میں اسے لندن لے گیا تاکہ وہ اپنی نئی شخصیت کے ساتھ ست بدھائی واپس آجائے۔ میں اسے لارڈ ارنسٹ کی مدد سے برطانوی شہریت بھی دلوانا چاہتا تھا۔ دو سال بعد لندن پہنچ کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ عائشہ دوبارہ ایلیشا بن چکی ہے اور ڈپریشن کے باعث نشہ کرتی ہے۔ اس کی ماں مرچکی تھی اور باپ سیاسی اور کاروباری معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ عائشہ کا عشق مجھے دیکھتے ہی پھر ایک جنون کی شکل میں لوٹ آیا۔ اس نے نور کو اغوا کرکے مجھے مجبور کیا کہ میں اس سے شادی کرلوں۔ نور کی جان بچانے کے لیے

مجھے یہ ڈراما بھی کرنا پڑا۔ چند دن بعد اس کے عیاش باپ کو دل کا دورہ پڑا اس کی وارث صرف عائشہ تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ عائشہ اس کی بزنس ایمپائر کو چلا نہیں سکتی۔ اس نے مرنے سے پہلے اپنی ایک سو بیس ملین پاؤنڈز کی جائداد اور وسیع کاروبار کا مالک مجھے بنادیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھ سے شادی کے بعد عائشہ بھی ٹھیک ہوجائے گی۔ میرے انکار اور ماں باپ کی موت نے عائشہ کے احساس جرم کو شدید تر کردیا اور وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ترک دنیا کرکے چرچ میں نن ہوگئی۔ قدرت کی طرف سے خوش نصیبی کی یہ دوسری لاٹری میرے لیے ایک آزمائش بن گئی۔ نور یہاں اکیلی رہنے پر راضی نہ تھی اور نہ میں یہاں رہتا یا واپس جاتا۔ پھر کچھ اور غیر معمولی واقعات پیش آئے۔ اچانک مجھے وہ شخص مل گیا جو چیف کہلاتا تھا۔ اس نے دس سال پہلے لاہور میں مجھے اپنی سیاسی تنظیم میں دہشت گردی کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب وہ لندن میں جلاوطنی اور روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میں اسے اپنا سیاسی مشیر بنالوں تو آئندہ انتخابات میں اپنے حریف رانا کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی میں پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے بظاہر اس کی پیشکش قبول کرلی۔ ست بدھائی کے اسپتال کو وسعت دینے میں میرے ساتھ ایک ڈاکٹر باپ بیٹا شامل تھے۔ اس فیملی کی تیسری رکن مینا بھی ڈاکٹر تھی لیکن محبت میں ناکامی اور پھر شوہر کے قتل نے اسے نفسیاتی مریض بنادیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے مجھے اپنا سابق محبوب وحید مان لیا اور کسی حد تک نارمل بھی ہوگئی۔ وحید ایک لاابالی مصور تھا جو لندن میں عریاں تصاویر بنا کے اپنا فن اونے پونے بیچ رہا تھا اور استحصال کا شکار تھا ..... مینا سے اپنی جان چھڑانے کے لیے وحید کو پاکستان لے جانا ضروری تھا۔ وہ ہوبہو میری کاربن کاپی تھا۔ میں نے اس کے تمام قرضے بے باق کیے اور اسے اپنے ہمراہ پاکستان لے جانے پر آمادہ کرلیا۔ چیف نے مجھے ٹپ دی کہ میں وحید کو اپنے ڈپلی کیٹ کے طور پر بھی استعمال کرسکتا ہوں۔ چیف کا اصل نام غلام علی تھا۔

اگرچہ میں یہ کرسکتا تھا کہ ست بدھائی کو رابعہ کے سپرد کردوں تاکہ اس کا حق تلفی کا احساس ختم ہو اور خود نور کے ساتھ لندن میں رہ کر کاروبار کو مزید پھیلاؤں۔ مگر نور کے سمجھانے سے میں نے لندن اور ست بدھائی دونوں جگہ رہنے کا فیصلہ کیا۔ لارڈ ارنسٹ کے تمام ملازم مجھے ساری خرابی کا ذمے دار سمجھتے تھے۔ وہ سب احتجاجاً ملازمت چھوڑ گئے ..... لارڈ کے سابق شوفر اور باڈی گارڈ نے میری راستوں سے ناواقفیت کے باعث مجھے ایک ویران احاطے میں لے جاکر قتل کرنے کی کوشش کی انہیں ناک آؤٹ کرکے میں نے غلام علی کو طلب کیا اور خود ایلیشا سے ملنے چرچ چلا گیا۔ غلام علی نے احاطے میں کھڑا ٹریکٹر چلا کر ریت کے ڈھیر میں لاشوں کو دبا دیا جو وہاں پہلے سے موجود تھا۔ چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے وہ گرفتار ہوگیا ..... میں نے اپنے بیان میں وہ سب بتادیا جو غلام نے اعتماد میں مجھے بتایا تھا۔ چارلی کے مددگار اپنی جان بچانے کے لیے وعدہ معاف گواہ بن گئے۔ حالات نے پلٹا کھایا اور مجھے اغوا کرلیا گیا۔ مگر سرغنہ کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ جس کا مقصد تھا کہ میں سارے الزامات اپنے سر لے لوں۔ چیف کی شکل دیکھ کر میں چونک گیا۔ اسی دوران چیف کی ایک نفسیاتی کمزوری کی بدولت میں نے یہ جان لیا کہ سرغنہ اصل چیف نہیں بلکہ اس کا ڈپلی کیٹ ہے۔ ادھر لندن پولیس کی مہارت اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے چیف اور اس کے گرگے گرفتار کرلیے گئے۔ میں قید خانے سے نکل کر ایک معمر انگریز جوڑے کی مدد سے اپنے گھر پہنچا۔ پھر میں نور کے ساتھ مل کر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں مصروف ہوگیا۔ میں اور نور تمام امور سے نمٹ کر مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اچانک ایلیشا راہبہ کے ملبوس میں پہنچ گئی۔ اب وہ اپنی جائداد کی واپسی کا مطالبہ کررہی تھی مگر مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ تھا لہٰذا میں نے اس کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کردیا جس پر مشتعل ہوکر اس نے پستول نکال لیا اور دیوانگی کی حالت میں مجھ پر فائر کردیا۔ پولیس اسے لے گئی۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو ایلیشا نے جواباً مجھ پر الزامات کی بوچھار کردی لیکن وہ اب کچھ نہیں کرسکتی تھی لارڈ ارنسٹ کے وکیل نے مجھے جذباتی بلیک میل کرتے ہوئے ایلیشا کی حالت کے پیش نظر اس سے شادی کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے یہ تجویز سختی سے مسترد کردی۔ دوسری جانب نور مجھے قائل کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ میں ست بدھائی رابعہ کے نام کردوں اور لندن میں اس کے ساتھ رہوں میں نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

بہرحال حالات کے پیش نظر میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا نور بڑی مشکل سے تنہا لندن میں رہنے پر راضی ہوئی۔ ایئرپورٹ پر میرا بریف کیس چوری ہوگیا جس کے باعث فلائٹ سے میری روانگی خطرے میں پڑگئی۔ اسی کشمکش میں غیر معمولی مہارت سے مجھے بے ہوش کردیا گیا اور ایمبولینس میں ڈال کر نامعلوم مقام پر منتقل کردیا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے اغوا کار کون ہیں پھر جب رابعہ میرے سامنے آئی تو میں ہکا بکا رہ گیا اور مزید یہ کہ اسی نے میرے حریف زوہیب کے ساتھ مل کر یہ ڈراما رچایا تھا۔ اس کا دیرینہ مطالبہ تھا کہ جاگیر اس کے نام کی جائے۔ مجھے اس پر مجبور کرنے کے دوران ایک بات پر مشتعل ہوکر اس نے ریوالور سے مجھ پر فائر کردیا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ اسی اثنا میں اس کے کارندے داخل ہوئے اور اسے لے کر چلے گئے۔ ایک دن میرے کمرے میں ٹی وی رکھ دیا گیا جس کے ذریعے رابعہ نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنا مطالبہ دہرایا۔ مسلسل قید اور ذہنی اذیت کے باعث میں اتنا بے زار تھا کہ میں نے اس کا مطالبہ منظور کرلیا۔ معاملہ یہ طے پایا کہ میں جاگیر رابعہ کو گفٹ کردوں گا۔ بعدازاں رابعہ نے مجھ سے رابطہ کرکے اپنی محبت کا اظہار کیا اور شادی کی درخواست کی میں نے انکار کیا تو وہ اپنی ناکامی پر دوبارہ مخالفت پر کمربستہ ہوگئی۔ یہاں مجھے یہ اطمینان ضرور ہوگیا تھا کہ اب میری زندگی محفوظ ہے کیونکہ وکیل اور راجا کے درمیان میں آجانے سے جان کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

قید کے دوران ایک دن میری نگرانی پر مامور افراد میں سے ایک کے دل میں آخر دم نیکی کا جذبہ بیدار ہوا اور اس نے قید خانے کی دیوار میں رخنہ ڈال کر مجھے رہائی دلادی۔ میں باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی متروک گیسٹ ہاؤس تھا۔ ویرانے میں مجھے ایک دیہاتی جوڑا نظر آیا جو مجھے ایک سابق فوجی خلیل صاحب کے گھر تک لے گیا جہاں خلیل صاحب اور ان کی اہلیہ نے میری بہت مدد کی اور میں راجا سے رابطہ کرنے اور وہ مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ رابعہ کی پراسرار گمشدگی پریشان کن تھی۔ راجا مجھے ایک اسپتال لے گیا تاکہ میری صحت پر سے منفی اثرات زائل ہوں۔ پھر مجھے ریشم کے ہاں ولادت اور مینا کے ساتھ وحید کی شادی کی خوشخبری ملی۔ اچانک رابعہ نے بھی فون پر مجھ سے بات کرنا چاہی مگر راجا نے اسے جھڑک دیا۔ کچھ وقت گزرا تھا کہ پولیس انسپکٹر نے اطلاع دی کہ کسی عورت کی لاش پاس کے علاقے میں ملی ہے۔ میں نے اسپتال جاکر دیکھا تو لاکٹ اور دیگر نشانیوں سے وہ رابعہ ثابت ہوئی جس کا چہرہ مسخ تھا۔ میں افسردہ واپس آرہا تھا کہ میرے عقب میں آتی گارڈز کی گاڑی دھماکے سے تباہ ہوگئی اور ایک خونی معرکے کے بعد میں حویلی واپس پہنچا تو نور نے فون پر بتایا کہ وہ پاکستان آرہی ہے لہٰذا میں اسے لینے کے لیے روانہ ہوا لیکن راستے میں مولاداد نامی ڈاکو نے مجھے اغوا کرلیا۔ مولاداد کے ڈیرے پر نیلم نامی لڑکی نے مجھے اس کے عزائم سے آگاہ کیا اور میری مدد کی۔ یہاں میں ڈاکوؤں سے نمٹ کر جب ایئرپورٹ پہنچا تو دیکھا نور نہیں آئی بلکہ فون پر مجھے الزام دیا کہ میں نے رابعہ کے بارے میں اس سے

غلط بیانی کی ہے۔ میں نے وضاحت کی تو اس نے فون پر رابعہ کی موجودگی کا انکشاف کیا اور اس کی آواز سن کر میں چکرا کر رہ گیا۔ رابعہ میرے لیے دردِ سر بن چکی تھی جبکہ اس نے نور کو بھی میرے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ لیکن نور نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے رابعہ کی نگرانی کی جس کے ذریعے انکشاف ہوا کہ رابعہ کا حویلی میں کسی سے رابطہ قائم ہے۔ لہٰذا نتیجے میں ایک گارڈ سردار خان مجرم ثابت ہوا اور ایک مختصر لڑائی کے بعد میں نے اس پر قابو پالیا۔ دوسری جانب وحید کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک مقابلے کے بعد اغوا کار بھی قیدی بنا لیے گئے۔ میں نے نور کو گل میں منتقل ہونے اور رابعہ کی نگرانی سخت کرنے کی ہدایت کی اور لندن جانا چاہا لیکن راجا نے مجھے معطل رو کا اور خود لندن جانے کا فیصلہ کیا جبکہ قیدیوں سے حاصل کی گئی معلومات کے مطابق ان ساری کارروائیوں کے پیچھے دلاور کا ہاتھ تھا۔ یہ نام میرے لیے نیا تھا جو اسلحے اور منشیات کا ایک بین الاقوامی اسمگلر تھا۔ وہ الیکشن میں اپنے حق میں میری دستبرداری کا خواہش مند تھا مگر میں نے اسے چیلنج کر دیا۔ رات کی تاریکی میں مجھے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ میں نے اپنے کمرے سے نکل کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ چیخ بینا کی تھی جسے کسی نقاب پوش نے دبوچ رکھا تھا۔ میری مداخلت پر وہ فرار ہو گیا۔ حملہ آور کی حویلی میں موجودگی باعث تشویش تھی۔ اسی دوران ڈاکٹر شہناز کی کزن شہلا جو ڈاکٹر تھی، بھی ہماری ٹیم کا ایک رکن بن گئی۔ سخت تفتیش کے بعد سجاد نامی حملہ آور کو ڈھونڈ نکالا گیا جو دلاور خان کا آدمی تھا۔ بعد ازاں سجاد نے اپنی ایک جھوٹی کہانی سنائی کہ کس طرح وہ دلاور کے شکنجے میں پھنسا مگر اب وہ حقیقت جان کر دلاور کا دشمن بن گیا ہے۔ میں اس کے جھانسے میں آ گیا میں نے یقین کر کے اسے اپنے دوست کی حیثیت سے حویلی میں رکھ لیا جبکہ ڈاکٹر شہناز نے حقیقت محسوس کر لی۔ راجا کا فون آیا اور اس نے اطلاع دی کہ رابعہ فرار ہو گئی ہے۔ ہم نے سجاد کے بارے میں معلومات کے لیے ایک شخص کو روانہ کیا جس کی روانگی کے بعد ایک نامعلوم کال کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ وہ اسپتال میں زخمی حالت میں ہے۔ ہم حیران تھے کہ اتفاقیہ صوبےدار میجر صاحب نے میرے پستول کی صفائی کے دوران ٹرانسمیٹر ٹائپ ایک ڈیوائس دریافت کی اور سجاد.... پر جو شک تھا وہ یقین میں بدل گیا لہٰذا اس سے تہ خانے میں تشدد کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں وہ شدید زخمی ہو گیا اور اسی حالت میں فوت ہو گیا۔ اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ اسے بھیجنے والا زوہیب تھا۔ راجا نے اطلاع دی تھی کہ وہ اور نور پاکستان آ رہے ہیں لہٰذا اسے لینے میں اپنے گارڈ کے ساتھ ائرپورٹ پہنچا جہاں ایک گارڈ نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ اسی دوران ایک فائر ہوا اور میں نے ایک گارڈ کو گرتے دیکھا۔ ایئرپورٹ پر اس صورت حال پر پولیس بروقت پہنچ کر پوچھ تاچھ کا سلسلہ شروع کرتی ہے۔ راجا اور نور ایئرپورٹ سے برآمد ہوتے ہیں۔ نور بڑی فکرمند ہے معاملہ کچہری کا ہے لہٰذا انہیں وہیں رکنا پڑتا ہے۔ اسی دوران راجا کا ایک کرائم رپورٹر دوست اثر و رسوخ کا حامل ہے ان کی مدد کرتا ہے۔ فراغت کے بعد یہ لوگ ست بدھائی پہنچ جاتے ہیں جہاں ڈاکٹر شہلا کو اپنے گھر سے بلاوے پر لاہور سرور کے ذریعے روانہ کیا جاتا ہے لیکن سرور زخمی حالت میں آ کر اطلاع دیتا ہے کہ شہلا کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ یہاں بھی راجا کا دوست ناصر کام آتا ہے اور شہلا کو بازیاب کرا لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد رفیق سکون کا سانس لیتا ہی ہے کہ ایک فون کال اس کا سکون غارت کر دیتی ہے۔ کال رابعہ کی تھی اور اس نے اپنی مظلومیت کا ایسا نقشہ کھینچا کہ کئی بار جھڑک دینے کے بعد بالآخر میں اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا جہاں مجھے قید کر کے ذہنی ٹارچر کیا جاتا ہے لیکن ایک بار پھر غنی کی بروقت مداخلت سے اسے رہائی ملتی ہے اور ساتھ ہی رابعہ کو بھی آزاد کرا لیا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی ایک شخص گجو کو بھی یرغمال بنا کر قید کر دیا جاتا ہے۔ یرغمالی کے منہ سے ایک نیا نام شاکر سامنے آتا ہے جو لاہور کا غنڈا ہے۔ اس حملے کے سلسلے میں بیان لینے پولیس افسر آتا ہے اور شاکر کے متعلق بتاتا ہے لیکن رفیق لاعلمی کا اظہار کرتا ہے۔ حویلی میں ایک پگلی عورت گھس آئی تھی جس سے گارڈز الجھے ہوئے تھے۔ میں نے گارڈز کو ان کی بے پروائی پر سرزنش کی اور پگلی کو روانہ کر دیا۔ راولپنڈی سے ناصر کا فون آیا۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ہم نے اس کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جانے کا فیصلہ کیا جبکہ نیلم نے بھی اپنے والد سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا لہٰذا وہ بھی ساتھ تھی۔ راستے میں نامعلوم افراد نے ہم پر حملہ کیا۔ نیلم نے بھرپور انداز میں مدد کی اور گجرات کی ڈپٹی کمشنر کی مدد کی بدولت میں اسپتال تک پہنچ سکا جہاں سے راجا کو فون پر اطلاع دی اور وہ آ کر ست بدھائی لے گیا۔ اس معرکے کے دوران میرا موبائل وہیں گر گیا تھا۔ اسی دوران خبر ملی کہ فریال کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس کی لاش کے پاس ہی میرا موبائل ملا ہے۔ یہ انتہائی تشویشناک صورت حال تھی لیکن راجا کے تعلقات اور ڈپٹی کمشنر کی مدد سے اس صورت حال پر قابو پا لیا گیا۔ غنی نے پریشانی کے عالم میں مجھے رابعہ کے متعلق خبر دی۔ رابعہ نے ڈراما کر کے بیمار بننے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ پگلی نے ایک بار پھر حویلی میں داخل ہونے کی جرأت کی جس پر اسے حویلی بلا لیا گیا جس نے انکشاف کیا کہ وہ پاگل پن کا ڈھونگ رچا رہی تھی رانا کے ظلم کی وجہ سے۔ لیکن بعد ازاں وہ جھوٹی ثابت ہوئی اور حویلی سے فرار ہو گئی۔ لندن روانگی سے پہلے نور کی شاپنگ کے سلسلے میں لاہور جاتے ہوئے راستے میں ایک ہوٹل میں شاکر سے حادثاتی ملاقات ہوئی اور اس نے اپنے اور دلاور کے درمیان جاری تنازعات کے بارے میں بتایا۔ واپسی میں کچھ لوگوں نے نواب رفیق اور نور کو اغوا کر کے قید کر لیا۔ جہاں رفیق نے مشتعل کر کے ایک ڈاکو کو قابو کر لیا۔ قید خانے سے فرار کے بعد کئی سنسنی خیز واقعات پیش آئے جن کی پشت پر رفیق کے دشمن دیرینہ دلاور کا ہاتھ تھا۔ قید خانے کے بعد دوبارہ ان پر حملہ کیا گیا لیکن انجام کار رفیق محفوظ رہا لیکن حملہ آور نور کو لے جانے میں کامیاب رہے۔ قید خانے میں نواب رفیق کی قابل اعتراض ویڈیوز ڈپٹی سیکریٹری کی بیٹی ثمرہ کے ساتھ اتاری گئی تھیں، لہٰذا رفیق اینڈ کمپنی نے نور کی بازیابی اور مسکین شاہ تک رسائی اور اسے بےنقاب کرنے کے لیے اس کے آلۂ کاروں کو قابو کر کے ان سے معلومات کی حکمت عملی اختیار کی۔ رفیق نے بھی مسکین شاہ کے خاص آدمی آفتاب کو اغوا کر کے اس سے پوچھ گچھ کی بعد ازاں اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے اس کی بیٹی کو بھی اغوا کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ فیصلے پر کامیابی سے عمل درآمد کیا گیا اور آفتاب کی بیٹی ارم کو اغوا کر لیا گیا۔ اس دوران چند اہم واقعات ہوئے۔ شاکر دلاور کے ہاتھوں مارا گیا اور شاہی بادشاہ سے اتفاقیہ ملاقات ہوئی۔ آفتاب کی بیٹی کی رہائی کے سلسلے میں سنگین نتائج کی دھمکیاں دی گئیں۔ جس پر رفیق نے ست بدھائی میں سیکیورٹی سخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی دوران رفیق کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ صوبیدار میجر صاحب نے سیکیورٹی کے بھرپور انتظامات کر رکھے تھے۔ آفتاب کی بیٹی کی رہائی کے سلسلے میں... دلاور اینڈ کمپنی کی جانب سے کئی دھمکی آمیز پیغامات ملنے کے بعد مطلوبہ سی ڈیز بریف کیس کی تلاش میں دلاور خان کے گرگے ارشد کے ٹھکانے پر ایک بھرپور کارروائی کی گئی جس میں بریف کیس برآمد کر لیا گیا۔ اس کامیابی نے مسکین شاہ کے گرد گھیرا مزید تنگ کر دیا۔ اسی دوران آفتاب کی بیٹی کو اس کے باپ کے حوالے کر دیا گیا اور جمال خان شیروانی کو بھی اس کی بیٹی سے متعلقہ سی ڈی واپس کی گئی۔ صورت حال کی اس تبدیلی کے پیش نظر نور کی بازیابی اور مسکین شاہ کی مکمل تباہی کے تمام انتظامات مکمل کر لیے گئے اور ہم ست بدھائی کی جانب روانہ ہوئے لیکن ریاست کی حدود میں داخلے پر سیکیورٹی کے انتظامات ہمارے لیے حیران کن تھے۔

اب آپ آخری قسط ملاحظہ فرمائیے

"مجھے اس وقت بالکل اندازہ نہیں تھا کہ دشمن اس حد تک میری جان کے درپے ہو جائیں گے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ٹھیکے پتر! ابھی جو ٹرالر دھماکے سے اڑا ہے، میری سمجھ میں اب تک وہ واقعہ بھی نہیں آیا ہے۔"

"یار! میں بھی اس وقت سے یہی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں خود بھی ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہوں کہ وہ ٹرالر کیا واقعی خراب ہو گیا تھا یا پھر اسے وہاں جان بوجھ کر کھڑا کیا گیا تھا۔ پھر وہ اچانک دھماکے سے پھٹ بھی گیا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوگا کہ اس میں کتنی گاڑیوں کو نقصان پہنچا، ممکن ہے جانی نقصان بھی ہوا ہو۔"

"یہ ساری رپورٹ ناصر اور احمد شاہ لے آئیں گے۔" راجا نے کہا۔

اس وقت تک ہم حویلی کے صدر دروازے تک پہنچ چکے تھے۔

ہماری گاڑی دیکھتے ہی حویلی کا صدر دروازہ بھی کھل گیا۔ غنی گاڑی وہاں سے سیدھا پورچ میں لے گیا۔

وہاں کھڑے ہوئے ایک گارڈ نے آگے بڑھ کر میرے لیے دروازہ کھولا۔ میں اس پروٹوکول کا عادی نہیں تھا، نہ اسے پسند کرتا تھا، اس لیے مجھے الجھن سی محسوس ہو رہی تھی۔

میں گاڑی سے نیچے اترا تو صوبیدار میجر صاحب نے میرا استقبال کیا۔ "آیئے رفیق میاں!" وہ مسکرا کر بولے۔ "کیسے ہیں آپ؟"

"میں بالکل خیریت سے ہوں، یہاں کیا صورت حال ہے؟"

"سب کچھ کنٹرول میں ہے۔" صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔

"آپ نے تو یہاں کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ حویلی کی طرف سے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میں نے یہی سوچ کر سیکیورٹی کے فول پروف انتظامات کر دیے ہیں۔"

اس وقت تک نیلم گاڑی سے اتر کر حویلی کی طرف جا چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب حویلی کے برآمدے میں پہنچا تو وہاں حویلی کی تقریباً سبھی خواتین موجود تھیں۔

"کیسی ہیں ڈاکٹر صاحبہ؟" میں نے شہناز سے پوچھا۔

"اچھی ہوں نواب صاحب!" شہناز نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

پھر مجھے ڈاکٹر شہلا دکھائی دی۔ اس نے مجھے سلام کیا تو میں اس کے سلام کا جواب دے کر بینا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تم کیسی ہو بینا؟"

"ایک دم فائن!" بینا مسکرا کر بولی۔

میں اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے نیلم سے بولا۔ "ریشم سے کہو، ہمارے لیے ذرا اچھی سی کافی بنائے۔"

"رات بہت ہو گئی ہے ٹھیکے پترا!" راجا نے کہا۔ "ریشم تو اب سو چکی ہوگی۔ مجھے تو شدید بھوک لگی ہے تو کافی کی فرمائش کر رہا ہے۔" پھر وہ نیلم سے بولا۔ "تم کھانے کا انتظام کرو۔"

"جی صاحب!" نیلم نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

"یہ ڈاکٹر شہناز وغیرہ اس وقت تک کیوں جاگ رہی ہیں؟" میں نے اپنا کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی نواب رفیق احمد شیرازی اپنی حویلی میں تشریف لائے ہیں۔" راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "وہ لوگ نواب صاحب کے استقبال کی خاطر جاگ گئی ہوں گی۔"

"اچھا یہ طنز چھوڑ، ناصر کو کال کر کے معلوم کر کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

"یہ کام میں تیرے کہنے سے پہلے ہی کر چکا ہوں۔" راجا نے جواب دیا۔ "ناصر اور احمد شاہ دونوں بس پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"

"یار پھر کچھ صبر کر لے، ہم لوگ ناصر کے ساتھ ہی کھانا کھائیں گے۔"

میں نے گرم پانی سے غسل کیا تو میری ساری تھکن اتر گئی۔ یوں بھی ست بدھائی پہنچ کر مجھے عجیب سے سکون کا احساس ہوا تھا۔

میں باتھ روم سے نکلا تو نیلم کھانا لگا چکی تھی۔ ناصر اور احمد شاہ بھی پہنچ چکے تھے۔

"ناصر!" میں نے کھانے کی میز پر پہنچ کر پوچھا۔ "کچھ معلوم ہوا کہ وہ دھماکا کیسا تھا؟"

"اس ٹرالر میں کسی نے ریموٹ کنٹرول بم فٹ کر

رکھا تھا۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اس بم کا ٹارگٹ کون تھا؟''

''دھماکے سے دیگر گاڑیوں کو نقصان بھی پہنچا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، دھماکے سے دو گاڑیوں کو شدید نقصان پہنچا ہے اور ان میں سوار افراد شدید زخمی ہوگئے ہیں۔ زخمیوں میں سے ایک شخص کی حالت نازک ہے۔''

''یہ ساری اطلاعات تمہیں سڑک پر کھڑے کھڑے مل گئیں؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔ ''اور تمہارے ساتھ وہ دوسرا شخص کون تھا؟''

''وہ میرا ایک صحافی دوست تھا سر!'' ناصر نے جواب دیا۔ ''اس کی گاڑی خراب ہوگئی تھی اس لیے میں نے اسے دینہ تک لفٹ دے دی تھی۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''صحافی ہونے کا بس یہی فائدہ ہے۔ دنیا بھر کی اطلاعات ایک فون کال پر مل جاتی ہیں۔''

''لیکن تم تو خود جائے واردات پر موجود تھے۔'' میں نے کہا۔

''میں اگر کوشش کرتا تو مجھے اس سے زیادہ اطلاعات مل سکتی تھیں۔'' ناصر نے کہا۔ ''اس چکر میں میرے مزید دو گھنٹے ضائع ہوتے۔ یہ کوئی اتنی اہم خبر نہیں ہے، ملک میں تو آئے دن دھماکے اور خودکش حملے ہوتے رہتے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہم کتنے بے حس ہوچکے ہیں۔ اس دھماکے میں خدانخواستہ اگر زیادہ تباہی پھیلتی، زیادہ انسانی جانیں ضائع ہوتیں تو اس خبر کی اہمیت کچھ اور ہی ہوتی۔ اب بھی وہاں مختلف ٹی وی چینلز کی ٹیمیں اور رپورٹرز پہنچ گئے ہوں گے۔ ابھی ساری اطلاعات کسی بھی ٹی وی کے نیوز بلیٹن سے مل جائیں گی۔''

کھانا کھانے کے بعد میں دوبارہ اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے ریموٹ اٹھایا اور ٹیلی وژن آن کردیا۔ ناصر کی اطلاع کے مطابق وہاں تین بڑے ٹی وی چینلز کے رپورٹر اور کیمرا مین وغیرہ موجود تھے اور وہ اس خبر کو لائیو ٹیلی کاسٹ کررہے تھے۔

کیمرا مین بار بار سڑک کا وہ حصہ دکھا رہا تھا جہاں دھماکا ہوا تھا۔ وہاں زمین میں اچھا خاصا گڑھا پڑچکا تھا۔

نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ''پولیس کا کہنا ہے کہ بم حکومت کے ایک وزیر کے خلاف اس ٹرالر میں پلانٹ کیا گیا تھا۔ ٹرالر اگر مضبوط اور دبیز آہنی چادر کا نہ ہوتا تو شاید اس سے کہیں زیادہ تباہی پھیلتی۔ دھماکا ہوتے ہی ٹرالر میں آگ لگ گئی تھی۔''

''کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ دھماکے کے نتیجے میں کتنے افراد زخمی ہوئے ہیں؟'' نیوز کاسٹر نے اپنے نمائندے سے پوچھا۔

''جی ہاں، سرکاری اطلاع کے مطابق سات افراد شدید زخمی ہوئے ہیں۔ زخمیوں میں سے دو افراد کی حالت نازک ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''دھماکا کس نوعیت کا تھا اور پولیس کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟''

''پولیس کے مطابق دھماکا ریموٹ کنٹرول بم سے کیا گیا ہے۔ پولیس نے علاقے کی ناکا بندی کردی ہے لیکن ابھی تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی ہے۔ جی ٹی روڈ پر بدترین ٹریفک جام ہے اور گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ پولیس اہلکار ٹریفک کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

میں نے جھنجلا کر ٹی وی بند کردیا۔ ''پولیس نے علاقے کی ناکا بندی کردی ہے اور دھماکے کے ذمے داروں کو جلد ہی گرفتار کرلیا جائے گا۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''پولیس تو جائے واردات پر پہنچی ہی ایک گھنٹے بعد ہے۔ اس وقت تک کیا دھماکا کرنے والا وہاں بیٹھا پولیس کا انتظار کررہا ہوگا کہ آؤ اور مجھے پکڑ لو۔'' میں نے سوچا۔ جہاں تک سوال ناکا بندی کا تھا تو دھماکا ہونے کے ایک گھنٹے بعد پولیس کی اس ذہانت پر ہنسی آتی تھی۔ جیسے ناصر اور احمد شاہ وہاں سے نکل آئے تھے، اسی طرح وہ شخص بھی وہاں سے غائب ہوگیا ہوگا۔

میں دن بھر کی بھاگ دوڑ سے بہت تھک گیا تھا اس لیے لائٹ آف کرکے سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔

ابھی میں نیم غنودگی میں تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں اس وقت بری طرح جھنجلا گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سیل فون کو اٹھا کر دیوار سے دے ماروں۔ غلطی میری ہی تھی۔ مجھے سیل فون آف کرکے سونا چاہیے تھا۔ پھر میں نے جھنجلا کر سیل فون اٹھالیا۔ اسکرین پر شامی کا نام دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

''ہیلو شامی!'' میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''نواب بھائی! آپ خیریت سے تو ہو؟'' شامی نے

پوچھا۔

''ہاں، میں اور تمام لوگ خیریت سے ست بدھائی پہنچ چکے ہیں۔'' پھر میں ہنس کر بولا۔ ''بھلے آدمی! تم صبح بھی تو فون کرسکتے تھے؟''

''میں اس وقت آپ کو کبھی ڈسٹرب نہ کرتا۔'' شامی نے کہا۔ ''لیکن بات ہی کچھ ایسی تھی کہ مجھے اس وقت فون کرنا پڑا۔ اب آپ کی آواز سن کر جان میں جان آئی ہے۔''

''بات کیا ہے شامی بادشاہ؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم جیسا آدمی بھی ایسی باتیں کررہا ہے؟''

''نواب بھائی! مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے معلوم ہوا ہے کہ دشمنوں کو آپ کی روانگی کی اطلاع مل گئی ہے۔ انہوں نے جی ٹی روڈ پر آپ کے لیے ایک خوفناک جال پھیلایا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ دھماکا......''

''ہاں نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''مجھے اپنے کچھ ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ دشمن آج آپ پر بھرپور انداز میں وار کریں گے۔ میں تو اطلاع دینے والے پر برس پڑا کہ اتنی اہم خبر تم مجھے اب دے رہے ہو؟''

''مجھے قتل کرنے کا ان لوگوں نے پورا سامان کردیا تھا شامی بادشاہ!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''لیکن میرے خلاف منصوبہ بندی کرنے والے شاید کیا بلکہ یقیناً یہ بھلا بیٹھے کہ زندگی اور موت ان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

''نواب بھائی! میں تو بہت پریشان ہوگیا تھا۔'' شامی نے کہا۔ ''پھر ٹی وی پر اس حادثے کی تصدیق بھی ہوگئی تو میں پاگل ہوگیا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ بچ گئے ہو نواب بھائی!''

''واقعی اللہ کا احسان ہے مجھ پر۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن شامی بادشاہ! میرا تو ایمان اس بات پر ہے کہ انسان کی جو رات قبر سے باہر ہوا سے دنیا کی تمام سپر پاور مل کر بھی قبر میں نہیں پہنچا سکتیں۔'' پھر میں چونک کر بولا۔ ''تم ابھی ایک دو دن اس سامان کو لے کر ست بدھائی مت آنا۔''

''میں اتنا کم عقل اور غیر محتاط نہیں ہوں نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''میں اس وقت تک وہ سامان لے کر نہیں نکلوں گا، جب تک مجھے راستہ صاف ہونے کا یقین نہ ہوجائے۔''

''یار شامی بادشاہ!'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔

''میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ دشمنوں کو ہماری روانگی کی اطلاع کیسے مل گئی؟'' میرے لہجے میں الجھن تھی۔

''یہ کوئی سمجھ میں نہ آنے والا معاملہ نہیں ہے نواب بھائی! ہمارا وہ ٹھکانا دشمنوں کی نظر میں آچکا تھا۔ ممکن ہے وہاں کی نگرانی بھی ہورہی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر آپ آج وہاں سے نہ نکلتے تو آپ کے گھر ہی پر زبردست حملہ ہوجاتا۔ آپ کے دشمن کوئی چھوٹے موٹے چور اچکے نہیں ہیں بلکہ گھاگ سیاست دان ہیں۔ وہ برسوں سے اس ملک کے عوام کو لوٹ رہے ہیں لیکن اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑتے۔ پاکستان کی کوئی عدالت بھی بغیر کسی ثبوت کے انہیں بری کرنے پر مجبور ہوگی۔''

''لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ میرے پاس ان کے کالے کرتوتوں کے ناقابلِ تردید ثبوت بھی موجود ہیں۔ وہ چند دن مزید سکون سے رہ لیں۔ مناسب موقع آتے ہی میں ان کی گردنیں توڑ دوں گا۔ بس ایک دفعہ مجھے نور کا سراغ مل جائے، پھر میں ان حرام زادوں پر زمین تنگ کردوں گا۔ میں دنیا کے آخری سرے تک ان کا پیچھا کروں گا۔''

''اس موقعے پر شامی آپ سے دو قدم آگے ہوگا۔'' شامی نے کہا۔

''میں جانتا ہوں شامی بادشاہ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے یوں ہی تو تم پر اعتماد نہیں کیا ہے۔'' پھر میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''خیریت معلوم کرنے کا بہت بہت شکریہ شامی! اپنا......''

''نواب بھائی اب آپ غیروں والی بات کررہے ہو۔'' شامی نے کچھ خفگی سے کہا۔

''اچھا اب ناراض ہونے کی ضرورت نہیں، اب صبح فون پر بات ہوگی، میں......''

''ہاں نواب بھائی! مجھے تو بالکل دھیان ہی نہیں رہا کہ اس وقت آپ سو رہے ہوں گے۔''

''اوکے شامی!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

اب نیند میری آنکھ سے اڑ گئی تھی۔ جسم پر تھکن طاری تھی لیکن دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آخر مجھ پر حملہ کون کراسکتا ہے؟ کسے معلوم تھا اور کیسے کہ میں ست بدھائی کے لیے نکل رہا ہوں۔ کہیں یہ خبر نادانستگی میں میرے ہی کسی اعتماد کے آدمی نے تو لیک نہیں کردی؟

میں نے پولیس انسپکٹر کو بھی بتایا تھا کہ مجھے ست بدھائی

جانا ہے لیکن میں نے اسے دن اور وقت نہیں بتایا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے ناصر سے کہا تھا، فون پر اس پولیس انسپکٹر کو اطلاع دے دو کہ میں ست بدھائی جارہا ہوں۔ وہ میرے مقتول گارڈ کی ڈیڈ باڈی لارہا تھا لیکن یہ اطلاع تو ناصر نے اس وقت دی تھی جب ہم لاہور سے ست بدھائی کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ کیا اتنی جلدی وہ لوگ اس دھماکے کی منصوبہ بندی کر سکتے تھے؟ یہ ممکن نہیں تھا پھر کیسے...... کیسے انہیں اطلاع مل گئی کہ میں ست بدھائی جارہا ہوں؟ میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔

نیند میری آنکھوں سے اڑ چکی تھی لیکن جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ اسپتال جا کر خواب آور گولیاں لے لوں۔ اس وقت کوئی نہ کوئی ڈاکٹر تو ڈیوٹی پر ضرور ہوگا۔

فضا میں اس وقت اچھی خاصی خنکی تھی۔ میں نے اپنا سلیپنگ گاؤن پہنا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں اسپتال کی طرف بڑھا تو مجھے ایسا لگا جیسے کوئی اور بھی میرے تعاقب میں آرہا ہو۔

میں ایک دم مڑا تو میرے پیچھے آنے والا ساکت ہوگیا۔ وہ احمد شاہ تھا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد اب وہ نائٹ ڈیوٹی بھی دے رہا تھا۔

مجھے اس پر ترس آگیا۔ میں کوئی روایتی اور ظالم جاگیر دار تو تھا نہیں کہ بس اپنی حفاظت کے لیے اپنے گارڈز کو جانور سمجھتا، ان سے یہ توقع رکھتا کہ وہ روبوٹ ہیں۔ احمد شاہ بھی میری طرح انسان تھا۔ میرے مقابلے میں اس نے دن بھر کہیں زیادہ بھاگ دوڑ کی تھی اور اب رات کے اس پہر بھی وہ ڈیوٹی پر موجود تھا۔

"احمد شاہ!" میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔

وہ فوراً ہی میرے سامنے پہنچ گیا۔ "یس سر!"

"تمہیں یہاں نائٹ ڈیوٹی کے لیے کس نے بھیجا ہے؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"کسی نے بھی نہیں سر!" احمد شاہ نے جواب دیا۔ "ایک دفعہ آپ ہی نے تو حکم دیا تھا کہ آج کے بعد احمد شاہ رات کے وقت میرے کمرے پر پہرا دے گا۔"

مجھے اپنی بات یاد آگئی۔ میں نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے احمد شاہ کہ تم دن رات جاگتے رہو۔ حویلی میں دوسرے گارڈز بھی تو موجود ہیں۔ تم جا کر آرام کرو اور سرور کو اپنی جگہ بھیج دو۔"

"یس سر!" احمد شاہ نے مستعدی سے جواب دیا اور وہاں سے چلا گیا۔

میں بھی اسپتال کی طرف روانہ ہوگیا۔

اسپتال کا فاصلہ یہاں سے زیادہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر شہناز، شہلا اور دوسرے ڈاکٹرز دن میں کئی مرتبہ یہ فاصلہ طے کرتے تھے۔

میں شاید اس دن بہت تھکا ہوا تھا۔ میرا ذہن اگر تھکن کا شکار ہو تو پورا جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔

اسپتال کی عمارت میں داخلے کے لیے شیشے کا دروازہ لگا تھا۔ میں اس دروازے کو دھکیل کر کوریڈور میں داخل ہوا تو ڈیوٹی روم سے مجھے شہلا کی آواز سنائی دی۔ "شہناز باجی! آپ کب تک اس گورکھ دھندے میں الجھی رہیں گی، کب تک اپنے جذبات کا خون کرتی رہیں گی۔ یہاں کے معاملات تو مجھے سدھرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ تو کیا آپ مزید پانچ دس سال حالات بہتر ہونے کا انتظار کرتی رہیں گی؟"

شہلا کا ایک ایک لفظ زہر بن کر میرے کانوں میں اتر رہا تھا۔

"شہلا!" شہناز نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم میرے اس مشن کو گورکھ دھندا کہہ رہی ہو؟ تم اگر یہاں سے فیڈ اپ ہوگئی ہو، بیزار ہوگئی ہو تو تم شوق سے واپس جا سکتی ہو۔ ہم نے تمہیں کوئی پابند تو نہیں کیا کہ تم اس اسپتال میں جاب کرنے پر مجبور ہو؟"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا باجی!" شہلا نے جلدی سے کہا۔ "یہاں کام کرنے تو میں اپنی خوشی سے آئی تھی اور یقین جانیے، میں یہاں بہت خوش ہوں، میرا اشارہ تو ان حالات کی طرف تھا جن سے نواب صاحب نبرد آزما ہیں، میں تو آپ کی اور راجا بھائی کی شادی کی بات کر رہی تھی۔" وہ سانس لینے کو رکی پھر بولی۔ "فرض کیجیے یہاں کے حالات مزید پانچ سال تک اسی طرح غیر یقینی صورت حال میں چلتے رہے تو کیا آپ......"

"شہلا! تم مجھ سے بہت چھوٹی ہو۔ تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ تم میرے نجی معاملات میں دخل اندازی کرو۔ میں صبح ہوتے ہی تمہیں لاہور بھجوا دوں گی۔"

"باجی پلیز! میرا یہ مطلب نہیں تھا، میں تو محض آپ کے خیال سے کہہ رہی تھی۔" شہلا کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں لیکن میرے سر میں اب شدید درد شروع ہوگیا تھا اور کنپٹیاں گویا چیخ رہی تھیں۔ میں ایک دفعہ پھر داخلی دروازے سے باہر نکلا اور اپنی

انگلیوں کے جوڑ سے شیشے پر دستک دے کر بولا۔ "ارے بھئی، یہاں کوئی ہے؟"

شہناز کا کمرا صدر دروازے کے بالکل ساتھ تھا۔ اس کے کانوں میں میری دستک پہنچی ہوگی اور میری آواز بھی۔ میں نے وہ جملہ بھی دروازہ تھوڑا سا کھول کر ادا کیا تھا۔

"کون ہے؟" اندر سے شہلا کی آواز سنائی دی، پھر ٹائلوں والے فرش پر اس کی چپلوں کی دھیمی سی آہٹ سنائی دی، پھر وہ دروازے پر آگئی۔ اس نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور حیرت سے بولی۔ "نواب صاحب آپ؟ خیریت تو ہے؟"

"ڈیوٹی پر اس وقت آپ ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ڈیوٹی پر تو شہناز باجی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں تو ان کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ میں آج دن میں بہت زیادہ سوئی ہوں اس لیے نیند نہیں آرہی تھی۔" اس نے وضاحت کی۔

میں شہناز کے ڈیوٹی روم کی طرف بڑھا تو وہ بھی دروازے سے باہر آرہی تھی۔ "کیا بات ہے رفیق؟" شہناز نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔

"میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے اور دونوں کنپٹیاں بری طرح چیخ رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم ادھر لیٹ جاؤ۔" اس نے اپنے کمرے میں لگے ہوئے اس بیڈ کی طرف اشارہ کیا جس پر وہ مریضوں کا معائنہ کرتی تھی۔

"اب میں اتنا بھی بیمار نہیں ہوں۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "دراصل مجھے نیند بہت زیادہ آرہی تھی اور تقریباً میں سو گیا تھا کہ ایک ٹیلی فون کی وجہ سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد سے نہ صرف نیند اڑ گئی بلکہ سر میں بھی شدید درد شروع ہوگیا۔"

شہناز نے میرا بلڈ پریشر چیک کیا تو حیرت سے بولی۔ "مائی گاڈ! تمہارا بلڈ پریشر تو اس وقت اچھا خاصا ہائی ہے رفیق! کیا پریشانی ہے؟"

"پریشانیاں تو مجھے نہ جانے کیا کیا ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"اچھا میں تمہیں خواب آور گولیاں دے رہی ہوں اور بلڈ پریشر کو نارمل کرنے کے لیے بھی ایک انجکشن دے رہی ہوں۔ بس سارے خیالات ذہن سے جھٹک کر اطمینان سے سو جانا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے لاہور میں تمہاری نیند ہی پوری نہیں ہوئی ہے۔ آنکھوں کے گرد...... بھی حلقے پڑ گئے ہیں۔"

"راجا بھائی کا بھی یہی حال ہے، ان کا ویٹ بھی خاصا کم ہوگیا ہے۔" ڈاکٹر شہلا نے کہا۔

"راجا تو انتہائی احمق آدمی ہے کہ میرے ساتھ ان پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے، میں اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا کہ میری وجہ سے اپنی زندگی خراب مت کرو لیکن اس کی کھوپڑی میں کوئی بات بیٹھتی ہی نہیں ہے۔"

ڈاکٹر شہلا نے چونک کر میری طرف دیکھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو، ابھی کچھ دیر پہلے یہی باتیں تو وہ بھی کر رہی تھی۔

"اچھا راجا کے ذکر کو اس وقت چھوڑو۔" شہناز نے انجکشن میں دوا بھر کے میرے بازو سے شرٹ ہٹا دی۔ انجکشن لگانے کے بعد اس نے مجھے دو ٹیبلیٹس دیں اور بولی۔ "انہیں بھی ابھی کھا لو اور جا کر آرام سے سو جاؤ۔"

شہلا نے بڑھ کر جگ سے گلاس بھرا اور میری طرف بڑھا دیا۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے گلاس اسے واپس دیا تو وہ ہمدردی سے بولی۔

"نواب صاحب! کیا تکلیف بہت زیادہ ہے؟"

"تکلیف تو اب آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔" میں نے کہا اور کرسی سے اٹھ کر اپنا سلیپنگ گاؤن پہننے لگا۔

"اب جا کر سو جانا اور اپنا سیل فون آف کر دینا۔"

میں تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ میرے ذہن میں اب تک شہلا کے الفاظ گونج رہے تھے۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب ہر قیمت پر راجا کو شادی کے لیے راضی کر لوں گا۔ شہلا جو کچھ کہہ رہی تھی درست تھا لیکن مجھے اس سے اس قسم کے رویے کی امید نہیں تھی۔ میں غیر ارادی طور پر ایک دفعہ پھر نہ چاہنے کے باوجود سوچ رہا تھا۔ میں نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اپنا سیل فون پہلے ہی آف کر چکا تھا۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا، پھر نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی بارہ بجا رہی تھی۔ کمرے میں خاصی روشنی تھی شاید نیلم یا ریشم میں سے کسی نے کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیے تھے۔ میری ہی ہدایت تھی کہ صبح کے وقت میرے کمرے کی کھڑکیوں سے پردے سرکا دیے جائیں۔

میرا سر ابھی تک بھاری ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر باتھ روم

میں گھس گیا اور گرم پانی سے دیر تک غسل کرتا رہا۔ نہانے سے کسل مندی خاصی حد تک کم ہوگئی۔

میں کمرے میں پہنچا تو راجا کرسی پر بیٹھا جھول رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”نیکے پتر! رات سونے سے پہلے کیا تو نے بھنگ کے دو تین گلاس چڑھا لیے تھے؟“

”یار! وہ بھنگ تھی کیا واقعی؟“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”مجھے تو ڈاکٹر شہناز نے کھلائی تھی۔“

اسی وقت ریشم نے کمرے میں جھانکا اور بولی۔ ”صاحب جی! ناشتا لاؤں؟“

”یہ ناشتے کا وقت ہے؟“ راجا نے آنکھیں نکالیں۔

”صاحب جی! میں تو......“

”تم ناشتا لے کر آؤ ریشم!“ میں نے اس سے کہا۔

میں ناشتے سے فارغ ہو چکا تو راجا نے مجھے بتایا۔ ”نیکے پتر! آج صبح صبح پولیس کی ایک وین ہمارے ہلاک شدہ گارڈ کی ڈیڈ باڈی لے آئی تھی۔“

”ہاں یار۔“ میں چونک کر بولا۔ ”ابھی تو اس کی تجہیز و تکفین بھی ہونی ہے۔“

”اس کی ڈیڈ باڈی پولیس صبح کے چار بجے یہاں لے کر آئی تھی۔“ راجا نے کہا۔ ”ہم اس کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو چکے ہیں۔“

”میری وجہ سے کتنے انسان موت کی بھینٹ چڑھتے جا رہے ہیں راجا!“

”نیکے پتر! تو اس وقت کچھ مت سوچ، شہناز نے منع کیا ہے کہ تیرے ذہن پر ذرا بھی دباؤ نہیں پڑنا چاہیے۔“

شہناز کا نام سن کر مجھے شہلا کی گفتگو یاد آگئی۔ واقعی میری وجہ سے راجا، شہناز اور کتنے ہی لوگ پریشان تھے، میں نے راجا سے کہا۔ ”راجا ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانے گا؟“

”تیری بات پر منحصر ہے۔“ راجا نے بے نیازی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے، میں تیری وہ بات ہنس کر برداشت کرلوں اور نیکے پتر! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں وہ بات سن کر تیرا سر توڑ دوں۔“ راجا کے لہجے میں شوخی تھی۔ ”تو جانتا ہے کہ میں برا مانتا ہوں تو نخریلی لڑکیوں کی طرح منہ نہیں پھلاتا بلکہ سامنے والے کا منہ توڑنے کی کوشش کرتا ہوں، اب بول!“

”اس بات کو مذاق میں مت لینا راجا! میں بہت سیریس ہوں۔“

”اب پھوٹ بھی چک!“ راجا نے جھنجلا کر کہا۔ ”میں تیری بات پر برا مانوں یا نہ مانوں لیکن تیرے اس انداز پر ضرور برا مان جاؤں گا۔“

”تو شہناز سے شادی کرلے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”میں شہناز ہی سے شادی کروں گا۔“ راجا نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ”نیکے پتر! تجھے یہ شبہ کیوں ہو گیا کہ میں کسی اور سے شادی کرنے والا ہوں۔“

”سیریس ہو جا راجا!“ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”تو شہناز سے اسی ہفتے شادی کرلے راجا!“ میں نے کہا۔ ”یہ میری خواہش ہے۔“

”تو تو یوں کہہ رہا ہے جیسے فلموں میں بیمار مائیں اپنے بیٹوں کی خوشامد کرتی ہیں کہ بیٹا شادی کرلے، یہ میری زندگی کی آخری خواہش ہے تاکہ میں آرام سے مرسکوں۔“

”ہاں، یہ میری زندگی کی آخری خواہش ہے۔“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”تجھے شہناز سے شادی کرنا پڑے گی۔“

”تو نے کوئی ایسا ویسا خواب تو نہیں دیکھ لیا نیکے پتر!“ راجا نے ہنس کر کہا۔ ”ویسے خوابوں کی تعبیر ہمیشہ الٹی ہوتی ہے۔“

”بات کو مذاق میں مت اڑا راجا!“ میں نے کہا۔

”تجھے اسی ہفتے شادی کرنا ہوگی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

راجا نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟“

”تو پھر تیرے اور میرے راستے الگ ہوں گے۔“

میں نے یہ جملہ بھی انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

راجا چند لمحے تک مبہوت ہو کر مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ”اگر ہماری برسوں کی دوستی محض اس ایک بات پر قائم تھی تو مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تجھ سے دوستی ہی کیوں کی؟“ وہ چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ ”ایسے کتنے ہی موقعے آئے جب میں نے تجھ سے کہا کہ نیکے شادی کرلے۔ میں نے وہ بات مذاق میں نہیں کہی تھی لیکن تو نے یا تو ہر بار بات کو مذاق میں اڑا دیا یا پھر میری تجویز پر کان نہ دھرے۔ کیا میں نے دوستی ختم کرنے کی بات کی؟“

”وہ بات اور تھی؟“ میں نے کہا۔

”کیا واقعی؟“ راجا نے منہ بنا کر کہا۔ ”اس لیے کہ تو نواب اور لارڈ ہے اور بڑے لوگ اپنے غریب دوستوں کی بات سن تو لیتے ہیں لیکن اسے جوتے کی نوک پر مارتے ہیں۔“

”بات کو دوسرا رنگ دینے کی کوشش مت کر راجا!“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”تجھے میری بات ماننا ہی پڑے گی۔“

”اس سے پہلے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ راجا نے کہا۔ ”میں...... میری...... اور...... تیری دوستی...... یہیں تک تھی۔“ راجا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور بچوں کی طرح آنسو بہانے لگا۔

”راجا! میری بات تو سن!“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔

اس نے بری طرح میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”آج کے بعد راجا تیرے لیے مرگیا۔“ اس نے اپنے آنسو صاف کیے۔

اس وقت شہناز کمرے میں داخل ہوئی اور کمرے کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”یہ تم لوگ چیخ پکار کیوں کر رہے ہو؟“ شہناز نے کہا۔

”اپنا سامان باندھو اور چلنے کی تیاری کرو۔“ راجا نے شہناز سے کہا۔ ”ہم ابھی اور اسی وقت ست بدھائی سے جا رہے ہیں، اب یہاں ہمارے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

”آخر ہوا کیا؟“ شہناز نے پوچھا۔

”ضروری نہیں کہ ہر بات تمہیں بھی بتائی جائے۔“ راجا نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

”بیٹھو شہناز!“ میں نے کہا۔ ”میں بتاتا ہوں، میں نے اس الو کے پٹھے سے صرف اتنا کہا ہے کہ تو شادی کرلے۔ اس پر یہ اتنا ہنگامہ کر رہا ہے۔“

”تو نے صرف اتنا ہی کہا ہے؟“ راجا نے چیخ کر کہا۔ ”یہ بھی تو بتا کہ تو نے شادی نہ کرنے پر مجھے دھمکی کیا دی ہے؟“

”وہ بات تو غصے میں میرے منہ سے نکل گئی تھی۔“ میں نے کہا۔

”غصے میں تو کچھ بھی کرسکتا ہے نیکے...... سوری نواب رفیق احمد شیرازی!“ راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”آپ اپنے کسی چاہنے والے کی جان بھی لے سکتے ہیں اور پھر کہہ سکتے ہیں کہ غصے میں ایسا ہو گیا۔“

”شہناز! میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ اگر تو نے ایک ہفتے کے اندر اندر شہناز سے شادی نہیں کی تو ہمارے تعلقات ختم ہو جائیں گے۔“

”تم نے ایسا کیوں کہا؟“ شہناز نے کہا۔ ”کیا تم راجا کی عادت جانتے نہیں ہو، یہ تو اس کی دوستی کی توہین ہے۔“

”تم بھی ایسا سمجھتی ہو؟“ میں نے کہا۔ ”میری وجہ سے تم لوگ اس گورکھ دھندے میں پھنسے ہوئے ہو۔ فرض کرو کہ میرے حالات آئندہ پانچ سال یا دس سال تک درست نہ ہوئے تو کیا تم میری وجہ سے اپنی زندگیاں خراب کرو گے؟“

شہناز نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولی۔ ”اچھا، اب میں سمجھی، رات تم نے شہلا کی باتیں سن لی ہیں۔ یہ انتہائی بداخلاقی ہے رفیق!“

”میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے تو محض اتفاق سے وہ باتیں سن لیں۔ اسے بھی یہاں بہت تکلیف ہے، تم ڈاکٹر شہلا کو بھی پہلی فرصت میں لاہور روانہ کردو۔ میرے مسائل اور میری دشمنیاں آخر دوسرے کیوں نبھائیں۔ یہاں تو ایک طرح سے وہ قلعہ بند ہو کر رہ گئی ہے، کوئی سوشل لائف نہیں ہے، نہ کہیں آنا، نہ کہیں جانا، وہ بے چاری تو حویلی سے باہر بھی نہیں نکل سکتی۔“

راجا حیرت سے منہ پھاڑے میری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”نیکے پتر! یہ تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو؟ کیا کہا ہے شہلا نے؟“

”ڈاکٹر شہلا کو شہناز کی بہت فکر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور وہ بھی ایک طرح سے ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میرے مسائل کی سزا تم لوگ کیوں بھگتو، وہ بے چاری تو شہناز کی ہمدردی میں ہی کہہ رہی تھی۔“

”تم کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟“ راجا نے کہا۔ وہ اس وقت شدید غصے میں تھا۔ اس کی علامت یہ تھی کہ وہ غصے میں مجھے ”تو“ کی بجائے تم یا آپ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

”میں نے تو کھل کر ہی بات کی تھی راجا!“ میں نے کہا۔ ”اس لیے تو میں تیری شادی پر زور دے رہا ہوں۔ میرے کیے کی سزا آخر تم لوگ کب تک بھگت سکتے ہو؟“

”یہ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو رفیق؟“ ڈاکٹر شہناز نے کہا۔ ”شہلا ابھی بچی ہے، کم عقل ہے، وہ نا سمجھی میں کچھ ایسی باتیں کر گئی تو تم اتنا برا مان گئے؟“

”میں نے بالکل برا نہیں مانا بلکہ میں تو شرمندہ ہو گیا ہوں۔ اس کی ایک ایک بات درست تھی۔“

”میں آج ہی شہلا کو لاہور بھجوا دیتی ہوں۔“ شہناز نے کہا۔

”وہ تو خیر جائے گی ہی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ......“

”تم بھی کیسی بچوں والی باتیں کر رہے ہو رفیق؟“ شہناز نے جھنجلا کر کہا۔ ”تم ہر طرف سے مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہو اور ہم شادی رچا کر بیٹھ جائیں؟“

”مصیبتیں تو اب میرے ساتھ ہی چلیں گی۔ اگر غور

موجود ہوتی تو خدا کی قسم میں خود بھی شادی کر لیتا۔ شادی کرنے سے کیا مصیبتوں میں اضافہ ہو جائے گا یا کمی واقع ہو جائے گی؟"

"اچھا، یہ بات ہے تو ہماری ایک شرط ہے۔" شہناز نے کہا۔

"ہماری کوئی شرط نہیں ہے۔" راجا نے کہا۔ "شرطیں وہاں پیش کی جاتی ہیں جہاں کوئی تعلق ہو۔ نواب صاحب تو اپنی ایک شرط کے ذریعے ہر تعلق ختم کر چکے ہیں۔ تم چلنے کی تیاری کرو۔"

"تم دونوں ہی بچے ہو۔" شہناز بھنا کر بولی۔

"تمہیں اگر یہاں رہنا ہے تو شوق سے رہو۔" راجا کھڑا ہو گیا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے راجا؟" شہناز نے بے بسی سے کہا۔ "کیا تم رفیق کے بغیر زندہ رہ سکو گے؟"

"اگر یہ زندہ رہ سکتا ہے تو میں زندہ کیوں نہیں رہ سکتا؟" راجا نے کہا۔

"یہ الو کا پٹھا تو بکواس کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ لاتوں کا بھوت ہے باتوں سے......"

"نواب صاحب!" راجا بپھر کر بولا۔ "اپنی زبان کو لگام دیں، میں نے آج تک کسی بڑے سے بڑے نواب، جاگیردار، سیاست دان اور بیوروکریٹس کی گالیاں نہیں سنیں بلکہ انہیں گالیاں دی ہیں۔"

"راجا!" میں نے بھی بپھر کر کہا اور زناٹے کا ایک تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ "تو مجھے اس سے بڑی اور کیا گالی دے گا۔ تو جاتا ہے تو چلا جا!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں سمجھ لوں گا کہ جیسے میرے والدین مر گئے، دوسرے چچا مر گئے، ایک دوست بھی مر گیا۔ پھر کون جانے میری زندگی بھی کتنی ہے۔ جا...... اب میں تجھے نہیں روکوں گا۔" میرے آنسو بہنے لگے۔ "تو نے آج برسوں کی دوستی کو خاک میں ملا دیا راجا!" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو اس مان کے ساتھ یہ شرط رکھی تھی کہ تو دوستی کی لاج رکھے گا۔ تو نے تو مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔ تو مجھے نواب ہونے کا طعنہ دے رہا ہے؟ جب تجھ سے دوستی ہوئی تو میں کہاں کا نواب تھا؟ کہاں کا لارڈ تھا۔ ہم دونوں تو میلوں پیدل چلتے تھے، میں تو اب تک تجھے وہی راجا سمجھ رہا تھا لیکن تو...... تو اب ملک کا ایک نامور صحافی ہے، تیرے قلم کی کاٹ سے بڑے بڑے سیاستدان ڈرتے ہیں تو پھر مجھے بھی ڈرنا چاہیے۔" میں نے قمیص کی آستین سے اپنے آنسو صاف کیے اور بولا۔ "جا راجا!...... اب میں نہ تجھے روکوں گا اور نہ شہناز کو۔ میں تم دونوں کا احسان مند ہمیشہ رہوں گا کہ تم نے ایک طویل عرصے تک میرے ساتھ رہ کے صعوبتیں برداشت کیں، سختیاں جھیلیں۔ اس کے لیے مجھے معاف کر دینا۔ ہاں، میں ایک وصیت ضرور کروں گا کہ اگر میں مر جاؤں تو راجا کو میرا یہ مکروہ چہرہ نہ دکھایا جائے۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

"رفیق...... سنو تو...... رفیق!" شہناز آواز ہی دیتی رہ گئی۔

میں وہاں سے سیدھا باغ میں آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ دنیا اس وقت مجھے بے رنگ لگ رہی تھی۔

میں اضطراب کے عالم میں باغ کی ایک سنگی بنچ پر بیٹھ گیا لیکن پھر بھی میرے اضطراب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی تو میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

اس وقت مجھے نیلم دکھائی دی۔ وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ میں نے اس پر کوئی دھیان نہ دیا اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ نکالا اور اسے سلگانے لگا۔

نیلم میرے نزدیک آ کر رک گئی اور جھجکتے ہوئے بولی۔ "صاحب جی!...... آپ...... کچھ پریشان ہیں؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، بس اسے گھور کر دیکھا اور دوبارہ سگریٹ پھونکنے میں مشغول ہو گیا۔

"صاحب جی!...... آپ...... اتنی سگریٹ تو نہیں پیتے تھے...... آپ......"

"تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ذاتی معاملات میں مداخلت کرو۔" میں چیخ کر بولا۔ "تم نے مجھ سے پوچھنے کی جرأت بھی کیسے کی؟"

اس کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا اور وہ بری طرح سہم کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے تو کیا، کسی بھی ملازم سے اس انداز میں گفتگو نہیں کی تھی۔ "کیا تمہیں نہیں معلوم کہ مالک جب تک کسی ملازم کو طلب نہ کرے، ملازم کو اس کے سامنے نہیں آنا چاہیے اور باغ کا یہ حصہ تو حویلی کے ہر ملازم کے لیے ممنوعہ حصہ ہے، تم یہاں تک آئیں کیسے؟"

نیلم خوف کے مارے بری طرح کانپنے لگی۔

میں نے چیخ کر کہا۔ "سرور!"

سرور ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں وہاں پہنچ گیا۔

وہ غالباً بہت تیزی سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔

"جی سر!" اس نے مستعدی سے کہا۔

"یہ لڑکی یہاں تک کیسے پہنچی؟" میں نے چیخ کر نیلم کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا مجھے یاد دلانا پڑے گا کہ تمہاری ذمے داری کیا ہے؟"

سرور نے ایک نظر نیلم کی طرف دیکھا جو اب بے ہوش ہونے کے نزدیک تھی، پھر آہستہ سے بولا۔ "سر! معافی چاہتا ہوں...... میں سمجھا کہ اسے آپ نے خود طلب کیا ہے۔"

"تم سب نکمے ہو گئے ہو۔" میں دھاڑ کر بولا۔

اسی وقت شہناز وہاں آ گئی۔ اس نے سرور سے کہا۔ "سرور! تم یہاں سے جاؤ۔ نیلم! تم بھی جاؤ۔"

اس کی بات سنتے ہی نیلم یوں گرتی پڑتی وہاں سے گئی جیسے اسے اپنے قدموں پر اختیار نہ ہو۔

"تم راجا کا غصہ دوسرے لوگوں پر کیوں اتار رہے ہو؟" شہناز نے کہا۔ "نیلم کی حالت دیکھی ہے، مجھے تو شبہ ہو رہا تھا کہ کہیں اس کی حرکت قلب ہی بند نہ ہو جائے۔ تم تو واقعی نواب بن گئے ہو رفیق!"

اچانک غنی تیزی سے وہاں آیا اور شہناز سے بولا۔ "ڈاکٹر صاحبہ! وہ سرور بتا رہا ہے کہ نیلم کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ سرور اسے اٹھا کر اسپتال کی طرف لے گیا ہے۔"

"میں دیکھتی ہوں۔" شہناز نے کہا۔ پھر مجھ سے بولی۔ "دیکھا تم نے! لیکن تمہیں کیا فرق پڑے گا۔ وہ مرے یا جیے۔ نوابوں اور جاگیرداروں کے ملازمین مرتے ہی رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ طنزیہ نظروں سے میری طرف دیکھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ میرا موڈ دیکھ کر غنی بھی وہاں سے کھسک گیا تھا۔

میں نے اچانک سب بدھائی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس جاگیر سے تنگ آ گیا تھا۔ اسے پانے کے بعد میں نے اپنے بہت سے رشتے کھو دیے تھے۔ مجھے رابعہ یاد آئی، اگر یہ جاگیر نہ ہوتی تو میری اس سے کبھی دشمنی نہ ہوتی، اس جاگیر کی وجہ سے نہ جانے کتنے لوگ مارے گئے تھے اور نہ جانے آئندہ کتنے مارے جانے والے تھے۔ ممکن ہے یہ جاگیر ہی میری جان بھی لے لے۔ میری آدھی جان تو راجا سے تعلق ٹوٹنے کے بعد نکل ہی چکی تھی، میں نے سوچا تھا کہ یہاں سے لاہور جاؤں گا۔ وہاں کسی گمنام گوشے میں رہ کر نور کو تلاش کروں گا۔ پھر اس کے ساتھ لندن جاؤں گا اور یہ جاگیر ٹرسٹ کے نام کر دوں گا۔

میں نے یہ سوچ کر غنی کو آواز دی۔ "غنی!"

غنی کی بجائے سرور دوڑا ہوا آیا اور بولا۔ "یس سر!"

"غنی کہاں ہے؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں غنی کو بھیجتا ہوں سر!" سرور نے کہا اور بھاگتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میرا یہ رویہ اس کے لیے بھی ناقابل فہم تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کا اظہار ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد غنی وہاں آ گیا۔ وہ بھی بری طرح ہانپ رہا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ "اب تم لوگ اتنے نازک مزاج ہو گئے ہو کہ حویلی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے میں ہانپ جاتے ہو؟ کیا میں تم لوگوں کے لیے کسی گاڑی کا بندوبست کروں؟"

"سر، میں اس وقت مین گیٹ کی طرف تھا، سرور کا پیغام ملتے ہی دوڑا ہوا ادھر آیا ہوں۔" غنی نے کہا۔

مین گیٹ وہاں سے اچھے خاصے فاصلے پر تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم میرے کمرے میں جاؤ اور ایک سوٹ کیس میں میرے دو تین جوڑے اور دوسرا ضروری سامان رکھ دو۔"

"او کے سر!" غنی نے کہا۔

"اور ہاں، میرا بریف کیس، تمام چیک بکس اور کریڈٹ کارڈز، اے ٹی ایم کارڈز اور پاسپورٹ وغیرہ بریف کیس میں چیک کر لینا۔"

"او کے سر!" غنی نے کہا اور جانے کے لیے مڑا۔

"یہ تمام سامان گاڑی میں رکھو اور گاڑی نکال کر مجھے اطلاع دو۔"

"کون سی گاڑی میں رکھوں سر؟" غنی نے پوچھا۔ "پراڈو یا لینڈ کروزر میں؟"

"ڈبل کیبن پک اپ میں۔" میں نے کہا۔ "اور کوئی گارڈ میرے ساتھ نہیں جائے گا۔"

"او کے سر!" غنی نے تیسری مرتبہ کہا اور جانے کے لیے مڑ گیا۔

میں اضطراب کے عالم میں وہاں کھڑا سگریٹ پھونکتا رہا۔ اضطراب زیادہ بڑھتا تو میں ٹہلنے لگتا۔

اچانک مجھے شہلا کی آواز سنائی دی۔ وہ چیخ کر کسی سے کہہ رہی تھی۔ "تم ہوتے کون ہو مجھے روکنے والے؟"

جواب میں کسی کی آواز آئی لیکن لہجہ اتنا دھیما تھا کہ مجھے کچھ سنائی نہ دیا۔

میں تیزی سے اس طرف بڑھا۔ وہاں شہلا کھڑی ہوئی تھی اور سرور پر برس رہی تھی۔ "اپنی حد سے تجاوز مت کرو، میں......"

"کیا بات ہے ڈاکٹر شہلا؟" میں نے پوچھا تو شہلا اور سرور دونوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"آپ کا یہ باڈی گارڈ مجھے اس طرف آنے سے روک رہا ہے۔" شہلا نے کہا۔ "کہہ رہا تھا کہ نواب صاحب اس وقت کسی سے بھی ملنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔"

میں نے سرور کی طرف دیکھا تو وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"اس میں اس کا قصور نہیں ہے ڈاکٹر صاحبہ!" میں نے کہا۔ "میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ میں اس وقت تنہائی چاہتا ہوں، کسی کو بھی ادھر آنے مت دینا۔"

"او!" شہلا طنزیہ لہجے میں بولی۔ "سوری نواب صاحب! میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا۔"

"کوئی بات نہیں، آیئے تشریف لایئے۔"

وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پھولوں کے اس کنج میں آگئی جہاں میں اب تک ٹہلتا رہا تھا۔ وہاں جا بجا سگریٹ کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے۔

"میں صرف آپ کو یہ بتانے آئی تھی نواب صاحب کہ میں لاہور جا رہی ہوں۔ میری ذات پر آپ کے کئی احسانات ہیں، میں نے سوچا کہ جاتے ہوئے آپ سے الوداعی ملاقات کرلوں۔"

"احسان تو آپ کا مجھ پر ہے ڈاکٹر شہلا!" میں نے کہا۔ "آپ نے اتنا عرصہ ایک ویرانے میں بلکہ قید خانے میں گزارا۔ میں اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔"

"آپ کو احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے نواب صاحب!" اس نے کہا۔ "یہ میری اپنی چوائس تھی۔ پھر میں نے یہاں رہ کر بھاری سیلری وصول کی ہے۔ میں نے آپ پر کون سا احسان کیا ہے، مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"میں جانتی ہوں، آپ میری ان باتوں سے ہرٹ ہوئے ہیں جو میں شہناز باجی سے کر رہی تھی۔ میرا مقصد آپ کی توہین نہیں تھا۔ میں تو......"

"میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ نے تو بہت نیک نیتی سے بات کی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ آپ نے یہاں سے جانے کی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن ......"

"لیکن وہ باتیں آپ کی طبع نازک پر گراں گزری ہیں۔" شہلا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ نیلم نہیں تھی جو میری ایک ہی ڈانٹ میں سہم جاتی یا پھر میرے چیخنے چلانے پر بے ہوش ہو جاتی۔

"میری وجہ سے آپ کے اور راجا بھائی کے تعلقات خراب ہوگئے۔ مجھے زندگی بھر اس کا قلق رہے گا۔"

"ڈاکٹر شہلا! آپ بھی مجھ پر طنز کر رہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں اور طنز!" شہلا نے حیرت سے کہا۔

میں نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا ورنہ ممکن ہے کہ اس کی مزید طنزیہ گفتگو پر میرا دماغ گھوم جاتا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں لاہور تک بھجوانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔"

"میں راجا بھائی کے ساتھ جا رہی ہوں۔" ڈاکٹر شہلا نے کہا۔ "آپ اپنا خیال رکھیے گا۔" اس نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ "مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔" پھر وہ اپنی مخصوص کیٹ واک والی چال میں وہاں سے چلی گئی۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں نے عالمِ اضطراب میں سوچا۔ میں تنہا کیوں ہوتا جا رہا ہوں؟

میں نے سگریٹ کے لیے پیکٹ کھولا تو اس میں سگریٹ نہیں تھی۔ میں نے وہ پیکٹ ایک طرف اچھال دیا۔

تھوڑی دیر بعد غنی نے آکر بتایا۔ "سر! میں نے آپ کا سامان پیک کر دیا ہے اور اسے ڈبل کیبن پک اپ میں رکھ دیا ہے۔ میں نے گاڑی گیراج سے نکال لی ہے۔ گیراج کے مکینک نے اس کا انجن، تیل پانی، ٹائر وغیرہ چیک کر لیے ہیں۔ گاڑی کا پیٹرول ٹینک آدھے سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ سی این جی بھی کافی ہے۔"

"ٹھیک ہے غنی!" میں نے کہا۔ "تم جاؤ۔"

یہ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ غنی ہر معاملے میں سمجھدار اور محتاط تھا۔ میں کمرے پر نظر ڈال کر محض یہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ کوئی ایسی ضروری چیز تو رہ نہیں گئی ہے جس کی وجہ سے مجھے دوبارہ ست بدھائی آنا پڑے۔

بیڈ پر تکیے کے پاس ہی میری قیمتی گھڑی پڑی تھی۔ میں نے گھڑی اٹھا کر کلائی پر باندھی، پھر میں نے یونہی تکیہ اٹھا کر دیکھا تو مجھے وہاں اپنے دونوں ریوالور نظر آئے۔

"یہ غنی بھی بہت بڑا احمق ہے۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "اب مجھے اپنے بریف کیس کی چیزوں کو بھی ایک مرتبہ پھر چیک کرنا پڑے گا۔"

میں نے ریوالور کے فاضل کارتوسوں کے لیے دیوار گیر آہنی سیف کھولا تو اس میں مجھے اچھا خاصا کیش بھی نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی نور کا پاسپورٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ پاسپورٹ اٹھا کر جیب میں ڈال لیا اور غصے میں غنی کو آواز دی۔ "غنی!"

میری دہاڑ پر غنی میرے کمرے میں داخل ہوا جیسے اس کے پیچھے خونخوار قسم کے کتے لگے ہوئے ہوں یا اگر اسے ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر ہو جائے گی تو میں اس کی موت کا حکم صادر کر دوں گا۔

"یس سر!" وہ بوکھلا کر بولا۔

"لگتا ہے اب تم بھی ناکارہ ہوگئے ہو۔ تم نے میرا سامان پیک کر دیا ہے؟"

"یس سر!" اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں یہاں سے بغیر کسی ہتھیار کے نکلوں تاکہ دشمنوں کا کوئی بھی آدمی آسانی سے مجھے مار لے؟"

"سر، میں آپ کے ریوالور اٹھانے ہی والا تھا کہ......"

"تمہیں کوئی اور کام یاد آگیا اور تم ریوالور اٹھانا بھول گئے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"نو سر!" غنی نے آہستہ سے کہا۔ "گاڑی میں بھی ہتھیار موجود ہیں اور میرے پاس بھی......"

"میں نے یہ کب کہا کہ تم بھی میرے ساتھ جا رہے ہو؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"سر! سرور اور احمد شاہ بھی ہمیشہ مسلح رہتے ہیں۔" غنی نے آہستہ سے کہا۔

"میں کسی کو بھی اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا ہوں۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "نہ تم، نہ سرور اور نہ احمد شاہ! کوئی بھی میرے ساتھ نہیں جائے گا۔"

غنی حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

"میں ست بدھائی ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"سر! اس کے باوجود آپ تنہا کیوں جا رہے ہیں؟"

"اب تم بھی مجھ سے جواب طلب کرو گے؟" میں نے دہاڑ کر کہا۔

"آپ ست بدھائی ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہے ہیں۔" غنی کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"ہاں، میں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔"

"سر! پھر آپ مجھے بھی فارغ کر دیں۔" غنی نے کہا۔ "جب میرا کوئی مصرف ہی نہیں ہے تو پھر یہاں رہنے کا کیا فائدہ؟"

"غنی...... تم بھی...... تم بھی مجھے چھوڑنے کی بات کر رہے ہو؟"

"سر، میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اس کا فیصلہ تو آپ نے کیا ہے۔ آپ ست بدھائی بھی ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہے ہیں، مجھے ساتھ بھی نہیں لے جانا چاہتے تو پھر میرا کیا مصرف رہ جاتا ہے؟"

"لیکن غنی......!"

"سر! میں آپ کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا...... لیکن آپ کا حکم ٹال بھی تو نہیں سکتا۔ میں نے اتنا عرصہ آپ کی خدمت کی ہے۔ اگر اس پورے عرصے میں مجھ سے یا رحیم سے کسی بھی قسم کی کوئی غلطی یا کوتاہی ہوئی ہو تو ہمیں معاف کر دیجیے گا۔" غنی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ لمبا چوڑا آدمی اس وقت بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

"آپ نے مجھ پر بے شمار احسانات کیے ہیں سر! میں جب تک زندہ رہوں گا، ان کے بوجھ تلے دبا رہوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے دونوں ریوالور نکالے، اپنا سیل فون نکالا جو اسے سیکیورٹی چیف کی حیثیت سے دیا گیا تھا، پھر اس نے وہ چیزیں میرے سامنے میز پر رکھ دیں۔ مجھے فوجی انداز میں سلام کیا اور اپنے آنسو پونچھتا ہوا رخصت ہوگیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میرے اندر سے آواز آئی۔ "تم تو بہت بڑے جاگیردار ہو، نواب ہو، لارڈ ہو، تمہیں ملازموں کی کیا کمی؟ تمہارے ایک اشارے پر بے شمار آدمی تمہاری خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔"

میں نے سیف میں رکھا ہوا تمام کیش اٹھا کر ایک رومال میں باندھا، اپنے دونوں ریوالورز جیب میں رکھے اور خالی الذہنی کے عالم میں کئی منٹ تک کھڑا یہی سوچتا رہا کہ اب میں کہاں جاؤں؟ میری عقل ماؤف ہو کر رہ گئی تھی۔

دماغ پر عجیب سا بوجھ تھا۔ کوئی میرے اندر سے چیخ رہا تھا۔ ''رفیق! راجا کو، ڈاکٹر شہباز کو، ڈاکٹر شہلا کو اور غنی کو روک لے ورنہ تو پلک جھپکتے میں بالکل اکیلا ہو جائے گا۔ یہ ہی لوگ تو تیرے غم گسار اور جاں نثار تھے۔ یہ بھی چلے گئے تو تیرے پاس باقی کیا بچے گا۔ پیسے سے تو دنیا کی ہر چیز خرید سکتا ہے لیکن راجا کی دوستی، شہباز کی بے لوث محبت، ڈاکٹر شہلا کی اپنائیت اور غنی کی جاں نثاری نہیں خرید سکتا۔ انہیں روک لے رفیق ورنہ تو بالکل تہی دست اور قلاش ہو جائے گا۔''

''میں انہیں کیسے روکوں؟'' میں نے کہا۔

''کیوں؟'' میرے اندر سے آواز آئی۔ ''کیا انہیں روکنے سے تیری شان میں فرق آجائے گا، کیا تیری نوابی کو ٹھیس پہنچے گی۔ انہیں روک لے رفیق، ورنہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر کچھ باقی نہیں بچے گا۔''

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور بے اختیار غنی کا نمبر ملا لیا۔

''جی سر!'' اس نے فوراً ہی جواب دیا۔

''ذرا میرے کمرے میں آؤ۔'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

غنی فوراً ہی کمرے میں آگیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ کر رہ گیا تھا۔

''یس سر!'' اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔

''راجا صاحب کو ذرا میرے پاس بھیجو اور تم میرے جانے سے پہلے حویلی مت چھوڑنا۔''

''اوکے سر!'' اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔ اس کی چال میں بھی وہ مستعدی نہیں تھی۔ گویا میرے ایک ہی جملے نے غنی جیسے مضبوط شخص کو توڑ پھوڑ دیا تھا۔ مجھے فوری طور پر اسے روکنے کا یہی طریقہ سوجھا تھا کہ اسے حویلی سے باہر نہ جانے دوں۔

تھوڑی دیر بعد وہ دستک دے کر اندر آگیا اور بولا۔ ''سر! وہ...... راجا صاحب کہہ رہے ہیں...... کہ...... کہ......''

''کیا کہہ رہے ہیں وہ؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

''سر، وہ کہہ رہے ہیں کہ میں نواب صاحب کا ملازم نہیں ہوں کہ ان کے طلب کرنے پر دوڑا چلا جاؤں۔ جا کر انہیں بتا دو کہ میں نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ ہاں، تم زبردستی مجھے وہاں لے جاؤ تو اور بات ہے۔''

مجھے امید نہیں تھی کہ راجا مجھ سے اتنا ناراض ہے۔ میں جانتا تھا کہ جب وہ کسی سے ناراض ہوتا تھا تو پھر مہینوں بلکہ برسوں اس سے ناراض رہتا تھا لیکن وہ میرے ساتھ یہ سلوک کرے گا، اس کا تو میں نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

غنی مجھے راجا کا پیغام دے کر جا چکا تھا۔ میں خود ہی اٹھا اور راجا کے کمرے کی طرف چل دیا۔

اس کے کمرے کے نزدیک پہنچ کر میں ٹھٹک کر رک گیا۔ اندر سے راجا کی بھرائی ہوئی آواز آرہی تھی۔ ''یار، میں کیسے بھول جاؤں؟ رفیق نے تو برسوں کی دوستی کو ایک پل میں توڑ دیا۔ میں نے کبھی اسے خود سے الگ نہیں سمجھا اور اس نے کتنی بے مروتی سے کہہ دیا کہ اگر تمہیں میری یہ شرط منظور نہیں ہے تو ہماری دوستی ختم!''

''یار راجا!'' ناصر کی آواز آئی۔ ''نواب صاحب ایسے ہیں تو نہیں، نہ جانے انہوں نے کس انداز میں یہ بات کی ہو اور تم نے کس انداز میں اسے لیا ہو۔''

''میں رفیق کے ہر انداز کو جانتا ہوں ناصر! آج سے نہیں بلکہ لڑکپن سے، اس وقت سے جب ہم دوستی کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں تھے۔''

''پھر بھی آپ اتنی پرانی دوستی کو ایک پل میں توڑ دیں گے، نواب صاحب کو ان حالات میں اکیلا چھوڑ دیں گے۔ وہ تو پہلے ہی چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں؟''

''میں نے اس کی دوستی چھوڑی ہے ناصر!'' راجا نے کہا۔ ''لیکن اسے اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ میں......''

مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں بے اختیار کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کی باتیں سن کر میری آنکھوں میں نہ جانے کس وقت آنسو آگئے تھے۔

مجھے دیکھ کر اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''الو کے پٹھے! تو مجھے چھوڑ کر جائے گا؟'' میں نے اچانک ریوالور نکال لیا۔

راجا کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

میں نے ریوالور اس کے سامنے بیڈ پر پھینک دیا اور بولا۔ ''جانے سے پہلے مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دے ورنہ یہ احساس مجھے روز مارتا رہے گا کہ میں نے تیری دوستی کی قدر نہیں کی۔ تو، تو یہی سمجھتا ہے نا۔''

راجا بے اختیار ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔ ''کمینے، ذلیل، الو کے پٹھے! تو نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا۔ ''اب تو موت ہی ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر

سکتی ہے۔''

ناصر اس دوران میں کمرے سے کھسک لیا تھا۔

''نکمے پتر!'' راجا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میں تو تیرا دوست ہوں، تیری رگ رگ سے واقف ہوں لیکن شہباز کو تیرے اس رویے سے شدید صدمہ پہنچا ہے۔''

''وہ بھی میری دوست ہے اور میری رگ رگ سے واقف ہے، البتہ شہلا کو ضرور صدمہ پہنچا ہوگا۔''

''تیرے اس چنگیزی رویے نے تو نیلم کو بھی بستر پر ڈال دیا۔''

''یار، اس کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''اگر تو اسے ایک دفعہ اور ڈانٹ دیتا تو اسے دل کا دورہ پڑ جاتا۔ وہ لاکھ ملازمہ سہی لیکن ہم ہی لوگوں نے تو اس کی عادتیں بگاڑی ہیں۔ اب اس بیچاری کو کیا پتا کہ نواب صاحب اس وقت واقعی نوابی کے موڈ میں ہیں۔ وہ یہی سوچ کر تیرے پاس چلی گئی تھی کہ تیری پریشانی اس سے دیکھی نہیں گئی تھی۔''

''یار، میں اس سے معذرت کر لوں گا، پہلے تو ذرا شہلا کو یہاں بلوا لے۔ میں اس سے معافی مانگ لوں۔ اس پورے واقعے میں وہ بے چاری فضول میں پس کر رہ گئی ہے۔''

راجا نے اسی وقت غنی کو آواز دی اور اس سے کہا کہ ڈاکٹر شہلا کو بلا لاؤ۔

تھوڑی دیر بعد شہلا افسردہ سی کمرے میں داخل ہوئی، مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھی، پھر راجا سے مخاطب ہوئی۔ ''راجا بھائی! آپ نے مجھے بلایا ہے؟''

''آپ کو راجا نے نہیں بلکہ میں نے بلایا ہے شہلا!'' میں نے کہا۔

''جی فرمایئے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''شہلا! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ تمہاری ذرا سی بات کا بتنگڑ بن گیا، میں نے واقعی اپنے جملوں سے تمہیں بہت ہرٹ کیا ہے۔''

''ارے ارے! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' شہلا تڑپ کر بولی۔ ''آپ نے اُس وقت تو نہیں لیکن اب مجھے ضرور ہرٹ کر دیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم لاہور نہیں جا رہی ہو؟''

''ارے یار! وہ میرے ساتھ لاہور جانے والی تھی۔ میں اگر لاہور جاتا تو شہلا بھی جاتی اور شہباز بھی! میرا تو کبھی ایسا ارادہ ہی نہیں تھا ورنہ اب تک یہاں نہ بیٹھا ہوتا۔ جانے والے اتنی دیر نہیں کرتے۔''

''ذلیل آدمی! تو مجھے بلیک میل کر رہا تھا؟'' میں نے آنکھیں نکالیں۔

''ہاں، کبھی کبھی دوستوں کو بھی بلیک میل کرنا پڑتا ہے، ورنہ دوستی برقرار نہیں رہتی۔'' راجا نے ڈھٹائی سے کہا۔

اس کی بات پر شہلا ہنسنے لگی۔ مجھے ایسا لگا جیسے پورے کمرے میں رنگ سے بکھر گئے ہوں۔

اسی وقت شہباز کمرے میں داخل ہوئی اور ہمیں خوش گوار موڈ میں دیکھ کر بولی۔ ''شہلا! میں نے کہا تھا نا کہ یہ ان دونوں کی نورا کشتی ہے، تم بالکل فکر مت کرو۔ نہ تو راجا یہاں سے جائے گا، نہ رفیق اسے جانے دے گا۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''رفیق! تم نے اس وقت تو میری بات نہیں سنی تھی۔ میں کہہ رہی تھی کہ میری ایک شرط ہے۔''

''ہاں بولو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''کیا اب بھی کوئی شرط باقی ہے؟''

''ہاں۔'' شہباز نے کہا۔ ''اور شرط یہ ہے کہ تمہاری اور راجا کی شادی ایک ہی دن ہوگی۔ اب میں اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں سنوں گی۔''

''مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے۔'' میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا جسے شہباز نے اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں تھام لیا۔

''ہاں، اب وہ نیلم کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ خوف اور صدمے سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اب ٹھیک ہے اور تھوڑی دیر بعد وہ بالکل نارمل ہو جائے گی۔''

''وہ تو اب تک اسپتال سے آبھی گئی ہوگی۔'' شہلا نے کہا۔

''راجا!'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''بہت سہہ لیے تیرے نخرے، اب اپنا سامان کھول دے۔''

''سامان کھول دوں؟'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''نکمے پتر! تو کیا سمجھا تھا کہ میں اتنی آسانی سے تیرا پیچھا چھوڑ دوں گا؟ میں نے سامان باندھا ہی کب تھا؟'' راجا نے ہنستے ہوئے کہا۔

جواب میں اس کی پیٹھ پر میں نے ایک دھپ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ جو تو ناصر سے بکواس کر رہا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟''

''اس کا بھی یہی مطلب تھا کہ ناصر تجھے مجبور کرے کہ راجا کو روک لو۔''

''یار، ویسے تو ہے بہت کمینہ!'' میں نے ہنس کر کہا۔

''تیرا ہی دوست ہوں۔'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''آخر

محبت کا بھی کوئی اثر ہوتا ہے۔"

"میں تو اتنا جانتا ہوں مہاراجا کہ یہ پیار کرنے والے، دل سے نہیں نکلتے۔ بدلیں ہزار موسم، رشتے نہیں بدلتے۔" میں نے باقاعدہ گنگنا کر کہا۔

"یار! میں ذہنی طور پر بہت تھک گیا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب ذرا دو گھڑی آرام کروں گا۔"

"تو ٹھہرا نواب!" راجا نے کہا۔ "تو اگر چار یا چھ گھڑی بھی آرام کرے تو تجھے کون روکنے والا ہے؟"

"لیکن ابھی ایسے آرام کا وقت نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "عشق وہ کارِ مسلسل ہے کہ اپنے لیے۔ ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کر سکتے۔"

میں کمرے سے نکل رہا تھا کہ شہلا کی آواز آئی۔ "اپنی مٹی کو سرفراز نہیں کر سکتے۔ یہ در و بام تو پرواز نہیں کر سکتے۔"

میں چلتے چلتے رک گیا اور بولا۔ "شہلا تمہارا شعری ذوق تو بہت اچھا ہے۔" یہ کہہ کر میں اس غزل کا دوسرا شعر گنگناتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ "حسن کو حسن بنانے میں میرا ہاتھ بھی ہے۔ آپ مجھ کو نظر انداز نہیں کر سکتے!"

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہی کمرا جو مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا، وہاں اب مجھے سکون اور راحت کا احساس ہو رہا تھا۔ بس ایک پھانس سی میرے دل میں چبھی ہوئی تھی کہ میں نے اس معصوم اور بے قصور لڑکی نیلم کو بہت بری طرح جھڑک دیا تھا۔

میں نے غنی کو آواز دی تو وہ فوراً کمرے میں آ گیا۔

"جی سر!"

"غنی! تم میرے ساتھ کب سے ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر بولا۔ "سر، میں نے کبھی حساب نہیں لگایا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ صدیوں سے آپ کے ساتھ ہوں۔"

"اور تم مجھے چھوڑ کر جانے کی بات کر رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"سر! میں ایسی بات تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ تو آپ ہی کا حکم تھا کہ......"

"اچھا، ان سب باتوں کو بھول جاؤ اور مجھے......"

"سر!" غنی تڑپ کر بولا۔ "میں جیتے جی تو کبھی آپ کو نہ چھوڑتا۔ آپ کیا سمجھ رہے تھے کہ میں آپ کو تنہا جانے دیتا۔ میں سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگا رہتا۔ میں نے تو سرور اور احمد شاہ کو بھی تیار کر لیا تھا کہ نواب صاحب نے غصے میں یہاں سے تنہا کہیں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن ہم انہیں تنہا چھوڑیں گے نہیں۔"

مجھے غنی کی یہ بات سن کر خوشی بھی ہوئی افسوس بھی! خوشی اس بات کی تھی کہ راناؔ یا میرے کسی اور دشمن کے پاس اس قسم کے جان نچھاور کرنے والے آدمی ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ پیسوں سے صرف لوگوں کو خرید سکتا تھا، ان کے دل میں اپنی ایسی محبت نہیں ڈال سکتا تھا، افسوس اس بات کا تھا کہ میں نے اتنے بے لوث لوگوں کو دکھ دیا تھا، ان کی دل آزاری کی تھی۔

"غنی! آج سے تمہاری، سرور اور احمد شاہ کی تنخواہ میں پانچ ہزار روپے کا اضافہ کر رہا ہوں۔ تم یہ اطلاع سرور اور احمد شاہ کو بھی دے دینا۔"

"سر! وہ......"

"اب ایک کام کرو۔" میں نے کہا۔ "ذرا نیلم کو میرے پاس بھیج دو۔"

"اوکے سر!" غنی نے اسی مستعدی سے کہا جو اس کی عادت تھی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں نے کپڑے بدلے اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی، پھر نیلم سہمے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوئی۔ اس نیلم میں اور اس نیلم میں زمین و آسمان کا فرق تھا جو میرے ساتھ لاہور سے آئی تھی۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ "جی صاحب جی! آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"کیا دروازے ہی پر کھڑے رہ کر میری بات سنو گی؟" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ اندر داخل ہونے کے باوجود دروازے ہی کے پاس رک گئی تھی۔ "اندر آؤ۔"

وہ جھجکتی ہوئی اندر آ گئی۔

"میں جانتا ہوں نیلم کہ میری بات سے تمہیں شدید دکھ اور اذیت پہنچی ہے۔"

"میں اس حویلی میں ملازمہ ہوں صاحب جی!" اس نے بہت ہی زخمی لہجے میں کہا۔ "پھر مالک تو ملازموں کو گالیاں تک دیتے ہیں۔ مجھے آپ کی بات سے بالکل تکلیف نہیں پہنچی۔ ہاں، میں آپ کو غصے میں دیکھ کر بہت زیادہ ڈر گئی تھی۔ میں نے آپ کا وہ روپ کبھی دیکھا نہیں تھا نا!" اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے تو اس بات کا افسوس تھا صاحب جی کہ آپ ہی نے تو مجھے اتنی عزت دی تھی۔ بس یہی سوچ کر آپ کے پاس چلی گئی تھی۔"

"میں اس وقت واقعی بہت غصے میں تھا نیلم! وہ غصہ تم پر نہیں تھا لیکن تم خوامخواہ زد میں آ گئیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم سے اس لہجے میں بات کی۔"

"آپ مجھے شرمندہ مت کریں صاحب جی!" وہ بری طرح رونے لگی۔ "اس حویلی میں آپ کے سوا میرا ہے ہی کون؟ حویلی کے دوسرے ملازم مجھ سے حسد کرتے ہیں کہ اسے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں حویلی میں آئے ہوئے اور یہ نواب صاحب کی خاص ملازمہ بن بیٹھی ہے۔"

"میں احسان فراموش نہیں ہوں نیلم!" میں نے کہا۔ "تم نے دو دفعہ میری جان بچائی ہے۔ ایک دفعہ اس وقت جب تمہارا باپ میرے اغوا میں شریک تھا اور دوسری دفعہ اس وقت جب میں گجرات جاتے ہوئے بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔"

"میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا تھا صاحب جی!" نیلم نے کہا۔ "میں اگر آپ کو اسی حالت میں چھوڑ دیتی تو......تو......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ "مجھے وہ واقعہ یاد مت دلائیں صاحب جی! میں آج بھی آپ کی وہ حالت یاد کرتی ہوں تو میرا دل خون ہو جاتا ہے۔"

"میں اپنے سخت رویے پر شرمندہ ہوں نیلم!" میں نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میں کسی بھی انسان کی دل آزاری کروں۔ تمہیں پہلے کی طرح آزادی ہے، تم حویلی میں ہر جگہ جا سکتی ہو۔ میں سرور کو بھی سمجھا دوں گا۔ اسے بھی میں نے فضول میں بہت بری طرح جھڑک دیا تھا۔"

نیلم کی آنکھوں میں ستارے سے دمکنے لگے۔ وہ خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ کے لیے کافی لاؤں صاحب جی!"

"لے آؤ۔" میں نے ہنس کر کہا۔ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

نیلم کے جانے کے بعد مجھے تکیے کے پاس ہلکی سی وائبریشن محسوس ہوئی تو مجھے یاد آیا کہ میں نے اپنا سیل فون سائلنٹ کر رکھا ہے۔

جب تک میں سیل فون اٹھاتا، گھنٹی خاموش ہو چکی تھی۔

میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا تو وہ کوئی اجنبی نمبر تھا لیکن اس نمبر سے مجھے سات مرتبہ کال کیا گیا تھا۔

میں نے سوچا نہ جانے کس کا نمبر ہے؟ ممکن ہے شامی مجھے کسی دوسرے نمبر سے کال کر رہا ہو۔ میں وہ نمبر ملانے ہی والا تھا کہ سیل فون میں ایک دفعہ پھر تھرتھراہٹ ہوئی۔ مجھے یاد آیا کہ سیل فون میرے کوٹ کی باہر والی دائیں جیب میں رکھا تھا، اس لیے مجھے اس کی وائبریشن محسوس نہ ہو سکی۔

میں نے کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے آنے والی آواز کو میں پہچان نہیں سکا۔ "نواب صاحب بات کر رہے ہیں؟"

"کون صاحب بول رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نواب صاحب! میں اکبر بول رہا ہوں۔"

"اکبر!" میں نے الجھ کر کہا۔

"اکبر سندھو!" اس نے جواب دیا۔

"اچھا اچھا اکبر سندھو! ہاں اکبر! کیسے فون کیا؟"

"میں نے اس لڑکی کے بارے میں معلوم کر لیا ہے جسے آپ کے ساتھ اغوا کیا گیا تھا۔" اکبر نے کہا۔

اس خبر سے میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ میں نے اپنے ہیجان پر قابو پا کر کہا۔ "تم کس لڑکی کی بات کر رہے ہو اکبر؟ میرے ساتھ دو لڑکیاں اغوا ہوئی تھیں۔"

"میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں نواب صاحب جس کی آپ کو تلاش ہے، اس کا نام شاید نور ہے۔"

"ہاں، اس کا نام نور ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کہاں ہے اور تمہیں اس کے بارے میں کیسے اطلاع ملی؟"

"میں اس وقت آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا۔" اکبر نے کہا۔ "میری جان اس وقت خطرے میں ہے۔ میں آپ کو پھر فون کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے عجلت میں رابطہ منقطع کر دیا۔

میں بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھا اور غنی کو آواز دی۔ "غنی! راجا اور ناصر صاحب کو یہاں بھیج دو۔"

غنی نے مستعدی سے سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔

فوراً ہی راجا اور ناصر میرے کمرے میں آ گئے۔ راجا نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا بات ہے فیکے پترا کیا پھر کوئی بات ہو گئی۔ میں نے تو تجھے آرام کرنے کو بھیجا تھا۔"

"یار، اس اکبر سندھو کا فون آیا تھا۔" میں نے کہا اور انہیں تفصیل بتا دی۔

"اکبر سندھو کو کیسے معلوم ہوا نور کے بارے میں؟" راجا نے پوچھا۔

"میں نے اس سے یہی پوچھا تھا لیکن اس نے عجلت میں فون بند کر دیا اور بولا کہ اس وقت میری جان خطرے میں ہے۔"

"تو اسے دوبارہ فون کر۔" راجا نے کہا۔

میں نے سیل فون اٹھا کر اسی نمبر پر فون کیا لیکن دوسری طرف سے ریکارڈنگ سنائی دی کہ آپ کا ملایا نمبر اس وقت بند ہے۔

’’اس کا سیل فون آف ہے۔‘‘ میں نے جواب دیا۔
’’اب سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ ہم اس کی کال کا انتظار کریں۔‘‘ ناصر نے کہا۔
’’ناصر!‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’باہر کی کیا خبریں ہیں؟ پولیس نے اس دھماکے کے بارے میں کچھ معلوم کیا؟‘‘ مجھے اچانک اس پراسرار دھماکے کا خیال آگیا۔
’’پولیس حسب معمول ملزموں کی تلاش میں ہے۔ کچھ گرفتاریاں بھی ہوئی ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ تمام بے قصور لوگ ہوں گے جو اس وقت وہاں سے گزر رہے ہوں گے۔‘‘
اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے یہ سوچ کر کال ریسیو کرلی کہ ممکن ہے یہ کال اکبر سندھو کی ہو۔ ’’ہیلو!‘‘ میں نے کہا لیکن دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔ ’’ہیلو!‘‘ میں نے اس مرتبہ زیادہ بلند آواز سے کہا لیکن دوسری طرف گہرے گہرے سانسوں کی آوازیں آتی رہیں۔ ’’کون صاحب ہیں؟‘‘ میں نے جھنجلا کر پوچھا۔ ’’آپ بولتے کیوں نہیں؟‘‘
جواب میں وہی گہرے گہرے سانس۔
میں نے جھنجلا کر رابطہ منقطع کردیا۔ ’’نہ جانے کون پاگل تھا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’بول ہی نہیں رہا تھا۔‘‘
اسی وقت گھنٹی پھر بجی۔ وہی نمبر تھا۔ میں نے راجا کو بتایا۔ ’’وہی نمبر ہے۔‘‘
راجا نے سیل فون میرے ہاتھ سے لے لیا اور بولا۔ ’’ہیلو!...... بھائی بولتے کیوں نہیں؟...... کوئی تکلیف ہے آپ کو؟...... سانس کی بیماری ہے؟ ہمارے پاس اس کا علاج بھی ہے لیکن آپ کچھ بولیں تو۔‘‘ پھر اس نے بھی سلسلہ منقطع کردیا اور بولا۔ ’’کوئی نہیں بول رہا ہے۔ شاید کوئی تجھے پریشان کررہا ہے ٹیکے پتر! یا پھر کررہی ہے؟‘‘
’’لعنت بھیج!‘‘ میں نے جھنجلا کر کہا۔
اسی وقت سیل فون کی بیل بجی۔ میں نے چونک کر دیکھا لیکن یہ میرے سیل فون کی بیل نہیں تھی بلکہ ناصر کا سیل فون تھا۔
اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور بولا۔ ’’ہیلو واجد!...... نہیں میں پنڈی میں نہیں ہوں...... کیوں...... اچھا کب...... پکی بات ہے؟...... اچھا...... تھینک یو یار!‘‘ اس نے رابطہ منقطع کیا اور راجا سے بولا۔ ’’میرے ایک صحافی دوست کی کال تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ آئی جی عبداللہ جان صاحب کو ان کے عہدے سے ہٹایا جارہا ہے، ان پر کرپشن کے الزامات ہیں۔‘‘
’’کیا؟‘‘ میں اچھل پڑا۔ ’’عبداللہ جان صاحب پر کرپشن کے الزامات؟‘‘
’’تم نے مزید تفصیل معلوم نہیں کی؟‘‘ راجا نے پوچھا۔
’’اسے زیادہ معلوم بھی نہیں ہوگا۔ تفصیل تو مجھے ابھی دوسرے ذرائع سے معلوم ہوجائے گی۔‘‘
’’یار، عبداللہ جان صاحب پر یہ ظلم نہیں ہونا چاہیے۔‘‘ میں نے کہا۔
ناصر نے کسی کا نمبر ڈائل کیا اور بولا۔ ’’وعلیکم السلام! کیا خبریں ہیں؟...... کوئی خاص خبر؟...... یار، میں نے سنا ہے کہ عبداللہ جان صاحب کو ان کے عہدے سے ہٹایا جارہا ہے؟‘‘ ناصر نے کہا...... ’’افواہ ہے...... لیکن افواہ کی بھی تو کوئی بنیاد ہوتی ہے...... کون کررہا ہے...... انہیں کیا تکلیف ہے؟...... اچھا ابھی فیصلہ نہیں ہوا ہے...... ویسے چانسز کیا ہیں؟...... اچھا...... میں دیکھتا ہوں۔‘‘ اس نے سیل فون آف کردیا۔
’’کیا ہوا؟‘‘ میں نے بے تابی سے پوچھا۔
’’میں نے اپنے ایک خاص آدمی کو فون کیا تھا۔ وہ سیکریٹریٹ میں ہے اور اندر کی ساری خبریں رکھتا ہے۔‘‘ ناصر نے کہا۔ ’’وہ بتا رہا تھا کہ مسکین شاہ، عبداللہ جان صاحب کو ان کے عہدے سے ہٹانے کے لیے پورا زور لگا رہا ہے۔‘‘
’’تو پھر یہ افواہ تو نہیں ہوئی؟‘‘ راجا نے کہا۔
’’ہاں، افواہ نہیں ہے۔‘‘ ناصر نے کہا۔ ’’مسکین شاہ اس وقت اس پوزیشن میں ہے کہ کوئی بھی اس کی بات ٹال نہیں سکتا۔ ممکن ہے ایک دو روز میں کوئی فیصلہ ہوجائے اور یہ فیصلہ عبداللہ جان کے خلاف ہی ہوسکتا ہے۔‘‘
’’ٹیکے پتر! مسکین شاہ کو اندازہ ہے کہ عبداللہ جان صاحب تیری حمایت کرتے ہیں۔ وہ ان ہی کو راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔‘‘
’’لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔‘‘ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ’’اس سے پہلے ہی مسکین شاہ کو بے نقاب کردوں گا۔‘‘ پھر میں راجا سے مخاطب ہوا۔ ’’تم اور ناصر اس سلسلے میں کوئی اسٹوری بنا رہے تھے، اس کا کیا ہوا؟‘‘
’’اس کا موقع ہی کہاں ملا؟‘‘ راجا نے کہا۔ ’’لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اسٹوری تو میرے ذہن میں ہے۔ ابھی ہم لوگ بنالیں گے۔ تو سب سے پہلے وہ اسٹف شامی سے یہاں منگوا لے جو مسکین شاہ کے خلاف استعمال ہوگا۔‘‘
’’اس سلسلے میں بھی بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔‘‘ ناصر نے کہا۔ ’’شامی کا یہاں بخیریت پہنچنا بہت ضروری ہے۔‘‘
’’میں ایسا کرتا ہوں، غنی، احمد شاہ اور سرور کو لاہور بھیج دیتا ہوں۔ وہ شامی اور گولی کو اپنے ساتھ لے آئیں گے۔‘‘
’’یہی مناسب رہے گا۔‘‘ راجا نے کہا۔ ’’یہ لوگ اپنی جان دے دیں گے لیکن شامی پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔‘‘
میں نے گھڑی دیکھی۔ ’’اس وقت چار بج رہے ہیں اگر غنی اس وقت لاہور کے لیے نکل جائے تو وہ لوگ رات کو گیارہ بجے تک واپس آجائیں گے۔‘‘
’’رات کے وقت ان کا سفر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔‘‘ راجا نے کہا۔ ’’وہ لوگ اس وقت لاہور چلے جائیں اور کل علی الصباح وہاں سے گولی اور شامی کو لے کر ست بدھائی آجائیں۔ وہ کل آٹھ، نو بجے تک یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس وقت تک ہم بھی ضروری تیاریاں کرلیں گے۔‘‘
میں نے اس وقت غنی کو بلایا اور اسے ہدایت دی کہ وہ اسی وقت احمد شاہ اور سرور کے ساتھ لاہور چلا جائے۔ وہاں سے شامی اور گولی کو لے کر ست بدھائی پہنچ جائے۔
’’تم نے شامی کا وہ ٹھکانا تو دیکھا ہے نا؟‘‘ میں نے غنی سے پوچھا۔
’’جی سر!‘‘ غنی نے جواب دیا۔
’’ٹھیک ہے، تم ابھی لاہور کے لیے نکل جاؤ۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اور بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ شامی اور اس سامان کا یہاں صحیح سلامت پہنچنا بہت ضروری ہے ورنہ میری ساری محنت اکارت ہوجائے گی۔‘‘
’’آپ فکر نہ کریں سر!‘‘ غنی نے اٹل لہجے میں کہا۔ ’’مجھے اگر اس کے لیے خون کی ندیاں بھی بہانا پڑیں تو میں بہا دوں گا۔ جب تک ہم تینوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہے۔ شامی کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔‘‘ یہ کہہ کر غنی وہاں سے چلا گیا۔
مجھے خیال آیا کہ میں خود بھی شامی سے بات کرکے اسے بتادوں کہ میرے آدمی وہاں آرہے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ چلا آئے۔
اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اس مرتبہ بھی کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگالیا۔ ’’ہیلو!‘‘ میں نے کہا۔
’’نواب صاحب! میں اکبر بول رہا ہوں۔‘‘
’’ہاں اکبر!‘‘ میں نے کہا۔ ’’تم اس وقت کہاں ہو؟‘‘
’’میں دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں نواب صاحب!‘‘ اس نے کہا۔ ’’یہ لوگ کسی بھی وقت میری جان لے سکتے ہیں۔‘‘
’’تم اس وقت ہو کہاں؟‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’میں اپنے آدمیوں کو بھیج دیتا ہوں۔‘‘
’’دشمن شاید مجھے اتنی مہلت نہ دیں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’میں آپ کو نور کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ اس وقت گجرات کے ایک صنعت کار اشفاق احمد گھمن کی تحویل میں ہے، گھمن انڈسٹریز کے نام سے اس کی فیکٹریاں ہیں۔ وہ وہاں کا خاصا بااثر شخص ہے اور......‘‘ وہ بولتے بولتے خاموش ہوگیا، پھر بولا۔ ’’نواب صاحب! مجھے ایسا لگا ہے جیسے میرے مکان میں کوئی کودا ہے۔ اگر زندگی رہی تو آپ سے ست بدھائی آکر ملاقات کروں گا۔ خدا حافظ!‘‘ اس نے اچانک سلسلہ منقطع کردیا۔
میں نے ناصر اور راجا کو اکبر کی گفتگو سے آگاہ کیا۔
’’اشفاق گھمن!‘‘ ناصر نے کہا۔ ’’میں اسے جانتا ہوں۔‘‘
’’کس قسم کا آدمی ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’اس سے میری ایک دو ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں۔‘‘ ناصر نے کہا۔ ’’اتنا جانتا ہوں کہ وہ کوئی نیک نام آدمی نہیں ہے۔‘‘
’’رانا کا دوست ہے تو نیک نام کیسے ہوسکتا ہے۔‘‘ راجا نے کہا۔ ’’میں بھی اس کے بارے میں جانتا ہوں۔ انتہائی اوباش شخص ہے، بہت ظالم ہے۔‘‘
’’بزدل آدمی عیاش اور اوباش بھی ہوتا ہے اور ظالم بھی۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’پہلے تو یہ معلوم کیا جائے کہ اس کے معمولات کیا ہیں؟ اس نے نور کو کہاں رکھا ہے اور......‘‘
’’یہ سب تو گجرات جاکر ہی معلوم ہوگا۔‘‘
’’تھوڑا بہت تو میں ابھی اور اسی وقت معلوم کرسکتا ہوں۔‘‘ راجا نے کہا۔ ’’گجرات کا ایک صحافی میرا دوست ہے، وہ اشفاق کو بہت اچھی طرح جانتا ہوگا۔‘‘
’’میں عبداللہ جان صاحب سے بات کرتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا اور سیل فون اٹھالیا۔
’’ٹیکے پتر!‘‘ راجا نے کہا۔ ’’تو عبداللہ جان صاحب کو اس سازش کے بارے میں بھی بتادے جو ان کے خلاف ہو رہی ہے۔‘‘

میں نے عبداللہ جان صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی، پھر میں مایوس ہو کر لائن کاٹنے ہی والا تھا کہ دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔ ''ہیلو!'' مجھے عبداللہ جان صاحب کی بھاری آواز سنائی دی۔

''السلام علیکم!'' میں نے کہا۔

''وعلیکم السلام!'' عبداللہ جان صاحب مجھے اس وقت بہت خوش گوار موڈ میں لگے۔ ''کیسے میں نواب صاحب؟''

''میں تو خیریت سے ہوں۔ آپ کے مزاج کیسے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''شکر الحمد للہ!'' عبداللہ جان صاحب نے ہنس کر کہا۔ ''کرم ہے اس مالک کا!'' پھر وہ ہنس کر بولے۔ ''آپ کو اس وقت ہماری یاد کیسے آگئی نواب صاحب؟''

''کافی عرصے سے آپ سے بات نہیں ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے سوچا کہ آپ خود تو فون کریں گے نہیں، میں ہی کرلوں۔''

''آپ کی بہت نوازش نواب صاحب! اصل میں آج کل مصروفیت کچھ زیادہ ہے۔ میں تو روز آپ سے بات کرنے کے بارے میں سوچتا ہوں لیکن......''

''آپ آج کل لاہور ہی میں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بھئی!'' عبداللہ جان صاحب ہنسے۔ ''ہم تو ملازمت پیشہ لوگ ہیں اور کہاں جاسکتے ہیں، آپ کی طرح نواب تو ہیں نہیں کہ جب دل چاہا لاہور چلے آئے، جب دل چاہا لندن چلے گئے یا سیر و شکار کو نکل گئے۔'' وہ ہنس کر بولے۔

''عبداللہ صاحب!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے کچھ عجیب و غریب خبریں ملی ہیں کہ......''

''مجھے کرپشن کے الزام میں ہٹایا جارہا ہے۔'' عبداللہ جان نے میرا جملہ پورا کردیا۔ ''میں پولیس میں ہوں نواب صاحب! میں دنیا بھر کی خبریں رکھتا ہوں۔ مجھے اپنے ہی بارے میں خبر نہیں ہوگی؟''

''لیکن میں تو اس خبر سے بہت پریشان ہوگیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے ذرہ برابر پریشانی نہیں ہے۔'' عبداللہ جان صاحب نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ مسکین شاہ کافی دنوں سے میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ یہ لوگ مجھے میرے عہدے سے تو ہٹاسکتے ہیں لیکن کرپشن کا الزام ثابت نہیں کرسکتے۔''

''کیا آپ ست بدھائی تشریف لاسکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''اگر آپ کو کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو؟''

''نواب صاحب! اگر آپ کو کوئی ضروری کام ہے تو میں اپنی ہر مصروفیت چھوڑ سکتا ہوں۔'' عبداللہ جان صاحب نے کہا۔

''مجھے آپ سے واقعی بہت ضروری کام ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر آپ کل ہی ست بدھائی تشریف لے آئیں تو......''

''میں آجاؤں گا۔'' عبداللہ جان صاحب نے کہا۔ ''کل شام کی چائے ہم لوگ آپ کے ساتھ ہی پئیں گے۔'' وہ ہنس کر بولے۔ ''بھئی، اب میں ست بدھائی آ ہی رہا ہوں تو سوچتا ہوں اپنی بیگم اور بچوں کو بھی لے آؤں، ان بے چاروں کی بھی آؤٹنگ ہوجائے گی۔ ہماری بیگم تو یوں بھی اکثر ست بدھائی آنے کا پروگرام بناتی رہتی ہیں۔''

''بسر و چشم!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے بہت خوشی ہوگی۔ تو پھر کل شام کو میں آپ کا انتظار کروں گا۔''

''ہم لوگ کل شام ساڑھے چار، پانچ بجے تک ست بدھائی پہنچ جائیں گے۔''

پھر رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد انہوں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

''کیا عبداللہ جان صاحب یہاں آرہے ہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''انہوں نے وعدہ تو کرلیا ہے۔ اگر عین وقت پر کوئی مصروفیت آڑے نہ آگئی تو وہ انشاء اللہ ضرور یہاں آئیں گے۔''

''عبداللہ جان صاحب ان پولیس افسروں میں سے ہیں جو ہر قیمت پر وعدہ نبھاتے ہیں۔ اب آندھی آئے یا طوفان، عبداللہ جان ہر صورت میں کل یہاں ہوں گے۔'' راجا نے کہا۔

''میں نے اپنے صحافی دوست سے گھمسن کے بارے میں معلوم کیا ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''تم نے اس سے کس وقت بات کرلی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''جب آپ عبداللہ جان صاحب سے بات کرنے میں مصروف تھے۔'' ناصر نے ہنس کر کہا۔

''کیا معلوم ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''گھمسن گجرات کا خاصا بدنام آدمی ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''چند برس پہلے تک اس کی سائیکلوں کی دکان تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پہلے پنکھوں کے چھوٹے موٹے پرزوں کی فیکٹری لگائی، پھر وہ پنکھے بنانے لگا۔ اس کا محل نما گھر گجرات سے تین چار میل دور ہے اور اس نے بدمعاشوں کی ایک پوری فوج رکھی ہوئی ہے۔ علاقے کی پولیس اس کی مٹھی میں ہے، اس لیے کوئی اس کے خلاف کچھ بولتا بھی نہیں ہے۔''

''وہ آج کل گجرات ہی میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، آج کل وہ گجرات ہی میں ہے۔'' ناصر نے جواب دیا۔

اچانک مجھے گجرات کے ڈپٹی کمشنر افتخار ٹوانہ کا خیال آیا۔ اس نے ایک دفعہ پہلے بھی میری بہت مدد کی تھی۔ وہی مجھے زخمی حالت میں گجرات لے گیا تھا۔

میں نے اپنا سیل فون اٹھایا لیکن میرے پاس افتخار ٹوانہ کا سیل نمبر نہیں تھا۔

''یار ناصر! تم کسی سے گجرات کے ڈی سی افتخار ٹوانہ کا فون نمبر لے سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

راجا نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''ہاں یار، مجھے اس ڈی سی کا تو خیال ہی نہیں آیا، اس کا سیل نمبر ملنا کیا مشکل ہے۔ ابھی وہاں کے کسی صحافی سے معلوم کر لیتے ہیں؟'' پھر وہ ناصر سے بولا۔ ''ناصر! تم اپنے اسی صحافی دوست کو فون کرو۔ اس کے پاس یقیناً ٹوانہ صاحب کا سیل نمبر ہوگا یا نہیں بھی ہوگا تو وہ کسی سے معلوم کرکے بتادے گا۔''

''ٹوانہ بہت بھلا آدمی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ اس موقعے پر بھی ہماری مدد ضرور کرے گا۔''

''شرط یہ ہے کہ وہ بھی گھمسن کے زیر اثر نہ ہو۔'' راجا نے کہا۔

ناصر نے اپنے اسی صحافی دوست کو فون کیا جس سے وہ گھمسن کے بارے میں پوچھ چکا تھا۔

پھر ناصر نے بتایا کہ اس کے پاس ڈی سی کا سیل نمبر موجود ہے۔ وہ ابھی اسے ایس ایم ایس کردے گا۔

اسی وقت ناصر کے سیل فون پر ایس ایم ایس آگیا۔ ناصر نے مجھے ڈی سی کا سیل نمبر نوٹ کرایا اور بولا۔ ''پہلے آپ ڈی سی صاحب سے کچھ علیک سلیک کرلیں۔''

میں نے ڈی سی کا نمبر ملایا، اس نے دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کرلی۔ ''ہیلو!'' مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

''افتخار ٹوانہ صاحب!'' میں نے پوچھا۔

''جی بول رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کون صاحب بول رہے ہیں؟''

''میں رفیق احمد شیرازی بول رہا ہوں، ست بدھائی سے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا آپ ہیں؟'' وہ گرم جوشی سے بولا۔ ''کیسے ہیں نواب صاحب؟''

''میں خیریت سے ہوں، آپ سنائیے؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میں بھی بہ خیریت ہوں۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''اس وقت آپ کو میری یاد کیسے آگئی؟''

''بھئی آپ نے تو پھر لوٹ کر کوئی رابطہ رکھا ہی نہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن ہم اتنے بے مروت نہیں ہیں۔''

''میں نے کئی بار ست بدھائی آنے کا پروگرام بنایا لیکن آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج کل ملک کی صورت حال کیا ہے، پھر گجرات تو سیاست کا گڑھ ہے، ان سیاسی اکھاڑوں میں سب سے زیادہ کم بختی ڈی سی اور کمشنر کی آتی ہے۔ آپ فرمائیں کیسے فون کیا؟''

''ٹوانہ صاحب، میں گجرات آنے کے بارے میں سوچ رہا تھا، میں نے سوچا، آپ سے بات کرلوں۔ وہاں اور تو کسی سے میری جان پہچان ہے نہیں۔''

''سر آنکھوں پر۔'' افتخار ٹوانہ نے کہا۔ ''اپنی اس پی اے کو بھی ضرور لائیے گا۔ میری بیگم کو وہ بہت پسند آئی تھی۔''

''میری پی اے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، وہ اپنی غلط فہمی پر شرمندہ بھی ہیں، ویسے بھی انہیں آپ کی پی اے سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی۔''

مجھے یاد آیا وہ نیلم کے بارے میں بات کررہا تھا۔

''میری پی اے آج کل چھٹی پر ہے، دیکھیے اگر وہ آگئی تو اسے بھی لے آؤں گا۔'' پھر میں نے یوں ہی سرسری انداز میں پوچھا۔ ''افتخار صاحب! وہاں ایک صنعت کار ہیں گھمسن صاحب! آپ انہیں جانتے ہیں؟''

''کیا وہ آپ کے دوست ہیں؟'' ڈی سی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میرے دوست ہوتے تو میں آپ سے کیوں پوچھتا۔ میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ گجرات میں آپ کے علاوہ میں کسی کو بھی نہیں جانتا۔''

''گھمسن سے کیا کام پڑ گیا آپ کو؟'' افتخار نے پوچھا۔

''لاہور میں میرے ایک دوست ہیں۔ وہ گھمسن کو جانتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ گھمسن کسی نئی فیکٹری کی

تیاری کر رہا ہے۔ آپ اگر اس میں سرمایہ لگانا چاہیں تو کھمن سے بات کرلیں۔"

"میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اس کے ساتھ بالکل شراکت نہ کریں۔ انتہائی کمینہ اور گھٹیا آدمی ہے۔ آپ کو فائدے کے بجائے نقصان ہی ہوگا۔"

"میں نے ابھی سرمایہ کاری کا فیصلہ نہیں کیا ہے، صرف سوچ رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"آپ کو سرمایہ لگانا ہی ہے تو یہاں کئی بہت اچھے اور دیانت دار صنعت کار بھی ہیں، آپ ان کے ساتھ سرمایہ کاری کرسکتے ہیں۔"

"میں نے تو یوں ہی پوچھ لیا تھا۔" میں نے کہا۔

"کھمن انتہائی بددیانت آدمی ہے۔ وہ جائز اور ناجائز ہر حربہ استعمال کرتا ہے بلکہ جائز کم اور ناجائز کام زیادہ کرتا ہے۔ قومی اسمبلی کا ایک ممبر اس کا چچازاد ہے۔ اس وجہ سے علاقے کی پولیس بھی اس سے خوف کھاتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ بھی اس سے خوف زدہ ہیں۔" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"میں تو اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہوں۔ اگر میرا بھائی چیف سیکریٹری نہ ہوتا تو یہ کھمن اب تک یہاں سے میرا تبادلہ کراچکا ہوتا۔ میں خود بھی اس شہر میں رہنا نہیں چاہتا، لیکن جب بھی جاؤں گا، اپنی مرضی سے جاؤں گا۔ میں ٹوانہ ہوں، کوئی کھمن یا ایرا غیرا نہیں ہوں۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "چھوڑیے، آپ بھی کس خبیث آدمی کا تذکرہ لے بیٹھے، یہ بتایئے، آپ گجرات کب آرہے ہیں؟"

"میں اسی ہفتے میں گجرات آؤں گا۔" میں نے کہا۔

"آنے سے پہلے مجھے فون ضرور کردیجیے گا۔" اس نے کہا۔

"ضرور!" میں نے ہنس کر کہا۔ "اچھا ٹوانہ صاحب! میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔ اب اجازت چاہوں گا۔"

"نواب صاحب! آپ تو ان چند افراد میں سے ہیں جو مجھے پہلی ہی نظر میں اچھے لگے ہیں، مجھے دوبارہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔"

"اس وقت تک کے لیے خدا حافظ!" میں نے ہنس کر کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

راجا اور ناصر بہت دلچسپی سے میری گفتگو سن رہے تھے، راجا ہنس کر بولا۔ "ملکیے پتر! تو تو بہت اچھا سیاست دان بن سکتا ہے، تو نے ٹوانہ سے کیسے ساری باتیں اگلوالیں۔"

"سیاست دان تو خیر میں بنوں گا ہی۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن رانا زوہیب اور اس کے باپ نے مجھے مجبور کردیا سیاستدان بننے پر!"

"یہ تیری سیکریٹری کب سے پیدا ہوگئی؟" راجا نے کہا۔

"یار، وہ نیلم کو پہلے تو میری بیگم سمجھا، پھر جب میں نے اسے بتایا کہ وہ میری بیگم نہیں ہے تو اس نے نیلم کو میری پی اے کا درجہ دے دیا۔" میں ہنس کر بولا۔

"یار، ویسے تو اب کوئی شوخ اور خوب صورت قسم کی سیکریٹری رکھ ہی لے۔" راجا نے کہا۔

"یہ مشورہ نور کے سامنے دینا۔" میں نے کہا۔

اسی وقت ڈاکٹر شہناز اور شہلا آگئیں۔ شہناز نے مجھے بیٹھے دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔ "رفیق! میں نے تم سے کہا تھا کہ تم آرام کرو، تم یہاں بیٹھے ان لوگوں کے ساتھ گپیں ہانک رہے ہو!"

"گپیں نہیں ہانک رہا بلکہ آئندہ کا لائحہ عمل طے کررہا ہوں۔ نور کے بارے میں معلوم ہوگیا ہے۔"

"نور کے بارے میں؟" شہناز کے لہجے میں خوش گوار حیرت تھی۔ "وہ کہاں ہے؟"

"وہ اس وقت گجرات میں ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "میں اور راجا ابھی یہی طے کررہے تھے کہ اس تک کیسے پہنچا جائے؟"

"یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے رفیق!" شہناز ہنس کر بولی۔ "اب تو تمہارا بلڈ پریشر نارمل ہوگیا ہوگا؟"

"اب تو اس کا بلڈ پریشر مزید بڑھ گیا ہے۔" راجا ہنس کر بولا۔

اچانک میری نظر شہلا کے چہرے پر پڑی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی افسردگی اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔ مجھ سے نظریں ملیں تو اس نے جلدی سے نظریں چرالیں۔ اس کا رویہ کچھ عجیب سا تھا۔

"میں اس کھمن کے بارے میں مزید معلومات کرتا ہوں۔" ناصر اٹھتے ہوئے بولا۔

"آج تو شام کی چائے پر کچھ اہتمام ہونا چاہیے۔" شہناز نے کہا۔ "میں ابھی ریشم کو ہدایات دیتی ہوں۔" وہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

راجا کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو وہ بھی سیل فون لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

شہلا ابھی تک وہاں بیٹھی تھی۔ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”نواب صاحب! آج تو آپ بہت خوش ہوں گے؟“

”بات ہی خوشی کی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔ نور تمہارا تو بہت خیال رکھتی تھی۔“

”مجھے خوشی کیوں نہیں ہوگی۔“ شہلا نے کہا، لیکن اس کا لہجہ الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

پھر ریشم نے کمرے میں جھانکا اور بولی۔ ”صاحب جی! غنی کو آپ نے کہیں بھیجا ہے؟“

”کیوں؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ”تمہیں اس وقت غنی کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“

”وہ دو تین گھنٹے سے غائب ہے، میں نے سوچا کہ......“

”غنی میری اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ ایک ضروری کام سے گیا ہے۔“

”آپ کو ڈاکٹر شہناز بلا رہی ہیں۔“ ریشم نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”اچھا، تم چلو، میں آ رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

اس کے جانے کے بعد شہلا نے کہا۔ ”کبھی کبھی تو مجھے آپ کے رویے پر بہت حیرت ہوتی ہے، آپ نے ان ملازمین کو اتنا سر چڑھا رکھا ہے۔“

”صرف غنی اور ریشم کو!“ میں نے کہا۔ ”ان لوگوں نے میری خدمت بھی بہت کی ہے۔“

”آپ نیلم کا نام بھول گئے۔ آج کل تو وہ بھی آپ کی گڈ بکس میں ہے۔“ شہلا کے لہجے میں خفیف سا طنز تھا۔ ”میں نے تو سنا ہے کہ آپ نے ڈانٹنے پر اس سے معذرت بھی کی ہے!“

”ڈاکٹر شہلا! میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ جو دلوں کو فتح کر لے، وہی فاتح زمانہ!“ یہ کہہ کر میں اٹھ گیا۔

☆☆☆

میں ساری رات نہ جانے کیوں بے چین رہا۔ وقفے وقفے سے میری آنکھ کھلتی رہی، شاید یہ اضطراب اور بے چینی نور کا سراغ ملنے پر تھی۔ اس وجہ سے صبح میری آنکھ خلاف معمول کچھ دیر سے کھلی۔ میں نے حسب عادت غنی کو آواز دی لیکن فوراً ہی مجھے خیال آ گیا کہ غنی تو ابھی لاہور سے لوٹا بھی نہیں ہوگا۔ میری آواز کے جواب میں نیلم کمرے میں داخل ہوئی۔ ”صاحب جی! غنی تو ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آیا۔“

”اچھا، تم میرے لیے چائے لے کر آؤ اور دیکھو باہر اخبار بھی ہوں گے۔ وہ بھی مجھے دے جاؤ۔“

نیلم کمرے سے باہر نکلی ہی تھی کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی تو غنی کا نام دیکھ کر چونک اٹھا۔ میں نے فوراً سیل فون کان سے لگا لیا۔

”ہاں غنی!“

”سر! وہ شامی تو یہاں موجود ہی نہیں ہے، کوئی بھی نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”اس بنگلے پر موجود آدمی سے میں نے شامی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔“

”کیا بکتے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”ہم لوگ ست بدھائی آ رہے ہیں۔“

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور شامی کا سیل نمبر ڈائل کیا لیکن اس کا سیل فون آف تھا اور ریکارڈنگ سنائی دے رہی تھی کہ آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ غنی اور احمد شاہ کی جگہ باہر ایک دوسرا گارڈ احمد موجود تھا۔ میں نے اشارے سے اسے بلایا اور اس سے کہا۔ ”راجا اور ناصر صاحب کو یہاں بھیج دو۔“

”سر، وہ دونوں تو صبح ہی صبح کہیں چلے گئے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں دوبارہ کمرے میں آ گیا۔ نیلم میرے لیے چائے لے آئی تھی۔ میں نے چائے کے دو چار گھونٹ لیے، پھر سیل فون اٹھا کر راجا کا نمبر ڈائل کیا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔ ”ہاں فیکے!“ راجا نے کہا۔

”یار، تم لوگ کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم لوگ ذرا دینہ تک آئے تھے، اب واپس آ رہے ہیں، اس وقت دوسری چیک پوسٹ کے پاس ہیں۔“ راجا نے کہا۔ ”خیریت تو ہے فیکے پتر! تو مجھے بہت گھبرایا ہوا لگ رہا ہے؟“

”خیریت نہیں ہے یار!“ میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ”تم لوگ واپس آؤ گے تو تمہیں بتاؤں گا۔“ میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو باہر بالکل سناٹا تھا۔ شہناز اسپتال میں ہوگی یا پھر اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہوگی۔ راجا اور ناصر موجود نہیں تھے۔ نیلم ایک مرتبہ پھر آئی اور مجھ سے ناشتے کے بارے میں پوچھا تو میں نے انکار کر دیا اور ٹہلتا ہوا مین گیٹ کی طرف نکل گیا۔ میں نے مین گیٹ کھلتے دیکھا، پھر ایک پرانی سی کرولا اندر داخل ہوئی۔ اس میں شامی اور گولی کو دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

شامی گاڑی سے اترا اور والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گیا۔ ”کیسے ہو نواب بھائی؟“

”جیسا بھی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”لیکن تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہو گیا تھا۔“

”کیوں؟“ وہ حیرت سے بولا۔

میں نے اسے غنی اور احمد شاہ وغیرہ کے بارے میں بتایا۔

”میں نے ہی اس آدمی کو ہدایت کی تھی کہ کسی کو بھی میرے بارے میں نہ بتائے۔ آپ کم سے کم مجھے فون پر بتا دیتے۔“ شامی نے کہا۔

”تمہارا ٹیلی فون بند ہے۔“ میں نے کہا۔

”بند ہے؟“ شامی نے حیرت سے کہا، پھر سیل فون جیب سے نکال کر دیکھا اور بولا۔ ”اوہو، اس کی تو بیٹری ہی ختم ہو گئی۔ میں نے تو دو دن سے بیٹری چارج ہی نہیں کی۔“

”اچھا چلو، اندر تو چلو۔“ میں نے کہا۔ پھر گولی سے بولا۔ ”تم کیسی ہو گولی؟“

”میں بھی جیسی ہوں، آپ کے سامنے ہوں۔“ گولی نے میرا ہی جملہ دہرا دیا اور ہنسنے لگی۔

”ایک منٹ!“ شامی نے کہا۔ ”میں آپ کی امانت تو نکال لوں۔“

اس نے پسنجر سیٹ ہٹا کر اس کے نیچے بنے ہوئے خفیہ خانے سے وہ بریف کیس برآمد کیا، پھر پچھلی سیٹ ہٹا کر ایک اور بریف کیس برآمد کیا اور بولا۔ ”ایک بریف کیس میں نے دشمنوں کو دھوکا دینے کے لیے رکھا تھا کہ اگر میں کہیں پکڑا بھی جاؤں تو یہ بریف کیس ان کے حوالے کر دوں۔ اس میں بھی سی ڈیز ہیں لیکن وہ سب ہندی اور انگریزی فلموں کی ہیں۔“ اس نے پسنجر سیٹ کے نیچے سے نکالا ہوا بریف کیس مجھے دے کر کہا۔ ”اس میں آپ کی امانت ہے۔“

میں نے شامی کو ایک مرتبہ پھر گلے لگا لیا اور بولا۔ ”تم نے واقعی مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔“

”نواب بھائی!“ شامی نے کہا۔ ”اب آپ میری

تلاش

کرکٹ کا میچ ہو رہا تھا۔ اسٹیڈیم کے گیٹ پر ایک لڑکا پاس دکھا کر اندر جانے لگا تو گیٹ کیپر نے کہا۔ ”یہ تمہارا پاس تو نہیں ہے۔“

”یہ میرے چچا جان کا ہے۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

”وہ کیوں نہیں آئے؟“ گیٹ کیپر نے پوچھا۔

”وہ بہت مصروف ہیں۔“ لڑکا بولا۔

”کیا کر رہے ہیں؟“ گیٹ کیپر نے پوچھا۔

”اپنا پاس تلاش کر رہے ہیں۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

☆☆☆

باپ (بیٹے سے) ”جب ابراہم لنکن تمہاری عمر کا تھا تو وہ اپنی روزی خود کماتا تھا۔“

لڑکا ”یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اتنا معلوم ہے کہ جب وہ آپ کی عمر کا تھا تو ملک کا صدر تھا۔“

☆☆☆

ایک ننھے بچے نے اسکول سے آتے ہی اپنے باپ سے کہا۔ ”ڈیڈی، پلیز کم ہیر!“

باپ نے خوش ہو کر کہا۔ ”تم تو بہت اچھی انگریزی بولنے لگے ہو۔ اچھا، یہ بتاؤ اگر مجھے گھر سے باہر بلانا ہو تو تم کیا کہو گے؟“

یہ سن کر لڑکے نے کہا۔ ”میں دروازے کے باہر کھڑا ہو جاؤں گا اور پھر کہوں گا، ڈیڈی، پلیز کم ہیر!“

☆☆☆

وکیل۔ ”میں تمہارا مقدمہ لڑوں گا مگر خرچ بھی برداشت کر سکو گے؟“

ملزم۔ ”جناب! میرے پاس صرف سونے کا ایک ہار ہے۔“

وکیل۔ ”خوب! یہ میری فیس کے لیے کافی ہوگا، تم پر الزام کیا ہے؟“

ملزم۔ ”جناب! مجھ پر اسی ہار کی چوری کا الزام ہے۔“

مرسلہ: حمدان ناصر، صدر کراچی

محبت کا مذاق تو مت اڑاؤ۔"

"چلو، پہلے ناشتا کرلیں۔" میں نے کہا۔ "باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

"ناشتا ہم نے بھی نہیں کیا ہے؟" راجا کی آواز آئی۔

وہ لوگ نہ جانے کس وقت آگئے تھے۔ میں شامی میں اتنا محو تھا کہ مجھے ان کی آمد کا علم ہی نہ ہوسکا۔

ناشتا تیار تھا۔ ریشم اور نیلم نے مل کر جلدی جلدی ناشتا لگادیا۔

"تو، تو بہت پریشان تھا نکے پتر؟" راجا نے پوچھا۔ "لیکن اس وقت تو تیرے چہرے پر پریشانی کی پرچھائیں تک نہیں ہے۔"

میں نے اسے بتایا کہ میں کیوں پریشان تھا۔

"یہ بات تو واقعی پریشانی کی تھی۔" ناصر نے کہا۔

"تم لوگ صبح صبح کہاں چلے گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے لیپ ٹاپ کی ہارڈ ڈسک اڑ گئی تھی۔" ناصر نے جواب دیا۔ "میرا خیال تھا کہ دینہ سے مجھے ہارڈ ڈسک مل جائے گی لیکن وہاں لیپ ٹاپ کی کوئی دکان نہیں ہے۔ ایک دکان ہے بھی تو اس میں کچھ پرانے لیپ ٹاپ رکھے ہوئے ہیں، البتہ پی سی کی کئی دکانیں ہیں۔"

"تمہیں اگر ضرورت ہے تو میرا لیپ ٹاپ استعمال کرلو۔" میں نے کہا۔

"ضرورت پڑے گی تو آپ سے لے لوں گا۔ فی الحال تو میں راجا کے لیپ ٹاپ ہی سے کام چلالوں گا۔"

ہم لوگوں نے ناشتا خوش گوار موڈ میں کیا۔

☆☆☆

میں نے صوبیدار میجر صاحب کو بتایا کہ نور کا سراغ مل گیا ہے تو وہ ایک دم پرجوش ہوگئے اور بولے۔ "رفیق میاں! بہت محتاط ہوکر یہ آپریشن کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر رانا کو بھنک بھی مل گئی کہ ہمیں نور کا سراغ مل چکا ہے تو وہ راتوں رات نور کو کہیں غائب کردے گا۔"

"آپ کی بات تو درست ہے۔" میں نے کہا۔ "اسی لیے میں نے ابھی تک کوئی پلاننگ بھی نہیں کی ہے۔"

"پلاننگ تو ہمیشہ دشمن کی پوزیشن دیکھ کر کی جاتی ہے۔" ان کے اندر کا فوجی ایک دم بیدار ہوگیا۔ "پہلے ہمیں دشمن کی خامیوں کو تلاش کرنا ہوگا، پھر اس پر اچانک حملہ کرنا ہوگا لیکن سوچنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کرنا چاہیے۔"

میں ان کے پاس بیٹھا ہی تھا کہ غنی، احمد شاہ اور سرور آگئے۔ ان کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ انہیں شاید علم ہوگیا تھا کہ میں اس وقت صوبیدار میجر صاحب کے پاس بیٹھا ہوں۔ وہ تینوں اس لیے سیدھے وہیں آگئے تھے۔

"سر!" غنی نے سر جھکا کر کہا۔ "وہ شامی......"

"شامی اور گولی دونوں یہاں پہنچ چکے ہیں۔" میں نے کہا۔

ان تینوں کے چہرے اچانک کھل اٹھے۔ "سر، آپ کم سے کم مجھے فون ہی کردیتے۔" غنی نے کہا۔ "میری تو جان ہی نکلی جارہی تھی کہ اب میں آپ کا سامنا کیسے کروں گا۔"

میں صوبیدار میجر صاحب سے رخصت ہوکر باہر نکلا تو غنی اور سرور میرے ساتھ ساتھ تھے۔ احمد شاہ ان سے چند قدم پیچھے تھا۔ وہ ابھی مجھ سے اتنا بے تکلف نہیں ہوا تھا کہ میرے ساتھ چلنے کی جرأت کرسکتا۔

"غنی! ایک خوش خبری اور بھی ہے۔" میں نے کہا۔ "نور کا سراغ مل گیا ہے۔"

غنی اور سرور دونوں کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے۔ غنی نے پوچھا۔ "وہ کہاں ہیں سر!"

"وہ گجرات میں ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب تم لوگ ایک نئے معرکے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

"ہم تو ہر وقت تیار رہتے ہیں سر!" سرور نے کہا۔

شامی باہر برآمدے میں ہی بیٹھا تھا۔ اس نے غنی سے بہت معذرت کی کہ اسے اتنی پریشانی اٹھانا پڑی۔ "میں نے احتیاطاً اپنے آدمی کو منع کردیا تھا کہ......"

"شامی بھائی!" غنی نے کہا۔ "اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے؟ غلطی ہماری ہی تھی۔ ہمیں پہلے فون کرلینا چاہیے تھا۔"

☆☆☆

حویلی کا مین دروازہ کھلا اور ایک ہنڈا سٹی اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے پولیس کی ایک جیپ بھی تھی۔

گاڑی میں عبداللہ جان صاحب کو دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ان کی بیگم اور دونوں لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔

عبداللہ جان صاحب والہانہ انداز میں میرے گلے لگ گئے۔ میں نے ان کی بیگم کو سلام کیا۔ ڈاکٹر شہناز آگے بڑھ کر ان کے گلے لگ گئی۔ ہم لوگ انہیں سٹنگ روم میں لے آئے۔

ان کے ساتھ آنے والے پولیس کے جوانوں کا استقبال غنی اور سرور وغیرہ نے کیا۔

"آپ پہلے فریش ہوجائیں، پھر اطمینان سے بات چیت کریں گے۔" میں نے عبداللہ صاحب سے کہا۔

عبداللہ جان صاحب کو بھی میری تجویز پسند آئی اور وہ اس کمرے میں چلے گئے جو ان کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔

اس دوران میں ریشم اور نیلم نے میز پر چائے اور دیگر لوازمات سجادیے۔ ڈاکٹر شہلا اور شہناز بھی ان کی مدد کررہی تھیں۔

چائے وغیرہ سے فارغ ہوکر خواتین باغ کی طرف چلی گئیں۔ عبداللہ جان صاحب ہمارے ساتھ رہ گئے۔

"ہاں نواب صاحب! فرمائیں، آپ نے مجھے کیسے یاد فرمایا؟"

"میرے پاس مسکین شاہ کے خلاف اتنے ناقابل تردید ثبوت ہیں کہ اس پر اسے کئی دفعہ پھانسی کی سزا ہوسکتی ہے۔" میں نے کہا۔

عبداللہ جان نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "مسکین شاہ کے خلاف ثبوت؟"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "میں نے بہت محنت کے بعد یہ ثبوت اکٹھے کیے ہیں۔"

پھر میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ میرے پاس مسکین شاہ کے خلاف کیا کچھ ہے۔

عبداللہ جان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ انہوں نے پرجوش انداز میں کہا۔ "اب تو اس پیر فرتوت کو میں خود گرفتار کروں گا۔ اس نے لوگوں کو بہت بے وقوف بنالیا۔ اب اس کا بھگت کے دن گنے جاچکے ہیں۔"

"آپ وہ ویڈیو فلمیں دیکھنا چاہیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں وہ ویڈیو فلمیں ضرور دیکھوں گا۔" عبداللہ جان صاحب نے کہا۔

میں نے غنی کو آواز دی اور اس سے کہا۔ "اوپر والے اس کمرے میں ڈی وی ڈی پلیئر اور ٹی وی رکھوادو۔"

"جی سر!" غنی نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ویسے نواب صاحب! اس دفعہ مجھے ست بدھائی آکر احساس ہوا کہ میں واقعی کسی اسٹیٹ میں آگیا ہوں، آپ نے تو اپنی اسٹیٹ کو ناقابل تسخیر بنالیا ہے، آپ کا سیکورٹی سسٹم مجھے بہت پسند آیا۔ بالکل فوجی انداز میں آپ نے پورا بندوبست کیا ہے۔"

"یہ میرا نہیں بلکہ ہمارے سیکیورٹی ایڈوائزر صوبیدار میجر صاحب کا کمال ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ سابق فوجی اور کمانڈو رہ چکے ہیں، انہوں نے آرمی انٹیلی جنس میں بھی کام کیا ہے اس لیے ست بدھائی کو بھی اس انداز میں سیکیورٹی سے آراستہ کیا ہے۔"

رات کے کھانے کے بعد خواتین تو ڈاکٹر شہناز اور شہلا کے ساتھ اسپتال دیکھنے نکل گئیں۔ عبداللہ جان صاحب کو میں اوپر لے گیا تاکہ انہیں وہ ویڈیو فلمیں دکھا سکوں، راجا اور ناصر بھی میرے ساتھ تھے۔

عبداللہ جان صاحب نے دو ہی ویڈیوز دیکھی تھیں کہ لاحول ولاقوۃ پڑھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "یہ غلاظت...... یہ مسکین شاہ کا کارنامہ ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اسی مسکین شاہ کا جسے لوگ بہت نیک اور خداترس سمجھتے ہیں۔"

"میں نے تو سوچا تھا کہ دو چار دن آرام کروں گا لیکن اب مجھے کل ہی واپس جانا ہوگا۔ میں اب اس بگلا بھگت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر وار کرے، میں اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالنا چاہتا ہوں۔"

"میں آپ کو روک بھی نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ "آپ پہلی دفعہ تو آرام کرنے کی غرض سے ست بدھائی آئے تھے۔"

"آرام تو میں اس مسکین شاہ کی گرفتاری کے بعد کروں گا۔" انہوں نے کہا۔ "میری بیگم اور بیٹیاں البتہ یہیں رہیں گی۔ اس پیر فرتوت کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیلنے کے بعد میں دوبارہ یہاں آؤں گا۔"

پھر وہ دیر تک سیل فون پر اپنے ماتحتوں سے باتیں کرتے رہے۔

انہوں نے اپنی بیگم کو بھی بتادیا تھا۔ "مجھے کل علی الصباح ایک ضروری کام سے جانا ہے لیکن تم یہیں رہو، میں وہ کام نمٹا کر دوبارہ ست بدھائی آؤں گا۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں نواب صاحب!" عبداللہ جان صاحب نے کہا۔ "میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ آپ کو تو ابھی یہاں رہنا چاہیے۔"

"میں تو آئی جی صاحب کے ساتھ ضرور جاؤں گا۔" ناصر نے کہا۔ "اور شاہ جی کی گرفتاری کی پوری ویڈیو فلم بناؤں گا۔ اب تک وہ دوسروں کی ویڈیو فلمیں بناتا رہا ہے،

اب اس کی ویڈیو بنے گی تو اسے احساس ہوگا کہ......"

"وہ بہت بے ضمیر شخص ہے۔" عبداللہ جان صاحب نے کہا۔ "اسے بالکل احساس نہیں ہوگا۔ ہاں، اسے یہ افسوس ضرور ہوگا کہ اس کی بنی بنائی ساکھ بگڑ گئی اور وہ کروڑوں روپے کی آمدنی سے محروم ہوگیا۔"

ناصر ضروری تیاری کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے پاس چھوٹا سا ایک مووی کیمرا تھا لیکن اس میں چار سے پانچ گھنٹے کی ریکارڈنگ کی جاسکتی تھی۔ اس کیمرے کے ساتھ بہت حساس قسم کا مائیکروفون بھی تھا جو تصویر کشی کے وقت خفیف سی خفیف آواز کو بھی ریکارڈ کرلیتا تھا۔

عبداللہ جان صاحب کچھ دیر مزید میرے کمرے میں بیٹھے رہے، اس دوران میں انہوں نے مجھ سے بات چیت کم کی، سیل فون پر اپنے ماتحتوں کو ہدایات زیادہ دیں۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ انہوں نے اب تک شاہ جی کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے نام لے لیا تو شاہ جی کا کوئی نہ کوئی تنخواہ دار اسے اطلاع کردے گا اور وہ فوری طور پر روپوش ہوجائے گا۔

دوسرے دن فجر کی نماز ادا کرکے عبداللہ جان صاحب روانہ ہوگئے۔ ان کے ساتھ ناصر بھی تھا۔ راجا بھی جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک لیا تھا۔ مجھے اب بے چینی سے اس وقت کا انتظار تھا جب ناصر کی طرف سے مجھے یہ خوش خبری ملے گی کہ وہ بگلا بھگت شاہ جی گرفتار ہوچکا ہے۔

اس دوران میں راجا سیل فون پر اپنے ایک صحافی دوست سے بات کرتا رہا جس کا تعلق گجرات سے تھا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ مسکین شاہ کی گرفتاری کی خبر سن کر دانا کہیں نور کو وہاں سے منتقل نہ کردے۔

میں نے اس کا اظہار راجا سے کیا تو وہ بھی فکرمند ہوگیا اور بولا۔ "ہاں فیکے پتر! یہ خدشہ تو ہے۔"

"پھر...... پھر کیا ہم گجرات چلیں؟" میں نے راجا سے پوچھا۔ میری سمجھ میں اس وقت کچھ نہیں آرہا تھا۔

"گجرات جانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا فیکے!" راجا نے کہا۔ "مجھے سوچنے دے اور تو بھی سوچ!"

مجھے ایک دفعہ پھر افتخار ٹوانہ کا خیال آیا۔ میں نے راجا سے کہا۔ "ہم ٹوانہ کو بھی اعتماد میں لے سکتے ہیں۔ وہ کوئی ایسا بندوبست کرسکتا ہے کہ اگر نور کو وہاں سے منتقل بھی کیا جائے تو اسے معلوم ہوجائے۔" پھر میں نے خود ہی اس خیال کو مسترد کردیا۔ میں ابھی ٹوانہ پر اتنا اعتماد نہیں کرسکتا تھا، پھر میں کون سا وی آئی پی یا اس کا جگری دوست تھا جس کی خاطر وہ کمسن کے بنگلے کی نگرانی کراتا۔ وہ اگر نگرانی کراتا بھی تو پولیس ہی کے ذریعے کمسن کو علم ہوجاتا کہ اس کی نگرانی ہورہی ہے۔

"میں افتخار ٹوانہ کو بتانے کے بجائے غنی، احمد شاہ اور سرور کو گجرات بھیج دیتا ہوں۔ وہ لوگ کمسن کے بنگلے کی نگرانی کرسکتے ہیں۔"

"ہاں، یہ مناسب رہے گا۔" راجا نے کہا۔ "غنی کو ہدایات دے دینا کہ اگر کمسن نور کو وہاں سے منتقل کرنے کی کوشش کرے تو وہ لوگ کسی قسم کی مزاحمت نہ کریں بلکہ تعاقب کرکے یہ معلوم کریں کہ نور کو کہاں لے جایا گیا ہے۔" راجا نے تجویز پیش کی۔

میں نے اسی وقت غنی کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ "غنی! گجرات میں تمہارا کوئی بااعتماد دوست ہے؟"

"سر، ایک ٹرک ڈرائیور ہے۔" غنی نے کہا۔ "وہ میرے اعتماد کا بندہ ہے۔ ہم لوگوں نے کافی عرصے تک ایک ساتھ ٹرک ڈرائیونگ کی ہے۔"

میں نے احمد شاہ اور سرور کو بھی بلالیا اور ان سے بھی یہی سوال کیا۔

سرور نے کہا۔ "میرا ایک سالا گجرات میں رہتا ہے۔ وہ پچھلے سال فوج سے ریٹائرڈ ہوا ہے اور بہت اعتبار کا آدمی ہے۔ پوری سسرال میں صرف اس سے میری بنتی ہے۔"

احمد شاہ کا کوئی جاننے والا گجرات میں نہیں تھا۔

میں نے ان لوگوں سے کہا۔ "تم لوگ اسی وقت گجرات جاؤ اور وہاں جاکر اشفاق کمسن کے گھر کی نگرانی کرو۔" پھر میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ اشفاق کمسن کون ہے اور کس قماش کا آدمی ہے۔

"اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ اگر کمسن وہاں با اثر آدمی ہے تو میرے دوست نواز کو ضرور علم ہوگا۔" غنی نے کہا۔ "اس کا بنگلا ڈھونڈنا تو کوئی مشکل نہیں ہے۔"

پھر میں نے ان لوگوں کو ہدایات دیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اور یہ کہ وہ اپنے اپنے سیل فون آن رکھیں اور مجھ سے رابطے میں رہیں۔ میں نے احتیاطاً انہیں افتخار کے بارے میں بھی بتادیا۔ غنی تو اسے پہلے سے جانتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر خدانخواستہ تم لوگ وہاں کسی مشکل میں پڑ جاؤ تو وہاں کے ڈی سی افتخار ٹوانہ سے بات کرنا اور میرا حوالہ دینا۔

وہ لوگ مناسب تیاری کے بعد ڈبل کیبن پک اپ میں روانہ ہوگئے۔

میں کچھ دیر تو راجا سے ادھر ادھر کی لایعنی باتیں کرتا رہا، پھر بے چینی زیادہ بڑھی تو ڈاکٹر شہناز کے پاس چلا گیا۔ وہاں ڈاکٹر شہلا کی وجہ سے مجھے الجھن ہورہی تھی۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

میرا چہرہ دیکھ کر شہناز نے کہا۔ "لگتا ہے تمہارا بلڈ پریشر دوبارہ بڑھ گیا ہے؟"

"مجھے تو محسوس نہیں ہورہا۔" میں نے کہا۔

شہناز نے میرا بلڈ پریشر چیک کیا تو بولی۔ "نواب صاحب! اس وقت آپ کا فشارِ خون انتہائی بلندیوں پر ہے۔ میں آپ کو ایک انجکشن دے دیتی ہوں، ابھی بلڈ پریشر نارمل ہوجائے گا۔"

اس نے انجکشن تیار کیا اور سوئی میرے بازو میں گھونپ دی۔

پھر وہ ہنس کر بولی۔ "اب آپ اطمینان سے جاکر اپنے بیڈ پر لیٹ جائیں۔"

میں یوں بھی وہاں بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ شہلا مسلسل مجھے زخمی کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے شاید شہناز کی موجودگی کا احساس بھی نہیں رہا تھا۔

میں اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر نیم دراز ہوگیا۔ اچانک مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا تو میری سمجھ میں آیا کہ شہناز نے مجھے نیند کا انجکشن دے دیا ہے۔ میں اس کی اس حرکت پر زیادہ دیر جھنجلا بھی نہ سکا اور نہ جانے کب میری آنکھیں بند ہوگئیں۔

میری آنکھ دوبارہ کھلی تو پہلے تو میں یہی سمجھا کہ اس وقت صبح ہے، پھر مجھے یاد آیا کہ میں شہناز کے پاس گیا تھا، اس نے مجھے انجکشن دیا تھا اور......

میں جھٹ کر اٹھ گیا۔ گھڑی میں اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔

میں نے منہ پر پانی کا ایک چھپکا مارا اور اپنے بال سنوارتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر ناصر کا نام تھا۔ میں نے فوراً کال ریسیو کرلی۔

"آپ کہاں تھے سر!" ناصر نے پوچھا۔ "میں اس سے پہلے کم سے کم دس بار آپ کو کال کرچکا ہوں۔"

اب میں اسے کیا بتاتا کہ شہناز نے مجھے خواب آور دوا کا انجکشن دے کر سلادیا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "وہاں کیا رہا؟"

"آپریشن کامیاب ہوگیا ہے۔ آپ کیا ٹی وی نہیں دیکھ رہے؟"

"نہیں، میں نے ابھی تک ٹی وی نہیں دیکھا۔" میں نے کہا۔

"عبداللہ جان صاحب نے پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ مسکین شاہ کے بنگلے پر چھاپا مارا اور اسے گرفتار کرلیا، وہاں سے ان کے ہاتھ مزید ثبوت لگے ہیں۔ میں تو ان سے کہہ رہا تھا کہ گولی مار کے اس مردود کا قصہ ہمیشہ کے لیے پاک کردیں لیکن وہاں سے جو ثبوت ملے ہیں، وہی اتنے کافی ہیں کہ مسکین شاہ کو لمبی سزا ہوجائے گی۔"

"تم نے اس واقعے کی ویڈیو بنائی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"میں نے تو ایک ایک لمحے کی ویڈیو بنائی ہے، میں شاید آج نہ آسکوں۔" ناصر نے کہا۔ "یہاں کافی مصروفیت ہے، مسکین شاہ کے بنگلے سے جو دوسرے افراد گرفتار ہوئے ہیں۔ پولیس ان کی نشاندہی پر مسکین شاہ کے دوسرے ٹھکانوں پر چھاپے مار رہی ہے۔ آپ ٹی وی دیکھیں، آپ کو سب کچھ تفصیل سے معلوم ہوجائے گا۔"

"اچھا، میں تھوڑی دیر بعد تم سے بات کرتا ہوں۔" میں نے سلسلہ منقطع کرکے سیل فون جیب میں رکھا اور راجا کے کمرے کی طرف دوڑا۔

راجا مجھے کوریڈور میں مل گیا۔ وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا اور بولا۔ "مسکین شاہ گرفتار ہوچکا ہے۔ یار اس کے مکروہ چہرے پر کیسی نحوست اور بے بسی تھی۔" راجا نے کہا۔ "میں تو گزشتہ ایک گھنٹے سے ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوں اور نیلم کو کئی دفعہ تیری طرف بھیج چکا ہوں کہ دیکھو نواب صاحب جاگے یا نہیں۔"

"یار، یہ شہناز بھی بعض اوقات بہت زیادتی کرجاتی ہے، بھلا اس وقت مجھے خواب آور دوا کا انجکشن دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی فیکے پتر!" راجا نے ہنس کر کہا۔ "ورنہ تو اس وقت تک تو پاگل ہوگیا ہوتا۔ چل، ٹی وی لاؤنج میں چل، وہاں ہر چینل سے مسکین شاہ ہی کے بارے میں خبریں آرہی ہیں۔"

میں ٹی وی کے سامنے جا بیٹھا، اس وقت اشتہارات چل رہے تھے۔

پھر چند منٹ بعد خبروں کا بلیٹن شروع ہوگیا۔ بلیٹن کی

ہیڈ لائن یہ تھی کہ معروف سیاست دان اور قومی اسمبلی کے رکن سید مسکین شاہ کو گرفتار کرلیا گیا۔ پولیس نے اچانک ان کے بنگلے پر چھاپا مار کے نہ صرف انہیں گرفتار کیا بلکہ وہاں سے دو لڑکیوں کو بھی برآمد کرلیا جنہیں چند روز پہلے اغوا کرلیا گیا تھا۔ پولیس ان لڑکیوں کی تلاش میں تھی۔ اس کے علاوہ مسکین شاہ کے بنگلے سے منشیات اور ناجائز اسلحے کی بھاری تعداد بھی برآمد ہوئی ہے۔ ان کے قبضے سے ایسے خطوط بھی برآمد ہوئے ہیں جو ملک کی سالمیت اور خودمختاری کے خلاف تھے۔ پولیس نے ابھی تک ان خطوط کی وضاحت نہیں کی ہے، ابھی مزید انکشافات کی توقع ہے۔ پولیس کے اس آپریشن کی نگرانی آئی جی عبداللہ جان نے خود کی ہے۔

پھر نیوز کاسٹر نے وہاں موجود اپنے نمائندے سے بات کی۔ اس دوران میں مسکین شاہ کی گرفتاری کے مناظر دکھائے جاتے رہے۔ مجھے ان مناظر میں ناصر بھی نظر آیا جو عبداللہ جان صاحب کے ساتھ ساتھ تھا اور اپنے مووی کیمرے سے فلم بنا رہا تھا۔

میں نے جیب سے سیل فون نکال کر غنی کا نمبر ڈائل کیا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کرلی۔

"غنی! وہاں کیا صورتِ حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سر، یہاں تو ابھی تک سکون ہے، ہم تینوں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر رہ کر کمسن کے بنگلے کی نگرانی کر رہے ہیں لیکن ابھی تک وہاں سے کوئی باہر نہیں نکلا ہے۔"

"کمسن خود کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تھوڑی دیر پہلے اپنے بنگلے میں داخل ہوا ہے۔" غنی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، تم نگرانی جاری رکھو اور کسی بھی غیر معمولی صورت حال کے پیدا ہوتے ہی مجھے فوراً اطلاع کرو۔"

"اوکے سر!" غنی نے مستعدی سے جواب دیا۔

"کیا صورت ہے گجرات میں؟" راجا نے پوچھا۔

"وہاں ابھی تک تو سکون ہے۔" میں نے جواب دیا۔

ہم لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے کہ شہناز، عبداللہ جان کی بیگم کے ساتھ وہاں آگئی۔

"شہناز!" میں نے کہا۔ "تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

"اگر میں ایسا نہ کرتی تو اب تک تمہارا بلڈ پریشر واقعی بہت بڑھ چکا ہوتا۔"

"تو کیا اس وقت میرا بلڈ پریشر نارمل تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ زیادہ تھا۔" شہناز نے کہا۔

"اچھا تو وہ ضروری کام یہ تھا۔" بیگم عبداللہ جان نے ہنس کر کہا۔ ان کا اشارہ ٹی وی کی طرف تھا جس کی اسکرین پر عبداللہ جان صاحب نظر آرہے تھے۔

"جی ہاں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اس بگلا بھگت کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے میں مجھے دانتوں پسینا آگیا ہے بھابی!" میں نے کہا۔

"مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ اس کے خلاف آپ ہی نے عبداللہ صاحب کو ثبوت بتائے ہوں گے ورنہ وہ یوں اچانک واپس نہ جاتے۔" وہ مسکرا کر بولیں۔ "وہ تو کچھ دن آرام کی غرض سے آئے تھے۔ یوں بھی وہ اکثر کہتے رہتے تھے کہ اب تو ہم آرام ہی آرام کریں گے۔ یہ خبیث مسکین شاہ ہماری نوکری کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔"

"لیکن بھابی!" راجا نے کہا۔ "یہاں تو الٹا حساب ہوگیا۔"

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سیل فون جیب سے نکالا۔ اسکرین پر غنی کا نمبر تھا۔ میں بھابی سے معذرت کرکے باہر نکل آیا اور سیل فون کان سے لگا کر بولا۔

"ہاں غنی!"

"سر! ابھی تھوڑی دیر پہلے کمسن کے گھر کوئی گاڑی میں آیا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ دو آدمی میڈم نور کو اٹھا کر گاڑی تک لا رہے ہیں۔"

"تم نے یہ کیسے دیکھ لیا کہ وہ نور ہی ہے؟"

"میں کمسن کے بنگلے کے سامنے ایک گھنے درخت پر چڑھا ہوا ہوں، میرے پاس ایک طاقت ور دوربین بھی ہے۔ یہاں سے کمسن کے بنگلے کا اندرونی منظر بھی نظر آرہا ہے۔"

"وہ نور کو اٹھا کر کیوں لا رہے تھے۔ کیا اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"جی سر!" غنی نے جواب دیا۔ "ان کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں لیکن وہ ہوش میں ہیں۔ وہ گاڑی اب بنگلے سے باہر آرہی ہے۔ میں بھی درخت سے اتر رہا ہوں۔" غنی نے سلسلہ منقطع کردیا۔

زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا جب غنی کی طرف سے سلسلہ منقطع ہوا تھا لیکن یہ اس کی مجبوری تھی۔

راجا بھی میرے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر آگیا تھا۔ میں نے اسے بھی نئی صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمارا اندیشہ درست تھا۔" راجا نے کہا۔

"یار، اب غنی اور احمد شاہ کامیابی سے ان لوگوں کا تعاقب کرلیں ورنہ اس مرتبہ ہم نے نور کا سراغ کھویا تو دوبارہ اس سے بھی زیادہ دشواری پیش آئے گی۔"

اس وقت پھر میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر سرور کا نام تھا۔

"بولو سرور!" میں نے کہا۔

"سر! ہم لوگ بہت کامیابی سے اس گاڑی کا پیچھا کر رہے ہیں۔ غنی اس وقت ڈرائیونگ کر رہا ہے اس لیے میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔"

"گاڑی میں کتنے آدمی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بڑی وین ہے۔ اس میں کم سے کم چھ آدمی تو ہوں گے۔" سرور نے کہا۔ "ڈرائیور سمیت سات آدمی ہیں سر!" پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "سر! کیا ہم لوگ اس گاڑی کو روکنے کی کوشش کریں؟"

"ابھی اس قسم کی کوئی حماقت مت کرنا۔" میں نے کہا۔

"سر! ہم ان لوگوں کو بہت آسانی سے گھیر سکتے ہیں۔" سرور نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم انہیں گھیر سکتے ہو لیکن میں اس کا بالکل مشورہ نہیں دوں گا۔ اس سے نور کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے، بس خاموشی سے اس گاڑی کا تعاقب کرتے رہو اور صرف یہ معلوم کرلو کہ وہ لوگ نور کو لے کر کہاں جاتے ہیں؟"

"اوکے سر!" سرور نے جواب دیا۔

ہم لوگ ایک مرتبہ پھر ٹی وی کے سامنے آگئے۔

دوبارہ بلیٹن شروع ہوا تو اس میں ایک نئی خبر تھی۔ پولیس نے گجرات کے ایک صنعت کار اشفاق کمسن کے بنگلے پر چھاپا مارا ہے۔ وہاں سے پولیس کو کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ملی لیکن مسکین شاہ کے بنگلے سے کمسن شاہ کے خلاف کچھ ایسے شواہد ملے ہیں کہ پولیس نے اشفاق کمسن کو حراست میں لے لیا ہے۔ انہیں پولیس کی ایک خصوصی ٹیم نے گرفتار کیا ہے جس کی قیادت ایس ایس پی ظفر کر رہے تھے۔ مزید انکشافات کی توقع ہے۔

"اب سمجھ میں آیا کہ کمسن نے فوری طور پر نور کو وہاں سے منتقل کیوں کردیا۔" میں نے کہا۔

"اسے اطلاع مل گئی ہوگی کہ لاہور سے پولیس کی ایک ٹیم اس کے بنگلے پر چھاپا مارنے آرہی ہے، اس نے فوری طور پر ہر قابل اعتراض چیز وہاں سے ہٹا دی۔ نور کو بھی اس نے رانا کے کسی آدمی کے حوالے کیا ہوگا یا پھر اسی کے آدمی اسے کہیں لے جارہے ہوں گے۔"

"یار، میرا خیال ہے کہ ہمیں رانا کے بنگلے کی بھی نگرانی کرنا چاہیے۔ یقیناً پولیس کو اس کے خلاف بھی کوئی ثبوت ملا ہوگا۔" راجا نے کہا۔

"ہمارے نگرانی کرنے سے کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔ "پولیس کو ثبوت ملا ہوگا تو وہ رانا کو چھوڑے گی نہیں کیونکہ اب یہ گرفتاریاں رک نہیں سکتیں۔"

"میں ناصر سے معلوم کرتا ہوں کہ وہاں سے کس کس کے خلاف ثبوت ملے ہیں؟" راجا نے کہا۔ "اسے ضرور علم ہوگا۔"

اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور ناصر کا نمبر ڈائل کرنے لگا، پھر جھنجلا کر بولا۔ "اس مردود کا نمبر بھی مصروف ہے، اس سے پہلے دو دفعہ کوشش کرچکا ہوں لیکن ہر بار یہی جواب ملا ہے کہ آپ کا مطلوبہ نمبر کسی اور لائن پر مصروف ہے۔" راجا نے منہ بنا کر کہا۔

اسی وقت میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر ناصر کا نام تھا۔

"ہاں ناصر!" میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

"پولیس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کمسن کو گرفتار کیا ہے لیکن نور وہاں سے برآمد نہیں ہوئی۔" ناصر نے کہا۔

"اس الو کے پٹھے نے نور کو اس سے پہلے ہی اپنے بنگلے سے نکال دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، غنی اور سرور اس گاڑی کا تعاقب کر رہے ہیں جس میں نور کو وہاں سے لے جایا گیا ہے۔"

"غنی اور سرور؟" ناصر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ شاہ جی کے گرفتار ہونے کے بعد اچھی خاصی ہلچل مچے گی۔ نور کمسن کی تحویل میں ہے تو وہ بھی یقیناً شاہ جی کا وفادار ہوگا۔ میں نے غنی، سرور اور احمد شاہ کو پہلے ہی گجرات روانہ کردیا تھا۔"

"یہ آپ نے بہت زبردست کام کیا ہے سر!" ناصر نے کہا۔

"تم یہ بتاؤ کہ شاہ جی کے بنگلے سے اور کتنے لوگوں کے خلاف ثبوت و شواہد ملے ہیں؟"

"کئی بڑے نام ہیں، ان میں دو ایس پی اور دو تین بیوروکریٹس بھی ہیں۔"

"پولیس کو وہاں سے رانا کے خلاف بھی کوئی ثبوت ملا ہے؟"

"حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ وہاں سے رانا کے

خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔'' ناصر نے کہا۔

''اچھا تم ہم سے رابطے میں رہو۔ راجا بہت جھنجلایا ہوا ہے، وہ کئی دفعہ تمہیں کال کرچکا ہے لیکن تمہارا نمبر ہر دفعہ مصروف ہی ملتا ہے۔''

''اب حماقت کا تو میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے سر!'' ناصر نے کہا۔ ''راجا کے پاس میرا وہ نمبر بھی ہے جو آپ کے پاس ہے، وہ نمبر مخصوص افراد کے لیے ہے اس لیے وہ بہت کم مصروف ہوتا ہے، راجا کو میرا وہ فون نمبر یاد نہیں؟''

''میں اسے یاد دلادوں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کردیا۔

''کیا فرمارہے تھے دنیا کے عظیم جرنلسٹ؟'' راجا نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے اسے ساری گفتگو بتائی تو وہ بھی دیر تک اپنی حماقت پر ہنستا رہا، پھر سنجیدہ ہوکر بولا۔ ''ٹھیکے پتر! یہ بڑی عجیب بات ہے کہ پولیس کو شاہ جی کے بنگلے سے رانا کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔''

''اسی سے اندازہ لگاؤ کہ رانا کتنا چالاک اور محتاط آدمی ہے۔'' میں نے کہا۔

میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اسکرین پر سرور کا نام تھا۔

میں نے کال ریسیو کرنے کے بعد پوچھا۔ ''ہاں سرور؟''

''سر! ہم لوگ اس گاڑی کے پیچھے اس وقت جی ٹی روڈ پر چل رہے ہیں۔''

''جی ٹی روڈ پر؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یس سر!'' سرور نے جواب دیا۔ ''اس گاڑی کا رخ لاہور کی طرف ہے۔''

''تم لوگ اس وقت کہاں ہو؟''

''ہم سرائے عالم گیر پہنچنے والے ہیں۔'' سرور نے جواب دیا۔ ''غنی نے گاڑی کے ہیڈلیمپس بند کررکھے ہیں اور اندھیرے میں اس گاڑی کا پیچھا کررہا ہے۔ جی ٹی روڈ کی وجہ سے ہمیں بہت آسانی ہے، اس روڈ کے تو ایک ایک پتھر سے ہماری واقفیت ہے۔ غنی تو اس سڑک پر آنکھیں بند کرکے ڈرائیونگ کرسکتا ہے۔''

''اس سے کہنا کہ اس وقت آنکھیں کھلی ہی رکھے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''جی سر!'' سرور بھی ہنسنے لگا۔

''مجھ سے رابطے میں رہو اور بتاتے رہو کہ گاڑی کس طرف جارہی ہے۔''

''اوکے سر!'' سرور نے جواب دیا۔

میں نے سلسلہ منقطع کرکے راجا کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''یار فیکے!'' راجا نے کہا۔ ''وہ لوگ نور کو کہیں لاہور تو نہیں لے جارہے؟''

''ممکن ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ''راجا! ہم اگر اپنے لوگوں کے ساتھ جی ٹی روڈ ہی پر اس گاڑی کو روک لیں تو؟''

راجا اچھل پڑا۔ ''ہاں یہ ہوسکتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہم غنی سے کہیں گے کہ جب وہ گاڑی دینہ پہنچنے والی ہو تو ہمیں اطلاع کردے۔ تو سرور سے گاڑی کا میک، ماڈل اور رجسٹریشن نمبر پوچھ لے۔ ہم کسی طرح سڑک بلاک کردیں گے۔ پھر ان لوگوں کو بہت اطمینان سے گھیر لیں گے، وہ واپس جانے کی کوشش کریں گے تو پیچھے سے غنی اور سرور انہیں گھیر لیں گے۔''

''چل پھر اٹھ۔'' میں نے کہا۔ ''ہم ابھی سے وہاں پہنچ کر راستہ بلاک کرنے کا بندوبست کرتے ہیں۔''

میں نے کمرے میں آکر تیزی سے لباس تبدیل کیا۔ سردی بڑھتی جارہی تھی اس لیے میں نے جیکٹ پہن کر اس کی زپ بند کرلی۔ اپنے ریوالور چیک کیے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

راجا بھی تیار ہوکر باہر نکل چکا تھا۔

ہم دونوں تیزی سے صوبیدار میجر صاحب کے پاس پہنچے اور انہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ درمیان میں راجا نے انہیں شاہ جی کی گرفتاری کے بارے میں بتایا تھا۔ باقی تفصیل وہ ٹی وی پر دیکھ چکے تھے۔

''سڑک کے درمیان میں اگر ایک گاڑی بھی کھڑی کردی جائے تو ان کا راستہ بلاک ہوجائے گا۔ ہم لوگ وہاں آس پاس جھاڑیوں میں اپنے گارڈز کو چھپاسکتے ہیں، ان کی گاڑی کی رفتار سست ہوتے ہی ہمارے آدمی اس پر فائرنگ شروع کردیں۔ انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

''لیکن اس طرح نور کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بھئی، اب یہ رسک تو ہمیں لینا پڑے گا۔'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔ ''ہاں، ہم اپنے گارڈز کو ہدایات دے

سکتے ہیں کہ وہ صرف گاڑی کے ٹائروں پر فائرنگ کریں، گاڑی کے اوپری حصے میں فائر نہ کریں، یوں بھی نور کیونکہ لیٹی ہوئی ہے اس لیے قدرے محفوظ ہے۔''

''مجھے کم سے کم چار بہترین گارڈز چاہئیں۔'' میں نے کہا۔ ''ایسے گارڈز جو سرور، احمد شاہ اور غنی کے ہم پلہ ہوں۔''

''ان جیسے گارڈز تو نہیں مل سکتے۔'' صوبیدار میجر صاحب نے بہت صاف گوئی سے کہا۔ ''ہاں، ہمارے پاس بہت بہترین نشانے باز ہیں، فوری طور پر ہمیں نشانے بازوں ہی کی ضرورت پڑے گی، پھر غنی اور سرور وغیرہ بھی پہنچ جائیں گے تو ہماری نفری دوگنی ہوجائے گی۔''

انہوں نے انٹرکام پر کسی سے کہا۔ ''احمد، علی، اجمل خان اور مشتاق کو بھیج دو۔''

تھوڑی دیر بعد وہ چاروں میرے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب احمد شاہ کی طرح چاق وچوبند تھے۔

میں نے انہیں اپنی مہم کے بارے میں بتایا اور ان سے کہا کہ ضروری انتظامات کرکے مجھے بتاؤ۔

''کتنی دیر میں تیار ہوجاؤ گے؟'' میں نے ان سے پوچھا۔

''پندرہ منٹ میں سر!'' ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

''نہیں، صرف دس منٹ!'' میں نے کہا۔

''اوکے سر!'' اس نے جواب دیا اور وہ چاروں تیزی سے باہر نکل گئے۔

''ان سب میں سینئر موسٹ علی حسن ہے۔'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔ ''آپ اسی کا سیل نمبر لے لیں اور اسے تاکید کردیں کہ وہ آپ سے رابطے میں رہے۔'' صوبیدار میجر صاحب یوں ہدایات دینے لگے جیسے دشمن کے کسی مورچے پر قبضہ کرنے کی بات کررہے ہوں۔

دس منٹ سے بھی کم عرصے میں وہ لوگ تیاری کرکے آگئے۔

''گاڑی کون سی لے جارہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''سر! ایسے موقعوں پر ڈبل کیبن پک اپ ہی بہترین ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم لوگ جی ٹی روڈ تک پہنچو۔ ہم تمہارے پیچھے آرہے ہیں۔ ہاں علی حسن! تم اپنا سیل نمبر مجھے دے دو۔ تم اس ٹیم کے لیڈر ہو، میں تم ہی سے رابطے میں رہوں گا۔''

''اوکے سر!'' علی حسن نے کہا۔ ''میں آپ کے سیل فون پر کال کردیتا ہوں۔ آپ میرا نمبر محفوظ کرلیں۔''

☆☆☆

ہمیں جی ٹی روڈ پر پہنچے پون گھنٹا ہوچکا تھا۔ سردی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

میرے گارڈز دو دو کی ٹکڑیوں میں سڑک کی دونوں طرف موجود تھے۔ ڈبل کیبن پک اپ اس وقت ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف سرور تھا۔ میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''کہاں تک پہنچے ہو سرور؟''

''سر، جی ٹی روڈ سے وہ گاڑی اچانک رانا زوہیب کی جاگیر کی طرف مڑ گئی ہے۔'' سرور نے جواب دیا۔

میں چونک اٹھا۔ ''رانا کی زمینوں کی طرف!'' میں نے ایک مرتبہ پھر اس خبر کی تصدیق کرنا چاہی۔

''یس سر!'' اچانک دوسری طرف غنی لائن پر آگیا۔ ''مجھے یہاں سے رانا زوہیب کی حویلی صاف دکھائی دے رہی ہے۔''

''وہ گاڑی کہاں گئی جس کا تم لوگ تعاقب کررہے تھے؟''

''وہ گاڑی ابھی ابھی رانا کی حویلی میں داخل ہوئی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم وہیں ٹھہرو، میں آرہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

میں نے اس وقت اچانک ہی رانا کی حویلی میں گھسنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے ایک گارڈ کو بلایا اور اس سے کہا۔ ''تم اسی وقت حویلی جاؤ اور صوبیدار میجر صاحب سے کہنا کہ حویلی میں جتنے بھی گارڈز ہیں، سب کو لے کر رانا زوہیب کی حویلی کی طرف پہنچیں۔ ہم لوگ اسی طرف جارہے ہیں۔''

گارڈ فوراً ہی واپس چلا گیا۔

میں نے اسے آواز دے کر روکا اور کہا۔ ''گاڑی لے کر جاؤ۔ کیا حویلی تک پیدل ہی جاؤ گے؟''

وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

''فیکے پتر! تو کیا پاگل ہوگیا ہے یا اپنی زندگی سے بےزار ہوگیا ہے جو یوں خودکشی کرنے چلا ہے؟''

''میں اور برداشت نہیں کرسکتا راجا!'' میں نے کہا۔ ''اور تجھے اگر میرے ساتھ نہیں جانا ہے تو، تو بھی حویلی

چلا جا۔‘‘

’’تیری عقل شاید گھاس چرنے چلی گئی ہے۔‘‘ راجا نے کہا۔ ’’میں تجھے یوں خودکشی نہیں کرنے دوں گا۔‘‘

اسی وقت سڑک پر دور سے روشنیاں نمودار ہوئیں جو بہت تیز رفتاری سے ہماری ہی طرف آرہی تھیں۔

میں اور راجا سڑک کے کنارے ہی کھڑے تھے۔ مجھے دور سے اندازہ ہوگیا تھا کہ آنے والی ایک نہیں بلکہ کئی گاڑیاں ہیں۔

سب سے آگے والی گاڑی کے ہیڈلیمپس کی روشنی مجھ پر پڑی تو میں ایک لمحے کے لیے گویا اندھا ہوگیا۔ میری آنکھیں اس تیز روشنی میں چندھیا کر رہ گئی تھیں۔

وہ گاڑی اچانک میرے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ میرے دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ آنے والے دشمن ہیں۔ اچانک گاڑی کے ہیڈلیمپس بند ہوگئے۔ پھر اس میں سے جو شخص اترا، اسے دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ پیچھے والی گاڑیوں کی روشنی میں مجھے ناصر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ عبداللہ جان صاحب بھی تھے۔

’’نواب صاحب!‘‘ عبداللہ جان نے کہا۔ ’’آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟‘‘

’’سر!‘‘ ناصر نے کہا۔ ’’خیریت تو ہے؟‘‘

میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ میں یہاں کیوں کھڑا ہوں؟

’’لیکن آپ لوگ تو لاہور میں تھے؟‘‘ میں نے حیرت سے کہا۔ ’’آپ لوگ یہاں کیسے؟‘‘

’’میں اس وقت تمہارے سب سے بڑے دشمن رانا زوہیب کی حویلی پر چھاپا مارنے جا رہا ہوں۔‘‘ عبداللہ جان صاحب نے کہا۔ ’’اس کے خلاف تو ایسے ناقابلِ تردید ثبوت ملے ہیں کہ وہ سیدھا پھانسی کے تختے پر جائے گا۔‘‘

’’لیکن ناصر! تم تو کہہ رہے تھے کہ......‘‘

’’مجھے بھی اس وقت تک علم نہیں تھا سر!‘‘ ناصر نے کہا۔ ’’بلکہ مجھے کیا، اس وقت تک تو عبداللہ جان صاحب کو بھی علم نہیں تھا۔‘‘

’’چلیں پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’بس مجھے یہ خدشہ ہے کہ وہاں نور بھی ہے، رانا زوہیب اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔‘‘

’’نواب صاحب!‘‘ عبداللہ صاحب نے کہا۔ ’’جس اللہ نے اب تک اس کی حفاظت کی ہے، وہی اب بھی کرے گا۔‘‘

میں نے سیل فون نکال کر صوبیدار میجر صاحب کا نمبر ڈائل کیا لیکن ان کا نمبر آف تھا۔ زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں اپنی پراڈو میں سوار ہوا۔ راجا میرے ساتھ تھا، پھر ہم بھی اس قافلے میں شامل ہوگئے۔

☆☆☆

ہم لوگ رانا زوہیب کی حویلی پر پہنچے تو اس کا بلند و بالا پھاٹک بند تھا۔ عبداللہ جان صاحب نے کئی دفعہ ہارن بجایا تو ایک شخص نے پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھولی اور بولا۔ ’’کون ہے بابا؟‘‘

’’دروازہ کھولو۔‘‘ ایک انسپکٹر نے ڈپٹ کر کہا۔ ’’پولیس!‘‘

’’پولیس کا یہاں کیا کام؟‘‘ اس نے خمار آلود آواز میں کہا۔ وہ شاید سو رہا تھا۔

’’دروازہ کھولو۔‘‘ انسپکٹر نے ڈپٹ کر کہا۔

’’میں ایسے دروازہ نہیں کھول سکتا۔‘‘ اس نے کہا۔

’’دروازہ کھولو ورنہ، ہم اسے توڑ دیں گے۔‘‘

’’توڑ دیں۔‘‘ اس نے بے نیازی سے کہا اور ذیلی کھڑکی دوبارہ بند کردی۔

انسپکٹر نے پولیس کے دو جوانوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے اپنی رائفلوں کے کندوں سے دروازے پر زوردار انداز میں دستک دی۔

چند منٹ بعد ذیلی کھڑکی پھر کھلی، اس مرتبہ وہاں ایک نیا چہرہ نظر آیا۔ ’’کیا بات ہے؟‘‘ اس نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

’’پولیس!‘‘ انسپکٹر نے صرف ایک لفظ کہا۔

’’آپ کے پاس حویلی میں داخلے کا وارنٹ ہے؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’ہمارے پاس خانہ تلاشی کا وارنٹ ہے۔‘‘ انسپکٹر نے جواب دیا۔

احمد شاہ نہ جانے کب اور کس طرح خاموشی سے وہاں پہنچ گیا اور اچھل کر اچانک اس شخص کی گردن دبوچ لی، پھر اسے اسی کھڑکی کے راستے باہر نکال لیا۔

’’یہ...... یہ کیا حرکت ہے؟‘‘ وہ برہم ہوکر بولا۔

’’تمہیں وارنٹ دیکھنا ہے نا!‘‘ انسپکٹر نے کہا۔ ’’دیکھو وارنٹ!‘‘ اس نے ایک چھپا ہوا کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

حویلی کے پھاٹک پر اتنی تیز روشنی ہو رہی تھی کہ وہاں

اردگرد دن کا سماں تھا۔

اس نے وارنٹ پر ایک نظر ڈالی پھر بولا۔ ’’آپ مجھے چھوڑیں، میں اندر جا کر دروازہ کھلواتا ہوں۔‘‘

’’دروازہ تو آپ یہاں سے بھی کھلوا سکتے ہیں۔‘‘ انسپکٹر نے کہا۔

’’اگر یہ دروازہ نہ کھولے تو اسے گولی مار کے ایک طرف پھینک دو۔‘‘ عبداللہ صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔

’’بہت بہتر آئی جی صاحب!‘‘ انسپکٹر نے کہا اور اچانک اپنا سروس ریوالور نکال لیا۔

’’آئی...... جی...... صاحب!‘‘ وہ آدمی حیرت سے بولا۔ ’’تو کیا آئی جی صاحب خود یہاں آئے ہیں؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ انسپکٹر نے کہا۔ ’’اور پولیس نے اس حویلی کو ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔ دروازہ کھولو ورنہ......‘‘ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ریوالور کی نال اس شخص کی طرف کردی۔

’’دروازہ کھول دو۔‘‘ اس نے بلند آواز میں کہا۔

فوراً ہی وہ بلند و بالا دروازہ کھل گیا جسے توڑنے کے لیے شاید بلڈوزر کی ضرورت پڑتی۔ وہ اتنا ہی مضبوط اور بھاری دروازہ تھا۔

دروازہ کھلتے ہی پولیس کی گاڑیاں اندر داخل ہوئیں اور بہت سے جوان پیدل ہی اندر کی طرف دوڑے۔

میں نے بھی اپنی گاڑی حویلی کے باہر چھوڑی اور اندر کی طرف دوڑا۔

غنی، سرور اور احمد شاہ سائے کی طرح میرے ساتھ تھے۔

وہاں عجیب افراتفری کا سماں تھا۔ پولیس والوں کی چیخ پکار اور بھاگ دوڑ، حویلی میں موجود لوگوں کی گرفتاری۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔

میں ایک برآمدے میں آگے کی طرف بڑھا۔ میں براہِ راست رانا کے کمرے میں پہنچنا چاہتا تھا۔

ایک ستون کی آڑ سے اچانک ایک آدمی نے سامنے آکر میری پیشانی پر ریوالور کی نال رکھ دی اور بولا۔ ’’رانا کا تو جو بھی حشر ہو لیکن میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا نواب زلق!‘‘

’’کون ہو تم؟‘‘ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

’’میں تیری موت ہوں، میرا نام دلاور ہے، دلاور!‘‘ اس نے یوں کہا جیسے موت کے فرشتے کا نام واقعی دلاور ہو۔

میں نے غور سے اسے دیکھا، وہ بھاری بھرکم جسم کا دراز قد شخص تھا۔ چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں پال رکھی تھیں اور اس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔

’’غور سے دیکھ لے۔‘‘ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

’’تو کہہ رہا ہے کہ تو میری موت ہے؟‘‘ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ’’حالانکہ تیری موت تو تیرے پیچھے کھڑی ہوئی ہے۔‘‘ میں نے گھسا پٹا حربہ آزمایا لیکن اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔

’’اب مرنے کے لیے تیار ہوجا!‘‘ اس نے کہا۔

میں اچانک نیچے بیٹھ گیا اور اس کا ریوالور والا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کا رخ چھت کی طرف کردیا۔ پھر میں نے اس کی ناف پر گھٹنے سے زوردار ضرب لگائی۔

اچانک ایک فائر ہوا اور گولی دلاور کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہاں غنی کھڑا تھا۔ سرور اور احمد شاہ اس سے کچھ فاصلے پر تھے۔

تو یہ تھا دلاور! میں نے سوچا۔ اونہہ، اتنا غرور، اتنا تکبر! آدمی بلبلہ ہے پانی کا! ریوالور کی چھوٹی سی ایک گولی نے اس کی عظمت کا بت پاش پاش کردیا اور اسے موت کی اندھی وادیوں میں دھکیل دیا۔

وہاں طویل کوریڈور تھا۔ اس میں دونوں طرف کمرے تھے۔ میں نے ایک کمرے کے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

اندر ایک لڑکی سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کی عمر مشکل سے پندرہ سال ہوگی۔

’’دیکھو...... مجھے مت مارو...... مجھے مت مارو۔‘‘ وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

’’کون ہو تم؟‘‘ میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

’’میں رانا صاحب کی بیوی ہوں۔‘‘

’’تم...... تم رانا کی بیوی ہو؟‘‘ میں نے حیرت سے کہا۔ ’’رانا کہاں ہے؟‘‘

’’وہ بڑی بیگم کے کمرے میں ہوں گے یا پھر...... تہ خانے میں ہوں گے۔‘‘

’’میرے ساتھ چلو۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’مجھے بڑی بیگم کے کمرے کا راستہ دکھاؤ۔‘‘

ہم لوگ کوریڈور میں آگے بڑھے تو مجھے وہاں ناصر اور پولیس کے چند جوان دکھائی دیے۔ ان لوگوں نے مجھے بھی گرفتار کرنا چاہا لیکن ناصر نے انہیں روک دیا اور بولا۔ ’’یہ تو آئی جی صاحب کے ساتھ ہی آئے ہیں۔‘‘

ہم لوگ اس لڑکی کی راہنمائی میں بڑی بیگم کے کمرے تک پہنچے لیکن کمرا خالی تھا۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

اچانک کمرے میں ایک اور لڑکی داخل ہوئی۔ اس کی عمر بھی سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ ''رانا بڑی بیگم کے ساتھ تہ خانے میں چلا گیا ہے، اگر آپ کو اس کی تلاش ہے تو میرے ساتھ آئیں، جلدی کریں ورنہ وہ چور راستے سے فرار ہو جائے گا۔''

ہم اس لڑکی کے پیچھے تقریباً بھاگتے ہوئے ایک طرف روانہ ہو گئے، ایک طرف مجھے عبداللہ جان صاحب دکھائی دیے۔ انہوں نے مجھے آواز دی لیکن میں رکا نہیں۔

وہ لڑکی ایک بیڈ روم میں پہنچی جہاں بڑی سی ایک الماری میں تہ خانے کا راستہ تھا۔ اس نے تہ خانے کی طرف اشارہ کیا۔ مجھ سے پہلے غنی کود کر اس میں داخل ہو گیا۔ اس کی تقلید میں سرور اور احمد شاہ بھی کود گئے۔

میں تہ خانے میں داخل ہوا تو پیچھے سے پھر آئی جی صاحب کی آواز سنائی دی لیکن میں اس وقت تک تہ خانے میں اتر چکا تھا۔

کئی سیڑھیاں اترنے کے بعد میں تہ خانے میں پہنچا۔

میں ابھی وہاں پہنچا ہی تھا کہ مجھے سامنے ہی رانا نظر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے رائفل کا رخ میری طرف کر دیا۔

''ہتھیار پھینک دو رانا!'' پیچھے سے عبداللہ جان صاحب کی آواز آئی۔ ''اب تم کسی بھی طرح بچ نہیں سکو گے۔''

رانا نے شکست خوردہ انداز میں رائفل پھینک دی۔

اس کے پیچھے نور پڑی تھی، اس کے ہاتھ پیر ابھی تک بندھے ہوئے تھے اور بال بری طرح الجھے ہوئے تھے۔

میں آگے بڑھا تو رانا نے نہ جانے کہاں سے ریوالور نکال لیا اور میری طرف نال کر کے بولا۔ ''میں تو برباد ہو ہی گیا ہوں رفیق لیکن تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹریگر دبا دیا۔ اچانک فائر ہوا لیکن ایک عورت اچھل کر میرے سامنے آ گئی۔ گولی اس کے سینے میں دھنس گئی۔ اس کے ساتھ ہی بہ یک وقت دو فائر ہوئے اور رانا کی کھوپڑی اڑ گئی۔

میں اس عورت کی طرف متوجہ ہوا جس نے میری طرف آتی ہوئی گولی کو اپنے سینے پر روک لیا تھا۔ وہ رابعہ تھی۔ میں نے حسرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''حیران کیوں ہو کزن؟'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''میں نے بچپن سے تمہیں ٹوٹ کر چاہا لیکن...... لیکن تم...... دوسری...... دوسری......'' اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک مسکراہٹ تھی۔

میں نے اس کا سر آہستگی سے فرش پر رکھا اور بوجھل دل کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس دوران میں احمد شاہ نے نور کے ہاتھ پیر کھول دیے تھے۔ وہ دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''اب کیوں رو رہی ہو؟'' میں نے کہا۔ ''اب تو میں آ گیا ہوں۔''

☆☆☆

دوسرے دن کے اخبارات ایک نئی کہانی سے بھرے ہوئے تھے۔ رانا زوہیب اور بدنام زمانہ دہشت گرد اور اسلحے کے اسمگلر دلاور کی موت کا خصوصی طور پر تذکرہ تھا۔ رانا کی حویلی سے بھی تین اغوا شدہ لڑکیاں اور ڈھیروں ناجائز اسلحہ برآمد ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے دستاویزی ثبوت بھی تھے جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ رانا اور مسکین شاہ پاکستان دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔

مجھے یہ سب کچھ ایک خواب لگ رہا تھا۔ میں نے غنی سے کہا۔ ''غنی! اب تک ہم نے جتنے لوگوں کو بھی قید کر رکھا تھا، ان سب کو رہا کر دو۔''

غنی اسی وقت واپس چلا گیا۔

اسی وقت جمال خان شیروانی، ثمرہ اور ان کی بیگم حویلی میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے آفتاب خان، اس کی دونوں بیٹیاں اور بیوی بھی تھی، وہ سب مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔

آخر میں ایک آدمی میری طرف بڑھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ یہ اکبر سندھو تھا۔ وہی اکبر سندھو جس نے مجھے نور کے بارے میں اطلاع دی تھی۔

نور بنی سنوری میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ جی ہاں، یہ ہماری شادی کی تقریب تھی۔ دوسری طرف شہناز اور راجا تھے۔ شہناز بھی دلہن کے لباس میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ میرا پروگرام تھا کہ میں دوسرے دن دو ہفتے کے لیے لندن چلا جاؤں گا۔ پھر ہنی مون منانے کے بعد ہم لوگ واپس سیدھا آ جائیں گے۔ مجھے آخر الیکشن میں حصہ بھی تو لینا تھا۔

(ختم شد)

قیمت

رضوانہ منظر

دنیا میں ویسے تو ہر چیز کی کوئی نہ کوئی قیمت ہے مگر بعض اوقات کوئی شے انمول ہوتی ہے اور کوئی بے مول اور جن کی قیمت ادا نہ کی جاسکے انہیں حاصل کرنا ایک کارِ لاحاصل ہی تو ہوتا ہے لیکن... اس نے پھر بھی اپنی قیمت کا تعین کر لیا تھا۔

مجرمانہ سرگرمیوں پر مشتمل مغرب سے درآمد شدہ تحریر

جوزف اپنی اسٹڈی میں داخل ہوا تو سامنے بیٹھا ہوا نوجوان شگفتہ انداز میں مسکرایا اور اس نے اٹھ کر جوزف کو تعظیم دی۔ جوزف کی اسٹڈی سستے اور پرانے فرنیچر سے آراستہ تھی۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے بھی بوسیدہ ہو چکے تھے۔

خود جوزف کے جسم پر بھی سستا اور میلا سا لباس تھا۔

''معاف کرنا نوجوان! تمہیں انتظار کرنا پڑا۔'' جوزف نے اپنے نوجوان مہمان سے کہا۔ ''دراصل میں کسی کام میں مصروف تھا کہ میرے ملازم نے تمہارے آنے کی

اطلاع دی۔“

”کوئی بات نہیں جناب!“ نوجوان نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنا ہیٹ سر سے اتارا۔ اپنے سفید چمک دار دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے جوزف کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میرا نام اسٹون ہے..... اینڈا اسٹون!“

”میں یہ نام سن چکا ہوں۔“ جوزف نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہارے اس جزیرے پر آنے کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ میامی پولیس نے میرے پولیس چیف کو ٹیلی فون پر تمہاری آمد کی بارے میں پیشگی بتا دیا تھا۔“ جوزف نے بڑے خلیق انداز میں کہا۔

جوزف کی عمر لگ بھگ ساٹھ سال تھی۔ اس کا جسم بھاری بھرکم تھا اور توند نکلی ہوئی تھی۔ اسے اکثر و بیشتر بہت زیادہ پسینا آتا تھا۔ اس کے سر کے تمام بال تقریباً غائب ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے پپوٹوں پر ورم تھا مگر اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی جو یہ بتا رہی تھی کہ وہ اسٹون کے کھیل سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

”مسٹر اسٹون! میں نے تمہارا نام بہت سنا ہے۔“ جوزف پھر مسکرایا۔ ”میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ بہرحال بیٹھ جاؤ۔ آرام سے بات کرتے ہیں۔“

”شکریہ۔“ کہہ کر اسٹون کرسی پر بیٹھ گیا اور دھیرے سے بولا۔ ”میں کسی تمہید کے بغیر اپنا مدعا بیان کرنا چاہوں گا تاکہ تمہارا بھی وقت ضائع نہ ہو اور میرا بھی۔“

”میں تمہاری بات سن رہا ہوں۔“ جوزف نے کہا۔

”میں تاجروں کے ایک گروہ کا نمائندہ بن کر تمہارے پاس آیا ہوں۔“ اسٹون نے کہنا شروع کیا۔ ”یہ سب تاجر، صنعت کار اور بزنس مین اس جزیرے کو اپنے مخصوص کاموں کے لیے ایک ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جگہ ان کا بیس کیمپ ہوگی۔“

”بزنس..... کس طرح کا بزنس.....؟ کیا میں تمہارے بزنس کی نوعیت جان سکتا ہوں؟“ جوزف نے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں بڑی نرمی تھی۔

”یہاں جوئے اور سٹے کا کاروبار ہوگا۔“ اسٹون نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اور میں تمہیں اس کام کے لیے آمادہ کرنے آیا ہوں، اس کے بدلے تمہیں بھاری انعام ملے گا۔“

”انعام یا رشوت؟“ جوزف نے پوچھا۔

”جو چاہو سمجھ لو، ویسے یہ بنیادی طور پر رشوت ہی ہے۔“ اسٹون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اوہ!“ جوزف نے بھی جواباً خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا پھر وہ اسٹون کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میرے دوست! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس موضوع پر مجھ سے بات کرنے والے تم پہلے شخص نہیں ہو۔“ جوزف نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ”تم سے پہلے بھی متعدد لوگ اس موضوع پر مجھ سے بات کر چکے ہیں اور مجھے اس کام پر آمادہ کرنے کی ناکام کوشش کر چکے ہیں۔ بہرحال مسٹر اسٹون! تمہیں میرے بارے میں یہ تو معلوم ہوگا کہ میں ایک دیانت دار انسان ہوں..... اسی لیے میں تمہاری اس پیشکش کو رد کرتا ہوں۔“

”مسٹر جوزف!“ اسٹون نے مسکراہٹ اچھالتے ہوئے کہا۔ ”مجھے انسانی فطرت کے بارے میں تھوڑا بہت علم ہے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر انسان کی ایک نہ ایک قیمت ہوتی ہے، چاہے وہ اصول پسند انسان ہو یا دیانت دار..... چور ہو یا ڈاکو، قاتل ہو یا لٹیرا، جاہل ہو یا عالم..... مگر یہ طے ہے کہ ہر شخص ایک مخصوص قیمت کا حامل ہوتا ہے۔ تمہاری کیا قیمت ہے، تم خود ہی بتا دو۔“ یہ کہہ کر اسٹون سنجیدہ نظروں سے جوزف کی طرف دیکھنے لگا۔

”مسٹر اسٹون! پلیز..... میں نے ساری زندگی کبھی کوئی بے ایمانی نہیں کی، کبھی اپنے اصولوں کا سودا نہیں کیا۔“ جوزف نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”جب میں سرکاری ملازم نہیں تھا اس وقت بھی اسی طرح دیانت دار تھا اور سرکاری ملازمت ملنے کے بعد تو میری اس خصوصیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ اب تو میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اس عمر میں ایسا کام کیسے کر سکتا ہوں؟“

”مسٹر جوزف!“ اسٹون نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”اس کام کے تمہیں پانچ ہزار ڈالرز ماہانہ ملیں گے۔ سوچ لو، یہ رقم کم نہیں ہے۔“ اسٹون کی بات سن کر جوزف زور سے ہنس پڑا۔

”مسٹر اسٹون! تم ضرور مجھ سے مذاق کر رہے ہو!“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”چلو، اس رقم کو دگنا کر لیتے ہیں۔“ اسٹون نے اس کی ہنسی کو نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”دس ہزار ڈالرز ماہانہ..... نقد.....“

”تم کچھ پیو گے؟“ جوزف نے اسٹون سے پوچھا۔

”ضرور، بھئی تمہارا مہمان ہوں۔“ اسٹون نے خوش دلی سے کہا۔ ”کچھ کھائے پیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“

”پیڈرو!“ جوزف نے اپنے ملازم کو آواز دی اور

اسے مشروب تیار کرنے کا حکم دیا۔

”مسٹر جوزف! ہم تمہاری مرضی اور اجازت کے بغیر اس جزیرے پر جوئے اور سٹے کا کاروبار شروع نہیں کر سکتے۔“ اسٹون نے کہا۔ ”یہ سمجھ لو کہ ہم اس غیر آباد اور ویران جزیرے کی قسمت بدل دیں گے۔ یہ ایک طرح سے جوئے اور سٹے کا پُررونق مرکز بن جائے گا۔ یہاں متعدد کیسینو بنیں گے۔ جن میں جوئے اور سٹے کے شوقین آ کر کھیلیں گے۔ یہاں شراب خانے بھی کھلیں گے۔ چلتے پھرتے اور تیرتے کیسینو بھی تیار ہوں گے جن میں بیٹھ کر شوقین حضرات سمندر میں اپنے شوق کی تکمیل بھی کریں گے اور سمندر کی سیر بھی کریں گے۔“ وہ بولتے بولتے اچانک رکا اور چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے جوزف سے سوال کیا۔ ”تم کبھی اس جزیرے سے کہیں اور گئے ہو؟“

”نہیں۔“ جوزف نے کہا۔ ”یہ جزیرہ ہی میرا گھر ہے اور اپنے گھر سے باہر کون جاتا ہے؟ میں اس جگہ سے کبھی نہیں گیا۔ یہیں رہتا ہوں۔“

”کبھی دل بھی نہیں چاہا کہ اس ویرانے سے نکلو، باہر کی دنیا دیکھو، گھومو پھرو؟ آخر اس دنیا میں دوسرے ملک اور دوسرے شہر بھی تو ہیں جو ہر لحاظ سے قابلِ دید ہیں۔ اگر انہیں نہیں دیکھا تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔“ اسٹون نے باہر کی دنیا کا حسین نقشہ کھینچ کر جوزف کو ورغلانے کی کوشش کی۔

”مسٹر اسٹون!“ جوزف نے کہا۔ ”میں ایک تنہا انسان ہوں، اپنی ذات کے خول میں بند رہتا ہوں۔ میرے لیے میرے خیالات، میرے احساسات اور میری سوچیں ہی بہت ہیں، میں ان سے باہر نہیں نکلنا چاہتا۔“

”ارے چھوڑو بھی، تارک الدنیا لوگوں کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ میں تو اس طرح کی گوشہ نشینی کا قائل نہیں ہوں۔ دوست! بھاری رقم پکڑو اور اس ویرانے سے باہر نکلو، گھومو پھرو، عیش کرو۔“ اسٹون نے بے تکلفی سے کہا۔ اس وقت اس کا انداز ایسا ہو گیا تھا جیسے وہ جوزف کا بہت گہرا دوست ہو اور اسی کی عمر کا ہو۔

اس سے پہلے کہ جوزف کچھ کہتا اس کا ملازم پیڈرو ایک ٹرے میں مشروب کے دو گلاس رکھے اسٹڈی میں داخل ہوا۔ اس نے پہلے مشروب کا گلاس اسٹون کو دیا، اس کے بعد جوزف کو۔ دونوں نے اپنے اپنے گلاس ہاتھوں میں لیے اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگے۔ ملازم کے جانے کے بعد اسٹون نے مسکرا کر جوزف کی طرف دیکھا مگر جوزف کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

”میری اور مسٹر جوزف کی دوستی کے نام!“ اسٹون نے کہا اور زور سے ہنس دیا۔ جوزف آہستہ سے مسکرا دیا جیسے زبردستی مسکرایا ہو مگر اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔

”مسٹر جوزف! کیا تم میری اس پیشکش پر غور کرو گے؟“ اسٹون نے اپنا گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

لاجواب

ایک صاحب کو سب سے منفرد بات کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ان کے دوست نے ان کا ٹیلی فون نمبر پوچھا۔ انہوں نے کہا۔ ”ساڑھے تین سو، پونے پانچ سو۔“

دوست نے کہا۔ ”یہ کیسا نمبر ہے؟“

وہ صاحب بولے۔ ”350475۔“

☆☆☆

ایک مسخرے سے کسی نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، تمہارے سر کے بال تو سفید ہیں لیکن ڈاڑھی ابھی کالی ہے؟“

مسخرے نے جواب دیا۔ ”ڈاڑھی سر کے بالوں سے بیس برس چھوٹی بھی تو ہے۔“

☆☆☆

دوسری جنگ عظیم کے دوران ایک دیہاتی عورت نے اپنے خاوند کو جو محاذ جنگ پر تھا، خط لکھا ”گاؤں کے سب مرد بھرتی ہو کر جنگ پر چلے گئے ہیں، اب مجھے خود ہی کھیتوں میں ہل چلانا پڑے گا۔“

کچھ دن بعد خاوند کا جواب آیا۔ ”کھیتوں میں اسلحہ دبا ہوا ہے، ہل ہرگز نہ چلانا۔“

راستے میں خط سنسر ہو گیا اور ایک فوجی دستے نے اسلحے کی تلاش میں تمام کھیت کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ بیوی نے خاوند کو اس واقعے کی اطلاع دی۔

خاوند نے جواب دیا۔ ”اب گندم بو دو۔“

مرسلہ: ذیشان منہاس، گلشن اقبال۔ کراچی

"میرا خیال ہے تمہیں اس پر سوچنا چاہیے۔"

"نہ اس پر سوچنے کی ضرورت ہے اور نہ غور کرنے کی۔" جوزف نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میرا جواب اب بھی وہی ہے اور بعد میں بھی وہی ہوگا یعنی...... انکار......"

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ مجھ سے پہلے کچھ اور لوگ بھی تمہارے پاس آئے تھے۔" اسٹون نے جوزف سے کہا۔ "ہوسکتا ہے وہ تمہاری قیمت تک نہ پہنچ سکے ہوں جبکہ......"

"کیا تمہارے خیال میں میری کوئی قیمت ہے؟" جوزف نے کہا۔ "کیا میری قیمت ضرور ہونی چاہیے؟"

"تم بھی تو ایک انسان ہو مسٹر جوزف!" اسٹون نے کہا۔ "میں تمہاری قیمت تک بہرصورت پہنچ کر رہوں گا۔ ایک وقت ایسا آئے گا جب تم خود کہو گے، ٹھیک ہے، تم تیار ہو۔ تم ضرور تیار ہوگے مگر ذرا میں تمہاری قیمت تک پہنچ جاؤں۔ اگر تم خود ہی اپنی زبان سے اپنی قیمت بتادو گے تم ہم دونوں کا وقت بچ جائے گا۔ میں کس حد تک جاسکتا ہوں، اس کا تمہیں اندازہ نہیں۔" اسٹون نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مسٹر جوزف! تم حکم تو کرو......"

"نہیں...... نہیں...... اور نہیں......" جوزف نے ناگواری سے کہا۔ "یہی میرا آخری اور حتمی جواب ہے۔"

"ٹھیک ہے، تو میں خود ہی تمہاری قیمت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔" اسٹون نے خوش مزاجی سے کہا۔

"چلو بیس ہزار ڈالر ماہانہ...... ٹھیک ہے؟"

"پلیز مسٹر اسٹون!" جوزف نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ میرا خیال ہے میں نے تمہیں کافی وقت دے دیا ہے۔ اب معذرت!"

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگا جس کا مطلب یہ تھا کہ اسٹون اب جاسکتا ہے۔

"کیا میں تم سے دوبارہ مل سکتا ہوں؟" اسٹون نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا مگر اس کے لہجے کی شگفتگی ابھی تک برقرار تھی۔ جوزف کے رویے کے باعث وہ اداس یا مشتعل نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے خود کو پرسکون رکھا ہوا تھا اور شاید یہی اس کی کامیابی کی وجہ تھی۔ وہ شخص اپنی خوش مزاجی اور شگفتگی کے باعث ان لوگوں کا ایک نمائندہ بن کر یہاں آیا تھا۔ وہ اب بھی خاصا پراعتماد نظر آرہا تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کامیاب ہو کر رہے گا۔

"میرے گھر کے دروازے ہر وقت تمہارے لیے کھلے ہیں مسٹر اسٹون!" جوزف نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں تمہارے سلسلے میں اپنے باس سے بات کروں گا۔" اسٹون نے کہا۔ "اس کے بعد کل دوبارہ تمہاری خدمت میں حاضر ہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ کل تم میری پیشکش کو رد نہیں کرسکو گے۔"

"تمہیں خود پر بڑا اعتماد ہے دوست!" جوزف نے کہا۔

"دراصل مجھے آج تک کسی بھی کام میں ناکامی نہیں ہوئی۔" اسٹون نے خوش دلی سے کہا۔ "میں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا ہے، کامیابی نے میرے قدم چومے ہیں۔"

"ہوسکتا ہے اس بار نتیجہ تمہاری توقع کے خلاف نکلے۔" جوزف نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے ایسا نہیں ہوگا۔" اسٹون نے بدستور دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "ناکامی کا لفظ میری لغت میں ہے ہی نہیں۔" پھر اس نے اپنا ہیٹ سر پر رکھا اور یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ "کل ملاقات ہوگی...... ایک نئی آفر کے ساتھ!"

جوزف دروازے میں کھڑا اسٹون کو جاتے دیکھتا رہا۔ وہ ایک تنہا آدمی تھا۔ اپنی ذات کے خول میں بند! اس کی اپنی فکریں اور اپنی سوچیں تھیں جن میں وہ مگن رہتا تھا اور ان سے نجات بھی حاصل کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ یہی خیالات اور احساسات اس کی زندگی تھے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو وہ کب کا مرچکا ہوتا۔ اس وقت اس کی عمر ساٹھ برس تھی۔ اس عمر میں بھی وہ ایک غریب انسان تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں نہ دولت دیکھی تھی اور نہ کبھی عیش و آرام کا خیال اس کے دل میں آیا تھا۔ ان ساٹھ برسوں نے اسے کیا دیا تھا؟ یہ موٹا، بھدا اور بے ڈول جسم جو چربی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر اس کے پاس بہت ساری دولت آجائے تو وہ اس سے کیا کرے گا؟ پھر اس کے دل نے خود ہی جواب دے دیا، وہ اس دولت سے دنیا کے حسین ملکوں اور خوبصورت شہروں کی سیر کرے گا۔ اس دولت سے وہ، وہ تمام چیزیں حاصل کرلے گا جن کے اس نے خواب دیکھے تھے۔ وہ ایسے ایسے کام کرے گا جن کے بارے میں وہ صرف سوچتا تھا مگر یہ کام اس کی پہنچ سے دور تھے اور اس کی قیمت؟

اگر وہ خود کو اس قیمت کے عوض بیچ دیتا تو پھر وہ کبھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا تھا کہ وہ ایک ایمان دار آدمی ہے۔ اس کے بعد نہ اس کی عزت باقی رہتی، نہ وقار اور نہ سکون...... وہ بے قرار، بے چین اور پریشان ہوجاتا۔ دولت اس سے یہ سب چھین لیتی۔ اس نے کھڑکی میں سے اسٹون کو اپنی کار میں واپس جاتے دیکھا۔ وہ بہت خوبصورت کار تھی۔ لمبی، چمچماتی......

اچانک جوزف کو محسوس ہوا کہ وہ پسینے میں شرابور ہوچکا ہے۔ اس کا لباس اس کے جسم سے اس طرح چپک گیا تھا جیسے ابھی لباس سمیت سمندر میں غوطہ لگا کر آیا ہو۔ اس نے خود کو سنبھالا اور کھڑکی سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح موسم بالکل صاف تھا۔ آسمان نیلا اور چمک دار تھا۔ سمندر کا پانی بھی پرسکون لگ رہا تھا۔ سورج کی سنہری کرنوں نے اس پورے جزیرے کو ایسا روشن اور منور کردیا تھا جیسے سمندر کے بیچوں بیچ کوئی ہیرا رکھا ہو۔ یہ جوزف کا جزیرہ تھا، جہاں قدرت نے خصوصی توجہ دے کر اس کے حسن کو دوبالا کردیا تھا۔

جوزف اپنی اسٹڈی کی کھڑکی میں کھڑا اس حسین منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک اسے سامنے سے اسٹون کی وہی لمبی اور چمک دار کار آتی نظر آئی اور تھوڑی دیر بعد وہ حسین کار اس کے گھر کے سامنے آکر رک گئی۔

اسٹون نے کار کا دروازہ کھولا اور بڑے اعتماد کے ساتھ اس میں سے اترا۔ اس کے لبوں پر حسب معمول خوشگوار مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شوخی! وہ ہنستا مسکراتا ہوا جوزف کی طرف بڑھا جو اب کھڑکی سے ہٹ کر دروازے میں آچکا تھا۔ اسٹون کے سفید چمکدار دانت آج کل کے مقابلے میں زیادہ چمک رہے تھے۔

اسٹون نے جوزف سے ہاتھ ملایا اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا نیلے رنگ کا ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" جوزف نے مشتبہ نظروں سے لفافے کی طرف دیکھتے ہوئے اسٹون سے سوال کیا مگر اسٹون نے اپنا ہاتھ پیچھے نہ کیا۔

"پلیز مسٹر اسٹون!" جوزف نے کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ میں......"

"ارے مسٹر جوزف! اس لفافے میں رقم نہیں ہے۔" اسٹون نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم کیا سمجھ رہے ہو، میں اس طرح کھلم کھلا تمہیں رقم لا کر دوں گا؟"

"تو پھر یہ کیا ہے؟" جوزف ابھی تک پریشان تھا۔

"یہ تو میرے باس کی طرف سے تمہارے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے جو خیر سگالی کے اظہار کے طور پر دیا جارہا ہے۔" اسٹون نے خوش مزاجی سے کہا اور بولا۔ "اصل چیز تو تمہیں بعد میں دی جائے گی...... پوری عزت، وقار اور احترام کے ساتھ۔"

"اچھا!" یہ کہہ کر جوزف نے وہ نیلا لفافہ اسٹون کے پھیلے ہوئے ہاتھ سے لے لیا، اس کے بعد اس نے اپنی میز پر

قارئین متوجہ ہوں

[illegible]

رکھا ہوا وہ چاقو اٹھایا جس کی مدد سے وہ اپنے نام آنے والی ڈاک کے لفافے کھولا کرتا تھا۔ اس نے اس چاقو کی مدد سے نیلا لفافہ کھولا۔ اس کے اندر سے دو کریڈٹ کارڈز نکلے۔

ایک کارڈ ایک بین الاقوامی ایئر لائنز کا تھا اور دوسرا ایک انٹرنیشنل ہوٹل کا تھا جس کے ہوٹل دنیا کے لگ بھگ سب ہی ملکوں میں قائم تھے۔ انٹرنیشنل ایئر لائنز کے ذریعے وہ دنیا کے کسی بھی ملک کا سفر کرسکتا تھا۔ دونوں کریڈٹ کارڈز پر جوزف کا نام درج تھا۔ جوزف دونوں کارڈ ہاتھ میں لیے اسٹون کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی اور پیشانی پر تفکر کی گہری لکیریں نمایاں تھیں۔

"کیا ہے یہ سب؟" آخر اس نے الجھے ہوئے لہجے میں اسٹون سے سوال کیا۔ اس کی آواز میں سنجیدگی تھی۔

"میرے باس کی جانب سے تحفہ...... خیر سگالی کے جذبات کا اظہار ہے یہ۔" اسٹون نے جواب دیا۔ "دونوں کریڈٹ کارڈز پر تمہارا نام لکھا ہے اور یہ ایک سال کے لیے ہیں۔ اس ایک سال کے دوران تم اس انٹرنیشنل ایئر لائنز کے ذریعے دنیا کے کسی بھی ملک اور اس کے کسی بھی شہر جاسکتے ہو اور دوسرے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے تم اس انٹرنیشنل ہوٹل کے مہمان بن سکتے ہو۔ دنیا کے کسی بھی ملک کے کسی بھی شہر میں جہاں اس ہوٹل کی شاخ موجود ہو، تمہاری رہائش، کھانا پینا، شاپنگ سب مفت ہوگا۔" اسٹون نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مسٹر جوزف! تمہارے تو عیش ہوگئے۔ خوب گھومو پھرو، مزے کرو...... دیکھ لو، یہ میرے باس کی طرف سے ایک معمولی سا تحفہ ہے۔ جب تم اس کا کام کرنے کے لیے راضی ہوجاؤ گے تو تمہیں کیا انعام ملے گا، اس کا اندازہ خود ہی کرلو۔"

جوزف سوچ رہا تھا کہ اس شخص کو دولت پر کس قدر بھروسا ہے۔ اس کے خیال میں دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز برائے فروخت ہوتی ہے۔ ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے خیال میں انسان بھی بکتے ہیں۔ انہیں بھی من چاہی قیمت پر خریدا

جاسکتا ہے۔

سوچتے سوچتے جوزف نے اپنی معمولی اسٹڈی کا جائزہ لیا۔ اس کی حالت کس قدر خستہ ہو رہی تھی۔ جب وہ برسوں پہلے چارج لینے کے بعد اس گھر میں شفٹ ہوا تھا، اس وقت ہی اس کا فرنیچر بہت پرانا اور بوسیدہ تھا، اب تو اس کی حالت اور بھی خراب ہوگئی تھی۔ ان برسوں میں جوزف کبھی اس قابل نہ ہوسکا کہ وہ اس دفتر یا گھر کے لیے کوئی نئی چیز خرید پاتا۔ دراصل جوزف اپنی تنخواہ کا بڑا حصہ ان عطیات میں خرچ کرتا تھا جو وہ فلاحی اور رفاہی اداروں کو دیا کرتا تھا۔ اس لیے اس کے پاس اتنی رقم نہیں بچتی تھی کہ وہ اس کمرے کو سجا سنوار پاتا۔ بہرحال وہ اس میں خوش اور مطمئن تھا۔

اس نے ایک نظر اپنے کمرے کے پرانے فرنیچر، بوسیدہ پردوں، پھٹے ہوئے قالین اور دوسری چیزوں پر ڈالی۔ یہ کمرا چیخ چیخ کر جوزف کی غربت اور خستہ حالی کا اعلان کر رہا تھا۔ مگر یہی چیزیں جوزف کی ایمانداری کی علامت بھی تو تھیں۔ ان پر جوزف کو فخر بھی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی غربت اس کے حق میں بہتر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے کوئی بھی اس کے کردار پر شک نہیں کرسکتا تھا۔ ہاں یہی کمرا قیمتی اشیا سے بھرا ہوا ہوتا تو دوسرے اس پر شک کرسکتے تھے۔ وہ اس بات پر خوش اور مطمئن تھا کہ اس نے ان برسوں میں دولت نہ کمائی، عیش و عشرت کی زندگی نہ گزاری مگر اسے جو عزت اور وقار حاصل تھا، اس کا کوئی بدل نہ تھا۔ وہ خوش تھا کہ اس نے ساری زندگی سخت محنت اور جدوجہد کرکے روزی کمائی ہے۔

جوزف نے کچھ سوچا، پھر دونوں کریڈٹ کارڈز نیلے لفافے میں رکھ کر واپس اسٹون کو دے دیے۔ اسٹون نے وہ لفافہ ہاتھ میں لے کر میز پر ڈال دیا اور مسکراتا ہوا جوزف کی طرف بڑھا مگر جواب میں جوزف کا چہرہ سپاٹ رہا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ میرے باس کی طرف سے ایک معمولی سا تحفہ ہے۔'' اسٹون کی آواز بہ دستور شگفتہ تھی۔

''میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اپنے باس کی طرف سے تمہارے لیے ایک ایسی آفر لاؤں گا جسے مسترد کرنا ممکن نہ ہوگا۔ میں نے درست کہا تھا۔ جب میرے باس نے مجھے اس آفر کے بارے میں بتایا تو یقین کرو، میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی شخص اس قدر وسیع القلب اور فراخ دل بھی ہوسکتا ہے۔''

''مسٹر اسٹون! ازراہ کرم اب مزید بات نہ کرو۔'' جوزف کے لہجے میں ایک دم تنی آگئی تھی۔ ''ہم دونوں اس موضوع پر بات کرچکے ہیں۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ چاہے تمہارا باس مجھے کتنی ہی بڑی آفر کیوں نہ کرے مگر میرا جواب ہر حال میں انکار میں ہوگا۔ سمجھ گئے؟''

''میں نے ابھی تمہیں اس آفر کے بارے میں بتایا ہی کہاں ہے۔'' اسٹون نے بہ دستور ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے وہ آفر تو سن لو، مجھے یقین ہے کہ تم اپنا ارادہ فوراً بدل دو گے۔''

جوزف نے ناگواری سے اسٹون کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ دیکھو، میری میز پر کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ابھی مجھے بہت کام کرنا ہے اور تم ہو کہ مسلسل میرا وقت خراب کیے جارہے ہو۔ بھئی! مجھے یہ سارا کام آج ہی نمٹانا ہے۔''

مگر اسٹون نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں، وہ ابھی تک پراعتماد تھا، اس کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ تھی۔ اس نے جوزف کے پاس رک کر آہستہ سے اس کے کان میں وہ رقم بتادی جو اس کے باس نے جوزف کو دینے کی پیشکش کی تھی۔ یہ سن کر ایک لمحے کو جوزف کو منہ کھل گیا۔ وہ حیران تھا کہ یہ لڑکا میری قیمت تک پہنچا کیسے؟

کچھ دیر بعد جوزف حیران پریشان اپنی اسٹڈی میں کھڑا تھا۔ اس کے سامنے فرش پر اسٹون کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے میں وہی چاقو پیوست تھا جس سے جوزف ڈاک کے لفافے کھولا کرتا تھا۔ اس کے سینے سے خون بہہ کر اس کی سفید قمیص اور فرش پر جم چکا تھا۔

''پیڈرو!'' اچانک جوزف نے اپنے ملازم کو زور سے آواز دی تو وہ گھبرا کر دوڑتا ہوا وہاں پہنچا۔ جیسے ہی اس کی نظر اسٹون کی لاش پر پڑی، اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ کبھی لاش کو دیکھتا اور کبھی جوزف کو۔

''پیڈرو!'' جوزف نے کہا۔ ''نہ غلطی اس لڑکے کی تھی اور نہ میری۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی بے ایمانی نہیں کی تھی جبکہ اس لڑکے کا کہنا تھا کہ دنیا کی ہر چیز یہاں تک کہ انسان کی بھی ایک قیمت ہوتی ہے۔ مصیبت کی بات یہ ہے کہ یہ لڑکا آگے بڑھتے بڑھتے میری قیمت تک پہنچ گیا...... اس قیمت تک، جس میں، میں بک سکتا تھا مگر میری ایمانداری کی عادت نے یہ گوارا نہ کیا۔ میں اس لڑکے کی جیت برداشت نہ کرسکا اور میں نے اسے ہلاک کردیا۔''

بند دروازے

ش صغیر ادیب

قدم دروازے سے باہر جائیں اور... غلط سمت میں اٹھ جائیں اور اس پر مستزاد یہ کہ سمت کا تعین بھی سوچ سمجھ کر کیا جائے تو نتائج بھلا کیسے درست مل سکتے ہیں... معاشرے کا مغربی یا مشرقی ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اہم تو صحیح یا غلط اصولوں کی پرورش سے ماحول کو ترتیب دیتا ہے... اس نے بھی اچھے اور برے کی تمیز تو سیکھی مگر... بہت دیر بعد...

بند دروازوں پر دستک دینے والی ایک بھٹکی ہوئی روح کا ماجرا

وہ جون کی ایک نیم گرم اور خوشگوار شام تھی۔

اجالا ماند پڑ چکا تھا اور دھندلکا بڑھتا جارہا تھا۔ میں نے پارکر اسٹریٹ میں قدم رکھا اور بغیر کسی پس و پیش کے سرخ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک منٹ بعد بانکے نے دروازہ کھولا۔ وہ نیلے رنگ کا سلیپنگ سوٹ پہنے ہوئے تھا اور اسی حالت میں دروازہ کھولنے چلا آیا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا نظر آرہا تھا۔ میں نے مسکرا کر ہیلو کہا تو وہ الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ قدرے ٹھہر کر میں نے کہا۔

''یار آج ذرا تنہائی محسوس کررہا ہوں۔''

''پھر......؟'' اس نے کہا۔

''شکو ہے......؟''

وہ مجھے اندھے کنویں کی طرح خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کھوکھلی آواز میں بولا۔

''آیئے، اندر آجایئے۔''

☆☆☆

شکو کا رنگ سانولا تھا۔ ناک نقشہ خاصا تیکھا۔ قد قدرے نکلتا ہوا۔ وہ خوبصورت تو نہیں، ہاں قبول صورت

ضرور تھی۔ کشادہ آنکھوں میں ہر وقت ایک بے نام سی اداسی رچی رہتی تھی۔ یہ اداسی اس کی مسکراہٹ میں بھی تھی ہرچند کہ اس کی مسکراہٹ خاصی دلکش تھی۔ اس کا جسم چھریرا تھا۔ خطوط اور نشیب و فراز دیکھنے والے کے احساس میں ہلچل پیدا کر دیتے تھے اور کمر کا گہرا خم اس کے بدن میں شاخِ گل جیسی لچک پیدا کرتا تھا۔ مگر اس کا اصل حسن اور جاذبیت اس کے بالوں میں پوشیدہ تھی۔ خوب گھنے، سیاہ اور دراز بال تھے جنہیں وہ ایک دبیز چوٹی کی شکل میں باندھے رکھتی تھی۔ میں نے چند ایک بار اسے بانکے کے ساتھ مارکیٹ میں خریداری کرتے دیکھا تھا اور وہ مجھے اچھی لگی تھی۔ شاید کچھ زیادہ ہی اچھی لگی تھی۔ اس کے سیاہ بالوں کو دیکھ کر میں نے اکثر سوچا تھا کہ اچھا ہے، اس عورت نے خوب گداز چوٹی باندھ رکھی ہے۔ اگر کہیں یہ اپنے بالوں کو کھول دے تو کیا ہوگا؟ شاید سارے میں گھٹا چھا جائے اور سارے میں جل تھل ہو جائے گا۔ اور پھر سارے مے خانے ڈوب جائیں گے اور سارے رند مستی میں چور ہو کر مدہوش ہو جائیں گے۔

ایک رات میں شراب خانے میں بیٹھا تھا۔ ابھی دو ہی گلاس پیے تھے اور خمار دھیرے دھیرے گہرا ہونا شروع ہی ہوا تھا کہ بار بند ہو گیا اور مزید شراب ملنے کی امید نہ رہی۔ اس میں غلطی میری ہی تھی کہ دیر سے پب میں پہنچا تھا۔ میں نے مایوسی سے پب کی مالکہ مسز ڈیوڈسن کی طرف دیکھا اور آخری گھونٹ لے کر گلاس خالی کر دیا۔ مسز ڈیوڈسن سے گزارش کرنا بے سود ہوتا کہ وہ اصولوں کی پابند تھی۔ گلاس خالی کر کے میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور سوچا کہ اب کیا، کیا جائے؟ گھر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ وہاں تنہائی ہر لمحے میری منتظر رہتی تھی۔ پھر کیا کروں؟ کسی ریستوران میں چلوں کہ اور شراب وہیں مل سکتی تھی۔ ہاں، یہی ٹھیک ہے۔ میں نے طے کیا، پھر گھوم کر لاؤنج میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ سب جا چکے تھے۔ صرف بانکے بیٹھا تھا اور اس کے گلاس میں تھوڑی سی بیئر ابھی باقی تھی۔

بانکے سے میری تھوڑی بہت شناسائی تھی۔ چند سال پہلے جب ہم نے کچھ دن ایک فیکٹری میں ساتھ ساتھ کام کیا تھا۔ میں مشینوں پر تھا جبکہ وہ لیبر جاب کرتا تھا۔ چند ماہ بعد اس نے نوکری چھوڑ دی اور وطن چلا گیا تھا۔ سات آٹھ ماہ بعد واپس آیا تو میں نے ایک بار اور غالباً پہلی بار شکو کو اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ غالباً وہ شکو کو لینے ہی کی نیت سے وطن گیا تھا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ہمارا سامنا ہوتا رہتا تھا۔ کبھی روڈ پر آتے جاتے، کبھی مارکیٹ میں اور کبھی پب میں۔ بانکے ہمیشہ مجھے خوش دلی سے سلام کرتا اور کبھی کبھار تھوڑی بہت گفتگو۔ اس سے زیادہ ہمارے مراسم نہیں تھے۔

جب میں اس کی میز کے قریب سے گزرنے لگا تو ایک بار پھر میری نظر اس کی جانب اٹھی۔ وہ خوش خلقی سے مسکرایا۔ جواب میں، میں نے بھی سر کو جنبش دی۔ اس نے گلاس اٹھاتے اٹھاتے سادگی سے کہا۔

”گھر جائیں گے اب آپ ....؟“

”نہیں۔ پہلے کسی ریسٹورنٹ میں جاؤں گا، اس کے بعد گھر۔“

”تنہا رہتے ہیں جناب۔“ اس نے کہا۔ ”دل تو بہت گھبراتا ہوگا۔“

میں کچھ نہیں بولا۔ ایک کش لے کر اعتراضی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اٹھ کر میرے پاس آ گیا اور ادھر ادھر دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”یہی بات ہے نا؟ تنہائی کبھی کبھی بہت عذاب بن جاتی ہے۔“

میں پھر بھی چپ رہا تو وہ مسکرایا۔ بڑی پراسرار اور معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ گردن کو جنبش دے کر سرگوشی میں بولا۔

”صرف شراب کا شوق ہے یا شباب سے بھی کچھ دلچسپی ہے؟“

میں خاصا نشے میں تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ حیران نہ ہو سکوں۔ آخر بانکے یہ کیا کہہ رہا ہے؟ شباب سے بھلا کسے دلچسپی نہیں ہوتی؟ میں نہ تو کوئی فرشتہ ہوں اور نہ ہی پارسائی کا دعوے دار۔ انسان ہوں، جوان بھی، تندرست بھی اور سینے میں ایک عدد دل بھی ہے جو صرف دھڑکتا ہی نہیں، کبھی کبھی مطالبہ بھی کرتا ہے۔ ریشمی بانہوں کے ہار، سیاہ زلفوں کی گھٹا اور مے خانوں سے آباد بدن کے لیے مچلتا بھی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ میری زندگی کا یہ خانہ اب تک خالی رہا ہے۔ نہ کسی نے مجھے چاہا، نہ کبھی اتنی فرصت ملی کہ کسی کی محبت میں گرفتار ہو سکوں۔ میری زندگی تو اب تک اس اجاڑ اور خشک صحرا کی طرح رہی ہے جس میں بارش کی بوند بھی کبھی نہیں برستی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بانکے نے یہ بات کیوں کہی؟ کیا مطلب ہے اس کا؟ میں نے تجسس آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“ اس کی مسکراہٹ کچھ اور پراسرار ہو گئی۔ ”کبھی کبھی دل بہلا لیا کریں ورنہ زندگی بالکل بنجر ہو جائے گی۔“

میرے ذہن میں ایک بار پھر اتھل پتھل ہوئی۔ ”کیا تم کچھ کر سکتے ہو؟“

”چلیں میرے ساتھ۔“

میں نے پس و پیش کیا۔ جاؤں یا نہ جاؤں۔ یہ کام تو میں نے پہلے کبھی نہیں کیا بلکہ زیادہ سچ یہ ہے کہ اس راستے پر چلنے کا پہلے کبھی کوئی موقع ہی نہیں آیا۔ بے شک بیئر اور کبھی کبھی وسکی یا واڈ کا پیتا رہتا ہوں اور اپنی تنہائیوں کو اوڑھ کر سو جاتا ہوں اور مطمئن رہتا ہوں۔ دل چاہا انکار کر دوں مگر پھر ذہن میں ایک نئی رو ابھری۔ تجسس سے بھری ہوئی۔ دیکھنا تو چاہیے کہ جو عورتیں اپنے آپ کو بیچتی ہیں، مسرت اور نشاط انگیز لمحات فروخت کرتی ہیں، وہ کیسی ہوتی ہیں؟ ان کا مزاج، ان کی سوچ، ان کا اخلاق اور رویہ کیسا ہوتا ہے؟ میں فرشتہ تو نہیں ہوں، آخر کو ایک انسان ہی تو ہوں۔ تمام بشری کمزوریاں بہرحال مجھ میں بھی ہیں تو اگر اک ذرا خوشی میں بھی خرید لوں تو اس میں کیا حرج ہے۔ تجسس نے آتش شوق کو ہوا دی۔ اگر نشے میں نہ ہوتا تو شاید انکار کر دیتا۔ مگر گہرے خمار کی ترنگ نے اکسایا۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو آمادہ ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ تجسس بھری نظروں سے بانکے کو دیکھا۔

”کیسی ہے؟...... تم جانتے ہو اسے؟“

”ہاں، بہت اچھی ہے۔“

”عمر......؟“

”بالی ہے۔“

”چال......؟“

”متوالی ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے...... چلو۔“

ہم دونوں باہر آئے اور ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کئی سنسان گلیوں سے گزر کر پارکر اسٹریٹ پہنچے۔ بانکے سے میری واقفیت ضرور تھی تاہم اس بات سے آگاہ نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس نے جیب سے چابی برآمد کی اور سرخ رنگ کا دروازہ کھولا تو میں تھوڑا سا حیران ہوا۔ آخر وہ مجھے اس گھر میں لے کر کیوں آیا ہے؟ مگر میں چپ رہا۔ ہم نے راہداری طے کی اور لونگ روم میں داخل ہوئے۔ تب میں مزید حیران ہوا بلکہ ایک تذبذب اور الجھن نے گھیر لیا۔ کیونکہ سامنے صوفے پر شکو بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی اداس سی مسکراہٹ یوں نمودار ہوئی جیسے خود نہ مسکرائی ہو بلکہ کسی میکانکی عمل کے تحت خودبخود اس کے ہونٹ کھنچ گئے ہوں۔

میں نے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا اور شش و پنج کے عالم میں بانکے کی طرف دیکھا۔

”بیٹھیں جناب! تکلف نہ کریں۔“

میں بیٹھ تو گیا لیکن حیرت کا غلبہ بدستور مجھ پر حاوی رہا۔ تذبذب میں گھرا ہوا۔ شک بھری نظروں سے کبھی شکو اور کبھی بانکے کو گھور رہا تھا۔ صورتِ حال میرے لیے قطعی طور پر بعید از فہم تھی۔ یہ آخر ماجرا کیا ہے؟ یہ...... یہ تو شاید بانکے کی بیوی ہے۔ پھر بانکے یہاں مجھے کیوں لایا ہے؟ میں نے پریشانی سے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ایک بار پھر شکو کو دیکھا۔ وہ خاموش کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ مگر یہ ضرور ہے کچھ سراسیمہ اور نروس ہونے کے باوجود نارنجی رنگ کے لباس میں وہ حسبِ معمول اچھی لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں اداسی تھی مگر ایک انوکھی سی کشش بھی۔ غنیمت یہ تھا کہ اس نے بالوں کی چوٹی باندھ رکھی تھی ورنہ کمرے میں اتنا اندھیرا ہوتا کہ میں اسے دیکھ بھی نہ سکتا۔ وہ مسکرا رہی تھی ہرچند کہ اس کی مسکراہٹ میں بے ساختگی اور شگفتگی کا فقدان تھا بلکہ ایک افسردگی سی تھی، پھر بھی مجھے چاروں طرف شرارے سے اڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ شاید یہ گہرے خمار کا اثر تھا۔ میں چند ایک لمحے چپ رہا پھر گھوم کر استعجابیہ نظروں سے بانکے کی طرف دیکھا۔

”میں سمجھا نہیں بھئی۔ یہ...... یہ تو شاید تمہاری......؟“

”ارے جناب! اس چکر میں مت پڑیں۔“ بانکا عجلت سے بات کاٹ کر بولا۔ ”اس وقت تو یہ آپ کے ساتھ ہے۔“

پھر اس نے مسکرا کر شکو سے کہا۔ ”میں ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ تم انہیں اوپر لے جاؤ۔“

”مگر...... مگر......“ میں نے کچھ کہنا چاہا۔

”ارے بھئی آپ بہت تکلف کر رہے ہیں۔ جائیں اوپر۔ شکو آپ کو سب کچھ سمجھا دے گی۔“

پھر وہ گھوما اور دروازے پر ایک ثانیے کے لیے رک کر اس نے پہلے شکو کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا، ایک آنکھ دبائی اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

میرا خیال غلط تھا مگر بالکل غلط بھی نہیں۔ شکو بانکے کی بیوی تھی بھی اور نہیں بھی۔ ان کا رشتہ محض کاغذی تھا۔ یعنی کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا تھا کہ شاکرہ بیگم، بشیر الدین عرف بانکے کی منکوحہ ہے۔ مگر وہ کاغذ فرضی تھا۔ بانکے نے کچھ رقم دے دلا کر کہیں سے وہ جعلی نکاح نامہ حاصل کر لیا تھا۔ شکو جب اپنے وطن میں تھی تو وہاں بھی ”نشاط فروشی“ ہی کرتی تھی مگر چوری چھپے۔ چند باتوں کا قیاس کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ جسم فروشی کے دھندے میں کیسے پڑی؟ اور یہ کہ یہ کام وہ بہ رضا و رغبت کرتی تھی یا کسی مجبوری کے ہاتھوں اسے اس راستے پر چلنا پڑا تھا۔ نیز یہ کہ اس کی

باقاعدہ شادی ہوئی تھی یا نہیں۔ ہاں، اتنا میرے علم میں ہے کہ بانکے بھی اسی گلی میں رہتا تھا جس میں شکو کا گھر تھا اور یہ کہ بانکے سے اس کے خاصے گہرے مراسم تھے۔ بانکے ایک غیر ذمے دار اور سطحی مزاج رکھنے والا آدمی تھا۔ باقاعدہ روزی روٹی کمانا اور ایک ذمے دار زندگی گزارنا اس کی سرشت کے خلاف تھا۔ دوسرے الفاظ میں لاابالی اور بدقماش تھا۔ چھوٹے موٹے جرائم تو کرتا ہی تھا، ساتھ ہی شراب بھی ادھر ادھر پہنچایا کرتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی شوقین فرمائش کر بیٹھتا تو اسے پکڑ کر شکو کے پاس لے آتا۔

بانکا شکو کے بارے میں کیا سوچتا تھا، یہ قیاس کرنا ذرا دشوار ہے۔ تاہم جہاں تک شکو کا تعلق ہے، وہ بانکے کو پسند کرتی تھی بلکہ شاید محبت بھی کرتی تھی اور ایک دو بار اس نے بانکے سے کہا بھی تھا کہ اگر وہ اس سے شادی کرلے تو وہ ایک شریف اور گھر گرہست عورت کی طرح ساری عمر بانکے کی خدمت کرے گی۔ لیکن بانکے نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

پھر ایک دن بانکے غائب ہوگیا۔

شکو کا خیال تھا کہ یا تو وہ کسی عورت کو بھگا لے گیا ہے یا پھر کوئی جرم کو بیٹھا ہے۔ پولیس اور قانون سے بچنے کے لیے روپوش ہوگیا ہے۔ لیکن دونوں ہی باتیں غلط تھیں۔ کوئی پانچ چھ سال بانکے غائب رہا۔ یہی وہ دن تھے جب میری اس سے ملاقات اور واقفیت ہوئی تھی۔ تقریباً چھ سال بعد جب وہ واپس وطن پہنچا تو اس کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر سیاہ پتلون اور چیک کا کوٹ تھا۔ کلائی میں گھڑی تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور چال میں اتراہٹ تھی۔ شکو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ دونوں تنہائی میں ملے تو شکو نے حیرت سے کہا۔

”ارے...... تم کہاں غائب ہوگئے تھے؟“

”ذرا انگلینڈ چلا گیا تھا۔“ بانکے نے بےپروائی سے کہا۔

”انگلینڈ......؟“

”ہاں...... اب وہیں رہتا ہوں۔“ بانکے نے جواب دیا۔ ایک لمحے کے لیے رکا، پھر ذرا فاخرانہ بےپروائی سے کہا۔ ”تم چلو گی انگلینڈ؟“

”تم...... تم مجھے انگلینڈ لے جانا چاہتے ہو؟“ شکو ہکابکا رہ گئی۔

”ہاں۔“

”مگر میں وہاں کیا کروں گی؟“

”یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے تم یہ طے کرو کہ انگلینڈ چلنا ہے یا نہیں؟“

یہ قیاس کرنا ممکن نہیں کہ بانکے کا منشا کیا تھا۔ وہ شکو کو کیوں انگلینڈ لے جانا چاہتا تھا۔ کیا ایسا ہے کہ وہ اپنی بےوقعت زندگی اور اپنے لاابالی پن سے اکتا گیا تھا اور اب شکو کے ساتھ ایک پرسکون اور گھر گرہست زندگی گزارنے کا خواہاں تھا یا کوئی اور سبب تھا؟ شاید پہلی بات درست ہو۔ یا ممکن ہے، بانکے کے ذہن میں کوئی اور منصوبہ پرورش پاتا رہا ہو شکو کے لیے۔ بانکے کے ذہن میں جھانکنا ممکن نہ تھا لیکن بہرحال وہ سوچ میں پڑگئی۔ کیا کرے؟ انکار کردے یا بانکے کی بات مان لے۔ اگر مان لے تو انگلینڈ جائے گی جہاں صاحب اور میم صاحب رہتے ہیں۔ سنا ہے، بہت اچھا اور خوبصورت ملک ہے۔ پیسے کی فراوانی ہے۔ نہ صرف ہر شام چولہا جلنے کی ضمانت موجود ہے بلکہ ان گنت دوسری آسائشیں بھی ہر شخص کو حاصل ہیں۔ اگر وہ انگلینڈ چلی جائے تو نہ صرف اسے ہر رات بکنا نہیں پڑے گا بلکہ یہ جو کئی نفوس اس کی جان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، ان کے لیے بھی کچھ بہتر کرسکے گی۔

وہ سوچتی رہی اور الجھی ہوئی نظروں سے بانکے کو دیکھتی رہی۔

”دو چار روز اور غور کرلو۔“ بانکے نے کہا۔ ”پھر مجھے بتادینا۔“

”مگر میں جاؤں گی کیسے؟“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

”کم از کم مجھے بتاؤ تو۔“

بانکے چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں تمہارا پاسپورٹ اپنی بیوی کی حیثیت سے چند ہفتے میں بنوالوں گا۔“

ایک شعلہ لپکا اور شکو کے دل کو جھلساتا چلا گیا۔ یہ بانکے نے کیا کہا؟ یہی تو وہ بات ہے جو وہ بانکے کی زبان سے سننے کی کب سے منتظر تھی اور جب شکو نے بےشرم بن کر خود ہی زبان کھولی تو بانکے نے توجہ ہی نہیں دی اور شکو سوچتی رہ گئی تھی۔ آخر یہ بانکے کیسا آدمی ہے؟ اپنی بیوی بنائے گا، وہ بھی محض دکھاوے کے لیے تاکہ انگلینڈ لے جاسکے۔ مگر کیوں؟...... کیا چاہتا ہے؟ کیا ہے اس کے من میں؟...... ضرور اس میں اس کا کوئی ذاتی مفاد ہے۔ کتنا ذلیل ہے یہ شخص۔ کمینہ، بےحیا۔ شرم نہیں آتی۔ شکو کا دل چاہا، صاف انکار کردے۔ کہہ دے کہ مجھ سے کھلونے کی طرح کھیلو مت۔ یہ فرضی شادی نہیں چلے گی۔ میں اتنی گری ہوئی اور بےقیمت نہیں ہوں۔ سچ مچ شادی کرو ورنہ جہنم میں جاؤ مگر پھر سوچ کی رو بدلی۔ کیسے کہہ سکتی ہے وہ یہ سب کچھ؟ اس کی وقعت ہی کیا ہے؟ گردن تک بداخلاقی کی دلدل میں دھنسی ہوئی ہے۔ اس

میں اور بانکے میں فرق ہی کیا ہے؟ دونوں ایک ہی گندگی کے کیڑے ہیں۔ چنانچہ وہ ابلتے ہوئے جذبات کو دبا گئی اور جلتی ہوئی آنکھ کا آنسو پی گئی اور اس گالی کا گلا دبا دیا جو ہونٹوں پر تقریباً...... آہی گئی تھی اور صرف اتنا کہا۔

”کیا میں تم پر بھروسا کرسکتی ہوں؟“

☆☆☆

یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں ویزے کی پابندیاں اتنی سخت نہیں تھیں، جتنی آج ہیں۔ تھوڑی سی دوڑ دھوپ اور تھوڑی بہت دروغ گوئی سے کام بن جاتا تھا۔ بانکے نے کاغذات تیار کروائے جو سب کے سب جعلی تھے۔ ویزے کی درخواست دی اور پھر کچھ دن ہی بعد شکو انگلینڈ پہنچ گئی۔

نئی دنیا تھی۔ نئے لوگ تھے۔ نیا ماحول تھا۔ شکو انگریزی سے بھی نابلد تھی۔ چنانچہ ابتدا میں اسے بڑی پریشانی ہوئی لیکن اس کے حالات نے اسے موم کی طرح بنا دیا تھا جو ہر سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ شکو نے بھی دھیرے دھیرے اپنے آپ کو نئے ماحول کے مطابق بنالیا۔ یہ بات بھی اس کے لیے باعث تقویت تھی کہ شہر کے کچھ حصوں میں ہر طرف ایشین ہی دکھائی دیتے تھے۔ یہ جان کر وہ ایک خوشگوار اچنبھے میں مبتلا ہوگئی تھی کہ اس ملک میں ایشین اتنی تعداد میں آباد ہیں۔ ان کی اپنی دکانیں ہیں، چائے خانے اور فیکٹریاں ہیں۔ بینکوں اور سرکاری دفتروں میں بھی ایشین ملازم ہیں۔ دھیرے دھیرے اس کی گھبراہٹ ختم ہوگئی۔ وہ باہر جانے لگی تھی۔ سودا سلف خریدنے یا خط پوسٹ کرنے لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ زیادہ تر گھر تک ہی محدود رہتی تھی۔ بلاسبب باہر جانا اسے یوں بھی پسند نہ تھا۔

کئی ماہ گزر گئے۔ صبح و شام لشتم پشتم گزرے۔ بانکے نے اس سے آئندہ زندگی کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی۔ شکو کے دل میں شک و شبہ تو تھا مگر اس نے سوچا شاید بانکے اس سے پھر اس دلدل میں اترنے کے لیے نہیں کہے گا بلکہ اپنے ساتھ ہی رکھے گا اور شاید زندگی یونہی گزرے گی۔ یہ سوچ کر ایک طرف تو شکو کو اطمینان کا احساس ہوتا، مگر دوسری طرف ایک خلجان بھی گھیر لیتا۔ کب تک؟ یونہی بغیر شادی کے ساری زندگی ایک ساتھ رہنا تو ٹھیک نہیں۔ اس کے ضمیر پر بوجھ پڑتا۔ ساتھ ہی ساتھ خوف بھی دامن گیر ہوتا۔ کیونکہ اس طرح ساتھ رہنے میں تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں تھی مگر وہ چپ رہتی۔ مناسب یہی تھا کہ انتظار کرے اور دیکھے کہ آنے والے وقت کی زنبیل سے اس کے لیے کیا نکلتا ہے؟

بانکے ایک غیر ذمے دار آدمی تھا۔ کسی ایک جگہ ٹک کر کام کرنا اور محنت سے روزی روٹی کما کر گھریلو زندگی گزارنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کی وہ ساری دلچسپیاں اور سرگرمیاں جو پیچھے وطن میں تھیں، اب بھی جاری تھیں۔ پب اور چائے خانوں میں اس کا بیشتر وقت گزرتا تھا۔ تاش بھی کھیلتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ریس کھیلنے کی لت بھی پال لی تھی۔ کبھی مارے باندھے کسی فیکٹری میں ملازمت کرتا بھی تو چند ماہ سے زیادہ نہیں، اس کے بعد پھر سوشل سیکیورٹی میں جا کھڑا ہوتا۔ یوں گھر میں پیسے کوڑی کی ہمیشہ پریشانی رہتی تھی مگر پھر بھی شکو کبھی شکوہ نہ کرتی۔ چپ رہتی اور انتظار کرتی۔ شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ دراصل اس نے مکمل طور پر خود کو حالات کے حوالے کردیا تھا۔

ایک بار اس نے ڈرتے ڈرتے بانکے سے کہا۔ ”ایسے کب تک چلے گا؟“

بانکے کچھ دیر قبل باہر سے آیا تھا، تھوڑا سا نشے میں تھا۔ ہاتھ میں سگریٹ تھی اور صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ شکو کی بات سن کر اس نے ایک زوردار کش لیا، گردن گھما کر نیم سرخ آنکھوں سے شکو کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

”کیا مطلب......؟“

”بات یہ ہے......“ شکو جھجکتے ہوئے بولی۔ ”کہ ہم یوں کب تک ساتھ رہیں گے؟ یہ کچھ اچھی بات تو نہیں۔ تم...... تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

”تو پھر......؟“

شکو کا دل زور سے دھڑکا۔ اعصاب کشیدہ ہوئے، ہونٹ تھرتھرائے۔ مگر جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی، کہنے میں کامیاب ہوگئی۔ ”کیوں نہ ہم شادی کرلیں......؟“

بانکے یکایک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک بار پھر زوردار کش لیا اور مسکرا کر شکو کی طرف دیکھا۔ ”شکو!...... میری جان! میں خود بھی کچھ دن سے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ مگر شادی والا خیال فی الحال مجھے کچھ جچا نہیں۔ خوامخواہ کا جھنجٹ ہے۔ کیا فرق پڑے گا شادی سے؟ صورتِ حال تو جوں کی توں ہی رہے گی۔ نہیں، شکو سویٹ ہارٹ! یہ بات تو سردست اپنے ذہن سے نکال ہی دو۔ آئندہ کبھی دیکھا جائے گا۔ میں تمہیں انگلینڈ لے آیا ہوں۔ منشا یہ تھا کہ تمہارا بھی کچھ بھلا ہوجائے گا۔ اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ چاہو تو اس موقعے سے فائدہ اٹھالو۔“

”کیا مطلب؟“

”دیکھو۔“ بانکے سوچ کر کہنے لگا۔ ”کچھ لوگ کی زندگی کی ڈگر قسمت یا وقت متعین کرتے ہیں اور وہ اس ڈگر

سے کبھی ہٹ نہیں سکتے۔ ہم دونوں بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ہیں۔ یاد ہے ہم دونوں کی زندگی کیا تھی؟ اور ہم کس ماحول سے آئے ہیں؟"

شکو نے الجھ کر کہا۔ "مگر تم کچھ کام کاج تو ٹھیک سے کرتے نہیں۔ اوپر سے تمہارے اتنے خرچے ہیں۔ گھوڑوں کی ریس، کتوں کی ریس اور نہ جانے کیا کیا۔ ایسے تو کام نہیں چلے گا۔" وہ رکی، پھر بولی۔ "کیوں نہ میں کوئی پارٹ ٹائم جاب کرلوں؟"

بانکے نے گہری معنی خیز نظروں سے شکو کو دیکھا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ پریشانی تو تمہیں واقعی ہوگی۔ اگر چاہو تو جز وقتی ملازمت کرلو مگر اس سے کیا ہوگا؟ روپے کا مسئلہ تو پھر بھی حل نہ ہوگا۔ ہاں، ایک صورت ہے۔"

"کیا......؟"

"دیکھو شکو! میری جان! میری بات سکون سے اور ٹھنڈے دل سے سنو۔ ہمیں تھوڑے نہیں، بہت سے روپوں کی ضرورت ہے۔ میری اپنی ضروریات ہیں۔ پیچھے تمہاری ماں اور بہن بھائی اور دو ایک دوسرے رشتے دار ہیں، انہیں بھی رقم چاہیے۔ ساتھ میں یہ بھی ہے کہ ہمیں ایک بہتر مکان کی ضرورت ہے۔ اگر کچھ عرصے میں ہمارے پاس کافی رقم آجائے تو ہم اس منحوس، واہیات اسٹریٹ اور اس بوسیدہ مکان کو چھوڑ دیں گے اور کسی بہتر علاقے میں چلے جائیں گے۔" وہ رکا، پھر مسکرا کر بڑی محبت سے بولا۔ "اور تب میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم سے شادی کرلوں گا۔"

"مگر اتنی رقم آئے گی کہاں سے؟" شکو ابھی تک الجھی ہوئی تھی۔

"برسے گا۔ بن برسے گا۔ اگر تم چاہو تو......" بانکے کے ہونٹوں پر ایک پراسراری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "دیکھو شکو! اس ملک میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو بے چارے تنہا ہیں اور......"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں......" شکو ٹپٹا کر چپ ہوگئی۔

بانکے کے ہونٹوں پر وہی کمینی، بے حس اور مکار مسکراہٹ نمودار ہوئی جو اس کی شخصیت کے باطن کی عکاس تھی اور شکو نے یہ مسکراہٹ کئی برسوں بعد دیکھی تھی۔ یکبارگی شکو کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ نفرت اور غصے سے اس کا رواں رواں سلگ اٹھا۔ دل چاہا کہ بانکے کے منہ پر تھوک دے اور گھر سے بھاگ جائے۔ مگر جائے گی کہاں؟ کون ہے اس ملک میں اس کا؟ وہ تو کسی کو جانتی تک نہیں۔ لاچاری...... لاچاری، بے کسی...... لمحاتی طیش اور کشاکش کا بھنور کچھ دیر میں بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے نفرت آمیز اور آتشیں نظروں سے بانکے کو دیکھتی رہی، پھر چاپ چاپ اٹھی اور اوپر چلی گئی۔

برسوں پہلے صورت حال آج سے قدرے مختلف تھی۔

اس دیار غیر میں، جہاں رنگ اور روشنی ہے، شراب ہے اور جان لیوا تنہائی بھی ہے، بے شمار ایشیائی اپنا گھر بار اور بیوی بچے چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ ابھی زیادہ تر لوگوں نے اپنی فیملی یہاں نہیں بلائی تھی اور تنہا ہی روزی روزگار کے مسائل سے نمٹ رہے تھے۔ تنہا رہنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ جب جذبات کی طنابیں تن کر چٹختی ہیں اور اکیلا پن آگ بن کر دل و دماغ کو جلاتا ہے...... ترستی ہوئی خواہشیں کچھ تقاضے کرتی ہیں تو نگاہیں ادھر ادھر بھٹکتی ہیں۔ تاک جھانک کرتی ہیں۔

بانکے تجربہ کار آدمی تھا۔ انسانی مزاج اور اس کے تقاضوں اور مطالبوں کو خوب پہچانتا تھا۔ ساتھ ہی وہ بہت زیرک اور چرب زبان بھی تھا۔ دوستی بڑھانے، ذہنوں کو ٹٹولنے اور نازک لمحات میں اپنا الو سیدھا کرنے کے ہنر سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ ابتدا میں اس نے ایسے ہی کچھ لوگ وقتاً فوقتاً تلاش کیے اور گھر لے کر آیا پھر اس نے شکو کو اکسایا کہ وہ خود ہی "شکار" کھیلے۔ طوعاً و کرہاً شکو کو سر جھکانا پڑا۔ وہ باہر نکلتی اور ایشین آبادی والی سڑکوں اور گلیوں میں بھٹکتی رہتی۔ کبھی کامیابی ہوتی، کبھی خالی ہاتھ واپس آتی۔ بانکے یا تو گھر میں پڑا رہتا یا پھر پب میں بیئر پیتا رہتا۔

گو ایک خاموش سمجھوتا ہوگیا تھا۔ زیادہ تر بوجھ شکو نے خود ہی اٹھا رکھا تھا۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ بانکے بالکل ہی لاتعلق ہوگیا ہو۔ کبھی کبھار کوئی ایسا شخص بھی مل جاتا جس کے بارے میں اسے اطمینان ہوتا کہ مطلب کا آدمی ہے اور اس کی جیب بھی وزنی ہے تو نہایت سلیقے سے اس کی جیب کا وزن کم کرنے کی کوشش کرتا۔

"کچھ شباب سے بھی دلچسپی ہے؟"

ایسے ہی لوگوں میں وہ بھی شامل تھا۔ لمبے قد، کھلتے ہوئے رنگ اور سنہری فریم کے چشمے والا راج۔ وہ ایک اندھیری رات میں ایک روشن جگنو کی طرح آیا تھا اور اپنی یاد کا ایک روشن عکس چھوڑ گیا تھا۔ شکو کو وہ پہلے ہی دن اچھا لگا تھا۔ سب سے الگ، سب سے انوکھا۔ وہ دھیمے دھیمے لہجے میں بے حد خوبصورت باتیں کرتا تھا جیسے مصور کی طرح کسی تصویر میں رنگ بھر رہا ہو۔ موسیقار کی طرح ستار کے تاروں کو چھیڑ رہا ہو اور سچ مچ وہ ستار کے تار ہی چھیڑ رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ستار شکو کے دل کا تھا۔ دھیرے دھیرے، بالکل غیر محسوس طریقے سے دل کے تاروں سے نکلنے والی لے

شکو کی روح کو سرشار کرنے لگی۔ تب شکو ڈر گئی۔ اس نے اپنے کان بند کرلیے اور جذبات و احساسات کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کے دامنِ حیات میں اتنے شگاف ہیں کہ کوئی بھی پھول وہاں کھلتا نہیں۔

☆☆☆

گاہے گاہے شکو سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ راہ چلتے یا پھر مارکیٹ میں۔ اگرچہ میں اس کے گھر میں کم ہی گیا مگر راہ چلتے ملاقات ہوتی تو تھوڑی بہت گفتگو کا تبادلہ بھی ہوتا۔ شکو مجھ سے مانوس ہوگئی تھی۔ شاید کچھ بھروسا بھی کرتی تھی۔ چنانچہ اکثر اپنے دل کا حال سناتی۔ ہر چند کہ یہ ذکر اس نے کبھی نہیں کیا کہ وہ بانکے کی منکوحہ نہیں ہے۔ مگر اپنے نجی حالات کا ذکر اس نے ضرور کیا۔ اس کا ماضی، اس کے حالات، پسند ناپسند۔ مگر اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ سفر حیات طے کرنے کے لیے کون سی ڈگر اپنانا چاہتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک گم شدہ عورت تھی...... لاشعوری طور پر خود کو جاننے اور پانے کی جستجو میں مبتلا۔ ایسے ہی دنوں میں ایک بار میں نے راج کو شکو کے ساتھ غالباً پہلی بار دیکھا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے دل میں اس کے لیے پسندیدگی کا احساس ابھرا تھا۔ وہ واقعی بڑا طرح دار نوجوان تھا۔ لمبا قد، چھریرا بدن، موٹی موٹی سی کشادہ آنکھیں جن پر سنہری فریم کا چشمہ بھلا لگتا تھا۔ سیاہ گھنگھریالے بال تھے۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے مارکس اینڈ اسپنسر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ میرے تجسس کا گھٹیا پن تھا کہ ان کے پیچھے پیچھے میں بھی چل دیا۔ راج نے شکو کے لیے ایک پل اوور خریدا۔ پھر دونوں باہر نکلے اور لائبریری کی طرف چلے گئے۔

☆☆☆

راج دراصل نصف ایشیائی تھا۔ کیونکہ اس کی ماں انگلش تھی اور باپ ایشین۔ وہ اپنے نصف وطن میں رہ رہا تھا لیکن باقی نصف وطن اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے نام کا معاملہ بڑا دلچسپ تھا۔ ماں اسے راجر لوئیس کہتی تھی اور باپ سراج احمد۔ اس بات پر دونوں میں اکثر جھگڑا بھی ہوتا رہتا تھا۔ بڑا گھمسان کا رن پڑتا تھا۔ سراج یا راجر نے دونوں ہی کو خوش رکھنے کے لیے درمیانی راستہ نکالا کہ صرف راج بن کر رہ گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی مسجد جاتا تھا اور کبھی اتوار کو چرچ میں بھی حاضری دے آیا کرتا تھا۔ ایک بار اس سے پوچھا گیا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے تو اس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا تھا۔

"دراصل میں نہیں چاہتا کہ مسجد اور چرچ میں کسی قسم کا تنازع یا جنگ ہو۔"

صاف ظاہر ہے کہ اس کا اشارہ اپنے ماں باپ کی طرف تھا۔ مگر پھر اس جھگڑے کا خاتمہ ہوگیا۔ اس طرح کہ اس کے باپ کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا اور شوہر کے غم میں کچھ عرصے بعد بیوی نے بھی رخت سفر باندھ لیا۔ وہ برطانیہ کی کہر آلود فضاؤں میں پلا بڑھا تھا اور تعلیم کی تکمیل کے بعد ایک فرم میں ملازم ہوگیا تھا۔ اس تمام عرصے میں وہ ایک بار بھی اپنے ایشیائی نصف وطن نہیں گیا تھا۔ ایشیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ذہنی، جذباتی، نظریاتی، کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ برطانوی تھا اور اس کا ذہنی تعلق صرف مغرب سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ذہن نے ایشیا کے نظریات اور سماجی و تہذیبی قدروں کا ہلکا سا عکس بھی قبول نہیں کیا تھا۔

کچھ دن تک وہ شکو کے پاس گیا، پھر اچانک اس نے اس سے ملنا بند کردیا۔ چند دن شکو کو انتظار رہا کہ وہ پھر آئے گا۔ کیونکہ اس کے پاس آنے والے اکثر افراد بار بار یا کبھی کبھار ضرور آتے تھے۔ لیکن راج نہیں آیا۔ حتیٰ کہ شکو مایوس ہوگئی۔

کئی ہفتے بعد ایک ویران سی شام کو وہ اچانک شکو کو مل گیا۔ سڑک کے کنارے، چاروں طرف سناٹا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو کچھ دیر چپ چاپ دیکھتے رہے۔ کچھ تذبذب کے ساتھ، کچھ سوالیہ نظروں سے جیسے سوچ رہے ہوں کہ کیا کہیں۔ کچھ دیر یونہی گزری، پھر آخر کار راج نے لب کھولے اور مسکرا کر کہا۔

''کیسی ہو شکو؟''

''اچھی ہوں۔'' شکو مسکرائی۔ پھر اس نے اضافہ کیا۔ ''تم کہاں غائب ہوگئے تھے؟ آئے کیوں نہیں؟''

''دراصل......'' راج شرارت سے مسکرایا۔ ''میں دراصل ڈر گیا تھا۔''

''ڈر گئے تھے؟'' شکو نے حیرت سے کہا۔ ''کس سے؟''

''تم سے...... تمہارے بالوں سے۔'' راج مسکرایا۔

''چلو ہٹو۔'' شکو جھینپ گئی۔

''نہیں، سچ میں......'' راج نے کہا۔ ''میں...... میں ان گھنے بالوں کے سیاہ جنگلوں میں گم نہیں ہونا چاہتا تھا۔''

''اب تم بیکار باتیں کر رہے ہو۔'' شکو شرما کر بولی۔

راج معاً سنجیدہ ہوگیا۔ ''شکو! یہ سچ ہے۔ تم مجھے اچھی لگنے لگی تھیں۔ روز بہ روز زیادہ اچھی لگنے لگی تھیں۔ میں ڈر گیا، کہیں ایسا نہ ہو، میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو جاؤں۔ اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔ محبت میں ہارنا میں پسند نہیں کرتا۔ آدمی اگر محبت کرے تو اسے جیتنا چاہیے یا مر جانا چاہیے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

شکو مبہوت سی اسے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر اچانک شام اتر آئی تھی اور آنکھوں کے لامحدود صحراؤں میں دھول اڑنے لگی تھی۔ کچھ دیر وہ گم صم سی راج کو دیکھتی رہی، پھر سوکھتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

''تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو؟''

''شاید ہاں، شاید نہیں۔''

''بدمعاش۔'' شکو ہنسی۔ راج بھی ہنسنے لگا۔ پھر شکو نے ایک بار اور ہونٹوں کی تپش کو زبان پھیر کر کم کیا اور آہستہ سے بولی۔ ''آج آؤ گے۔''

''تم کہتی ہو تو آجاؤں گا۔''

اس رات جب راج شکو کے پاس پہنچا تو بانکے گھر میں نہیں تھا۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ راج آئے گا، وہ کتوں کی ریس کھیلنے چلا گیا تھا۔ راج پلنگ پر نیم دراز ہوگیا۔ شکو نے اس کے لیے ایک کپ کافی بنائی، پھر پلو اودر اتار کر پلنگ پر پھینک دیا۔ اس کے بعد وہ جمپر اتار رہی تھی کہ اچانک راج نے کہا۔

''شکو! ایک بات پوچھوں؟...... برا تو نہیں مانو گی؟''

''پوچھو۔''

''تمہیں یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے؟''

''کیا......؟''

''یہی...... یہ کام؟''

شکو کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے سٹپٹا کر ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے اور گم صم ہو کر راج کو دیکھنے لگی۔ راج نے جلدی سے کہا۔ ''دیکھو شکو! میں تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ تم چاہو تو انکار کر سکتی ہو۔''

کئی صدیوں کی ذہنی کشمکش کے بعد شکو نے کہا۔ ''نہیں۔''

''تو پھر تم یہ سب کچھ ترک کیوں نہیں کر دیتیں؟''

شکو استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔ ''یہ اتنا آسان نہیں ہے راج!''

''کیوں نہیں ہے؟''

''ارے چھوڑو بھی راج!'' شکو بیزار ہوگئی۔ ''میں ایک گری ہوئی عورت ہوں۔ اگر یہ سب کچھ ترک کر دوں تو بھی مجھے عزت نہیں ملے گی۔ کوئی بھی گندگی میں گرا ہوا نگینہ نہیں اٹھاتا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ چونکہ تم اب تک اس پیشے سے وابستہ رہی ہو اس لیے کسی عزت کی مستحق نہیں ہو۔ لیکن یہ بات مجھے عجیب سی لگتی ہے۔ یہ زندگی تمہاری اپنی ہے۔ تم اپنے ہر فعل کے لیے آزاد اور خود مختار ہو۔ جب تک تم شادی نہ کرو، اس وقت تک تم پر کسی کا حق نہیں ہے۔ لہٰذا کسی کو تمہارے کسی فعل پر اعتراض کا حق بھی نہیں ہے۔ ہاں، اگر شادی کر لو تو پھر تم اپنے شوہر کی وفادار ہونے کی پابند ہوگی۔''

شکو کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ کیسی آواز تھی؟ یہ کیسی بات تھی؟ بالکل انوکھی، بالکل نئی۔ اس سے پہلے تو ایسی بات اس نے کبھی نہیں سنی تھی۔ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ شاید ہاں۔ یہ ماحول، یہ نئی دنیا، نئے لوگ شاید اس کے لیے حوصلہ شکن نہیں تھے۔ اس ملک میں شکو جیسی عورتوں کو چھوت کی بیماری نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اس سے پہلے تو کسی نے اسے کیچڑ سے نکالنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

راج نے معاً شکو کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''شکو کئی برائیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں اگر مانا جائے تو برائی ہیں ورنہ نہیں۔''

''راج......!'' شکو نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر صرف اس کا نام ہی زبان سے نکل سکا۔

راج نے مزید کہا۔ ''شکو سارے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ ایک دروازہ یا کھڑکی یا روزن ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔''

شکو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے، کیا کہے، کہاں جائے؟

☆☆☆

لونگ روم میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ چاروں طرف مختلف اشیا بے ترتیبی سے بکھری پڑی ہیں۔ شکو وہاں نہیں تھی۔ نہ ہی فائر پلیس پر اس کی تصویر نظر آرہی تھی۔ میں نے بانکے سے پوچھا۔

''شکو کہاں ہے......؟''

بانکے کا چہرہ ستا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس نے تھکے تھکے انداز میں ایک سگریٹ جلائی، لمبا کش لیا، پھر کھوکھلی آواز میں بولا۔

''بھاگ گئی۔''

☆☆☆

چھ سات ماہ گزر گئے۔ بانکے سے گاہے گاہے سامنا ہوجاتا تھا۔ میں شکو کے بارے میں استفسار کرتا، بانکے مایوسی سے سر ہلا دیتا۔ اس نے اپنے طور پر شکو کو تلاش کرنے کی کافی کوشش کی مگر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ شکو کا پھر کوئی سراغ نہیں ملا۔ بانکے پولیس کی مدد بھی حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ خدشہ تھا کہ وہ خود بھی کئی دشواریوں میں پڑ جائے گا۔ انہی دنوں اس نے یہ بات مجھے بتائی تھی کہ اس نے شکو سے باقاعدہ شادی نہیں کی تھی۔ چھ سات ماہ بعد بانکے خود بھی غائب ہوگیا۔ جب کئی ماہ تک وہ نظر نہیں آیا تو میں نے چند ایک بار اس کے واقف کاروں سے اس کے بارے میں سرسری طور پر پوچھا لیکن کسی کو یقینی طور پر اس کے متعلق کچھ علم نہیں تھا۔ ایک خیال یہ تھا کہ وہ شہر چھوڑ کر ساؤتھ میں کہیں چلا گیا ہے۔ دو ایک افراد کا یہ بھی گمان تھا کہ شاید منشیات کے دھندے میں دھر لیا گیا ہے اور اب کئی سال کے لیے جیل کی ہوا کھا رہا ہے۔ سبب کچھ بھی ہو، اس کے بعد بانکے سے پھر کبھی سامنا نہیں ہوا۔

پھر میرے اپنے حالات بھی بدلے۔ کچھ ایسی صورت حال پیدا ہوئی کہ مجھے شہر چھوڑنا پڑا۔ نیا گھر بہت دور گلاسکو میں بنایا۔ سارا لاابالی پن، بے فکری اور غیر ذمے داری ترک کر دی، شادی کی اور گھر بسا لیا۔ زندگی ایک بندھے بندھے اصول پر گزرنے لگی۔ حتیٰ کہ پچیس سال بیت گئے۔

☆☆☆

یہ اگست کی ایک روشن اور گرم سہ پہر ہے۔ میں اپنے دوست کے ساتھ ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں بیٹھا ہوا ہوں۔ انتظار گاہ کے دونوں جانب کشادہ دریچوں سے دونوں پلیٹ فارموں پر آتے جاتے لوگ دکھائی دے رہے ہیں۔ بائیں جانب والے پلیٹ فارم پر میری گاڑی کھڑی ہے۔ لیکن ابھی روانگی میں چند منٹ کی دیر ہے۔ میں کپ اٹھا کر ایک چسکی لیتا ہوں اور اپنے دوست کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ کہہ رہا ہے۔

''پھر کب آؤ گے؟''

''بھئی اس کا انحصار فرصت پر ہے۔ مگر اطمینان رکھو۔ جونہی موقع ملا، چکر لگاؤں گا۔''

''ہوں......'' میرا دوست سگریٹ سلگاتا ہے۔ ''ویسے میں بہر حال بہت خوش ہوں کہ تم اتنی دور سے شادی میں شرکت کے لیے آئے۔''

''یار! اتنے پرانے مراسم ہیں۔'' میں ہنس کر کہتا ہوں۔ ''تمہاری بیٹی آخر میری بیٹی بھی تو ہے۔ آنا تو تھا ہی۔''

دراصل ہم دونوں بہت عرصہ قبل اپنے پرانے شہر میں اور ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ کچھ مدت ایک ہی فیکٹری میں ساتھ ساتھ کام بھی کیا تھا اور ایک دوسرے کے گہرے دوست رہے تھے۔ پھر میرے دوست کو بوجوہ لنکا شائر کو خیر باد کہنا پڑا۔ اس کے بعد میں بھی گلاسگو چلا گیا۔ میرا دوست مڈلینڈ

ازدواجیات

☆ شوہر اور بیوی گاڑی کے پہیوں کی طرح ہیں لہٰذا عقل مند شوہر ہمیشہ گاڑی کے پہیے چار کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں، دوسری اور تیسری شادی کی صورت میں۔

☆ شادی شدہ زندگی بہت آسان ہے، جیسے کسی پارک میں واک کرنا، بالکل جراسک پارک کے سیر جیسی آسان۔

☆☆☆

☆ میاں بیوی سفر پر جا رہے تھے راستے میں گدھا گھاس کھاتا ہوا نظر آیا۔ بیوی نے از راہ مذاق کہا۔ ''اپنے رشتہ دار کو سلام کر لو۔''

شوہر نے کہا۔ ''کیوں نہیں ضرور۔'' اور سر کھڑکی سے نکال کر بولا۔ ''سسر جی سلام۔''

کے اس چھوٹے سے شہر میں آبسا تھا۔ برسوں سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر قلم اور فون کے ذریعے ہمارا رابطہ بہر حال قائم رہا تھا۔ جب اس نے اپنی بیٹی کی شادی کی تقریب سعید کا اہتمام کیا تو مجھے بھی دعوت نامہ بھیجا۔ دو دن قبل میں شادی میں شرکت کی غرض سے آیا تھا۔ اس شہر میں یہ میری پہلی آمد تھی۔ دو دن بعد اب میں واپس جا رہا تھا اور میرا دوست مجھے رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن تک آیا تھا۔

دفعتاً میرا دوست کہتا ہے۔ ''تمہارے بلڈ پریشر کا کیا حال ہے اب؟''

''کنٹرول میں ہے۔'' میں ہنس کر جواب دیتا ہوں۔

''اب تو یہ زندگی بھر ساتھ رہے گا۔''

''بال بھی تمہارے سفید ہو رہے ہیں۔'' میرا دوست مسکراتا ہے۔

''ارے میاں! بال سفید ہو رہے ہیں، جسم ناتواں ہو رہا ہے، بیماریاں گھیرنے لگی ہیں۔'' میں ٹھنڈی سانس لیتا ہوں۔ ''یہ سب تو ہونا ہی ہے۔ زندگی کی شام سر پر ہے۔ کون جانے رات ہونے میں اور کتنا وقت باقی ہے۔''

''ہاں یار! یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میرا دوست تاسف بھرے لہجے میں کہتا ہے۔ ''بیتے دن یاد آتے ہیں تو ہوک سی اٹھتی ہے۔ کیسے خوبصورت دن تھے وہ۔ اور کیسا ولولہ تھا ہمارے دلوں میں۔ کیسے کیسے خواب دیکھتے تھے اور کیا کیا منصوبے بناتے تھے، یاد ہے نا؟ زندگی میں یہ کریں گے، وہ کریں گے۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا اور زندگی گزر گئی۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گیا۔

میں بھی چپ رہا۔

چند لمحے بعد میرا دوست چونک کر بولا۔ ''ارے...... یہ تو استانی جی ہیں۔''

وہ ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے۔ میں دائیں جانب پلیٹ فارم پر نظر ڈالتا ہوں۔ ابھی ابھی ایک ٹرین آ کر رکی ہے، کمپارٹمنٹس کے دروازے کھل گئے ہیں اور لوگ ڈبوں سے باہر آ رہے ہیں۔ لیکن میرے دوست نے جس ہستی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ایک خاتون ہیں جو درمیانے کے عین سامنے والے ڈبے سے اتری ہیں۔ وہ ایک پختہ عمر کی خاتون ہیں۔ قدرے فربہ جسم اور سانولا رنگ۔ کاسنی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس ہیں۔ شانوں پر ایک ہلکی شال پڑی ہے۔ سر پر نہایت نفاست اور سلیقے سے حجاب بندھا ہوا ہے۔ آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک ہے جو بہت بھلی لگ رہی ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت بہت پاکیزہ اور باوقار نظر آتی ہے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی اور ایک جوان مرد بھی ہے۔ لڑکی نے ایک چھوٹی سی بچی کو گود میں اٹھا رکھا ہے جبکہ نوجوان کے ہاتھ میں سوٹ کیس ہے۔ وہ تینوں باتیں کرتے ہوئے صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔

''استانی جی؟'' میں اپنے دوست کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھتا ہوں۔

''ہاں۔'' میرا دوست جواب دیتا ہے۔ ''یہ اس شہر کی بہت ہی ہردلعزیز ہستی ہیں۔ ان کے ساتھ ان کی بیٹی اور داماد ہے۔ ایک لڑکا بھی ہے جو مقامی کونسل میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہے۔ استانی جی بہت نیک اور دردمند ہیں۔ فلاحی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہیں۔ ایک مدرسہ بنا رکھا ہے جہاں بچوں اور نوجوان لڑکیوں کو بلا معاوضہ قرآن اور اردو پڑھاتی ہیں۔ بیوہ اور مظلوم عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک انجمن بھی قائم کر رکھی ہے جو دکھی عورتوں کی مدد کے لیے بہت کام کرتی ہے۔ اگر پاک و ہند میں کوئی ناگہانی آفت نازل ہو تو نہ صرف خود حسب مقدور عطیہ دیتی ہیں بلکہ چندہ جمع کرنے نکل کھڑی ہوتی ہیں اور ہزاروں پاؤنڈز اکٹھا کر کے مصیبت زدگان کے لیے بھجواتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے فلاحی کاموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی ایشین کمیونٹی میں انہیں بہت عزت و احترام حاصل ہے۔''

میں استانی جی کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ اب صدر دروازے کے قریب پہنچ چکی ہیں۔ میں نرم آواز میں کہتا ہوں۔

''بھئی بہت خوشی ہوئی ان کے بارے میں جان کر...... نام کیا ہے؟''

''شائستہ بیگم۔'' میرا دوست جواب دیتا ہے۔ ''موقع نہیں ہے ورنہ میں تمہیں ان سے ملواتا۔''

''ہاں، واقعی وقت نہیں ہے۔'' میں اٹھتے ہوئے کہتا ہوں۔ ''میری گاڑی اب چھوٹنے ہی والی ہے۔''

کچھ دیر بعد میری گاڑی روانہ ہوتی ہے۔ میں اپنے دوست کو خدا حافظ کہتا ہوں اور کھڑکی سے ایک بار پھر صدر دروازے کی طرف دیکھتا ہوں۔ مگر اب وہاں استانی جی نہیں ہیں۔ میں یکا یک ایک طویل سانس لیتا ہوں۔ میرے دوست نے وقت کی کمی کی بات کی تھی لیکن اسے یہ نہیں معلوم کہ میرے پاس اگر وقت ہوتا بھی تو میں استانی جی سے نہ ملتا۔ میں پچیس سال پہلے بیتے ہوئے لمحے کو واپس نہیں لانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں نے جان لیا تھا مگر اپنے دوست کو نہیں بتایا تھا کہ استانی جی کا نام شائستہ بیگم نہیں بلکہ شاکرہ بیگم عرف شکو ہے۔

حضرت عزیر علیہ السلام

رضوانہ ساجد

انسانوں کی ہدایت کے لیے کوئی بھی بڑا واقعہ ایک ہی دن میں رونما نہیں ہوتا۔ وقت برسوں اس کی پرورش کرتا ہے... خدا اپنے قانون خود بناتا ہے... وہ فرعون کے گھر میں موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کراتا ہے اور کہیں قدرت اپنے مخصوص بندوں کے لیے سامان نجات تیار کر رہی ہوتی ہے... بھڑکتی آگ کے شعلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ٹھنڈے ہو کر نمرود کو حیران کرتے ہیں تو کبھی بخت نصر جیسے جلاد بادشاہ کو ششدر کر دیتے ہیں... جس نے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے یہ منظر دیکھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو آگ میں دھکیلا گیا تو نہ صرف بھٹی کے اندر بھڑکتے شعلے خاموش ہو گئے... بلکہ بھٹی کے فرش پر انگاروں کے ڈھیر پھولوں میں تبدیل ہو گئے... سبحان اللہ... بے شک اللہ اپنے صادق اور امین بندوں کو اپنی امان میں رکھتا ہے... اور انبیا کا درجہ تو بہت بلند ہوتا ہے۔

ابن آدم کے لیے سطر سطر عبرت اثر واقعات سے احوال انبیا

''اے میرے خداوند، کاش! یہ خواب تجھ سے کینہ رکھنے والوں کے لیے اور اس کی تعبیر تیرے دشمنوں کے لیے ہو۔ وہ درخت جو تو نے دیکھا کہ بڑھا اور اس کی چوٹی آسمان تک پہنچی۔ اے بادشاہ وہ تو ہی ہے جو بڑھا اور مضبوط ہوا کیونکہ تیری بزرگی بڑھی اور تیری سلطنت زمین کی انتہا تک پہنچی۔ پھر کسی نے کہا اسے کاٹ ڈالو تو اس کی تعبیر یہی ہے کہ تجھے آدمیوں میں سے ہانک کر نکال دیں گے اور تو میدان کے حیوانوں کے ساتھ رہے گا اور تو بیل کی طرح گھاس کھائے گا اور تجھ پر سات دور گزر جائیں گے اور یہ

جو کہا گیا کہ جڑوں کو باقی رہنے دو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب سات دور گزر جائیں گے تو تو اپنی سلطنت پر پھر بحال ہو جائے گا۔"

"کوئی ایسی ترکیب بھی ہے کہ میں اس تعبیر سے بچ جاؤں؟"

"حق تعالیٰ نے جو حکم دے دیا وہ تو ہو کر رہے گا۔ پھر بھی میں تجھے ایک صلاح دیتا ہوں۔ شاید حق تعالیٰ اپنا حکم تبدیل کر دے۔ تو اپنی خطاؤں کو صداقت سے اور اپنی بدکرداری کو مسکینوں پر رحم کرنے سے دور کر۔ ممکن ہے اس سے تیرا اطمینان زیادہ ہو۔ غرور کی ہوا اپنے دماغ میں نہ چلنے دے اور ہمہ وقت یہ یاد رکھ کہ اصل حکمرانی حق تعالیٰ کی ہے۔ وہ جسے چاہے حکمرانی دیتا ہے جس سے چاہے لے لیتا ہے۔"

اس واقعے کو ایک سال گزر گیا تھا کہ خواب کی تعبیر کا وقت قریب آ گیا۔ بادشاہ اپنے محل کی چھت پر ٹہل رہا تھا۔ بابل شہر کا منظر اس کے سامنے تھا۔ اس نے اس شہر کو ایسا پرشکوہ بنا دیا تھا کہ اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ شہر کے اندر مردوک دیوتا اور عشتار دیوی کے مندر تھے۔ ٹائلوں کے نہایت پرشکوہ ببر شیر اور اژدہے بنے ہوئے تھے۔ یہاں سے جلوس کی سڑک شروع ہوتی تھی جو پرتعیش شاہی محل تک جاتی تھی۔ اپنی ملکہ کے لیے معلق باغ تعمیر کروائے تھے۔ یونانی انہیں سات عجائبات میں شمار کرتے تھے۔

ان مناظر کو دیکھ کر اس کے دل میں غرور کا جذبہ پیدا ہوا، بے اختیار کہنے لگا۔ "کیا یہ بابلِ اعظم نہیں؟ جس کو میں نے اپنی توانائی اور قدرت سے تعمیر کیا ہے، کیا یہ میرے جاہ و جلال کا نمونہ نہیں۔"

ابھی وہ خود سے یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ آسمان سے آواز آئی کہ اے بادشاہ، تیرے حق میں یہ فتویٰ ہے کہ سلطنت تجھ سے جاتی رہی۔ تو اب حیوانوں کے ساتھ رہے گا اور بیل کی طرح گھاس کھائے گا اور سات دور تجھ پر گزریں گے تب تجھے معلوم ہو گا کہ حق تعالیٰ آدمیوں کی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے۔

اسی وقت بادشاہ ایک مرض میں مبتلا ہو گیا جسے "گرگ خولیا" کہا جاتا تھا۔ اس کا مریض یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ بھیڑیا ہے۔ بادشاہ محل کی چھت سے نیچے اترا تو جانوروں جیسی حرکتیں کر رہا تھا۔ اس کے خدام اور پہرے دار یقیناً یہ سمجھے ہوں گے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ بڑی مشکل سے اسے قابو کیا اور ایک کمرے میں بند کر کے پہرا لگا دیا گیا۔ اسے کھانے کو دیا گیا تو وہ جانوروں کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر جھک کر کھانے لگا۔ ایسے بااعتماد اطبا بلائے گئے جو اس راز کو فاش کیے بغیر اس کا علاج کر سکیں۔

عوام کو یہی معلوم تھا کہ بادشاہ بیمار ہے اور اس کا علاج ہو رہا ہے۔ بیماری کی نوعیت کسی کو معلوم نہیں تھی۔ ہر دوا ناکارہ ثابت ہوتی جا رہی تھی۔ شاہی خاندان کے لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اس کا جانشین کسے بنایا جائے۔ عوام کس طرح کسی اور کو قبول کریں گے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب عوام اپنی آنکھوں سے اس کی حالت دیکھ لیں۔ تخت کے آرزومندوں نے اسے محل سے باہر نکال دیا۔ لوگوں نے اپنے بادشاہ کو سڑک پر دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اب سب کو یقین آ گیا کہ بادشاہ پاگل ہو گیا ہے اور سلطنت کے کام چلانے کے لائق نہیں رہا۔ حضرت دانیال علیہ السلام شاہی خاندان کے لوگوں کو بتا رہے تھے کہ یہ کیفیت سات سال تک رہے گی، اس کے بعد بادشاہ پھر اپنے تخت پر بیٹھے گا۔ اس پیش گوئی کے بعد کوئی اس کے تخت پر نہیں بیٹھا البتہ بادشاہت کا اعلان کیے بغیر سلطنت کا کام چلاتے رہے۔

کچھ دنوں تک بادشاہ کا رعب لوگوں پر طاری رہا پھر بابل کے بچوں کے ہاتھ ایک شغل آ گیا۔ وہ بادشاہ کو جہاں دیکھتے پتھر برساتے۔ انتظامی معاملات حضرت عزیر علیہ السلام کے ہاتھ میں تھے۔ انہوں نے ایسا انتظام کر دیا تھا کہ لوگ بادشاہ کو پریشان نہ کریں۔

حضرت عزیر علیہ السلام کو تبلیغ کے لیے ایک نمونہ مل گیا تھا۔ اب وہ لوگوں سے پوچھ رہے تھے کہ تمہارے دیوتا کہاں ہیں جو بادشاہ کو اس حال میں دیکھ رہے ہیں اور خاموش ہیں۔ حق تعالیٰ کے کاموں میں دخل اندازی کی قوت کیوں نہیں رکھتے۔ اگر قوت ہے تو حق تعالیٰ کا فیصلہ تبدیل کر دیں لہٰذا ثابت ہوا کہ خدا ہی ہے جو انسانوں میں رہ کر حکمرانی کرتا ہے۔ وہ جس سے چاہتا ہے بادشاہت چھین لیتا ہے۔ بت پرستی چھوڑ دو اور اس خدا کی پرستش کرو جو سب سے زیادہ طاقتور ہے۔

بخت نصر کب تک بھیڑیا بنا شہر میں گھومتا رہتا۔ ایک روز منہ اٹھا تو جنگل کی طرف چلا گیا۔ خواب کی یہ تعبیر بھی سچی ثابت ہوئی کہ تجھے آدمیوں میں سے ہانک کر نکال دیں گے اور تو حیوانوں کے ساتھ رہے گا۔

لوگوں کو تشویش تھی کہ ایک انسان جنگل میں کس طرح رہ سکتا ہے۔ جنگلی جانور اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ بہت دن تک لوگ جنگل میں جا کر اسے دیکھتے رہے اور حیران ہوتے رہے۔ وہ جنگل کے جانوروں کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ وہ جانوروں میں جانور بن کر رہ رہا تھا۔ بیل کی طرح گھاس چرتا پھر رہا تھا۔

آہستہ آہستہ لوگ اسے بھولتے چلے گئے البتہ اس کے عزیز و اقارب دن گن رہے تھے کہ کسی طرح سات سال پورے ہوں، پیش گوئی غلط ثابت ہو اور وہ اس کے تخت پر قبضہ کریں۔ جنگل سے کون سلامت آیا ہے جو وہ آئے گا۔

موسموں کا ردوبدل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ سات دور گزر گئے۔ بارش ہو چکی تھی۔ جنگلی جانور بارش سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ بخت نصر بھی ایک گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا۔ بے اختیار آسمان کی طرف آنکھیں اٹھائیں۔ یہی وقت تھا جب کھوئی ہوئی عقل واپس آ گئی۔ سب کچھ یاد آ گیا۔ بے اختیار حق تعالیٰ کے لیے شکر کے الفاظ زبان پر آ گئے۔

"تعریف ہو اس کی جس کی مملکت پشت در پشت ہے... زمین کے تمام باشندے ناچیز گنے جاتے ہیں... اور وہ آسمانی لشکر اور اہلِ زمین کے ساتھ... جو کچھ چاہتا ہے، کرتا ہے... اور کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ روک سکے یا اس سے کہے... کہ تو کیا کرتا ہے۔"

عقل آتے ہی اپنی برہنگی کا احساس ہوا۔ بدن کے کپڑے تار تار ہو گئے تھے بلکہ تھے ہی نہیں۔ سر کے بال کاندھے پہ جھول رہے تھے۔ ایک شخص جو سات سال سے جنگل میں ہو، اس کی جو حالت ہو سکتی ہے، بس وہی اس کی تھی۔ عقل آتے ہی اسے جانوروں سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ وہ جس درخت تلے بیٹھا تھا، گھبرا کر اسی پر چڑھ گیا۔ اس کی خوش قسمتی کہ یہ ایک ایسا درخت تھا جس کے پھل کھائے جا سکتے تھے۔ وہ جنگل سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ دنیا کا سامنا کر سکتا۔ اسے اپنے عزیزوں کا انتظار تھا کہ شاید ان میں سے کوئی ڈھونڈتا ہوا آ جائے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کو یاد تھا کہ سات دور گزر جانے کے بعد بادشاہ کو واپس آنا ہے۔ انہوں نے شاہی خاندان کے افراد کو یاد دلایا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر جنگل میں گئے تاکہ اسے تلاش کریں اور اس کی حالت کا جائزہ لیں۔ اس وسیع جنگل میں اسے تلاش کرنا آسان نہیں تھا لیکن وہ سب جنگل میں ادھر ادھر پھیل گئے اور بالآخر ایک درخت کے اوپر سے بادشاہ نے انہیں پکارا۔

اللہ کے وعدے کے مطابق وہ اپنے تخت پر دوبارہ بحال ہو گیا۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اسے قادرِ مطلق پر یقین آ گیا تھا۔ حضرت عزیر علیہ السلام نے اس کی ملاقاتیں بھی بہت بڑھنے لگی تھیں لیکن بت پرستی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ آسمان کے بادشاہ کی تکریم و ستائش کے باوجود وہ بت پرستی سے تائب نہ ہو سکا البتہ ایک سرکاری اعلان کے ذریعے اس نے تسلیم کیا کہ آسمانی لشکر اور زمین کے باشندوں میں حق تعالیٰ ہی قادرِ مطلق ہے۔ وہ اس کی تعظیم و تکریم اور ستائش کرتا ہے اور اقرار کرتا ہے کہ آسمان کا بادشاہ اپنے سب کاموں میں راست اور اپنی سب راہوں میں عادل ہے اور مغروروں کو ذلیل کر سکتا ہے۔

اب حضرت عزیر علیہ السلام کو تبلیغ کے کاموں میں آسانی ہو رہی تھی۔ بادشاہ کی طرف سے مکمل حوصلہ افزائی ہو رہی تھی۔ جہاں جہاں بنی اسرائیل آباد تھے، حضرت عزیر علیہ السلام وہاں پہنچ رہے تھے۔ انہیں یہ خوش خبری سنا رہے تھے کہ عنقریب وہ اپنے وطن یروشلم کی طرف لوٹیں گے حالانکہ اب جلاوطنوں میں یروشلم کے لیے دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ حضرت عزیر علیہ السلام انہیں تلقین کر رہے تھے کہ وہ ہر اس گمراہی سے بچیں جس کی وجہ سے وہ غلام بنا لیے گئے تھے۔ اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کریں اور اس کی ذات میں کسی کو شریک نہ کریں۔ ان کی یہ تبلیغ اہلِ بابل کے لیے بھی تھی اور بہت سے مقامی لوگ ان کی باتوں سے متاثر ہو رہے تھے۔

جب تک بخت نصر زندہ رہا، حضرت عزیر علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو رعایتیں ملتی رہیں۔ عام بنی اسرائیل بھی بے فکری کی زندگی گزارتے رہے لیکن اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے بیلشضر نے زمامِ حکومت سنبھالی تو اسے حضرت عزیر علیہ السلام یا حضرت دانیال علیہ السلام سے وہ ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی جو بخت نصر کو تھی۔

اسی بیلشضر نے ان مقدس ظروف میں شراب بھی پی جو بخت نصر اپنے ساتھ یروشلم سے لایا تھا اور ابھی تک شاہی خزانے میں محفوظ تھے۔ ان میں شراب پینے کی جسارت بخت نصر نے کبھی نہیں کی تھی۔

بیلشضر نے شاہی محل کے باغ میں اپنے امرا کی ضیافت کی تھی۔ دورانِ ضیافت اسے سونے چاندی کے ان ظروف کا خیال آیا جو یروشلم سے لائے گئے تھے۔ اپنی قومی فتح کی یاد منانے کا یہ بہترین وقت تھا۔

حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے بخت نصر کو نصیحت کی تھی کہ وہ ان مقدس ظروف میں شراب نہ پیے ورنہ بابل کی تباہی یقینی ہو گی۔ اب اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ بخت نصر نے ان ظروف کو شراب سے کبھی آلودہ نہیں کیا لیکن بیلشضر یہ حرکت کر بیٹھا، وہ ظروف لائے گئے اور مہمانوں نے اور ان کی بیویوں نے ان برتنوں میں شراب پی۔

ابھی شراب پی جا رہی تھی کہ بیلشضر نے دیکھا کہ شمع دان کے مقابل شاہی محل کی دیوار دو حصوں میں تقسیم ہوئی اور اس مضبوط دیوار کو چاک کرتا ہوا ایک ہاتھ نمایاں ہوا اور اس نے دیوار پہ کچھ لکھا۔ بادشاہ نے اس تحریر کو بھی صاف طور پر دیکھا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا کہ یہ کیسا ہاتھ ہے، دیوار پھاڑ کر کس طرح اندر آیا اور اجنبی تحریر میں جو کچھ لکھا، اس کا مطلب کیا ہے؟

بابل کے حکیم اور نجومی بلائے گئے۔ انہیں طرح طرح کے لالچ دیے گئے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس نوشتۂ دیوار کو نہیں پڑھ سکا۔ جشن کا مزہ ہی کرکرا ہو گیا۔ سب کا نشہ جاتا رہا۔ دیوار پر چند الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ دیکھ سب رہے تھے لیکن اس کا مطلب کسی کو معلوم نہیں تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ تجسس بڑھتا جا رہا تھا کہ بخت نصر کی بیوہ جشن گاہ میں آئی اور اسے حضرت دانیال علیہ السلام کا پتا بتایا۔ یہ نیا بادشاہ حضرت دانیال علیہ السلام کو تقریباً بھول چکا تھا اور حضرت دانیال علیہ السلام نے بھی دربار میں آنا موقوف کر دیا تھا۔

"تیری مملکت میں ایک شخص ہے جس میں قدوس الہٰوں کی روح ہے اور تیرے باپ کے ایام میں نور اور دانش اور حکمت، الہٰوں کی حکمت کے مانند اس میں پائی جاتی تھی اور تیرے باپ نے اسے تمام ساحروں کا سردار بنایا تھا اس کا نام دانی ایل ہے۔ اسی کو بلا۔ وہی مطلب سمجھائے گا۔"

بیلشضر، حضرت دانیال علیہ السلام کی طرف سے کدورت رکھتا تھا۔ اس کے دور میں حضرت دانیال علیہ السلام کبھی اس کے دربار میں نہیں آئے تھے۔ وہ اس وقت بھی نہیں چاہتا تھا کہ ضیافت کے اس جشن میں حضرت دانیال علیہ السلام آئیں نہیں، وہ ہمیشہ "حقیر غلام" کہتا رہا تھا لیکن کام ایسا آن پڑا تھا کہ بلائے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اس نے ماں کا مشورہ مان لیا اور آدمی دوڑا دیے کہ حضرت دانیال علیہ السلام کو بلا لائیں۔

حضرت دانیال علیہ السلام نے وہ دیوار دیکھی جس میں شگاف پڑا تھا پھر اس تحریر پر نظر ڈالی اور پھر بادشاہ کی طرف دیکھا جس کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا اور حضرت دانیال علیہ السلام سے التجا کر رہا تھا کہ وہ اس تحریر کا مطلب اسے سمجھا دیں۔

"اس کا مطلب مجھ سے بیان کر۔ میں تجھے ارغوانی خلعت کا حق دار ٹھہراؤں گا اور تو میری مملکت میں تیسرے درجے کا حاکم ہوگا۔"

"مجھے کسی انعام کی حاجت نہیں۔ میں تو انبیا کی پیش گوئیوں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور وہ سب کچھ بتاؤں گا جو پیش آنے والا ہے۔" حضرت دانیال علیہ السلام نے اسے یاد دلایا۔ "بخت نصر کو خدا نے بڑی عزت بخشی تھی لیکن جب اس کی طبیعت میں گھمنڈ سمایا اور اس کا دل غرور سے سخت ہو گیا تو وہ تخت سلطنت سے اتار دیا گیا اور وہ انسانوں سے نکل کر گورخروں کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ اس حال میں تب تک رہا جب تک اسے یہ معلوم نہیں ہو گیا کہ خدا تعالیٰ انسان کی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے اس پر قائم رکھتا ہے۔"

"تو مجھے یہ سب کچھ کیوں یاد دلا رہا ہے؟" بادشاہ نے کہا۔ "تو مجھے صرف یہ بتا کہ اس تحریر میں کیا لکھا ہے۔"

"ان واقعات کا اس تحریر سے بڑا گہرا تعلق ہے بلکہ اسی کا تسلسل ہے۔ تو اپنے باپ کا انجام دیکھ چکا تھا، تو بھی تو نے اپنے دل سے عاجزی نہیں کی۔ تو نے ہیکل کے ظروف میں شراب پی اور پتھر اور لکڑی کے بتوں کی پرستش کرتا رہا۔ پس اسی خدا کی طرف سے ہاتھ کا وہ حصہ بھیجا گیا اور یہ نوشتہ لکھا گیا اور وہ نوشتہ یہ ہے "منے منے تقیل وفرسین" اس کے معنی یہ ہیں کہ تیری مملکت کا حساب کیا اور اسے تمام کر ڈالا۔ تیری مملکت تقسیم ہوئی اور مادیوں اور فارسیوں کو دی گئی۔"

اس تحریر کا متن اتنی جلد پورا ہوا کہ اسی رات ایران کے بادشاہ خورس نے کسی مزاحمت کے بغیر بابل پر قبضہ کر لیا۔ اس کے سپاہی شاہی محل میں گھس آئے اور بیلشضر کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

خورس خود فتح کے جلوس کے ساتھ اس مشہور شہر میں داخل ہوا اور نوروز کا سالانہ تہوار منانے تک یہیں قیام پذیر رہا۔

حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی پیش گوئی پوری ہونے کا وقت آیا جو انہوں نے برسوں پہلے کی تھی کہ جو لوگ جلاوطن ہوئے ہیں انہیں فارس کا بادشاہ رہائی دے گا اور وہ لوگ اپنے وطن کو لوٹیں گے۔ ہیکل پھر سے تعمیر ہوگی۔ یروشلم پھر سے آباد ہوگا۔

یہ پیش گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا۔ اس نے دل میں تہیہ کیا کہ یروشلم کے جلاوطن بنی اسرائیلیوں کو ان کے وطن واپس بھیج دیا جائے۔ اس نے یہ فرمان جاری کیا۔

"خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی سب مملکتیں مجھے بخشی ہیں اور مجھے تاکید کی ہے کہ میں یروشلم میں جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں۔ بس تمہارے درمیان جو کوئی اس کی ساری قوم میں سے ہو اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم میں جو یہوداہ میں ہے جائے اور خداوند اسرائیل کا گھر جو یروشلم میں ہے بنائے اور جو کوئی کسی جگہ جہاں اس نے قیام کیا باقی ہو تو اس جگہ کے لوگ چاندی اور سونے اور مال اور مویشی سے اس کی مدد کریں اور علاوہ اس کے وہ خدا کے گھر کے لیے جو یروشلم میں ہے رضا کے ہدیے دیں۔"

اس فرمان کا جاری ہونا تھا کہ بنی اسرائیل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہوداہ اور بن یامین کے آبائی خاندانوں کے سردار اور کاہن اور لاوی اور وہ سب جن کے دل کو خدا نے ابھارا، اٹھے کہ جا کر خداوند کا گھر بنائیں اور ان سب نے جو ان کے پڑوس میں تھے، سونے چاندی اور دیگر قیمتی اشیا سے مدد کی۔

خورس بادشاہ نے بھی خداوند کے گھر کے ان برتنوں کو نکلوایا جن کو بخت نصر یروشلم سے لے آیا تھا اور اپنے دیوتاؤں کے مندر میں رکھا تھا اور ان کو گن کر یہوداہ کے امیر کے حوالے کیا، ان ظروف کی تعداد پانچ ہزار چار سو تھی۔

شاہ فارس کی اجازت اور سرکاری امداد و اعانت کے ساتھ یہودی جلاوطن یروشلم کے طویل اور پُرخطر سفر پر روانہ ہوئے۔ انہوں نے عزم صمیم کر رکھا تھا کہ ہیکل کو دوبارہ تعمیر کریں گے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ واپسی 538 ق م یا اس سے اگلے سال عمل میں آئی ہوگی۔ کہا جاتا ہے پچاس ہزار جلاوطن یروشلم واپس آئے۔

اتنی بڑی بھیڑ کو یروشلم تک لے جانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ اس کے لیے حضرت عزیر علیہ السلام نے گیارہ لیڈر مقرر کیے جن میں زربابل اور یشوع زیادہ سرگرم تھے۔ زربابل، یروشلم کے شاہی خاندان سے تھا اس لیے سیاسی قیادت اس کی ذمے تھی جبکہ یشوع سردار کاہن تھا اور مذہبی رسومات کی ادائیگی کا ذمے دار تھا۔

واپسی کے سال کے ساتویں مہینے تک لوگ یروشلم کے گرد و نواح میں کافی بس گئے، انہوں نے اسرائیل کے خدا کی قربان گاہ بنائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بتائی ہوئی سوختنی قربانیاں چڑھانے کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ اسی مہینے کی پندرہ تاریخ کو انہوں نے لکھے ہوئے شرعی احکام کے مطابق عید خیام بھی منائی۔

ان پُرتاثیر تقریبات کے ساتھ یروشلم میں خدا کی عبادت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور پھر مقررہ اوقات اور موسموں کے مطابق نئے چاند کی عید اور دوسری عیدیں بھی منائی جانے لگیں۔

خداوند کے ہیکل کی بنیاد ہنوز نہیں ڈالی گئی تھی۔

ہیکل کی تعمیر کا کام اگلے سال کے دوسرے مہینے میں شروع ہوا۔ ہیکل کی بنیاد رکھنے کے لیے موزوں اور مناسب رسم ادا کی گئی۔ کاہنوں نے اپنے اپنے مخصوص لباس پہن کر نرسنگے پھونکنے کی خدمت سرانجام دی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق خدا کی حمد و ستائش کے گیت گائے اور خوشی کے نعرے بلند کیے۔

حضرت حزقیل علیہ السلام کو جو کچھ عالم رویا میں دکھا دیا گیا تھا تمام کام اسی کے مطابق ہو رہے تھے، بنیادیں بتا رہی تھیں کہ تعمیرات کا تمام نقشہ اسی عالم رویا کے مطابق ہے۔

یہ کام بہ حسن و خوبی چل رہا تھا کہ اچانک اس میں رکاوٹیں پیدا ہونے کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ شمالی اسرائیل کے دارالحکومت اور اس کے اردگرد کے علاقے کو "سامریہ" کہا جاتا تھا۔ یہ غیر ملکی تھے جنہیں یہاں آباد کیا گیا تھا۔ یہ بت پرست تھے لیکن پھر توریت پر ایمان لے آئے تھے۔ یہاں کے حاکموں نے جب سنا کہ ہیکل کی تعمیر دوبارہ شروع ہو گئی ہے تو یہ لوگ یروشلم کے آبائی خاندانوں کے سرداروں کے پاس آئے اور اس تعمیر میں حصہ داری کے طالب ہوئے۔

"ہمیں بھی اس تعمیر میں شامل کرو کیونکہ ہم بھی تمہارے خدا کے طالب ہیں جیسے تم ہو اور ہم شاہ اسور اسرحدون کے دنوں سے جو ہم کو یہاں لایا اس کے لیے قربانی چڑھاتے ہیں۔"

ان سرداروں نے ان کی اس خواہش کا احترام نہیں کیا اور انہیں صاف جواب دے دیا۔ "یہ تمہارا کام نہیں کہ ہمارے ساتھ مل کر کام کرو اور ہمارے خدا کے لیے گھر بناؤ بلکہ ہم آپ ہی مل کر خداوند اسرائیل کے خدا کے لیے اسے بنائیں گے جیسا شاہ فارس خورس نے ہم کو حکم کیا ہے۔"

اس انکار کے بعد سامریوں اور اسرائیلیوں میں کھلی دشمنی ہو گئی۔ سامریوں نے تعمیراتی کام میں روڑے اٹکانے شروع کر دیے، خزانچیوں کو رشوت دیتے رہے۔ بعض سرکاری مشیر بھی ان کی طرف ہو گئے۔ کام تقریباً بند ہو کر رہ گیا۔ اس اثنا میں خورس کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ فرمان بھی کسی کے پاس نہیں تھا جس میں ہیکل کی تعمیر کی اجازت دی گئی تھی۔ سامریہ کے لوگ کہتے تھے، تم کس کے حکم پر یہ تعمیر کر رہے ہو۔

فارس کے تخت پر اخسویرس بیٹھا تو سامریہ کے حاکموں نے یہوداہ اور یروشلم کے باشندوں کی شکایت لکھ بھیجی، وہ اس باغی اور فسادی شہر کو بنا رہے ہیں چنانچہ دیواروں کو ختم اور بنیادوں کی مرمت کر چکے ہیں۔ بادشاہ پر روشن ہو جائے کہ اگر یہ شہر بن جائے اور فصیل تیار ہو جائے تو وہ خراج چنگی یا محصول نہیں دیں گے اور آخر بادشاہوں کو نقصان ہوگا۔ سو چونکہ ہم حضور کے دولت خانے کا نمک

کھاتے ہیں اور مناسب نہیں کہ ہمارے سامنے بادشاہ کی تحقیر ہو اس لیے ہم نے بادشاہ کو لکھ کر اطلاع دی ہے تا کہ حضور کے باپ دادا کے دفتر کی کتاب میں تفتیش ہو تو اس دفتر کی کتاب سے حضور کو معلوم ہوگا اور یقین ہو جائے گا کہ شہر فتنہ انگیز شہر ہے جو بادشاہوں اور صوبوں کو نقصان پہنچاتا رہا ہے اور قدیم زمانے سے اس میں فساد برپا کرتے رہے ہیں۔ اسی سبب سے یہ شہر اجاڑ دیا گیا تھا اور ہم بادشاہ کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر یہ شہر تعمیر ہوا اور اس کی فصیل بن جائے تو اس کی صورت میں حضور کا حصہ دریا پار کچھ نہ رہے گا۔"

ان کی یہ تدبیر کارگر رہی۔ خورس بادشاہ کے فرمان کو سب بھول چکے تھے۔ اخسویرس نے بھی یہ تصور کیا کہ یہ لوگ اپنے طور پر ہیکل کی تعمیر کر رہے ہیں۔ اس نے اس خط کا حوصلہ افزا جواب دیا۔

"جو خط تم نے ہمارے پاس بھیجا وہ میرے حضور صاف صاف پڑھا گیا اور میں نے حکم دیا اور تفتیش ہوئی اور معلوم ہوا کہ اس شہر نے قدیم زمانے سے بادشاہوں سے بغاوت کی ہے اور فتنہ وفساد اس میں ہوتا رہا ہے اور یروشلم میں زور آور بادشاہ بھی ہوئے ہیں جنہوں نے دریا پار کے سارے ملک پر حکومت کی ہے اور خراج چنگی اور محصول ان کو دیا جاتا تھا۔ سو تم حکم جاری کرو کہ یہ لوگ کام بند کریں اور یہ شہر نہ بنے جب تک میری طرف سے فرمان جاری نہ ہو۔ خبردار! اس میں سستی نہ کرنا۔"

سامریہ کے حکمران اور سردار اس خط کو لے کر یروشلم آئے اور بنی اسرائیل کو یروشلم کی تعمیر سے روک دیا۔ ہیکل کی تعمیر رک گئی اور پھر برسوں رکی رہی یہاں تک کہ دارا بادشاہ کا دور آیا۔ سامریہ کے حاکموں نے دارا کو بھی خط لکھا۔

"دارا بادشاہ کی ہر طرح سلامتی ہو!

بادشاہ کو معلوم ہو کہ ہم یہوداہ کے صوبے میں خدا تعالیٰ کے گھر کو گئے۔ وہ بڑے بڑے پتھروں سے بن رہا ہے اور دیواروں پر کڑیاں دھری جا رہی ہیں اور کام خوب کوشش سے ہو رہا ہے۔ ہم نے ان بزرگوں سے سوال کیا اور ان سے یوں کہا کہ تم کس کے فرمان سے اس گھر کو بناتے ہو۔ ہم نے ان کے نام بھی پوچھے تا کہ ہم ان لوگوں کے نام لکھ کر حضور کو خبر کر دیں کہ ان کے سردار کون ہیں۔

"اور انہوں نے ہم کو یوں جواب دیا کہ ہم زمین و آسمان کے خدا کے بندے ہیں اور وہی مسکن بنا رہے ہیں جسے بنے بہت برس ہو گئے لیکن جب ہمارے باپ دادا نے آسمان کے خدا کو غصہ دلایا تو اس نے انہیں شاہ بابل کے ہاتھ میں کر دیا جس نے اس گھر کو اجاڑ دیا اور لوگوں کو بابل لے گیا لیکن شاہ بابل خورس نے حکم دیا کہ خدا کا گھر بنایا جائے۔

"سو اب اگر بادشاہ مناسب جانے تو بادشاہ کے دولت خانے میں جو بابل میں ہے تفتیش کی جائے کہ خورس بادشاہ نے خدا کے اس گھر کو یروشلم میں بنانے کا حکم دیا تھا یا نہیں جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں اور اس معاملے میں بادشاہ اپنی مرضی ہم پر ظاہر کرے۔"

دارا بادشاہ نے بابل کے تاریخی کتب خانے میں اس فرمان کی چھان بین کی۔ ہیکل کی تعمیر رکے برسوں گزر گئے تھے اور ابھی تک فرمان کی تلاش ہو رہی تھی۔ رکاوٹیں ڈالنے والے جان بوجھ کر رکاوٹیں ڈال رہے تھے لیکن خدا چاہتا تھا کہ اس کا گھر تعمیر ہو۔ حضرت عزیر علیہ السلام اس فرمان کی تلاش میں دارا کی مدد کر رہے تھے بالآخر یہ فرمان مل گیا جس میں لکھا تھا۔

"خورس بادشاہ کے پہلے سال خورس بادشاہ نے خدا کے گھر کی بابت جو یروشلم میں ہے حکم کیا کہ وہ گھر یعنی وہ مقام جہاں قربانیاں کرتے ہیں بنایا جائے اور اس کی بنیادیں مضبوطی سے ڈالی جائیں اور اس کی اونچائی ساٹھ ہاتھ اور چوڑائی ساٹھ ہاتھ ہو۔ تین ردے بھاری پتھروں کے اور ایک ردہ نئی لکڑی کا ہو اور خرچ شاہی محل سے دیا جائے اور خدا کے گھر کے سونے چاندی کے برتن بھی واپس دیے جائیں۔"

اس فرمان کے ملتے ہی دارا نے فرمان جاری کیا۔

"دریا پار کے حاکم اور تمہارے رفیق!

تم وہاں سے دور رہو۔ خدا کے اس گھر کے کام میں دست اندازی نہ کرو۔ یہودیوں کا حاکم اور یہودیوں کے بزرگ خدا کے گھر کو اس کی جگہ پر تعمیر کریں۔ علاوہ اس کے خدا کے گھر کو اس کی جگہ پر تعمیر کرنے میں یہودیوں کے بزرگوں کے ساتھ تم کو کیا کرنا ہے۔ سو اس کی بابت میرا یہ حکم ہے کہ شاہی مال میں سے یعنی دریا پار کے خراج میں سے ان لوگوں کو بلاتوقف خرچ دیا جائے تا کہ ان کو رکنا نہ پڑے اور آسمان کے خدا کی سوختنی قربانیوں کے لیے جس جس چیز کی ان کو ضرورت ہو یعنی بچھڑے اور مینڈھے اور جتنا نمک اور تیل، سب ان کو فراہم کیا جائے۔

میں نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ جو شخص اس فرمان کو بدل دے، اس کے گھر میں سے کڑی نکالی جائے اور اسے اسی پر چڑھا کر سولی دی جائے۔

مجھ دارا نے حکم دے دیا اس پر بڑی کوشش سے عمل ہو۔"

کس کی مجال تھی کہ دارا کے اس فرمان پر عمل نہ کرتا۔ دریا پار کے حاکم اور اس کے سرداروں نے بلاتوقف اس پر عمل کیا۔ تعمیر کا رکا ہوا کام زور شور سے جاری ہو گیا۔ اس مرتبہ مزید قوی جذبہ تھا بنی اسرائیل اسے اپنی فتح سمجھ رہے تھے نیز انہیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ خدا کی ناراضی دور ہو گئی ہے اور وہ ان کے ساتھ ہے جو بادشاہوں کے دلوں کو نرم کر رہا ہے۔

نئی ہیکل کی تعمیر میں مزید پانچ سال اور لگے۔ اگرچہ یہ ہیکل بھی پہلی جگہ تعمیر کی گئی اور خوبصورتی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر کردہ ہیکل کی پرچھائیں بھی نہیں تھی۔ چند بوڑھے لوگ اب بھی موجود تھے جنہوں نے پرانی عمارت کی شان وشوکت دیکھی تھی۔ وہ اس عمارت کو دیکھ کر آبدیدہ ہو رہے تھے لیکن یہ سوچ کر خوش بھی تھے کہ خدا نے انہیں اپنے گھر میں پھر سے آباد کیا۔

ہیکل کی تعمیر کے بعد تقدیس کی تقریبات نہایت بارعب تھیں۔ بڑی تعداد میں قربانیاں گزاری گئیں جن میں 100 بیل، 100 مینڈھے اور اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے لیے 12 بکروں کی قربانیاں شامل تھیں۔ آخری قربانی کا یہ مطلب تھا کہ اس عبادت میں ساری قوم جس سے عہد کیا گیا تھا، شامل ہے۔ اس تقدیس کے ساتھ ہی کاہنوں اور لاویوں نے باقاعدہ خدمات کا آغاز کر دیا۔

اگلے مہینے یہودیوں نے عید فسح منائی۔ کاہنوں اور لاویوں کو باقاعدہ پاک کیا تا کہ ان تاریخی تقریبات کی ادائیگی کے لیے مناسب طور سے تیار ہوں۔ اب کاہن اس لائق ہو گئے کہ خون چھڑک سکیں۔

وہ اسرائیلی جو ابھی تک فلسطین میں آباد تھے۔ شادمانی کی اس تقریب میں وہ بھی آنے والے جلاوطنوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ان اسرائیلیوں نے غیر اقوام کی بے دینی کی رسموں کو اپنا لیا تھا۔ اب انہوں نے ان رسموں کو ترک کیا اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق کی تجدید کی اور ہیکل میں عبادت کرنے لگے۔ عید فسح نے انہیں یہ بھی یاد دلایا کہ تمہیں مصر کی غلامی سے کس طرح فدیہ دے کر چھڑایا گیا تھا۔

حضرت عزیر علیہ السلام اب تک بابل میں رہ کر بنی اسرائیل کی تعلیم وتربیت میں مشغول تھے۔ انہیں واپسی کے لیے نہ صرف رضامند کر رہے تھے بلکہ ایسی تربیت بھی کر رہے تھے کہ وہ خدا کے گھر میں پاک صاف ہو کر پہنچیں لیکن جب مقدس تقریبات ہو چکیں اور ہیکل کی تعمیر مکمل ہو گئی اور بابل میں بہت تھوڑے سے جلاوطن رہ گئے تو حضرت عزیر علیہ السلام نے ارتخششتا بادشاہ سے درخواست کی کہ مجھے واپس جانے کی منظوری دی جائے۔

ارتخششتا بادشاہ آپ کی اتنی قدر کرتا تھا کہ نہ صرف آپ کو اجازت دی بلکہ یہ بھی فرمایا کہ باقی ماندہ جلاوطن آپ کی قیادت میں یروشلم واپس جائیں اور آپ کو اختیار دیا کہ یروشلم میں حاکم اور قاضی مقرر کریں اور جو نافرمانی کرے اس کی جائداد ضبط کر لیں اور اسے قید میں ڈالیں۔ انہیں کھلی اجازت دی کہ ہیکل میں عبادت کے لیے جو کچھ درکار ہو وہ شاہی خزانے سے طلب کر لیں۔ دریائے فرات پار کے حکمرانوں کے نام بھی فرمان جاری ہوا کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خوراک اور نقدی فراہم کریں تا کہ شاہی خاندان پر خدا کا غضب نازل نہ ہو۔

ابھی چلنے کی تیاری ہو رہی تھی کہ ارتخششتا بادشاہ نے ان تمام زبانی باتوں کو تحریر کی شکل دے کر حضرت عزیر علیہ السلام کے حوالے کیا تا کہ بوقت ضرورت سند کا کام دے۔ اس میں لکھا تھا:

"ارتخششتا بادشاہ کی طرف سے میں یہ فرمان جاری کرتا ہوں کہ اسرائیل کے جو لوگ اور ان کے کاہن اور لاوی میری مملکت میں ہیں ان میں سے جتنے اپنی خوشی سے یروشلم کو جانا چاہتے ہیں تیرے ساتھ جائیں۔ چونکہ تو بادشاہ اور اس کے ساتوں مشیروں کی طرف سے بھیجا جاتا ہے تا کہ اپنے خدا کی شریعت کے مطابق جو تیرے ہاتھ میں ہے یہوداہ اور یروشلم کا حال دریافت کرے اور جو چاندی اور سونا بادشاہ اور اس کے مشیروں نے اسرائیل کے خدا کو جس کا مسکن یروشلم میں ہے اپنی خوشی سے نذر کیا ہے لے جائے اور جس قدر چاندی سونا بابل کے سارے صوبے سے تجھے ملے گا اور جو خوشی کے ہدیے لوگ اور کاہن اپنے خدا کے گھر کے لیے جو یروشلم میں ہے اپنی خوشی سے دیں ان کو لے جائے۔

اس لیے اس روپے سے بیل اور مینڈھے اور حلوان اور ان کی نذر کی قربانیاں اور ان کے تپاون کی چیزیں تو بڑی کوشش سے خریدنا اور ان کو اپنے خدا کے گھر کی قربان گاہ پر جو یروشلم میں ہے چڑھانا اور تجھے اور تیرے بھائیوں کو باقی چاندی سونے کے ساتھ جو کچھ کرنا مناسب معلوم ہو وہی اپنے خدا کی مرضی کے مطابق کرنا اور جو برتن تجھے تیرے خدا کے گھر کی عبادت کے لیے سونپے جاتے ہیں ان کو یروشلم کے خدا کے حضور دے دینا اور جو کچھ اور تیرے خدا کے گھر کے لیے ضروری ہو جو تجھے دینا

پڑے اسے شاہی خزانے سے دینا اور میں ارتخششتا بادشاہ خود دریا پار کے سب خزانچیوں کو حکم کرتا ہوں کہ جو کچھ عزرا کاہن آسمان کے خدا کی شریعت کا فقیہہ تم سے چاہے وہ بلاتوقف کیا جائے۔ جو کچھ آسمان کے خدا نے حکم کیا ہے سوٹھیک ویسا ہی آسمان کے خدا کے گھر کے لیے کیا جائے کیونکہ بادشاہ اور شہزادوں کی مملکت پر غضب کیوں بھڑکے۔

اور اے عزرا (عزیزؑ) تو اپنے خدا کی اس دانش کے مطابق جو تجھ کو عنایت ہوئی حاکموں اور قاضیوں کو مقرر کرنا کہ دریا پار کے سب لوگوں کا جو تیرے خدا کی شریعت کو جانتے ہیں انصاف کریں اور تم اس کو جو نہ جانتا ہو سکھاؤ اور جو کوئی تیرے خدا کی شریعت پر اور بادشاہ کے فرمان پر عمل نہ کرے، اس کو بلاتوقف قانونی سزا دی جائے۔ خواہ موت یا جلاوطنی یا مال کی ضبطی یا قید کی۔''

بادشاہ نے یہ خط حضرت عزیر علیہ السلام کے حوالے کیا تو شکر خداوندی میں آپؑ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ آپؑ کو وہ زمانہ یاد آگیا جب آپ نوعمر تھے اور قیدی بنا کر لائے گئے تھے۔ غلاموں کی کیا عزت لیکن خدا نے عزت کے اسباب پیدا کیے۔ خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ بادشاہوں کے دل نرم کردیے۔ آج وطن جانا نصیب ہورہا ہے اور وہ بھی اس سعادت کے ساتھ کہ شاہ فارس مہربان ہے۔

آپؑ اپنے خدا کے حضور سجدے میں گر گئے۔ ''خداوند ہمارے باپ، دادا کا خدا مبارک ہو جس نے یہ بات بادشاہ کے دل میں ڈالی کہ خداوند کے گھر کو جو یروشلم میں ہے آراستہ کرے اور بادشاہ اور اس کے مشیروں کے حضور اور بادشاہ کے سب عالی قدر سرداروں کے آگے اپنی رحمت مجھ پر کی اور میں نے خداوند اپنے خدا کے ہاتھ سے جو مجھ پر تھا تقویت پائی۔''

خدا کے فضل اور بادشاہ کے ہاتھ کا سہارا لے کر حضرت عزیر علیہ السلام کو چلنے کی تیاری کرنی تھی۔ بارش کے مہینے کی پہلی تاریخ کو آپؑ نے اپاوا نامی نہر کے کنارے خیمہ لگایا اور اسرائیل کے سرکردہ افراد کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ آپؑ نے دیکھا کہ بنی لاوی میں سے کوئی حاضر نہیں ہوا ہے تو آپؑ نے ایک وفد تشکیل دیا اور اسے ''کسیفیا'' بھیجا (کسیفیا، جلاوطن یہودیوں کا مرکز تھا) اس وفد نے سردار سے ملاقات کی۔ سردار کی کوشش سے 40 لاوی اور ہیکل کے 220 خدمت گزار حضرت عزیر علیہ السلام کو میسر آگئے۔ اب کل 1800 افراد تھے جو آپؑ کے ساتھ یروشلم جانے کے لیے یہاں جمع تھے۔ سونا چاندی اور قیمتی اجناس بھی تھیں۔ راستہ پرخطر اور طویل تھا۔ کوئی محافظ دستہ ساتھ نہ تھا کیونکہ حضرت عزیر علیہ السلام نے بادشاہ سے کوئی محافظ دستہ نہیں مانگا تھا۔ اپنی حفاظت کی دعا کے لیے آپؑ نے روزے کی منادی کی۔ تمام لوگ روزہ رکھیں اور اپنے بال بچوں اور اپنے مال کے لیے سیدھی راہ طلب کریں کیونکہ میں نے شرم کے باعث بادشاہ سے سپاہیوں کے جتھے اور سواروں کے لیے درخواست نہ کی تھی تاکہ وہ راہ میں دشمن کے مقابلے میں ہماری مدد کریں کیونکہ ہم نے بادشاہ سے کہا تھا کہ ہمارے خدا کا ہاتھ بھلائی کے لیے ان سب کے ساتھ ہے جو اس کے طالب ہیں اور اس کا زور اور قہر ان سب کے خلاف ہے جو اسے ترک کرتے ہیں۔

اب آپؑ کو یروشلم کی جانب روانہ ہونا تھا۔ سفر کا آغاز نیسان کی بارہ تاریخ کو ہوا۔ ایک ہزار میل کا سفر ساڑھے تین ماہ میں طے ہوا۔ خدا کا ہاتھ ان کے ساتھ تھا جس نے انہیں دشمنوں اور راستے میں گھات لگانے والوں کے ہاتھ سے بچایا اور یہ قافلہ بہ حفاظت یروشلم پہنچ گیا۔ لاوی اور کاہن جو خزانے اور ظروف بابل سے لائے تھے مقامی کاہنوں کی زیرنگرانی ہیکل میں جمع کرادیے گئے۔ اس کے بعد واپس آنے والے جلاوطنوں نے صحن میں بڑی تعداد میں قربانیاں چڑھائیں۔

ارتخششتا نے جو خط آپؑ کو دیا تھا اس کی نقول آپؑ نے باج گزار حاکموں اور گورنروں کے حوالے کیں۔ انہوں نے عہد کیا کہ وہ یہودی ریاست کے لیے ہر ممکن مدد فراہم کریں گے۔

ایک نبی کی حیثیت سے حضرت عزیر علیہ السلام کا کام انتظامی معاملات نہیں بلکہ بنی اسرائیل کی اصلاح تھا تاکہ اب ان سے کوئی ایسا کام سرزد نہ ہوجائے جو خدا کی ناراضی کا سبب بن جائے۔

اس کام کے لیے انہوں نے چند لوگوں کو مقرر کردیا جو تحقیق کرکے ایسی خامیوں کو تلاش کریں جن کی اصلاح ضروری ہو۔ چند ہی روز کی کوششوں سے ان لوگوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف دلائی۔

مقامی اہل کاروں نے بتایا۔ ''اسرائیلیوں نے بے دین اور بت پرست باشندوں سے بیاہ شادیاں کرکے خدا کا قصور کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان میں مذہبی و سرکاری رہنما بھی شامل ہیں۔ مقدس نسل ان اطراف کی قوموں کے ساتھ خلط ملط ہوگئی اور سرداروں اور حاکموں کا ہاتھ اس بدکاری میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔''

حضرت عزیر علیہ السلام کو اس خبر سے ایسا دکھ ہوا کہ آپؑ نے اپنے غصے اور قہر کے اظہار کے لیے اپنا پیراہن چاک کرلیا اور عالم پریشانی میں ہیکل کے صحن میں جا بیٹھے۔ سارے لوگ خوفزدہ ہوگئے کہ اس جلال اور غصے کا اثر نہ جانے کیا ہو۔ آپؑ کی دلداری کے لیے بہت سے لوگ آپؑ کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ اس وقت تک کچھ بول نہیں سکتے تھے جب تک وہ خود بولنے کی ابتدا

کریں۔ شام ہوگئی۔ شام کی قربانی ہوچکی تو اسی شرمندگی کی حالت میں سر اٹھایا اور پھر گھٹنوں پر گر کر خدا کی طرف ہاتھ پھیلائے۔

''اے میرے خدا، میں شرمندہ ہوں اور تیری طرف اے میرے خدا اپنا منہ اٹھاتے مجھے لاج آتی ہے کیونکہ ہمارے گناہ بڑھتے بڑھتے ہمارے سر سے بلند ہوگئے اور ہماری خطاکاری آسمان تک پہنچ گئی ہے۔ اپنے باپ دادا کے وقت سے آج تک ہم بڑے خطاکار رہے اور اپنی بدکاری کے باعث ہم اور ہمارے بادشاہ اور ہمارے کاہن اور ملکوں کے بادشاہوں اور تلوار اور اسیری اور غارت اور شرمندگی کے حوالے ہوئے ہیں جیسا آج کے دن ہے۔ اب تھوڑے دنوں سے خداوند ہمارے خدا کی طرف سے ہم پر فضل ہوا ہے اور اب اے ہمارے خدا، ہم اس کے بعد کیا کہیں کیونکہ ہم نے تیرے ان حکموں کو ترک کردیا ہے جو تو نے اپنے خادموں یعنی نبیوں کی معرفت فرمائے کہ وہ ملک جسے تم میراث میں لینے کو جاتے ہو اور ملکوں کی قوموں کی نجاست اور نفرتی کاموں کے سبب سے ناپاک ملک ہے کیونکہ انہوں نے اپنی ناپاکی سے اس کو اس سرے سے اس سرے تک بھر دیا ہے اور اے خدا تو نے ہمارے گناہوں کے مقابلے میں بہت کم سزا دی ہے۔ کیا ہم پھر تیرے حکموں کو توڑیں اور ان قوموں سے ناتا جوڑیں جو ان نفرتی کاموں کو کرتی ہیں۔ کیا تو ہم سے ایسا غصہ نہ ہوگا کہ ہم کو نیست و نابود کردے۔''

جس وقت آپؑ یہ دعا فرما رہے تھے ایسا جذباتی ماحول ہوگیا اور لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ ان کا پیغمبر ان کی خاطر کتنی پریشانی اٹھا رہا ہے۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کی جو ایک بڑی جماعت وہاں جمع ہوگئی تھی، وہ سب لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

ایک سردار آگے بڑھا اور حضرت عزیر علیہ السلام سے کہنے لگا۔ ''ہم اپنے خدا کے گناہ گار تو ہوئے ہیں اور اس سرزمین کی قوموں میں سے اجنبی عورتیں بیاہ لی ہیں لیکن اب بھی بنی اسرائیل کے لیے امید ہے۔ خدا اب بھی انہیں معاف کرسکتا ہے اگر ہم عہد کریں کہ ان بیویوں اور ان کی اولادوں کو شریعت کے مطابق دور کریں گے۔''

انہوں نے کاندھے پکڑ کر حضرت عزیر علیہ السلام کو اٹھایا۔ آپؑ نے اسی وقت سردار کاہنوں اور لاویوں اور سارے اسرائیل سے قسم لی کہ وہ خدا سے عہد باندھیں گے اور اس کے مطابق عمل کریں گے۔ ان سب نے قسم کھائی۔

پورے ملک میں اعلان کیا گیا کہ تمام لوگ تین دن کے اندر اندر یروشلم میں جمع ہوں۔ جو حاضر نہیں ہوگا، اس کو قوم سے خارج کردیا جائے گا اور اس کا مال و متاع ضبط کرلیا جائے گا۔

اس اعلان نے سب کو فکرمند کردیا تھا۔ بازار کے ہر چوک میں جہاں لوگ جمع ہوتے تھے یہی باتیں ہورہی تھیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام نے جمع ہونے کا حکم کیوں دیا ہے، ہر شخص اپنی اپنی رائے کا اظہار کررہا تھا۔ اس میں ایک رائے یہ بھی تھی کہ حضرت عزیر علیہ السلام غیر قوموں سے شادیوں کے مسئلے پر بات کریں گے۔

نویں مہینے کی بیسویں تاریخ تھی۔ بارش بھی ہورہی تھی لیکن حضرت عزیر علیہ السلام کے حکم کی تعمیل لازمی تھی۔ ہر شخص گھر سے نکلا ہوا تھا۔ ہر راستہ ایک ہی طرف جارہا تھا۔ لوگ ہیکل کے سامنے بڑے چوک میں جمع ہورہے تھے۔ کچھ بارش، کچھ خوف سے کانپ رہے تھے کہ دیکھو کیا حکم جاری ہوتا ہے کیونکہ یہ مسئلہ سب کا تھا۔ بنی اسرائیل کے ہر گھر میں کوئی نہ کوئی اجنبی عورت ضرور تھی اور یہ خیال کیا جارہا تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام ان غیر قوم کی عورتوں سے الگ ہونے کا حکم دیں گے۔ ان کی عورتوں نے گھر سے نکلتے وقت انہیں روکا بھی تھا لیکن جائداد کی ضبطی کا سوال سامنے تھا پھر یہ یقین بھی نہیں تھا کہ واقعی یہ مسئلہ سامنے ہوگا۔ یہ معما اسی وقت حل ہوسکتا تھا جب حضرت عزیر علیہ السلام کا خطاب شروع ہو۔

حضرت عزیر علیہ السلام سامنے آئے اور ان سے مخاطب ہوئے ''تم نے خطا کی ہے اور اسرائیل کا گناہ بڑھانے کو اجنبی عورتیں بیاہ لی ہیں۔ پس خداوند اپنے باپ دادا کے خدا کے حضور اقرار کرو اور اس کی مرضی پر عمل کرو اور ان اجنبی عورتوں سے الگ ہوجاؤ۔''

انہیں یاد تھا کہ ان کے باپ دادا نے اپنے نبیوں اور کاہنوں کی باتیں نہیں مانی تھیں تو ان پر عذاب ٹوٹا تھا۔ جلاوطنی کا ایک طویل عذاب۔ اب انہیں اپنا وطن دوبارہ نصیب ہوا تھا۔ اب وہ یہ برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ خدا ان سے خفا ہو اور ایک مرتبہ پھر کوئی ظالم بادشاہ ان پر مسلط کردیا جائے۔ انہوں نے چیخ چیخ کر حضرت عزیر علیہ السلام کی آواز میں آواز ملائی۔

''جیسا تو نے کہا ویسا ہی ہم کو کرنا لازمی ہے لیکن لوگ بہت ہیں اور اس وقت شدت کی بارش ہورہی ہے اور ہم باہر کھڑے نہیں رہ سکتے اور نہ یہ ایک دو دن کا کام ہے کیونکہ ہم نے اس معاملے میں بڑا گناہ کیا ہے۔ کوئی گھر اس سے خالی نہیں۔''

حضرت عزیر علیہ السلام نے اس وقت سب کو جانے دیا کیونکہ اس وقت تو سب سے عہد لینا منظور تھا۔ سب نے عہد کیا۔ چند آوازیں مخالفت میں بلند ضرور ہوئی تھیں لیکن بعد میں انہیں کوئی اہمیت نہیں ملی۔

برسات کے سبب لوگوں کو رخصت کردیا گیا۔ چنیدہ افراد... اور یہودی مملکت کے مختلف حصوں کے نمائندہ افراد کی مدد

سے حضرت عزیر علیہ السلام نے تین ماہ تک قصور وار افراد کے معاملات کی تفتیش کی۔

مخلوط شادیوں کے قصوروار لوگوں میں بارسوخ اور معتبر افراد بھی شامل تھے۔ فہرست میں 114 نام تھے جن میں متعدد کاہن اور لاوری بھی شامل تھے۔ قصوروار کاہنوں میں اٹھارہ سردار کاہن یشوع کے قریبی رشتہ دار تھے۔ وہ زربابل کے ساتھ واپس آئے تھے۔ ان قصورواروں نے دل سے قسم کھائی کہ ان شادیوں کو منسوخ کردیں گے۔ اس عہد کے لیے انہوں نے خطا کی قربانی کا مینڈھا چڑھایا۔

☆☆☆

جب بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کرڈالا اور بنی اسرائیل کے لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکا کر بابل لے گیا تو نہ صرف بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا بلکہ توریت کے تمام نسخوں کو بھی جلا کر خاک کردیا تھا۔ اب بنی اسرائیل کے پاس نہ تو اس مقدس کتاب کا کوئی نسخہ باقی بچا تھا اور نہ کوئی حافظ تھا جس کو اول سے آخر تک توریت یاد ہو۔ اسیری کے پورے دور میں یہ قوم اپنی کتاب سے محروم رہی لیکن جب یہ اسیری ختم ہوئی اور یہ لوگ بیت المقدس میں دوبارہ آباد ہوئے تو انہیں یہ فکر ہوئی کہ توریت کو کہاں سے حاصل کریں۔ حضرت عزیر علیہ السلام کی اصلاحی تحریک نے اس ضرورت کو اور بھی شدید کر دیا۔ زندگی گزارنے کے لیے قدم قدم پر حضرت موسیٰؑ کی شریعت کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہ خدشہ بڑھنے لگا تھا کہ اگر یہ کتاب غائب رہی تو غلط روایات رواج پاجائیں گی اور قوم بے دین ہوتی چلی جائے گی۔ قوم کے افراد بار بار آپؑ کے پاس آرہے تھے کہ ہم نے ہیکل کو دوبارہ تعمیر کرلیا لیکن اللہ کی کتاب کہاں سے لائیں جسے ہیکل کی زینت بنائیں اور اپنے دلوں میں آباد کریں اور اس کے مطابق اپنی زندگیاں گزاریں۔

توریت کے گم ہوجانے کا آپؑ کو بھی سخت افسوس تھا۔ اس افسوس میں آپؑ ہر وقت آنسو بہاتے رہتے تھے۔ ایک روز اسی طرح غم کی حالت میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص آپؑ کے پاس آیا اور آپؑ کے رونے کا سبب پوچھنے لگا۔

"اے عزیرؑ، آپ کیوں رو رہے ہیں؟"

"اللہ تعالیٰ کی کتاب ضائع ہونے پر رو رہا ہوں۔ وہ کتاب ہمارے پاس تھی لیکن ہمارے گناہوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہوگیا۔ اس نے ہمارے دشمن کو ہم پر مسلط کردیا جس نے ہمارے مردوں کو قتل کیا ہمارے شہروں کو تباہ کیا اور ہماری کتاب کو آگ لگادی۔ اب اس کے بغیر ہم اپنی دنیا و آخرت کیسے سنوار سکتے ہیں۔ اگر میں اس پر نہیں روؤں گا تو کس صدمے پر میرے آنسو بہیں گے۔"

"کیا آپؑ چاہتے ہیں کہ وہ کتاب آپؑ کو واپس مل جائے؟"

"چاہتا تو یہی ہوں لیکن اس کی صورت کیا ہوگی؟"

"صورت بھی نکل ہی آئے گی۔ ابھی چلے جاؤ۔ روزہ رکھو کل اسی جگہ آنا۔"

حضرت عزیر علیہ السلام واپس چلے آئے۔ روزہ رکھا، اپنے جسم اور کپڑوں کو پاک کیا اور پھر اگلے روز اسی جگہ پر تشریف لے آئے اور وہاں بیٹھ گئے۔ وہی شخص دوبارہ آیا۔ یہ شخص دراصل اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا فرشتہ تھا۔ اس کے پاس پانی سے بھرا ہوا برتن تھا۔ اس نے برتن کا پانی حضرت عزیر علیہ السلام کو پلایا جس کی وجہ سے توریت آپؑ کے سینے میں آگئی۔

بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ جس وقت انہوں نے بنی اسرائیل کو جمع کیا اور اعلان کیا کہ وہ توریت کو دوبارہ مرتب کریں گے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ مشکل کام کس طرح سرانجام پائے گا۔ یہ تو حضرت موسیٰؑ کی طاقت سے بھی باہر ہے کہ پوری توریت زبانی لکھوادیں۔ اسی وقت لوگوں نے یہ منظر حیرت سے دیکھا کہ آسمان سے دو نورانی شہاب زمین کی طرف آئے اور پھر یہ دونوں شہاب حضرت عزیر علیہ السلام کے سینے میں اتر گئے۔ لکھنے والے چاروں طرف بٹھادیے گئے تھے۔ انہوں نے بولنا شروع کیا اور لکھنے والے لکھتے گئے۔ کئی شب و روز کی محنت کے بعد توریت کا صحیفہ دوبارہ مرتب ہوگیا۔

اس کارنامۂ عظیم نے یہوداہ کو بے حد متاثر کیا۔ اتنا متاثر کیا کہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ توریت کو دوبارہ مرتب کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام اپنے بیٹے کے ذریعے انجام دیا۔

پہلے چند لوگوں کا یہ خیال تھا پھر اس میں اور لوگ شامل ہوتے چلے گئے۔ حضرت عزیر علیہ السلام اور دوسرے انبیا شرک کے جس زہر سے اس قوم کو بچانے کے لیے کوشاں تھے، ایک مرتبہ پھر یہ زہر ان میں سرایت کرنے لگا۔ حضرت عزیر علیہ السلام کے دنیا سے اٹھتے ہی حضرت عزیر علیہ السلام کے بت تیار ہونے لگے اور پرستش کی جانے لگی اور ایک گروہ ضرور ایسا پیدا ہوگیا جو

حضرت عزیر علیہ السلام کو "ابن اللہ" یعنی خدا کا بیٹا کہتے اور ان کے بت کی پرستش کرنے لگے۔ ان کے اس خیال کی تردید قرآن نے ان الفاظ میں کی۔

"اور یہودیوں نے کہا، عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا، مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ ان کی باتیں ہیں محض ان کی زبانوں سے نکالی ہوئی۔ ان لوگوں نے بھی ان ہی کی سی بات کی جو اس سے پہلے کفر کی راہ اختیار کرچکے ہیں۔ ان پر اللہ کی لعنت، یہ کدھر جارہے ہیں۔"

قرآن مجید کے اس اعلان پر کہ عزیر علیہ السلام کو یہود خدا کا بیٹا کہتے ہیں آج کے بعض یہودی عالم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم تو حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے اس لیے قرآن کا یہ دعویٰ غلط ہے مگر ان علمائے یہود کا یہ اعتراض بھی اپنے پیش رووں کی طرح حقیقت چھپانے پر مبنی ہے ورنہ تو وہ جانتے ہیں اور ان کے علاوہ ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کی اور اس کو اقوام عالم کے مذاہب کی تحقیق سے دلچسپی رہی ہو کہ آج بھی نواح فلسطین میں یہود کا وہ فرقہ موجود ہے جو حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتا ہے اور رومن کیتھولک عیسائیوں کی طرح ان کا مجسمہ بنا کر ان کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو خدا کے ساتھ ہونا چاہیے۔ (قصص القرآن)

یہی وہ زمانہ ہے جب حضرت یرمیاہ علیہ السلام طویل نیند یا عارضی موت سے بیدار ہوئے۔ آپؑ کی نیند کا واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب بخت نصر نے یروشلم کو لوٹنے کے بعد انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہا تھا لیکن آپؑ نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کردیا تھا۔ آپؑ کو بہ ذریعہ وحی مطلع کیا گیا تھا کہ یروشلم کو دوبارہ آباد کیا جائے گا۔ آپؑ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ یروشلم تو کھنڈر بن چکا اب اسے کون آباد کرے گا۔ یہ آباد ہو بھی گیا تو میں اسے دیکھنے کے لیے کب زندہ رہوں گا۔ آپؑ انہی خیالوں میں غرق اجڑے ہوئے شہر سے نکل کر قبرستان میں چلے گئے تھے۔ آپؑ نے اپنے گدھے کو ایک درخت سے باندھا۔ اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا سرہانے رکھا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ سونے کے لیے لیٹے تھے تو صبح کا وقت تھا۔ آنکھ کھلی تو غروب آفتاب کا منظر تھا۔

ندا آئی۔ "تم کتنی دیر سوئے؟"

آپؑ نے جواب دیا۔ "ایک دن یا اس سے کچھ زیادہ۔"

جواب آیا۔ "نہیں، تم سو سال بعد سو کر اٹھے ہو۔ ذرا اپنے گدھے کی طرف دیکھو جو گل سڑ چکا اور پھر اپنے کھانے کی طرف دیکھو جو ترو تازہ ہے۔ یہ ہماری قدرت ہے۔ اب تم دیکھو ہم کس طرح ہڈیوں پر گوشت چڑھاتے ہیں۔"

حضرت یرمیاہ علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کے گدھے کے ڈھانچے پر گوشت چڑھنے لگا اور پھر اس میں جان پڑ گئی۔ آپؑ کو یاد آگیا کہ آپؑ نے یہ خیال کیا تھا کہ یروشلم کو کون آباد کرے گا اور ہڈیوں پر گوشت کیسے چڑھے گا؟ آپؑ نے اسی وقت توبہ کی اور اقرار کیا کہ بے شک! اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ آپؑ گدھے پر سوار ہوئے اور شہر کی طرف آئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پورا شہر آباد ہوچکا ہے۔ بڑی بڑی عمارتیں بن گئی ہیں۔ دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ لوگ چل پھر رہے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔

"اور کیا تم نے اس شخص کا حال نہ دیکھا جس کا ایک بستی پر گزر ہوا جو اپنی چھتوں سمیت زمین پر ڈھیر تھا تو وہ کہنے لگا۔ اس بستی کی موت کے بعد اللہ تعالیٰ کس طرح اس کو زندگی دے گا پس اللہ نے اس شخص پر سو برس کی موت طاری کردی اور پھر زندہ کردیا۔ اللہ نے دریافت کیا، تم یہاں کتنی مدت پڑے رہے۔ اس نے جواب دیا ایک دن یا دن کا بعض حصہ۔ اللہ نے کہا ایسا نہیں ہے بلکہ تم سو برس تک اس حالت میں رہے۔ تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ بگڑی تک نہیں اور پھر اپنے گدھے کو دیکھو اور (یہ سب کچھ اس لیے ہوا) تاکہ ہم تم کو لوگوں کے لیے "نشان" بنائیں اور اب تم دیکھو کہ کس طرح ہم ہڈیوں کو ایک دوسرے پر چڑھاتے اور آپس میں جوڑتے ہیں اور پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔"

قرآن مجید نے اس ہستی کا نام ذکر نہ فرمایا۔ بس اتنا کہا کیا تم نے اس شخص کا حال نہ دیکھا۔ اس لیے بعض لوگوں نے اس واقعے کو حضرت یرمیاہ علیہ السلام سے منسوب کیا جبکہ بعض نے فرمایا یہ ہستی حضرت عزیر علیہ السلام تھے۔

اسحٰق بن بشر کئی طریق سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام وہی شخص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے سو سال تک مارے رکھا پھر اٹھایا۔ اس واقعے کو وہ اس طرح فرماتے ہیں۔

"حضرت عزیر علیہ السلام ایک دن اپنی زمین کی طرف نکلے۔ واپسی میں ایک ویرانے میں ٹھہر گئے کیونکہ گرمی سخت تھی۔ آپؑ اپنے گدھے پر سوار اس ویرانے میں داخل ہوئے تو گدھے سے اترے اور آپؑ کے ساتھ کھانے کا ٹوکرا تھا جس

میں انجیر تھے اور دوسرے ٹوکرے میں انگور تھے پھر اپنے ساتھ موجود پیالہ نکالا اور انگور اس میں نچوڑے پھر خشک روٹی نکالی اور اس کو مشروب میں ڈال دیا تاکہ کچھ نرم ہو جائے تو کھالیں۔ کچھ دیر کے لیے سیدھے لیٹ گئے۔ جس عمارت میں آپ قیام فرماتے تھے وہ بوسیدہ ہو چکی تھی اور اس کے رہنے والے مر کھپ چکے تھے۔ بے اختیار آپؑ کے دل میں خیال آیا۔ "اللہ کیسے ان کو موت کے بعد زندہ فرمائے گا۔" یہ خیال آنا تھا کہ آپؑ پر موت طاری ہو گئی اور سو سال تک سوئے رہے۔

جب سو سال کامل بیت چکے اور اس درمیان بنی اسرائیل میں بہت سے واقعات اور حادثات رونما ہوئے اور پھر آپؑ کی موت زندگی میں بدل گئی۔

فرشتے نے آپؑ سے پوچھا۔ "کتنا عرصہ ٹھہرے؟"

فرمایا۔ "ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔"

فرشتے نے کہا۔ "نہیں بلکہ آپ سو سال تک ٹھہرے ہیں۔"

آپؑ کے دل میں اس مدت کے انکار کا خیال پیدا ہوا تو فرشتے نے کہا۔ "آپؑ میری بات کو غلط سمجھ رہے ہیں تو ذرا اپنے گدھے کی طرف دیکھ لیجیے۔"

دیکھا تو اس کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ فرشتے نے ہڈیوں کو حکم دیا تو وہ ہر طرف سے اکٹھی ہو کر اٹھ اٹھ کر ایک جگہ اکٹھی ہو گئیں اور جڑ گئیں اور عزیرؑ دیکھتے رہے۔ پھر ان پر رگیں چڑھیں اور پٹھے بنے پھر گوشت چڑھا پھر ان پر بال اور کھال تک آ گئے پھر فرشتے نے اس پر پھونک ماری تو گدھا آسمان کی جانب اپنا سر اور کان اٹھا کر آواز نکالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ آپؑ اس گدھے پر سوار ہوئے اور شہر میں تشریف لائے تو کسی نے بھی آپؑ کو نہ پہچانا۔ ایک اندھی بڑھیا بیٹھی تھی جس کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ آپؑ نے اس سے پوچھا کیا یہ عزیر کا گھر ہے؟ یہ سنتے ہی اس بڑھیا کے آنسو جاری ہو گئے اور بولی میں نے اتنے سالوں سے کسی کے منہ سے عزیر کا ذکر نہیں سنا۔ اب تو لوگ انہیں بھول ہی گئے۔ حضرت عزیر علیہ السلام نے فرمایا، میں ہی عزیر ہوں۔ بڑھیا نے جواب دیا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ عزیرؑ کو گم ہوئے سو سال ہو چکے۔ اس وقت میں بیس سال کی جوان لڑکی تھی اور اب ایک سو بیس کی ہو چکی۔"

آپؑ نے پھر اصرار کیا کہ میں ہی عزیر ہوں۔ اس بڑھیا نے کہا۔

"عزیر تو مستجاب الدعوات تھے جو دعا مانگتے تھے قبول ہوتی تھی۔ اگر آپ عزیرؑ ہیں تو میرے لیے دعا کیجیے کہ میری بصارت لوٹ آئے۔ میں دیکھنے لگی تو دیکھ کر بتاؤں گی کہ آپ عزیرؑ ہیں یا نہیں۔" آپؑ نے اس کے حق میں دعا کی تو اس کی بینائی لوٹ آئی اور فوراً پکار اٹھی۔

"میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ ہی عزیرؑ ہیں۔" پھر بڑھیا چل کر بنی اسرائیل کے محلے میں ان کی ایک محفل میں پہنچی اور سب کو اطلاع دی۔ سب لوگوں نے دیکھا اور پہچانا تو پھر بنی اسرائیل نے کہا ہمارے اندر کوئی تورات کا حافظ نہیں لہٰذا آپؑ ہمارے لیے تورات کو لکھ کر دکھایئے پھر آپؑ ایک درخت کے سائے میں تشریف فرما ہوئے اور بنی اسرائیل کے لوگ آپؑ کے گرد بیٹھ گئے۔ اتنے میں آسمان سے دو شعلے سے اترے اور آپؑ کے شکم مبارک میں داخل ہو گئے اور آپؑ کو تورات خوب یاد آ گئی پھر آپؑ نے نئے سرے سے ان کو تورات لکھ دی۔

راویوں نے یہ رائے بیان ضرور کی ہے لیکن یہ واقعہ حضرت یرمیاہ علیہ السلام سے منسوب معلوم ہوتا ہے، حضرت عزیر علیہ السلام سے نہیں کیونکہ وہ اسرائیلیوں کے ساتھ بابل میں رہے، وہیں منصب نبوت سے سرفراز ہوئے اور یروشلم کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالنے والوں کے خلاف دارا اور اردشیر کے درباروں میں جس وفد نے کوششیں کیں ان میں بھی یہ پیش پیش رہے۔ غرض بنی اسرائیل کی اسیری بابل سے لے کر رہائی اور بیت المقدس کی تعمیر تک بنی اسرائیل کے ساتھ نظر آتے ہیں لہٰذا سو سال کے لیے وہ کب غائب ہوئے؟

کہا جاتا ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام نے تورات کی تجدید عراق کے اندر دیر حزقیلؑ میں کی تھی اور اسی نواح کے ایک قریہ سائرہ آباد میں آپؑ کی وفات ہوئی اور یہیں دفن کیا گیا۔

ماخذات: قصص القرآن، قصص الانبیا، توریت، تاریخ طبری

صد چاک

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

"جس تعلق میں خلوص نہ ہو وہ بوجھ بن جاتا ہے"... یہ جملہ کہنے میں تو بہت آسان ہے مگر... عمل کرتے وقت زندگی بڑی بڑی آزمائشوں سے گزر جاتی ہے۔ اس کے باوجود قدم قدم پر تشنگی پیچھا کرتی ہے... یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے درخت کبھی چھوٹے پودوں کو پنپنے ہی نہیں دیتے۔ ہمیشہ زرد موسم کے سائے ان پر چھائے رہتے ہیں۔ اس کی زندگی بھی کمزور پودے کے مانند ہی گزر رہی تھی۔

قدرت کے اسرار سے پردے اٹھاتی ایک سبق آموز کہانی

گناہ آلود رات کا جانے کون سا پہر تھا۔

خواب گاہ کے وسط میں بچھی آرام دہ مسہری پر موجود مول، اپنے شکستہ وجود کو جیسے سمیٹے ہوئے بیٹھی تھی۔ اس کے معصوم اور حسین چہرے پر اس وقت صحرا کی سی اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بہ مشکل بیس بائیس کے پیٹے میں ہوگی، رنگت شہابی جھیل جیسی گہرائی لیے ہوئے اس کی آنکھوں میں ڈوب جانے کو جی چاہتا تھا، مگر اس وقت وہ خود جیسے قصرِ ذلت میں ڈوبنے کے عمل سے گزر رہی تھی۔

دسمبر کی ٹھٹھرا دینے والی سردی عروج پر تھی مگر اس پر تعیش خواب گاہ کے ایک کونے میں رکھے برقی روم ہیٹر نے کمرے کی فضا کو ایک خوشگوار اور مسحور کن سی حدت میں تبدیل کر رکھا تھا۔

خواب گاہ کی ایک جانب کونے میں کیبنٹ کے قریب ایک ساٹھا پاٹھا اور بارعب شخص، چار خانوں والی تہبند اور

مدری پہنے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اعلیٰ درجے کی ڈرائی جن تھی جسے وہ اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑے کانچ کے ایک گلاس میں انڈیل رہا تھا۔ یہ وڈیرا میر لکھ میر خان تھا۔ اس کے پورے جسم پر بال ہی بال نظر آرہے تھے جسے دیکھ کر ایک کالی تھوتھنی والے جھبرے ریچھ کا تاثر ذہن میں ابھرتا تھا۔ وہ خاصا تنومند آدمی تھا۔ اس کے سر کے سفیدی مائل سیاہ بال وسمہ لگانے کے عادی معلوم ہورہے تھے۔ اس کے بھاری بھرکم چہرے پر ازلی رعونت کھنڈی ہوئی تھی۔ اس نے گلاس میں شراب انڈیلنے کے بعد بوتل واپس دیوار گیر چوبی کیبنٹ میں رکھی اور مسہری پر سکڑی سمٹی بیٹھی موئل کی طرف نیم خلائی آنکھوں سے تکتے ہوئے، قریب رکھی ایک چوڑے اور نقشین پایوں والی بان کی کرسی پر براجمان ہوگیا۔ اس لمحے جانے کیا ہوا کہ مسہری پر بیٹھی موئل سسک پڑی۔ وڈیرے لکھ میر نے ایک گھونٹ بھرا پھر موئل کی طرف دیکھتے ہوئے کھرکھراتی آواز میں بولا۔

''اڑے بابا...... روتی کیوں ہے چھوکری! فکر نہ کر...... فیصلہ میں تیرے حق میں ہی دوں گا۔ آخر کو میں اس پورے ''تر'' (علاقے) کا وڈا سائیں ہوں، کسی کی مجال نہیں کہ میرے فیصلے پر اعتراض کرے۔'' اس نے موئل کو تسلی دی۔ موئل دوپٹے سے اب اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ مگر اس کی سسکیاں جاری تھیں۔ وڈیرا پھر بولا۔

''شکر کر کہ میرے آدمی تجھے یہاں لے آئے۔ ورنہ تیرا مڑس (شوہر) کلہاڑی سے تیرے ٹکڑے کرکے رکھ دیتا۔'' وہ لحظہ بھر کو تھما، پھر قدرے معنی خیز نظروں سے موئل کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ویسے ایک بات تو بتا چھوکری! اب بھلا مجھ سے کیا چھپانا، کیا واقعی تو سائیں رکھیو کے ساتھ کاری......''

''نن...... نہیں...... نہیں......'' بے ساختہ موئل نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''میرے مڑس (شوہر) نے مجھ پر کاری کا جھوٹا الزام لگایا ہے۔''

''ہا...... ہاؤ...... بابا ہاؤ...... چنگو چنگو......!'' (اچھا بھئی، ٹھیک ہے) وڈیرا لکھ میر خان اپنا ایک ہاتھ بلند کرکے بولا۔

''تو اب میری پناہ میں ہے اور رواجاڑیں (جرگہ) میں فیصلہ ہونے تک تو روایت کے مطابق ادھر ہی میری حویلی کی پناہ میں اور محفوظ رہے گی۔ علی گل اب تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''نہیں، سائیں وڈا! تیری وڈی مہربانی!'' موئل نے کہا۔ ''میں اپنے بھائی صوبت خان کے پاس رہوں گی۔'' موئل نے زخمی لہجے میں کہا اور وڈیرے نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے گلاس ہونٹوں سے لگالیا۔

☆☆☆

صوبت خان ایک پچیس چھبیس سالہ کڑیل نوجوان تھا۔ وہ وڈیرے میر لکھ میر خان کی زمینوں پر کھیت مزدوری کیا کرتا تھا۔ جب اسے یہ روح فرسا خبر ملی کہ اس کے بہنوئی علی گل نے اپنی بیوی یعنی اس کی بہن موئل کو سائیں رکھیو کے ساتھ کاری کیا ہے تو وہ یکدم بپھر اٹھا۔ وہ جانتا تھا کہ علی گل نے اس کی معصوم بہن پر جھوٹا الزام لگایا تھا، کیونکہ وہ اپنی بہن موئل کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ نیک اور شریف ایک سیدھی سادی باحیا عورت تھی۔ لہٰذا وہ اپنے ہاتھ میں کلہاڑی تھامے دوڑتا ہوا علی گل کے پاس پہنچا۔

''علی گل! تو نے میری غیرت کو للکارا ہے۔ کدھر ہے میری بہن کی لاش؟ میں اس کی لاش پر ہاتھ رکھ کر گواہی دوں گا کہ وہ نیک چلن اور پاکباز ہے۔''

علی گل اس کا ہم عمر تھا، وہ صوبت خان کے للکارنے پر ذرا بھی مرعوب نہ ہوا اور استہزائیہ لہجے میں مگر غصے سے بولا۔

''زبان سنبھال کر بات کر صوبت خان! تیرے میں اگر اتنی غیرت ہے تو جا وڈے سائیں کی حویلی میں جدھر تیری چھپتی بہن نے پناہ لے رکھی ہے، کردے اس کے ٹوٹے، کم بخت بچ کر بھاگ نکلی مجھ سے ورنہ......'' اس نے دانت پیس کر تہدیدی انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

علی گل کی بات پر صوبت خان ذرا چونکا اور یہ جان کر کسی قدر طمانیت ہوئی کہ اس کی بہن موئل ابھی زندہ ہے اور علی گل کی بربریت کی بھینٹ نہیں چڑھی، تاہم وہ یہ سن کر کچھ بے چین سا ہوگیا تھا کہ موئل نے وڈیرے لکھ میر خان کے پاس پناہ لے لی تھی۔ جانے کیوں اس اطلاع پر اس کا سارا جوش ہوا ہونے لگا تھا اور وہ ایک عجیب سی پریشان کن الجھن کا شکار ہوگیا تھا۔

☆☆☆

''دھڑیں سائیں (اللہ میاں) میرے بچے کی جان کی خیر رکھنا۔ رکھیو میرا ایک ہی بیٹا ہے، بھٹائی سائیں کا واسطہ، میرے بچڑے پر رحم کرنا۔''

ایک بوڑھی عورت اپنے کپکپاتے ہاتھ بلند کرکے روتے ہوئے دعا مانگ رہی تھی اور اس کے قریب ایک نوجوان لڑکی اسے سنبھالنے کی کوشش کررہی تھی۔ خود اس لڑکی کی سرمگیں آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ اس کا نام سوہنی تھا اور وہ سائیں رکھیو کی چھوٹی بہن تھی۔

دونوں ماں بیٹیوں کو جیسے ہی یہ اطلاع ملی کہ علی گل نے رکھیو کو اپنی بیوی موئل کے ساتھ کارو (بدکار) کیا ہے تو دونوں

ماں بیٹی اپنا کلیجا تھام کر رہ گئی تھیں۔ یہ ایک ایسا اندوہناک اور افسوس ناک موقع ہوتا ہے کہ کوئی بھی ان کی دادرسی اور پرسے کے لیے نہیں آتا، یہ کٹھن حالات اکیلے ہی رونے پیٹنے والوں کو بھگتنا پڑتے ہیں۔ لہٰذا اس وقت بھی یہ دونوں ماں بیٹی تنہا ہی اس دکھ کو سہنے کی کوشش کررہی تھیں۔

''امڑ گودی (پیاری ماں) حوصلہ کر اللہ سائیں بہتر کرے گا۔ ادا سائیں رکھیو ابھی زندہ ہے، میرا بھائی کمزور نہیں۔ یہ علی گل کا مقابلہ کرسکتا ہے۔'' سوہنی نے ماں کو دلاسا دیتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''ہم سائیں وڈے (وڈیرا لکھیم خان) کے پاس فریاد لے کر جائیں گے، مجھے یقین ہے وہ ضرور ہمارے ساتھ انصاف کرے گا۔''

اس کی ماں جس کا نام بھیاں تھا، بیٹی کی بات سن کر اپنی رقت آمیزی پر قدرے قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن دھیے! وہ مردود علی گل تو کلہاڑی لیے میرے بچے کے خون کا پیاسا ہورہا ہے۔ جانے میرا بچہ کدھر دربدر ہورہا ہوگا۔ ہے مولا سائیں! میرے بچڑے، میرے رکھیو کی جان کی حفاظت کرنا۔ وہ بے گناہ ہے۔'' وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ سوہنی نے آہستگی کے ساتھ اپنی بوڑھی ماں بھیاں کو قریب ہی رلی بچھی چارپائی پر بٹھایا اور کچے بوسیدہ سے صحن کی ایک جانب دھری گھڑونچی کی طرف بڑھی۔ پھر جست کے ایک ٹیڑھے میڑھے گلاس میں مٹکے سے پانی انڈیلا اور ماں کے کپکپاتے ہونٹوں سے لگادیا۔

سرمئی دھوپ اب گارے مٹی کی مختصر سی چہار دیواری پر اترنے لگی تھی۔

☆☆☆

علی گل اپنے گھر کے کچے صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھا غصے سے بل کھا رہا تھا۔ اسے اپنے منصوبے کی ناکامی پر بری طرح جھنجلاہٹ ہورہی تھی۔ یہ غصہ اسے اپنی جواں سال بیوی موئل کے کاری ہونے پر نہیں تھا اور نہ وہ اس بات پر تلملا رہا تھا کہ سائیں رکھیو کو قتل کرنا اس کے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔ وہ تو خود بھی چاہتا تھا کہ سائیں رکھیو صرف دہشت زدہ ہوکر فرار کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہوجائے تاکہ بعد میں اس کے وارث اسے تاوان دہشت یا ''سر دھان'' کی صورت میں سائیں رکھیو کی جان کی بخشش دینے پر مجبور ہوجاتے۔ جھنجلاہٹ اور غصہ تو اسے اس بات پر آرہا تھا کہ وہ اپنی بیوی موئل کو منصوبے کے مطابق ہلاک نہیں کرسکا تھا، جبکہ وہ ہر قیمت پر موئل کو قتل کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوجاتا۔ یہ حقیقت اسے بھی معلوم تھی کہ

موئل اور سائیں رکھیو دونوں ہی بے گناہ تھے مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ جب وہ موئل کو جان سے مارنے کی کوشش کررہا تھا تو عین وقت پر وڈیرے میر لکھ میر خان کے کارپردازوں (گماشتوں) نے بیچ میں آکر موئل کو کیوں اس کے خونی پنجے سے بچالیا تھا۔ کیا اس کے ساتھ بھی دھوکا کیا گیا تھا؟ کیا اسے بھی ڈبل کراس کرنے کی کوشش کی گئی تھی؟ یا وڈیرے لکھ میر خان کے کمدار منشی مٹھن منگن ہار نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا؟ یہ خیال آتے ہی وہ چارپائی سے اٹھا اور کمدار مٹھن سے ملنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

☆☆☆

''واہ ڑے مٹھن! تو نے تو آج چاکری کا نمک حلال کردیا، حق ادا کردیا تو نے، ایسی چال چلی کہ پکا ہوا پھل سیدھا ہماری جھولی میں آن گرا۔''

وڈیرا... میر لکھ میر خان سامنے ہاتھ جوڑے اپنے بہ ظاہر بھیگی نظر آنے والے کمدار منشی مٹھن منگن ہار سے توصیفی لہجے میں بولا اور مٹھن اپنی تعریف پر نہایت خبیثانہ انداز میں بتیسیں نکال کر ہنسنے لگا۔ وہ پینتالیس پچاس سالہ تخنی سا شخص تھا۔ رنگت الٹے توے جیسی تھی۔ لمبوترے چہرے پر گول عدسوں والی عینک کے پیچھے اس کی چھچھوندر جیسی چندی چندی آنکھوں میں بڑی خباثت رقصاں تھی اور وہ یونہی اپنے کان میں اٹکی ہوئی پنسل سے کھیلنے لگا۔

وہ دونوں اس وقت اوطاق میں تنہا تھے جو حویلی کی عمارت کے ساتھ ہی تھی۔

وڈیرا لکھ میر خان بلا کا عیاش فطرت اور بوالہوس شخص تھا۔ گوٹھ کے ہر جوان اور خوب صورت چہرے کو وہ اپنی ملکیت سمجھتا تھا خواہ وہ شادی شدہ ہی کیوں نہ ہو۔ نہ جانے اب تک وہ کتنی ہی مجبور و بے بس عورتوں اور لڑکیوں کو اپنی بوڑھی ہوس کا نشانہ بنا چکا تھا۔ اس کی راہ سہل کرنے میں اس کے مقرب خاص کارپرداز مٹھن منگن ہار کا زیادہ ہاتھ تھا اور موئل کے سلسلے میں بھی اس نے ہی اپنے وڈے سائیں کا کام آسان کیا تھا۔

ایک روز جب اوطاق میں بٹائی کے دوران علی گل اپنی جواں سال اور خوب صورت بیوی موئل کو بھی ساتھ لایا تھا تو وڈیرا بھی اس وقت اپنے منشی مٹھن کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس نے جو موئل کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں فوراً ہی شیطانی چمک لہرا گئی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اس کی زمینوں پر کھیت مزدوری کرتی تھی، بس پھر کیا تھا۔ وڈیرے نے اپنے خاص چیلے مٹھن کو موئل کے پیچھے لگادیا۔ پھر تھوڑے ہی دنوں

بعد منشی مٹھن مکھن ہار نے اپنی کارپردازی کے جوہر دکھاتے ہوئے ایسی چال چلی کہ نازک اندام موتل پکے ہوئے پھل کی طرح وڈیرے کی جھولی میں آن گری۔

انسان کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ جب وہ اپنے تئیں کوئی بڑی فتح حاصل کرلیتا ہے تو بار بار اس کے تذکرے سے حظ اٹھاتا رہتا ہے۔ مٹھن کو معلوم تھا کہ اس کے وڈے سائیں کی خصلت میں یہ بات بدرجہ اتم موجود تھی اس لیے عیارانہ چاپلوسی سے بولا۔

"بس سائیں! آپ کا پرانا نمک خوار ہوں، آپ کی خوشی میری غلامی ہے۔"

"تو نے بتایا نہیں منشی کہ تو نے آخر ایسی کون سی چال چلی تھی؟" وڈیرا گویا محظوظ ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"حاضر سائیں وڈا! یہ سب آپ کے لیے بھی جاننا ضروری ہے۔" منشی نے بتانا شروع کیا۔

"سائیں بھوتار! موتل کے سلسلے میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ اس کے شوہر علی گل کو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ درحقیقت وہ کس مزاج کا انسان ہے۔ فطری طور پر وہ ایک لالچی اور خود غرض شخص ہے۔ میں نے اپنا جال سب سے پہلے اسی پر پھینکا تھا۔ میں اس کے ساتھ گھل مل گیا اور اندر سے وہ بھی رفتہ رفتہ کھلنے لگا۔ حتیٰ کہ وہ مجھے اپنا خیر خواہ سمجھنے لگا کہ اپنے دل کی کوئی بات مجھ سے چھپاتا نہیں تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے رقم کی ضرورت ہے۔" مٹھن سانس لینے کو رکا۔ وڈیرا بڑی دلچسپ و پراشتیاق نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"جب اس نے مجھے یہ بات بتائی تو میں نے فوراً اس کی طرف ایک کانٹا پھینکا قرض کا کانٹا، جس میں بڑی سے بڑی مچھلی بھی بہ آسانی پھنس جایا کرتی تھی۔" لمحہ بھر توقف کے بعد مٹھن نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"علی گل درحقیقت قرض لینا چاہتا تھا کیونکہ اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔ سود کی اسے پروانہ تھی۔ جب میں نے اسے کریدا کہ وہ اتنا سارا قرض کیوں لینا چاہتا ہے تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ دراصل دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ سائیں رکھیو کی جوان بہن سوہنی سے۔ یہ سن کر میرا ماتھا ٹھنکا، مانا کہ سائیں رکھیو کی بہن بھی خوب صورت سہی مگر پھر بھی موتل اس سے کہیں زیادہ حسین ہے۔ میں نے اپنی حیرت کا اظہار جب اس سے کیا تو تب اس نے صاف صاف لفظوں میں مجھے یہ بتایا کہ درحقیقت اس کی نظر زمین کے اس ٹکڑے پر ہے جو صرف اور صرف سوہنی کی ملکیت ہے کیونکہ سوہنی کا مرحوم باپ اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتا تھا، اس کی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی سوہنی کی جب شادی ہو تو اس جگہ پر اپنا گھر بنا کر اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ سکھی رہے۔ علی گل کی درحقیقت نظر زمین کے اسی ٹکڑے پر تھی کیونکہ اسے اپنے گدھے باندھنے کے لیے ایسی ہی زمین کا ایک ٹکڑا درکار تھا۔ یہ وہ گدھے تھے جنہیں علی گل ریس کے میدان میں دوڑا کر بڑی بڑی شرطیں جیتا کرتا تھا مگر یہ گدھے باندھنے کے لیے اس کے پاس کوئی معقول جگہ نہ تھی۔ موگو ہاری کے گھر کے پچھواڑے وہ اپنے گدھے باندھ تو دیا کرتا تھا مگر ایک تو اسے اس کا خاصا کرایہ دینا پڑتا تھا، دوسرے موگو ہاری کا گھر دور ہونے کی وجہ سے ان کی بہتر طور پر حفاظت اور دیکھ بھال وہ نہیں کرپاتا تھا۔ بہرطور...... جب علی گل نے مجھ سے رقم بہ طور قرض مانگی تو میں نے صاف انکار کردیا۔"

"اڑے بابا! ایسا کیوں کیا تھا تو نے؟" معاً وڈیرے نے اس کی بات کاٹ کر کہا تو مٹھن مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"سائیں وڈا! اگر میں اسے قرض دے دیتا تو آپ کا کام بھلا کیسے ہوسکتا تھا؟"

"کیا مطلب......؟" وڈیرا اب پوری طرح لطف اٹھا رہا تھا۔

"میں نے علی گل کو بڑی سچل ترکیب بتائی جس میں نہ قرض کا بکھیڑا نہ سود اور پانچوں انگلیاں سر سمیت کڑھائی میں۔" مٹھن اپنی سازش کا تانا بانا آشکار کرتے ہوئے آگے بتانے لگا۔

"اس ترکیب سے نہ صرف علی گل کو سوہنی بھی (بھوگے) زر تلافی میں مل جاتی بلکہ زمین کا وہ ٹکڑا بھی اسے حاصل ہوجاتا۔ علی گل تو پہلے میری ترکیب سن کر ذرا گھبرایا مگر پھر جلد ہی اس کی گھبراہٹ پر لالچ نے غلبہ پالیا اور پھر میری بات پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ یعنی وہ اپنی بیوی موتل کو سوہنی کے بھائی سائیں رکھیو کے ساتھ کاری کرکے قتل کرنے پر تیار ہوگیا۔"

"ایں...... یہ کیا منشی؟ اس طرح تو موتل کی جان کو خطرہ بھی ہوسکتا تھا۔" وڈیرے نے پھر درمیان میں لقمہ دیا۔ جواباً منشی مٹھن مکاری سے ہنسنے لگا، پھر بولا۔

"سائیں وڈا! میں نے بھی تو کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں ناں۔ میں نے علی گل کو سختی سے اس بات کی تاکید کی تھی کہ جب وہ موتل کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرے تو اس سے ذرا ہی دیر پہلے مجھے خبر کرے تاکہ میں اس کا کام مزید آسان کرتے ہوئے جھوٹے گواہوں کا بندوبست کرلوں۔ وہ میری بات

سمجھ گیا مگر اس کے درپردہ چال نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ جس وقت وہ موتل کو کاری کرنے کی غرض سے کھیتوں میں لایا تو میں بھی اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ ادھر علی گل نے جیسے ہی۔ "تو کاری ہے...... کاری ہے......" کہتے ہوئے موتل پر کلہاڑی سونت لی تو گھات میں بیٹھے ہمارے آدمی یکدم علی گل کے سامنے آگئے اور کسی چڑیا کی طرح خوف سے تھر تھر کانپتی ہوئی ہراساں موتل کو ہم نے علی گل کے خونی پنجوں سے بچالیا۔ جبکہ میں نے اپنے آدمیوں سے لاتعلقی ظاہر کردی اور علی گل سے یہی کہا کہ یہ محض اتفاق ہے کہ گوٹھ کے کچھ لوگوں کی اس پر نگاہ پڑگئی اور انہوں نے محض انسانی ہمدردی کی بنا پر موتل کو اس کے خونی پنجوں سے بچالیا اور اس طرح دستور کے مطابق گوٹھ کے لوگوں نے موتل کی جان کی حفاظت کی خاطر اسے آپ کی پناہ میں دے دیا، تاہم میں نے بھی علی گل کو مایوس کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس سے کہا کہ وہ فوراً اب منصوبے کے دوسرے اور آخری حصے پر عمل کرڈالے اور سائیں رکھیو کو بھی اپنی بیوی کے ساتھ کارا کرکے اسے قتل کرنے کے بجائے محض دہشت زدہ کرکے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کردے۔ لالچ میں اندھا ہوکر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے علی گل محروم ہوچکا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور اپنے چند کلہاڑی بردار ساتھیوں کے ساتھ سائیں رکھیو کے پاس پہنچا جو اس وقت کھیت میں ٹریکٹر چلا رہا تھا۔ اس نے جو علی گل اور اس کے کلہاڑی بردار ساتھیوں کو "کارو ہے...... کارو ہے" (بدکار ہے) کا نعرہ بلند کرتے اور کلہاڑیاں سونتے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو بے چارہ حواس باختہ ہوگیا اور فوراً ہی جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ علی گل درحقیقت اسے ہلاک کرنا نہیں بلکہ وہ تو صرف اسے دہشت زدہ کرکے فرار ہونے پر مجبور کرنا چاہتا تھا اور اپنے مقصد میں وہ خاطر خواہ کامیاب بھی ہوا۔ اس طرح سائیں وڈا! موتل آپ کے بستر کی زینت بننے پر مجبور ہوگئی کیونکہ اپنے شوہر علی گل سے اب اسے سخت نفرت ہوگئی ہے مگر دوسری طرف وہ مجبور بھی اور آپ کے رحم و کرم پر بھی۔" منشی مٹھن مکھن ہار اتنا بتا کر چپ ہو رہا۔

"پر منشی ایک بات تو بتا۔" ساری بات سننے کے بعد وڈیرے نے پوچھا۔

"حاضر سائیں سرکار! پوچھو؟" منشی مٹھن جھٹ سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر مخصوص لہجے میں بولا۔

"اب تو علی گل کو کیا جواب دے گا؟ کیونکہ موتل کو قتل کیے بغیر اسے بھونگا (خون بہا) تو نہیں مل سکتا۔"

وڈیرے کی بات پر شاطر منشی مٹھن کے چہرے پر ایسے معنی خیز تاثرات ابھرے جیسے اسے وڈیرے سے اس سوال کی پہلے ہی سے توقع تھی، بولا۔ "سائیں وڈا! اب بھلا علی گل کی کیا مجال جو آپ کے آگے دم مارے۔ جب آپ کا دل اس لال پری (موتل) سے بھر جائے گا تو اسے علی گل کے حوالے کردیں گے، اب اس چھوکری کی مثال تو اس بکری جیسی ہے جو بہت سا دودھ دے چکے تو اسے قسائی کے حوالے کردیا جائے۔" مٹھن کے لہجے میں سفاکانہ سرسراہٹ عود کر آئی اور وڈیرے میر لکھ میر خان کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

حد نگاہ تک پھیلے ہوئے گندم اور جوار کے کھیتوں پر چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی، سوہنی آج تنہا ہی کام پر آگئی تھی۔ ماں اس کی بیمار تھی۔ وہ اس وقت گوٹھ کی دیگر عورتوں اور لڑکیوں کے ہمراہ چارے کی گٹھیاں بنانے میں مصروف تھی، معاً اس کی نگاہ ذرا دور نہر کے کراڑے (کنارے) پر پڑی۔ وہاں ایک درخت کی آڑ میں ایک شخص کی مخصوص جھلک دکھائی دی۔ اس کا دل یکبارگی انجانے احساس تلے زور سے دھڑکا۔ پھر اس نے کام سے ذرا ہاتھ روکتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے اپنے پاس کام میں منہمک ہاری عورتوں کو دیکھا۔ سوہنی دھیرے دھیرے غیر محسوس طریقے سے نہر کے کراڑے کی طرف کھسکنے لگی۔ درخت کے تنے کے ذرا قریب پہنچ کر وہ لوسن کی گٹھیوں کا ڈھیر سر پر رکھے آگے بڑھی تو حسبِ توقع اسے درخت کی آڑ میں صوبت خان کھڑا نظر آگیا۔ پھر دفعتاً ہی سوہنی کی سماعتوں سے شناسا آواز ٹکرائی۔

"سوہنی......! ڑی سوہنی۔" صوبت خان نے دھیرے سے اسے پکارا۔ وہ قدرے سامنے آچکا تھا۔

سوہنی رک گئی اور جواباً بولی۔ "ہاں میں سن رہی ہوں۔"

"تو پریشان ہے؟" صوبت خان نے کسی قدر ملائمت آمیزی سے پوچھا مگر سوہنی اس کے لہجے سے عیاں پریشانی اور تفکر کو بھانپ چکی تھی جواباً دھیرے سے مغموم لہجے میں بولی۔

"ہاں! وہ ادا سائیں رکھیو......"

"مجھے معلوم ہے، پر تو فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" صوبت خان نے اسے تسلی دی۔

"تمہاری بہن موتل......؟" سوہنی نے دانستہ اپنا جملہ مصلحتاً ادھورا چھوڑا تو صوبت خان بولا۔

"وہ ٹھیک ہے وڈیرے سائیں کے پاس، اس کی پناہ میں ہے وہ اور وہاں بالکل خیریت سے ہے۔ میں اسے لے آؤں گا۔ میں حویلی بھی گیا تھا مگر مجھے ابھی اس سے ملنے نہیں دیا گیا۔ وہ زنان خانے میں تھی۔" اس نے مزید بتایا۔

"کیا تم بھی ایسا ہی سمجھتے ہو کہ ادا سائیں رکھیو اور موتل......"

"بکواس اور جھوٹ ہے یہ سب۔" صوبت خان نے دانت پیس کر کہا۔

"تو مجھ سے اب نہ ملا کر صوبت! مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔" دفعتاً سوہنی کے لہجے میں انجانا خوف در آیا۔ صوبت خان اس کی بات پر چند لمحے کے لیے خاموش رہا پھر بولا۔

"سوہنی! میں نے کہا نا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میں ہوں ناں......سب سنبھال لوں گا۔"

"اچھا اب میں چلتی ہوں۔" کہتے ہوئے سوہنی کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ اس کا آگے قدم بڑھانے کو جی نہیں چاہا پھر اس لمحے صوبت خان نے گہرے لہجے میں اس سے کہا۔

"اپنا خیال رکھنا سوہنی! تو اسی طرح پریشان ہوتی رہے گی تو ہم دونوں......" اس نے ایک لمحے کے لیے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا مگر پھر فوراً پرعزم لہجے میں بولا۔

"مجھ پر اعتبار کر دسوہنی! اللہ سائیں نے مجھے برے بھلے کی تمیز عطا کی ہے۔"

"میں چلتی ہوں۔" اس بار سوہنی کے دل کو یک گونہ تسلی ہوئی تھی۔

☆☆☆

وڈیرے میر لکھ میر خان کی سربراہی میں علی گل اور مفرور سائیں رکھیو کے تنازعے کا فیصلہ ہوا اور بالآخر موتل اور سائیں رکھیو کو بے گناہ قرار دے دیا گیا۔ اس فیصلے پر راجواڑیں کے کسی فریق یا دوسرے شخص کو اعتراض کرنے کی جرأت نہ تھی۔ جس میں نہ صرف موتل اور سائیں رکھیو کو بے گناہ قرار دیا گیا تھا بلکہ علی گل کے اپنی بیوی موتل اور سائیں رکھیو پر کاروکاری کے لگائے گئے جھوٹے الزام کی پاداش میں الٹا علی گل کو ہی بھونگا (تاوان ہتک عزت) دینا پڑ گیا، وہ بھی دونوں کو۔ یہ بھونگا یعنی چٹی ایک خطیر رقم کی صورت میں علی گل کو موتل اور سائیں رکھیو کے وارثوں کو اکتیس دنوں کے اندر اندر ادا کرنی تھی۔

البتہ اگر موتل چاہتی تو اپنے شوہر علی گل کو اپنے حصے کا بھونگا معاف کر سکتی تھی مگر یہ ممکن نہ تھا کیونکہ موتل کو اب اپنے شوہر علی گل سے شدید نفرت ہو چکی تھی جس نے ذاتی غرض کی خاطر اس پر کاری کا شرم ناک اور جھوٹا الزام لگایا تھا اور اس کی وجہ سے وہ مجبوراً بدطینت وڈیرے میر لکھ میر خان کے پنجۂ ہوس کا شکار ہو گئی تھی۔ اگرچہ اس میں موتل کے اندر اپنے بے غیرت شوہر علی گل سے اس کی جھوٹی تہمت پر انتقام لینے کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ بہرطور...... موتل نے اپنے شوہر کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا بلکہ حالات کو اپنے حق میں سازگار محسوس کرتے ہوئے علی گل سے فوری طلاق بھی لے لی تھی، وہ اب اپنے بھائی صوبت خان کے ساتھ رہنا چاہتی تھی مگر ادھر وڈیرے کا ابھی موتل سے جی نہیں بھرا تھا، وہ ابھی موتل کو مزید پناہ کی آڑ میں اپنی داشتہ بنائے رکھنا چاہتا تھا اور یوں موتل کو زنان خانے میں خدمت گار کے طور پر رکھ لیا گیا تھا۔ اس ضمن میں وڈیرے نے یہی عذر پیش کیا تھا کہ ایسا موتل کی بہتری کے لیے کیا گیا ہے۔ تھوڑا وقت گزرنے کے بعد اسے اس کے بھائی صوبت خان کے پاس جانے کی اجازت دے دی جائے گی بہرطور...... یہ پہلا موقع تھا جس پر وڈیرے کے کمدار منشی مٹھن کو بھی حیرت ہوئی تھی کہ آخر سائیں وڈے کا دل ابھی موتل سے بھرا کیوں نہیں، حالانکہ اس سے پہلے وڈیرا موتل جیسی بیشتر لڑکیوں کی مجبوریوں سے کھیلنے کے بعد انہیں فوراً اپنے عشرت کدے سے رخصت کر دیا کرتا تھا۔ اپنی اس خلاف فطرت بات سے خود وڈیرے میر لکھ میر خان کو بھی ایک لمحے کو اچنبھا ضرور ہوا تھا، وہ بے اختیار یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ آخر اس چھوکری میں ایسی کیا بات تھی کہ ابھی تک اس کا دل موتل سے بھرا نہیں تھا۔ وہ ہنوز اس کی قربت کا دیوانہ تھا۔ ایک آتش تھی کہ بجائے کم ہونے کے بڑھتی ہی جاتی تھی، اس صورت حال پر ایک دن کمدار مٹھن نے وڈیرے کے سامنے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"سائیں وڈا! اب اس چھوکری کا زیادہ دیر آپ کی پناہ میں بلاجواز پڑے رہنا مناسب نہیں۔ اس کا راجواڑیں فیصلہ ہو چکا ہے اب اسے رخصت کر دو۔"

منشی کی بات پر وڈیرے میر لکھ میر خان نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا پھر گھنڈی ہوئی رعونت سے اس کی بات کو رد کرتے ہوئے بولا۔ "تو اپنی کھال میں رہ منشی! ورنہ اتار پھینکوں گا، میری مرضی میں جو بھی کروں۔ کسی کی جرأت ہے میرے آگے کوئی دم بھی مارے۔"

"برابر...سائیں...... برابر......" کہتے ہوئے منشی مٹھن اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

موتل اور سائیں رکھیو کے اس راجواڑیں کے فیصلے سے

متعلق کارروائی گوٹھ کے دیگر عام لوگوں کے علاوہ بخش علی نے بھی دیکھی تھی۔ بخش علی ایک چوبیس پچیس سالہ گبرو نوجوان تھا۔ یہ کمدار مٹھن منگن ہار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس نے جب موتل کو دیکھا تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اس کی معصومیت اور حسن بلاخیز پر مر مٹا، پہلے تو وہ کچھ عرصہ خاموش رہا مگر ایک دن وہ اپنے دل پر قابو نہ پاسکا اور اپنے دل کی خواہش باپ سے کہہ ڈالی۔ منشی مٹھن نے جو اپنے دیوانے بیٹے کی بات سنی تو اپنی جگہ دھک سے رہ گیا۔ بخش علی دراصل موتل سے شادی کا خواہش مند تھا مگر مٹھن جانتا تھا کہ موتل اب کیا سے کیا بن چکی ہے، لہٰذا بھڑک کر بیٹے سے بولا۔

"اڑے چھوکرا! تیرا کیا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ڑے تجھے پتا ہے وہ کاری ہے۔"

"نہیں، وہ بے گناہ ہے۔" بخش علی بلا تامل بولا۔ "وڈے سائیں نے خود اسے بے گناہ قرار دے دیا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" دفعتاً ہی مٹھن کے منہ سے جھنجلاہٹ میں یہ الفاظ برآمد ہوئے اور اس کا بیٹا حیرت سے باپ کا منہ تکنے لگا۔ ادھر مٹھن کو بھی فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور دوسرے لمحے وہ بات بناتے ہوئے بولا۔

"اڑے چریا چھوکرا! میرا مطلب ہے اگر ایک بار کسی چھوکری پر کاری کا داغ لگ جائے تو وہ ساری زندگی نہیں اترتا، یہ کمہار کا کوئی برتن نہیں ہے جسے چاک میں رکھ کر دوبارہ درست کر لیا جائے۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں، وہ اپنے شوہر سے اب طلاق لے چکی ہے۔ تو اب موتل کا سنگ (رشتہ) میرے لیے مانگ لے، تو وڈے سائیں کا خاص آدمی ہے بابا! وہ انکار نہیں کرے گا۔"

منشی مٹھن حیرت سے اپنے بیٹے کا منہ تکنے لگا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ جس لڑکی کے پیچھے وہ دیوانہ ہو رہا ہے، وہ درحقیقت اب وڈے سائیں کے ہاتھوں کھلونا بن چکی تھی اور وہ کاری نہ ہوتے ہوئے بھی اب واقعی کاری ہو چکی تھی۔ وہ کسی طور بھی موتل کو اپنی بہو بنانے کو تیار نہ تھا مگر اس نے روایتی تحمل مزاجی سے کام لیتے ہوئے بہ غور اپنے کڑیل بیٹے کا چہرہ دیکھا۔ اسے بیٹے کے چہرے سے ہی نہیں بلکہ اس کے لہجے سے بھی صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اس نے اپنے جوان بیٹے سے ذرا بھی سختی سے کام لیا تو کوئی بعید نہیں کہ وہ سرکشی پر اتر آتا۔ اس وقت مٹھن نے کوئی جواب نہ دیا مگر وہ اس دن سے بے چین اور پریشان ضرور رہنے لگا تھا۔ وہ بیٹے کے سامنے اپنے وڈے سائیں کا راز بھی نہیں کھولنا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا خمیازہ نہ صرف اسے بلکہ اس کے بیٹے کو بھی بھگتنا پڑے گا۔ مگر سرکشی کی طرف مائل نظر آتے بیٹے کو حقیقت بتانے کے سوا اسے کوئی اور چارہ بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

ادھر علی گل غصے اور پریشانی کے عالم میں بری طرح تلملایا ہوا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یوں الٹی آنتیں گلے پڑ جائیں گی۔ اس کا منصوبہ نہ صرف بری طرح ناکام ہو جائے گا بلکہ الٹا سارا الزام بھی اس کے سر لگ جائے گا اور اسے بیک وقت دو جگہوں پر اس کا ہرجانہ بھی دینا پڑے گا۔ یہ ساری پٹی منشی مٹھن کی ہی پڑھائی ہوئی تھی جس نے اپنی کارپردازی دکھاتے ہوئے اپنے وڈے سائیں کی خوشنودی کی خاطر یہ چال چلی تھی مگر علی گل نہیں جانتا تھا کہ اب خود مٹھن بھی بری طرح اس چال کی زد میں آچکا تھا۔

علی گل کو مٹھن پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے جب غصے کے عالم میں اس کا شکوہ منشی مٹھن سے کیا تو مٹھن نے انتہائی روکھے لہجے میں اسے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں یہ تو ایک چال تھی۔

علی گل جانتا تھا کہ اب منشی مٹھن سے بحث کرنا فضول تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ وہ اب بھلا منشی کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ مسئلہ اب موجودہ صورت حال سے نمٹنے اور اس سے جان چھڑانے کا تھا لیکن علی گل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ایک طرف اسے موتل کے وارثوں کو بھونگا دینا تھا تو دوسری طرف سائیں رکھیو پر لگایا گیا الزام جھوٹا ثابت ہونے پر اسے بھی تاوان بے عزتی بھرنا پڑ رہا تھا۔ وہ اس دنیا میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ اسے اب احساس ہونے لگا تھا کہ اس نے لالچ میں آکر خود اپنے ہی گھر کو آگ لگا دی مگر باوجود اس کے اندر موجود بے حس انسان ہنوز اپنی شکست تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا اور وہ بیک وقت ان دونوں گمبھیر مسئلوں سے چھٹکارا پانے کی تدبیر پر غور کرنے لگا۔ ورنہ بہ صورت دیگر اس کے پاس یہی ایک حل رہ گیا تھا کہ وہ اپنے گدھوں اور گھر کو فروخت کر دے۔

مغربی افق پر شام طاری ہونے لگی تھی۔ آسمان کے نارنجی سناٹوں میں آشیانوں کی طرف لوٹتے آزاد پرندوں کے غول واپسی کے سفر میں محو پرواز تھے۔ علی گل یونہی گھر سے پریشان کن سوچوں کے ساتھ فیض محمد کے چھپر ہوٹل کی طرف چل دیا۔ بے ترتیب گارے مٹی سے بنے کچے مکانوں کے بیچ دھول اڑاتے راستے پر وہ چلا جا رہا تھا کہ

اچانک اس کی نظر سوہنی پر پڑی۔ وہ اپنے سر پر پانی کا مٹکا دھرے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چلی جارہی تھی۔ اسے دیکھ کر علی گل ایک لمحے کو ٹھٹکا اور پھر اس کے پیچھے ہولیا۔ سوہنی اپنے تعاقب سے بے خبر اب کھیتوں کے بیچ پگڈنڈی پر چلی جارہی تھی۔ علی گل خاصا فاصلہ رکھ کر برابر اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ دائیں بائیں چنے اور مٹر کی فصلیں تھیں اور کہیں کہیں گھنے درختوں کی قطاریں محافظوں کی طرح ایستادہ تھیں۔ کھیتوں کے درمیان سے گزرتی یہ پگڈنڈی سانپ کی طرح بل کھارہی تھی کہ اچانک علی گل ذرا ٹھٹکا۔ اس نے دیکھا سوہنی اب چلتے چلتے رک گئی تھی۔ علی گل کے ذہن میں پہلا خدشہ یہی ابھرا کہ کہیں سوہنی کو اپنے تعاقب کا شبہ تو نہیں ہو چلا؟ مگر پھر دوسرے ہی لمحے علی گل نے دیکھا کہ ایک شخص سوہنی کے قریب آگیا، کچھ سوچ کر علی گل بہ سرعت ایک قریبی درخت کی آڑ میں ہو گیا اور اپنی نظریں اس شخص پر جمادیں جو، اب چوروں کے سے انداز میں سوہنی کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ علی گل اس شخص کو پہچان چکا تھا۔ یہ صوبت خان تھا، اس کا سالا اور موِل کا بھائی، دوسرے ہی لمحے علی گل کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں ہوگئی تھی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ خاموشی کے ساتھ واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

سائیں رکھیو جو اس واقعے کے بعد ایک قریبی گوٹھ میں اپنے دوست کے ہاں روپوش ہو چکا تھا، جب اسے یہ پتا چلا کہ وہ بے گناہ قرار دے دیا گیا ہے تو وہ خوش ہو گیا اور اپنی عارضی روپوشی ترک کر کے گھر آگیا۔

بیٹے کو صحیح سلامت پا کر اس کی بوڑھی اور بیمار ماں مائی بھیاں جیسے دوبارہ جی اٹھی۔ ''میرا لعل میں صدقے تھیاں، تو آگیا، ٹھیک تو ہے ناں تو میڈا اچڑا......'' وہ بے چاری مارے خوشی کے بے قرار ہو کر بیٹے کا ماتھا چومتے ہوئے ممتا بھرے لہجے میں بولی تو سائیں رکھیو ملائمت سے بولا۔

''ہاؤ اماں! میں بالکل ٹھیک ہوں پر تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''تو آگیا، اب میں خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ تجھے پتا ہے...... وڈے سائیں نے تجھے بے گناہ قرار دے دیا ہے۔ فیصلہ تیرے حق میں ہوا ہے۔''

''ہاؤ امڑ! مجھے معلوم ہے، راجا اڑیں فیصلہ میرے ہی حق میں ہوا ہے۔'' سائیں رکھیو نے قدرے خوش ہو کر کہا اور مزید بولا۔ ''بلکہ میں نے تو سنا ہے کہ اس بدذات نے مجھ پر کارو کا جو جھوٹا الزام لگایا تھا اس کا بھی اب اسے بھوگنا دینا پڑے گا۔''

''ہمیں کچھ نہیں چاہیے پٹ رکھیو! بس تیرے سر کی خیر ہوگئی یہی بہت ہے۔'' ماں نے کہا۔ اس کی بہن سوہنی بھی بھائی کو دیکھ کر اپنے خوشی کے آنسو پونچھتی ہوئی اس کی طرف بڑھی تو سائیں رکھیو شفقت و محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

☆☆☆

بخش علی کا چہرہ جوش غیظ و غضب کے باعث بری طرح تمتما رہا تھا، اس کے باپ مٹھن نے اس کی خطرناک ضد کے آگے مجبور ہو کر اسے موِل کی اصل حقیقت و حیثیت کے بارے میں بتا دیا تھا، اس خیال سے کہ یہ سن کر اس کا دیوانہ بیٹا اپنی ضد چھوڑ دے گا اور موِل سے بددل ہو جائے گا، مگر نہیں جانتا تھا کہ جذبۂ دل اور محبت ایسی راہ ہوتی ہے جو کسی بات کی پروا نہیں کرتی یہ تو وہ انمول شے ہے جس کا سودا بغیر نفع و نقصان کے اور عزم صمیم سے کیا جاتا ہے۔ یہ سودائے عشق تو ''جہاں ہے جیسا ہے'' کی بنیاد پر بے نیازانہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مٹھن کا یہ خیال یکسر غلط ثابت ہوا تھا کہ موِل سے متعلق کر یہ حقیقت جان لینے کے بعد بخش علی اس عشق سے باز آجائے گا مگر اس کے بعد بخش علی اس بری طرح بپھرا تھا کہ مٹھن جی جان سے لرز اٹھا اور اس نے فوراً اپنے جوان کڑیل بیٹے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دیکھ پٹ! اب اپنی ضد چھوڑ دے...... ورنہ...... ورنہ وڈے سائیں کو تو جانتا ہے، وہ...... وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' اس کے لہجے میں التجا در آئی تھی مگر بخش علی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے پر اب بھیدوں بھرے سناٹوں کا راج تھا۔

بیٹے کی خاموشی پر مٹھن کو ذرا حوصلہ ہوا تھا مگر اسے کیا معلوم تھا کہ تقدیر اس کے ساتھ کیا گل کھلانے والی ہے۔ منشی مٹھن کا بیٹا ہونے کی وجہ سے بخش علی پر وڈیرے میر لکھ میر خان کی حویلی اور اوطاق میں آنے جانے کی کوئی پابندی نہ تھی۔

درحقیقت بخش علی خود بھی وڈیرے کے زرعی فارم میں کام کرتا تھا اور چھوٹے موٹے معاملات اور حساب کتاب دیکھا کرتا تھا۔ ادھر جانے کب الم نصیب موِل اور بخش علی کے درمیان دلوں کے معاملات طے پا گئے اور وہ دونوں محبت کا دم بھرنے لگے۔ موِل بے چاری خود اپنی شرمناک زندگی سے عاجز آچکی تھی۔ اسے جیسے ہی بخش علی کا سہارا ملا دونوں نے ایک نئی اور خوش آئند زندگی کے عہد و پیمان باندھ لیے اور پھر نہ جانے کب دونوں نے ایک اہم اور خطرناک فیصلہ کیا

اور اس پر عمل بھی کر ڈالا۔

ایک رات وہ دونوں خاموشی سے فرار ہو گئے۔

☆☆☆

دور ندی کنارے دھواں سا اٹھے ہے
میں جانوں، جس کارن میں جوگن بنی
ارے جا کے دیکھو تو
کہیں وہ بھی جلتا نہ ہو......

''بخش علی! تو مجھے چھوڑ تو نہیں دے گا ناں...... ورنہ...... ورنہ میں آپ گھات (خودکشی) کرلوں گی۔''

ایک مقام پر وہ دونوں ذرا ستانے کے لیے رکے تو موِل نے ہراساں لہجے میں بخش علی سے کہا۔

''اڑی چری ہوگئی ہے کیا۔'' وہ اسے تسلی دیتے ہوئے محبت بھری حلاوت سے بولا۔ ''تیری خاطر میں نے وڈیرے جیسے ظالم جابر آدمی سے ٹکر لے لی۔ بھلا میں تجھے کس طرح چھوڑ سکتا ہوں؟'' بخش علی کے لہجے میں حوصلوں کی گونج تھی۔ اس سمے رات گہری ہو چکی تھی اور قدرے سرد بھی۔ وہ دونوں اس وقت گوٹھ کی حدود سے کئی کوس دور کیکر اور لئی کے جنگل کی طرف نکل آئے تھے۔ جہاں کہیں کہیں بھربھری مٹی والے میدان میں ٹیلے، بھے اور جبل بھٹ بھی پھیلے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ایک قدرے اونچے جبل بھٹ (ریتیلا ٹیلا) پر ذرا ستانے آبیٹھے۔ دونوں کے جسموں پر سوتی اور گرم چادروں کے علاوہ رلی بھی تھی جو موِل نے اوڑھ رکھی تھی۔ بخش علی نے کہیں سے سوکھی جھاڑیاں اور خشک ٹہنیاں جمع کر کے سردی سے بچنے کے لیے الاؤ روشن کر دیا تھا۔ آسمان پر ننھے منے ستارے ٹمٹما رہے تھے اور پوری تاریکیوں کا چاندان پر نرم نرم سی چاندنی بکھیرے ہوئے تھا۔ چہار سو فضا خاموش اور دم بخودسی محسوس ہوتی تھی۔ ایسے میں دونوں سندھ کے عظیم صوفی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی اس غزل کی تفسیر نظر آرہے تھے۔

دل ہے وابستہ غم محبوب
عالم جذب و شوق لامحدود
ہے گرانبار عشق کی زنجیر
جنبش ہائے ناتواں بے سود
ہر تمنا جراحت صد چاک
آرزو ایک شعلہ بے دود!
بحر غم اور سیل اشک رواں
موج در موج گوہر مقصود
(شاہ سائیںؒ)

معصومیت

بیوی۔ ''میں مر جاؤں گی۔''
شوہر۔ ''میں بھی مر جاؤں گا۔''
بیوی۔ ''میں تو بیمار ہوں تم کیوں مرو گے؟''
شوہر۔ ''مجھ سے اتنی خوشی برداشت نہیں ہوگی۔''

☆☆☆

شیخ۔ ''میری بیوی بڑی فضول خرچ ہے جب سے شادی ہوئی ہے 100، 200 مانگتی رہتی ہے۔''
دوست۔ ''وہ ان پیسوں کا کیا کرتی ہے؟''
شیخ۔ ''پتا نہیں، میں نے کبھی دیے بھی نہیں۔''

☆☆☆

ایک آدمی کی شادی نہیں ہو رہی تھی وہ 2 رکعت صلوٰۃ الحاجات روزانہ پڑھنے لگا۔
آخر اس کی شادی ہوگئی۔ اب وہ ہر روز 4 رکعت صلوٰۃ التوبہ پڑھتا ہے۔

مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور، ضلع مظفر گڑھ

دونوں کے خاموش چہرے انجانے خدشات کی غمازی کر رہے تھے۔

''بخش علی! ہم کب تک یہاں بیٹھے رہیں گے؟ وڈیرے کے آدمی شکاری کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔'' بالآخر موِل کے اندر کا خوف نوک زباں پر آہی گیا۔ وہ اب بری طرح خوف محسوس کرنے لگی تھی۔

''تو فکر نہ کر۔ یہاں سے بس تھوڑی ہی دور ایک گوٹھ آئے گا۔ وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے سب سے پہلے ہم وہاں جا کر نکاح کریں گے اور پھر آگے شہر کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔'' بخش علی نے موِل کے چاندنی میں نہائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر محبت پاش لہجے میں کہا۔ مسلسل حالات دگرگوں نے موِل کو اب ہر قسم کے خطرات سے یکلخت بے نیاز کر ڈالا تھا۔ بخش علی کی سنگت نے اسے کافی حوصلہ عطا کر دیا تھا۔

جبکہ ادھر خود بخش علی آتش عشق میں۔ سفاک حقیقت فراموش کر بیٹھا تھا کہ اس نے وڈیرے میر لکھ میر خان جیسے جابر شخص سے دشمنی مول لے لی ہے۔ جو نسل در نسل ان کی تقدیروں کا خودساختہ مالک چلا آرہا تھا اور جو بے انتہا

اژدر سوخ والا اور طاقت ور بھی تھا لیکن آتش عشق میں دیوانہ وار کودنے والوں کو بھلا اس کی کب پروا ہوتی ہے۔

رات دبے پاؤں گزر رہی تھی۔ آس پاس ہو کا عالم تھا۔ سناٹا اس قدر شدید تھا کہ پتا کھڑکا اور دل دھڑکا...... مگر وہ دونوں دیوانے ماحول اور حالات کی ہیبت ناکیوں سے یکسر بے نیاز، خوش آئند مستقبل کے خواب دیکھ رہے تھے اور تقدیر کی غیر مرئی آنکھیں کسی اور نظر سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

مکار علی گل بڑی سفاکی کے ساتھ ایک مکروہ منصوبے کے تانے بانے بننے میں مصروف تھا۔ اسے خوب اندازہ تھا کہ اگر اس کی یہ سازش کامیاب ہو جاتی تو کسی حد تک تاوان بے عزتی بھرنے سے بچ سکتا تھا۔ وہ اب صوبت خان اور سوہنی کے خفیہ پروان چڑھنے والے معاشقے سے آگاہ ہو چکا تھا۔ علی گل اب ان دونوں کو سائیں رکھیو کے ذریعے کاروکاری کروانا چاہتا تھا۔ اس کے پاس وقت کم تھا لہٰذا وہ اب جلد از جلد اپنے منصوبے کو عملی شکل دینا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس نے اس دوران وڈیرے کی منت سماجت کر کے تاوان بھرنے کی مدت ذرا اور بڑھوالی تھی لیکن وہ اب مزید دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے گھناؤنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اس نے سوہنی اور صوبت خان کے درمیان ہونے والی خفیہ ملاقاتوں کے معمولات کا اچھی طرح اندازہ لگالیا تھا، پھر ایک دن وہ سوہنی کے بھائی سائیں رکھیو سے ملا۔ سائیں رکھیو پہلے ہی اس پر خار کھائے بیٹھا تھا۔ اس نے پہلے تو بڑی بے دلی سے اس کا استقبال کیا مگر پھر جب مکار علی گل نے اسے اس کی بہن سوہنی اور صوبت خان کے درمیان ہونے والی خفیہ ملاقاتوں کے بارے میں آگاہ کیا تو سائیں رکھیو کا دماغ گرم ہو گیا اور جوش غیظ سے اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ مگر یہ طیش اسے علی گل کی تحش گوئی پر آیا تھا کیونکہ اس نے علی گل کی بات پر ذرا بھی اعتبار نہ کیا تھا۔ وہ اس کی لالچی اور بدفطرت طبیعت سے بہ خوبی واقف تھا۔ لہٰذا وہ علی گل پر اپنی کلہاڑی تان کر غضب ناک لہجے میں بولا۔

”علی گل اپنی زبان سنبھال اور دفع ہو جا میری نظروں سے، ورنہ میں تیرے ٹکڑے کر دوں گا۔“ جواباً علی گل بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مکروہ انداز میں مسکرایا اور پرسکون لہجے میں بولا۔

”تجھے اگر میری بات کا یقین نہیں آتا تو چل میرے ساتھ اور اپنی آنکھوں سے اپنی بہن اور صوبت خان کے کرتوت دیکھ لے۔ میں بھی تیرے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ اگر میری بات جھوٹ نکلے تو بے شک تیری کلہاڑی اور میرا سر حاضر۔“

علی گل کے لہجے کی بے خوفی اور اعتماد نے ایک لمحے کو سائیں رکھیو کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا، اور بالآخر اس نے علی گل کی طرف گھورتے ہوئے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

☆☆☆

وڈیرے میر لکھ میر خان کا پورا وجود اس وقت غصے کے مارے پھنک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر موتل یوں اچانک کدھر چلی گئی۔ اس نے اپنے حواریوں کو پہلے صوبت خان کے گھر کی طرف دوڑایا۔ اس نے سمجھا شاید موتل بھاگ کر اپنے بھائی کے گھر نہ چلی گئی ہو مگر وہاں بھی اس کا پتا نہ چلا پھر اس کے مقرب خاص کارپرداز پیرل لاکھیر نے وڈیرے میر لکھ میر خان کے کان میں یہ بات ڈالی کہ موتل تنہا حویلی سے بھاگنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ اسے کوئی ورغلا کے ساتھ بھگا لے گیا ہے۔

اس انداز میں سوچنے پر گرگ باراں دیدہ وڈیرے کا ماتھا ٹھنکا اور تب اسے پتا چلا کہ اس کے کمدار مٹھن کا جواں سال بیٹا بخش علی اس دن سے غائب ہے جس دن سے موتل حویلی سے بھاگی ہے۔ اس شبہے کو تقویت اس طرح ملی کہ اس روز سے خود کمدار مٹھن بھی اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے گھر میں ہی مقید ہو کر رہ گیا تھا۔ بس پھر کیا تھا کمدار مٹھن کو وڈیرے نے آناً فاناً حاضر ہونے کا حکم دیا۔ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ جب وڈیرے کے مقرب خاص پیرل لاکھیر نے اس پر سختی کی تو مٹھن نے بے اختیار روتے ہوئے اپنی ٹوپی وڈیرے کے قدموں پر رکھ دی اور پیروں پر گر کر رونے لگا۔

”بس...... بس...... سائیں بھوتار! سائیں وڈا...... ام ...... مجھے معاف کر دو، میرے بچے سے غلطی ہو گئی ...... پر...... پر میں اسے خود ڈھونڈ کر آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔“

وڈیرے نے نہایت خشمگیں نظروں سے کمدار مٹھن کی جانب گھورا پھر اس کی ٹوپی کو لات رسید کرتے ہوئے مٹھن سے غضب ناک لہجے میں بولا۔

”اڑے تو اسے کیا ڈھونڈے گا، اس کی تو اب لاش ہی ہمارے ہاتھ لگے گی۔“

”نہیں سائیں وڈا! مجھ غریب کے بچڑے پر رحم کرو۔ میرا ایک ہی پٹ (بیٹا) ہے۔ میں اس کی معافی مانگتا ہوں آپ سے۔ مجھے جو چاہے سزا دے دو پر میرے بچے پر رحم کرو سائیں بھوتار!“

”تو سب پہلے سے جانتا ہوگا کہ تیرا وہ تیس مار خان بخش علی موتل کے ساتھ بھاگنے کا منصوبہ پہلے ہی بنا چکا تھا۔ تجھے ہمیں آگاہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ ہماری ہی حویلی میں نقب لگا رہا تھا۔ تو نے بھی ہمارے ساتھ نمک حرامی کی ہے۔“

وڈیرے کی بات پر منشی مٹھن کی آنکھیں مارے خوف سے پھیل گئیں۔ وڈیرے نے حقارت سے ایک زوردار ٹھوکر مٹھن کے رسید کی پھر اسے جلاد صفت پیرل لاکھیر کے حوالے کیا، اس کے بعد گرجدار لہجے میں اس سے بولا۔

”پیرل۔“

”حاضر سائیں وڈا۔“ وہ مستعدی سے بولا۔

”اسی وقت آدمی تیار کر اور شکاری کتوں کے ساتھ ان دونوں حرام خوروں کے پیچھے نکل جا، جدھر نظر آویں گولیوں سے اڑا دے ان سسی پنوں کی جوڑی کو۔“

”برابر سائیں وڈا...... برابر۔“ پیرل لاکھیر کی سرخ سرخ آنکھوں میں بلا کی سفاکی عود کر آئی تھی۔ کمدار منشی مٹھن اس سفاک حکم پر بلبلا اٹھا۔

”رحم سائیں! رحم...... میرے بچڑے کی جان بخش دے۔ میرے...... میرے پورے کنبے نے تیری خدمت چاکری کی ہے، یہ ظلم ہم پر مت کر۔“

مگر سنگ دل اور جابر وڈیرے پر مٹھن کی داد فریاد کا مطلق اثر نہ ہوا۔

☆☆☆

علی گل، سائیں رکھیو کو لے کر ایک ایسے مقام پر پہنچا جدھر سوہنی اور صوبت خان کی خفیہ ملاقات متوقع تھی، سائیں رکھیو کے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی اور وہ بری طرح غصے سے بل کھا رہا تھا۔ مکار علی گل دل ہی دل میں اپنے منصوبے پر خوش ہو رہا تھا۔ وہ اب ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ وہ صوبت خان اور سائیں رکھیو کو آپس میں الجھا کر خود تاوان بے عزتی ادا کرنے سے صاف بچ نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت سائیں رکھیو کے سر پر خون سوار ہے اور پھر اچانک سائیں رکھیو کی جلتی سلگتی آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ اس کا سارا وجود جل اٹھا۔ دور نہر کے ریتیلے کراڑے پر اس نے اپنی بہن سوہنی اور صوبت خان کو دیکھا، ان دونوں کی باہم ملاقات نے اس پر یہ تلخ حقیقت واضح کر دی کہ علی گل کی بات جھوٹ نہیں ہے۔ آس پاس کا علاقہ ویران تھا۔ وہ سراپا آتش غیظ بن چکا تھا۔ پھر اس کا بندوق والا کپکپاتا ہوا ہاتھ دھیرے دھیرے بلند ہوا اور سب سے پہلے اس نے صوبت خان کا نشانہ لے کر فائر کر ڈالا۔ سرمئی شام کی پرسکون فضا میں کان پھاڑ دھماکا ہوا اور اگلے ہی لمحے سامنے ریتیلے کراڑے پر صوبت خان کا وجود کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرتا اور تڑپتا ہوا دکھائی دیا۔ دہشت زدہ سوہنی کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا کہ ادھر جوش غیرت میں سلگتے ہوئے سائیں رکھیو نے اپنی بہن سوہنی کا بھی نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ سوہنی کے حلق سے برآمد ہونے والی آخری چیخ بڑی لرزہ خیز تھی۔ وہ بھی خون میں لت پت مردہ صوبت خان پر گری اور اس کے ساتھ ہی سفر آخرت پر روانہ ہو گئی۔

مکار علی گل اب تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کی غرض سے سائیں رکھیو کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ غیظ و غضب میں کپکپاتا ہوا سائیں رکھیو آگے بڑھا اور کراڑے پر پہنچ کر سلگتی ہوئی نظروں سے صوبت خان اور سوہنی کی خون آلود لاشوں کو گھورتے ہوئے ہانپنے لگا پھر اچانک ہی جیسے اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مکار علی گل جانے کب سے گھات لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے جیسے ہی سائیں رکھیو کو اپنے کام سے فارغ ہوتے دیکھا تو نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کے عقب میں پہنچ کر اپنی کلہاڑی کے ایک بھرپور وار سے سائیں رکھیو کا بھیجا چیر ڈالا..... سائیں رکھیو تیورا کر گرا اور چند لمحوں میں ہی تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ علی گل اپنی خونیں آنکھوں سے سائیں رکھیو کی خون میں لت پت لاش کو چند ثانیے گھورتا رہا اور پھر اس نے اس کی لاش گھسیٹ کر صوبت خان اور سوہنی کی لاشوں کے قریب ڈال دی۔

اب علی گل نے جلدی سے اپنی کلہاڑی سائیں رکھیو کی لاش پر پھینکی اور اس کی بندوق بھی اس کے قریب ہی پھینک کر وہاں سے غائب ہو گیا۔

☆☆☆

بڑی سفاکی اور مکاری کے ساتھ سائیں رکھیو، صوبت خان اور سوہنی کو کرب ناک موت سے ہم کنار کرنے کے بعد علی گل شاداں و فرحاں تھا، اپنی کامیابی پر۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اب اسے تاوان بے عزتی نہیں دینا پڑے گا کیونکہ سائیں رکھیو کی بوڑھی ماں اب بالکل تنہا رہ گئی تھی اور علی گل کو معلوم تھا کہ اب اس بوڑھی پاگل عورت میں تاوان طلب کرنے کی ہمت نہ ہوگی اور کم و بیش صوبت خان کے وارثوں کا بھی یہی حال تھا۔ متعلقہ تھانے کی پولیس کے لیے یہ واقعات معمول کی بات تھے، لہٰذا کسی جھنجھٹ میں پڑے بغیر اس اندوہناک واقعے کو سیدھے سیدھے کاروکاری کا واقعہ قرار دیتے ہوئے کسی ممکنہ تفتیش میں پڑے بغیر داخل دفتر کر دیا۔ کسی کو بھی علی پر شبہ نہ ہو سکا کہ یہ ساری کارروائی اس کی تھی مگر علی اب بھی چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ اسے اب موتل کی

تلاش تھی وہ اس سے بھی انتقام لینا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے وہ اچھی طرح سن گن لینا چاہتا تھا اور پھر جلد ہی اس کے کانوں میں یہ بھنک بھی پڑ گئی کہ موبل کمہار مٹھن کے بیٹے بخش علی کے ساتھ فرار ہوئی تھی اور اب وڈیرے کے آدمی بھوکے کتوں کی طرح انہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ علی گل سراپا انتقام بنا خود بھی موبل کی تلاش میں نکل پڑا۔

☆☆☆

دور مشرقی سمت پو پھٹ رہی تھی۔ موبل اور بخش علی کو ایک پوروائی (گوٹھ یا آبادی) کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ دونوں وہاں جا پہنچے۔ بخش علی کا وہاں ایک دوست یار محمد رہتا تھا۔ بخش علی نے اسے ساری کتھا سنائی اور ساتھ ہی اس سے درخواست کی کہ جس قدر ممکن ہوسکے اس معاملے کو خفیہ رکھے۔ یار محمد اس کا گہرا دوست تھا۔ اس نے ان دونوں کو گائے بھینسوں کے باڑے کے پچھواڑے ایک چھوٹی کوٹھڑی نما کمرے میں پناہ دے دی۔ بخش علی نے اسے صرف ایک رات وہاں رہنے کو کہا تھا اور ساتھ ہی اس سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ آج ہی ان دونوں کے نکاح کا بھی بندوبست کرے۔ اگرچہ یار محمد جانتا تھا کہ بخش علی نے جو خطرناک قدم اٹھایا اس کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا مگر اس نے اپنے دوست کو یہ بات سمجھانا۔۔ سود ہی سمجھا۔ کیونکہ اب اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ بہر طور...... اس نے حقِ دوستی ادا کرتے ہوئے اتنا ضرور کر دیا کہ گوٹھ کے پیش امام کا فوری بندوبست کرنے کے بعد اس نے دو گواہوں کے سامنے بخش علی اور موبل کا نکاح پڑھوا دیا پھر وہ دن اور رات بخش علی اور موبل نے باڑے کے پچھواڑے کمرے میں گزارے اور اگلے دن صبح دم وہ ایک بیل گاڑی میں سوار ہو کر شہر جانے والی پختہ سڑک کی جانب ہو لیے مگر بیل گاڑی والا انہیں تھوڑی دیر بعد ہی سڑک سے چند فرلانگ نزدیک اتار کر دوسری جانب ہولیا۔

اندیشوں بھرے وقت کا ایک ایک لمحہ ان دونوں پر بھاری سل کی طرح گزر رہا تھا، تاہم اس سے ان دونوں کے چہروں پر شب رفتہ کی ایک الوہی سی خوشی کا احساس روپہلی چاندنی کی طرح دمک رہا تھا مگر ساتھ ہی ایک انجانے خوف کے غیر مرئی حصار نے انہیں ذہنی طور پر ہنوز جکڑ رکھا تھا۔

"بخش علی! ہم شہر جائیں گے؟ کہاں رہیں گے؟" معاً موبل نے اطراف کے ویرانے میں سراسیمگی سے دیکھتے ہوئے بخش علی سے کہا۔ وہ دونوں اب تیز قدموں سے شہر جانے والی پختہ سڑک کی جانب بڑھ رہے تھے۔

"وہاں میرے دور کے رشتے کا ایک چاچا رہتا ہے کچھ روز چاچا کے وہاں رہ کر میں شہر میں ہی کام تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔" بخش علی نے جواب دیا۔

"مگر ہم شہر جائیں گے کس طرح؟ وہ تو سنا ہے یہاں سے بہت دور ہے۔" موبل نے پرتفکر لہجے میں پوچھا۔ جواباً بخش علی بولا۔

"ابھی ہم سڑک کے ساتھ ساتھ شہر کی طرف پیدل چلتے رہیں گے۔ ہمیں شہر جانے والی لاری ضرور مل جائے گی۔"

بخش علی نے اتنا کہا پھر اس نے ایک نظر موبل کے متفکر و پریشان چہرے پر ڈالی اور رک گیا۔ موبل بھی تھم گئی۔ بخش علی نے موبل کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور اسے آہستگی سے اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے اس کے کومل چہرے پر اپنی محبت پاش نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

"موبل! اب بھلا تجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔ ہمیں اب کوئی بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتا۔"

"پتا نہیں کیوں مجھے ڈر سا لگ رہا ہے علی!" موبل کے لہجے میں اب بھی خوف تھا۔

"اللہ سائیں خیر کرے گا، آؤ آگے بڑھیں...... وہ دیکھو شہر جانے والی سڑک سامنے ہے۔" یہ کہہ کر بخش علی نے ابھی قدم بڑھایا ہی تھا کہ عقب سے بندوق چلنے کا دھماکا سنائی دیا۔ وہ دونوں جی جان سے لرز اٹھے۔ دونوں نے بیک وقت اپنے عقب میں گردن موڑ کر دیکھا تو بے اختیار موبل کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہوگئی۔ سامنے علی گل کھڑا بندوق ان کی طرف تانے خونخوار نظروں سے انہیں گھور رہا تھا۔

"موبل! تو اس کے ساتھ کدھر جا رہی ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" علی گل حلق کے بل دھاڑ کے بولا تو بخش علی یکدم موبل کے سامنے آگیا اور علی گل کی طرف شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"علی گل! زبان سنبھال کر بات کر۔ یہ اب میری بیوی ہے، جرگے کے فیصلے کے مطابق تو اسے طلاق دے چکا ہے۔"

علی گل یہ سن کر مزید آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے بخش علی پر اپنی بندوق تان لی اور آناً فاناً فائر داغ دیا۔ فضا میں کارتوس چلنے کا دھماکا ہوا اور بخش علی کا وجود خاک و خون میں تڑپنے لگا۔ موبل اپنی جگہ سکتے میں کھڑی رہ گئی۔ ٹھیک اسی وقت دوبارہ گولی چلنے کی آواز ابھری موبل تو جیسے گونگی بہری ہوچکی تھی اور خود سے بے پروا پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے قدموں تلے پڑی بخش علی کی لاش کو تکے جا رہی تھی، اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس کے محبوب شوہر بخش علی کو قتل کرنے والا علی

گل بھی اب خود پیوند خاک ہوچکا ہے۔ وہ چونکی اس وقت جب ایک گولی کے بعد دوسری اور تیسری پھر چوتھی گولی چلنے کی سمع خراش آواز گونجی، تب اس نے اپنی نمناک نگاہیں اٹھا کر سامنے دیکھا تو اسے بخش علی کا باپ مٹھن اپنے ہاتھ میں پستول تھامے کھڑا نظر آیا۔ اس کی حالت پاگلوں کی سی ہو رہی تھی وہ وڈیرے کے حواریوں کے پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بیٹے اور بہو کو تلاش کر کے کسی محفوظ مقام تک انہیں لے جانا چاہتا تھا لیکن بدقسمتی سے وڈیرے کے حواریوں سے پہلے علی گل نے اس کے بیٹے بخش علی کا کام تمام کر ڈالا تھا مگر اس نے اپنے بیٹے کے قاتل کو بھی نہیں بخشا۔ علی گل کو جہنم واصل کرنے کے بعد اس نے پستول ایک طرف پھینکا اور "میڈا پٹ...... میرا بچہ......!" کہتا ہوا بیٹے بخش علی کی لاش کی طرف دوڑا اور دھاڑیں مار مار کر بیٹے کی خون آلود لاش سے لپٹ کر رونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنسوؤں بھرا چہرہ اٹھا کر ایک نگاہ موبل پر ڈالی تو اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں پھوٹ پڑیں۔ تب وہ اٹھا اور جنونی انداز میں موبل پر جھپٹا اور اس کی گردن دبوچ لی۔

"م...... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا...... تو...... تو...... ناگن ہے...... تو نے...... تو نے...... میرے بیٹے کو ڈس لیا۔"

"ہاں...... بابا...... م...... مجھے مار دے...... مار دے مجھے...... میں بھلا اب زندہ رہ کر بھی کیا کروں گی...... مجھے مار دے...... بابا...... مجھے مار دے۔" موبل نے گھٹی گھٹی آواز میں نیم مردنی سے کہا تو اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ موبل کی گردن پر مٹھن کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب تذبذب کے آثار نمودار ہونے لگے اور بالآخر اس نے موبل کی گردن چھوڑ دی اور عجیب سے انداز میں خود کلامی کرتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔

"نہیں...... میرے بخش علی نے تجھے بچانے کے لیے ہی تو اپنی جان دی ہے۔ م...... میں بھلا اپنے بیٹے کی قربانی کو کیوں ضائع جانے دوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ تھامے رو پڑا۔

ادھر موبل اس کی بات پر کٹ کر رہ گئی اور وہ بھی بے اختیار رو پڑی پھر اپنے مرتعش وجود کے ساتھ وہ اپنے محبوب شوہر بخش علی کی لاش کے پاس آکر بھر بھری مٹی والی زمین پر بیٹھ گئی اور بخش علی کا سر اپنی گود میں رکھ کر بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو بخش علی کے ابدی نیند میں ڈوبے ہوئے چہرے کو بھگونے لگے۔ اس دوران مٹھن بھی پاس آکر بیٹے کی لاش پر گر سا گیا۔ تب موبل نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں مٹھن کو بتایا کہ وہ اور بخش علی گزشتہ رات شادی کے بندھن میں بندھ چکے تھے۔ مٹھن نے جیسے ہی یہ سنا تو اس کے بوڑھے وجود کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ چونک سا گیا پھر اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے اور اس نے اپنا کپکپاتا ہوا ایک ہاتھ موبل کے سر پہ رکھا اور بولا۔

"چل میری نوں (بہو) ہم یہاں سے دور نکل جاتے ہیں۔" یہ سن کر موبل نے چونک کر غم آگیں نگاہوں سے مٹھن کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ مرتعش تھے۔ مٹھن دوبارہ بہ عجلت بولا۔ "چل میری دھی دیر نہ کر اس وڈیرے کے کتے تیری اور میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ میں اب اپنے پٹ کی عزت کو ان خبیثوں کے حوالے کبھی نہیں کروں گا۔"

موبل جیسے یکدم اس کی بات کی گہرائی کو سمجھ گئی اور پھر وہ اٹھ کر شہر جانے والی سڑک پر ہولیے۔

☆☆☆

اس بھرے شہر کی ایک کچی آبادی میں رہتے ہوئے مٹھن اور موبل کو اب ایک سال سے زائد عرصہ ہوچلا تھا۔ وہ دو کمروں کے ایک بوسیدہ سے گھر میں رہنے لگے تھے۔ مٹھن شہر میں ہی مزدوری کرنے لگا تھا۔ اس دوران موبل نے ایک پیارے سے بیٹے کو جنم دیا تھا۔

"دیکھ بابا......! یہ بالکل بخش علی کا چہرہ نہیں لگتا؟"

اس روز موبل نے اپنے سسر مٹھن سے کہا تو بہو کی بات پر مٹھن کا جیسے برسوں پرانا غم بھرنے لگا اور وہ خوشی سے نہال ہوگیا۔ اس نے بچے کو اپنی گود میں لے کر چوما پھر موبل سے بولا۔

"ہاں دھیے! تو ٹھیک کہتی ہے۔ یہ بالکل میرے بخش علی کا چہرہ ہے۔"

"بابا! اس کا نام بھی تو ہی رکھ دے۔" موبل نے اپنے حلق میں اترتی رقت پر قابو پاتے ہوئے کہا تو مٹھن ایک بار پھر اپنے گل کوتھنے پوتے کو اپنے بوڑھے ہونٹوں سے چوم کر بولا۔

"ہاں یہ میرا بخش علی ہی تو ہے اور...... اور...... اس کا نام...... علی بخش...... ہے۔"

موبل کی آنکھوں میں نمی اتری ہوئی تھی۔

جنبش ہائے ناتواں سے سود
ہر تمنا جراحت صد چاک

(شاہ عبداللطیف بھٹائی)

مقابلے کی انعام یافتہ کہانی

شکست پندار

عائشہ فاطمہ

جب خواب دیکھنے اور پھول کھلنے کا وقت دبے پاؤں گزر جائے تو آتے جاتے موسم دلوں میں ہلچل نہیں مچاتے، جب چھن جائیں سایے سائے... اور دھوپ سفر میں آجائے... جب کوئی کھلا نہ دریائے اور دل میں خواہش مر جائے تو ہر رنگ اداسی اور ہر پل پیاس بڑھاتا ہے۔ جب کوئی کمزور انسان حالات سے شکست کھا جائے تو اتنا اچنبھا نہیں ہوتا مگر جب... فاتح اپنے قدموں کی پستی سے بھی نیچے گر جائے تو اس کی ذلت و رسوائی کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا... آج تک زن، زر اور زمین سے جانے کتنے قصوں نے جنم لیا اور جانے کب تک یہ درد انگیز واقعات رونما ہوتے رہیں گے۔ وہ حرما نصیب بھی ایسے ہی دگرگوں حالات کا شکار... پل پل روشنی کو ترستے ہوئے زندگی سے نبرد آزما تھی... ابھی تو کم عمری کی دھوپ سر پہ تھی... ابھی تو خوابوں کی کلیوں نے رنگ جمایا تھا... ابھی تو وہ دھندلا منظر بھی پوری طرح دیکھ نہ پائی تھی کہ امید کی کرن دھیرے دھیرے حسرت میں ڈھلنے لگی اور بالآخر... ایک روز زندگی کی شام نے اسے گھیر لیا... خواہشوں کی گلیوں میں اندھیروں نے ڈیرے جما لیے مگر... اس کے باوجود کائنات کی چکی مسلسل دائرے میں گھوم رہی ہے۔ جانے والا کل آنے والے کل کی نوید لاتا ہے... اور کسے خبر کہ آنے والے پل اپنے دامن میں کس کے لیے کیا سوغات چھپائے لاتے ہیں۔

بے بسی کے شجر پر بیٹھی چڑیا کے مانند لرزتی، کانپتی ایک معصوم حسینہ کی دلخراش روداد

شوہر نکھٹو بھی ہو تو عورت کے لیے سائبان ہوتا ہے۔ اس سائبان میں دھوپ ستاتی تو ہے جلاتی نہیں۔ جب یہ سائبان گرتا ہے تو سایہ بھی دھوپ بن کر ڈستا ہے۔ صغرا کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک دن اچانک اس سائبان میں سیکڑوں سوراخ ہو گئے۔ سائبان کا گرنا تھا کہ بجی سسرال درندوں سے بھرا جنگل بن گئی۔ کسی نے منحوس کہہ کر پکارا۔ کسی نے چھل پیری کہا۔ وہ پورے چھ سال اپنے شوہر کے ساتھ رہی تھی لیکن ساس نے چھاتی پیٹ لی کہ منحوس نے آتے ہی میرے بیٹے کو کھا لیا۔ اس نے احتجاج کیا تو ساس نے چوٹی پکڑ لی۔ دیوروں نے مردانگی دکھائی، اتنا مارا کہ وہ کئی گھنٹے کے لیے بے ہوش ہو گئی۔ اس کی چار سالہ معصوم بچی سرہانے بیٹھی روتی رہی۔ شوہر نے بیوی کی چادر کیا اوڑھائی کہ وہ سر سے پاؤں تک عریاں ہو گئی۔ اس کا باپ اس سے ملنے آیا تو یہ کہہ کر دروازے سے واپس کر دیا گیا کہ ہمارے یہاں عدت

کے دوران باپ سے بھی پردہ کرایا جاتا ہے۔ جب عدت ختم ہوجائے تو آکر لے لیتا بلکہ اس منحوس کو اپنے ساتھ ہی لے جاتا۔

باپ سے تو پردہ تھا لیکن دیور سر پر کھڑے تھے۔ ایک کاغذ ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ ضد کررہے تھے کہ اس پر دستخط کردو۔

''اس کاغذ پر کیا لکھا ہے؟''

''کچھ بھی لکھا ہے تجھے اس سے کیا۔ تجھے تو بس حکم ماننا ہے۔ کر اس پر دستخط۔''

''میں ماسٹر کی بیٹی ہوں۔ میرے باپ نے اتنا ضرور بتادیا ہے کہ پڑھے بغیر کسی کاغذ پر دستخط نہیں کرنا چاہیے۔''

''پڑھ سکتی ہے تو پڑھ لے۔''

''یہ انگریزی میں ہے ورنہ پڑھ بھی لیتی۔ ابا کو بلا لو وہ کہیں گے تو دستخط کردوں گی۔''

''کرتی ہے دستخط یا ادھیڑیں تیری چمڑی۔''

''مجھے مار بھی ڈالو تو دستخط نہیں کروں گی۔ میں پڑھ نہیں سکتی لیکن مجھے معلوم ہے اس کاغذ پر کیا لکھا ہے۔''

''کیا لکھا ہے۔ کیا سمجھتی ہے تو؟''

''یہ مکان میرے شوہر کا ہے یہ مجھے ملے گا۔ اس کی جو زمین ہے وہ مجھے ملے گی۔ تم چاہتے ہو میں اپنا حق چھوڑ دوں، اپنا حصہ تمہیں دے دوں۔ یہی لکھا ہے نا اس کاغذ پر۔''

''چار جماعتیں کیا پڑھ لی ہیں۔ بڑی سیانی سمجھتی ہے خود کو۔ عورت کا کیا حصہ، حصہ تو مرد کا ہوتا ہے۔ ہمارے بھائی کی جائداد تھی، اب وہ نہیں رہا تو سب ہمارا ہے۔''

''سیدھی طرح مان جا ورنہ ہمیں ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکالنا آتا ہے۔''

''میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے نہیں تو اس بچی کو تو اس کے باپ کی جائداد سے حصہ دے دو۔''

''اولاد مرد کی ہوتی ہے۔ یہ ہمارے بھائی کی اولاد ہے۔ ہم جانیں اور یہ جانے۔ تو کون ہوتی ہے بیچ میں بولنے والی۔''

''کیا مرد مرد لگا رکھی ہے۔'' وہ تن کر کھڑی ہوگئی۔ ''عورتوں میں کیا روح نہیں ہوتی۔ عورتیں کیا انسان نہیں ہوتیں؟''

یہ واقعی اس کی بڑی گستاخی تھی۔ وہ عورت ذات ہوتے ہوئے گھر کے مردوں سے زبان چلارہی تھی۔ قریب کھڑی ساس نے اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ مارا۔

''مردوں سے زبان چلاتی ہے منحوس۔ اب تجھے دن بھر میں ایک روٹی اور ایک گلاس پانی ملا کرے گا۔ جب بھوک سے مرنے لگے تو مرنے سے پہلے مکان اور زمین میرے بیٹوں کے نام کردینا۔ پڑی رہ اس کوٹھری میں جہاں تو نے خصم کو ڈسا تھا ناگن۔''

صغرا کے لیے شوہر کی وفات کا صدمہ ہی کیا کم تھا کہ سسرال والوں کے رویے نے اسے بے حال کردیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اسے اس کے حصے سے محروم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن اس نے بھی تہیہ کرلیا تھا کہ وہ کمزور ہے لیکن ان مظالم کا مقابلہ کرتی رہے گی۔

گھر کے مرد اپنی مردانگی کا مسلسل مظاہرہ کررہے تھے۔ کبھی سمجھاتے، کبھی دھمکاتے تھے لیکن وہ کسی صورت ان کاغذات پر دستخط کرنے کو تیار نہیں تھی۔ کوئی ایسا ذریعہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے باپ کو بلوا سکتی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کی بیوگی کا سن کر اس کا باپ آیا ضرور ہوگا لیکن ان لوگوں نے اسے ملنے نہیں دیا ہوگا۔ وہ یہاں سے بھاگ جانے کی ترکیبیں بھی سوچ رہی تھی لیکن کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

ایک روٹی اور ایک گلاس پانی پر گزارہ کرتے ہوئے ایک مہینا ہوگیا تھا۔ وہ بھرے جسم کی عورت تھی لیکن اب سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔ اسے اب اپنے سے زیادہ اپنی بیٹی نوراں کی فکر تھی۔ کہیں یہ درندے جائداد کے لالچ میں نوراں کو نقصان نہ پہنچادیں۔

صغرا کے دونوں دیور اپنی بار بار کی شکست پر زخمی سانپ کی طرح بل کھارہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا ایک چچازاد بھائی بالے بھی شامل ہوگیا تھا جو اپنے علاقے کا مشہور غنڈا تھا اور ایسے معاملات سے نمٹنا خوب جانتا تھا۔

گرمیوں کی دوپہر تھی۔ گلیاں سنسان، گھر خاموش تھے۔ صغرا کی ساس پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ اس کی نند اندر کسی کوٹھری میں دبکی بیٹھی تھی۔

وہ تینوں دبی دبی آوازوں میں لفظوں کے تیر چھوڑ رہے تھے۔ نشانہ صغرا تھی۔ بالے سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس کی آواز ذرا بلند ہوئی تو صغرا کی نند نے آواز پر کان لگادیے۔ پھر وہ بلی کے پاؤں دبے قدموں چلتے ہوئے اس جگہ آکر کھڑی ہوگئی جہاں سے وہ ان آوازوں کا قد ناپ سکتی تھی۔

بالے کہہ رہا تھا۔ ''شریف عورت موت سے نہیں ڈرتی لیکن عزت جانے کے خوف سے لرز جاتی ہے۔ اس کی عزت پر ہاتھ ڈال دو پھر دیکھتا ہوں کیسے دستخط نہیں کرتی۔''

''یار یہ بھی تو سوچو وہ ہماری بھابی ہے۔ ہمارے بڑے بھائی کی بیوی رہی ہے۔ ہم اس کی عزت پر ہاتھ ڈالتے اچھے لگیں گے۔''

''ابے زنخو! مرد بنو، مرد۔ مردوں کے لیے عورت بس عورت ہوتی ہے کوئی بھابی وابی نہیں ہوتی۔ میرا ساتھ دینا ہے تو دو ورنہ میں اکیلے ہی دستخط کرا کے دکھا دوں گا۔''

''نہیں بالے۔ جب گنگا بہہ ہی رہی ہے تو ہم کیوں نہ ہاتھ دھوئیں۔ ہم بھی تیرے ساتھ ہیں۔ یقین نہیں تو چل ابھی چل۔''

''نہیں، ابھی نہیں۔ چوری رات ہی کو اچھی لگتی ہے۔'' بالے نے کہا۔ ''رات کو جب سب سو جائیں گے تب ہم تینوں صغرا کی کوٹھری میں جائیں گے۔ اگر اس نے دستخط کر بھی دیے تو بھی اسے بے عزت کرنا ہے تاکہ وہ آئندہ سر اٹھا کر نہ جی سکے۔''

اس کے بعد وہ تینوں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے جیسے یہ باتیں اتنی بے ہودہ ہوں کہ آپس میں کرتے ہوئے بھی شرم آرہی ہو یا انہیں احساس ہوگیا ہو کہ کوئی ان کی باتیں سن رہا ہے۔

صغرا کی نند ان باتوں کو سمجھتی بھی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ جب کوئی عورت بے عزت ہوتی ہے تو اس پر کیا بیت جاتی ہے۔ اسے بتول یاد آگئی۔ اسے گاؤں کے ایک آدمی نے بے عزت کردیا تھا۔ اس نے کنویں میں چھلانگ لگادی تھی۔ بتول مرگئی، اس آدمی کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ آج بھی عزت دار بنا پھرتا ہے۔ یہی کچھ میری بھابی کے ساتھ ہونے والا ہے۔ ایک نہیں تین تین درندے اس کی بوٹیاں نوچنے کی تیاری کررہے ہیں۔ ڈر کے مارے اس کے پاؤں کانپ رہے تھے، وہ وہاں سے ہٹنا بھول گئی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ بھائیوں میں سے کوئی بھی اسے دیکھ سکتا ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنی کوٹھری میں آگئی۔ اس کا بدن پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ کچھ تو گرمی کچھ گھبراہٹ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟ پہلے اس نے سوچا بھاگتی ہوئی جائے اور ماں کو بتادے۔ کوٹھری سے باہر جانے بھی لگی لیکن پھر واپس آگئی۔ ماں میری بات کا یقین نہیں کرے گی وہ ضرور بھائی سے معلوم کرے گی اور بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ بھائی ہوشیار ہوجائے گا۔ ابھی وہ بے خبر ہے۔ نہیں جانتا کہ میں سب کچھ سن چکی ہوں۔ اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ بھائیوں کے گھر سے نکلنے کا انتظار کرنے لگی۔

صغرا کی قسمت اچھی تھی کہ وہ تینوں بھائی اسی وقت گھر سے نکل بھی گئے۔ صغرا کی نند تڑپ کر اٹھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اطمینان کرلیا کہ گھر میں کوئی ہے تو نہیں۔ اس کی ماں ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ اسے اپنی ماں کی عادت معلوم تھی۔ وہ جہاں جاتی تھی گھنٹوں گزار کر آتی تھی۔ اس نے مطمئن ہوکر ماں کے سرہانے رکھی ٹین کی پیٹی کھولی اور چابی نکال لی۔ بھاگتے ہوئے گئی اور اس کوٹھری کا تالا کھولا جہاں صغرا کو قید رکھا گیا تھا۔

تالے کی آواز سن کر صغرا چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے قریب معصوم نوراں بے خبر سو رہی تھی۔ اپنی نند کو سامنے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کیونکہ وہ اس سے ملنے کبھی اس کوٹھری میں نہیں آئی تھی اور اب آئی بھی اس طرح تھی کہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کررہی تھی۔

''بھابی تو مجھے غلط مت سمجھنا۔ میں تیری ہمدرد ہوں اور تجھے ایک اہم بات بتانے آئی ہوں۔''

''میں تو یہاں کسی کو بھی غلط نہیں سمجھتی۔ غلط تو میں ہی ہوں جو اپنا حق چھوڑنے پر تیار نہیں۔ تو بھی مجھے سمجھا کر دیکھ لے مگر میں دستخط نہیں کروں گی۔''

''یہ بات نہیں ہے بھابی۔ میں تو یہ بتانے آئی ہوں کہ تیری عزت خطرے میں ہے۔ بالے اور میرے دونوں بھائی رات میں کسی وقت تیرے پاس آئیں گے۔ تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ اس سے پہلے تو یہاں سے بھاگ جا۔''

''میرا بس چلتا تو کب کی بھاگ جاتی۔ کوٹھری میں تالا پڑا رہتا ہے۔''

''میں نے اس کا انتظام کرلیا ہے۔ اس وقت ماں گھر پر نہیں ہے۔ تو اسی وقت نکل جا۔ میں دروازہ کھلا چھوڑ دوں گی، سارا الزام ماں پر آئے گا کہ وہ تالا لگانا بھول گئی اور تجھے موقع مل گیا۔''

''دیکھ لے، میری وجہ سے تجھ پر کوئی مصیبت نہ آجائے۔''

''اب جو بھی ہوگا وہ تو ہوگا۔''

صغرا اس ماحول سے اتنی خوف زدہ ہوگئی تھی کہ اسے کسی پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی اس کی نند جو اس کے پاس آئی ہے کہیں اس میں بھی کوئی چال پوشیدہ نہ ہو۔

اسے سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر اس کی نند نے پھر اسے یاد دلایا کہ اس کی عزت خطرے میں ہے۔ ''کیا سوچ رہی ہو؟ بھاگ سکتی ہو تو بھاگ جاؤ۔ ماں آبھی گئی تو میں بہت دیر تک اسے اس کوٹھری کی طرف نہیں آنے دوں گی۔ رات آنے سے پہلے کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ تم جاچکی ہو۔''

صغرا کو جیسے ہوش آگیا۔ اس نے نوراں کو گود میں سمیٹا اور کوٹھری سے باہر نکل آئی۔ گھر کا پچھلا دروازہ کھیتوں کی

طرف کھلتا تھا۔ وہ اسی طرف سے باہر نکل گئی۔ اپنے گھر سے باپ کے گھر تک دو کوس کا فاصلہ تھا۔ یہ فاصلہ اسے پیدل طے کرنا تھا۔

☆☆☆

ماسٹر فیض محمد کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیٹی کی شادی کے بعد وہ گھر میں تنہا رہ گیا تھا۔ اس تنہائی کا علاج اس نے یہ ڈھونڈا تھا کہ اسکول سے آنے کے بعد قصبے کے بچوں کو گھر بلا لیتا تھا۔ ایک اسکول گھر کے آنگن میں کھل جاتا تھا۔ دل بھی بہل جاتا تھا اور بعض لوگ ٹیوشن کی مد میں فیس بھی ادا کر دیتے تھے۔ اس وقت بھی اسکول سجا ہوا تھا۔ فیض محمد کسی کام سے اٹھ کر کمرے میں گیا تھا کہ بچوں نے شور مچایا۔ ”صغرا باجی آ گئی۔ صغرا باجی آ گئی۔“ فیض محمد کمرے سے باہر آیا تو صغرا واقعی صحن کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔

”ارے صغرا تو؟ آ جا آ جا۔ اندر چلی آ۔ کیسی دھوپ ہو رہی ہے۔“

”اب کہاں دھوپ۔ اب تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔“

”دھوپ سے سائے میں آؤ تو اندھیرا ہی لگتا ہے۔ آ جا میری دھی آ جا۔“

صغرا یوں چلی جیسے نیند میں چلتے ہیں۔ کوٹھری تک جانے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ دالان تک آئی تھی کہ فرش پر بیٹھ گئی۔ معصوم نوراں نے ماں کی انگلی چھوڑی اور ٹیوشن پڑھنے والے بچوں کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ فیض محمد نے مٹکے سے پانی نکالا اور صغرا کے پاس چلا آیا۔

”کیا پیدل چلی آ رہی ہے جو اتنی تھک گئی؟“

صغرا نے پانی کا کٹورا اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور ایک ہی سانس میں کٹورا خالی کر دیا۔ پھر کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھی اور کمرے میں چلی گئی۔

فیض محمد کچھ دیر اپنی نواسی نوراں سے کھیلتا رہا پھر بچوں کی چھٹی کر دی۔ گھر میں بسکٹ رکھے تھے۔ اس نے بسکٹ نوراں کے آگے رکھ دیے اور خود صغرا کے پاس چلا آیا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ فیض محمد منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے، اس کی نیند کا بھی یہی حال تھا۔ تھک بھی تو گئی ہے۔ چلو اچھا ہے آرام کرنے دو۔ وہ کوٹھری سے باہر آیا تو نوراں فرش پر پڑی سو رہی تھی۔ اسے ہنسی آ گئی۔ یہ بھی بنی بنائی اپنی ماں ہے۔ اس نے نوراں کو گود میں بھرا اور لے جا کر صغرا کے برابر لٹا دیا۔

لڑکیاں میکے آتی ہیں تو ان کی کیسی کیسی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ صغرا کیسی بدنصیب ہے کہ اپنا میاں گنوا کر آئی ہے اور یہاں اس کی ماں بھی نہیں کہ اس کا درد بانٹ سکے۔ پھر اسے خیال آیا کہ صغرا بھوکی بھی تو ہوگی۔ کیا خبر کب کھانا کھا کر گھر سے چلی ہوگی۔ اٹھتے ہی کچھ کھانے کو مانگے گی۔ وہ بازار سے جا کر کھانا لے آیا اور اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ دودھ تو گھر میں رکھا ہی تھا جو نوراں کے لیے کافی تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ فیض محمد کئی مرتبہ کمرے میں جھانک کر دیکھ چکا تھا۔ صغرا ابھی تک سو رہی تھی۔ فیض محمد کا جی الجھنے لگا تھا۔ اس نے صغرا کو جی بھر کے دیکھا تک نہیں تھا اور وہ تھی کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ وہ اندر گیا اور صغرا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ پیشانی اتنی گرم ہو رہی تھی کہ اسے فوراً ہاتھ ہٹانا پڑا۔ اس نے بے در بے کئی آوازیں دے ڈالیں۔ صغرا نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن فوراً آنکھیں بند ہو گئیں۔ شور ہوا تو نوراں اٹھ کر بیٹھ گئی اور رونا شروع کر دیا۔ فیض محمد نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ نوراں اس سے مانوس نہیں تھی اور شاید بھوکی بھی تھی۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ وہ اسے لے کر کوٹھری سے باہر آ گیا۔ جلدی جلدی دودھ گرم کیا اور ٹھنڈا کر کے دودھ کا کپ نوراں کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ بچی واقعی بھوکی تھی۔ دودھ پیٹ میں گیا تو اس نے رونا بند کر دیا۔ اب فیض محمد کا دھیان صغرا کی طرف گیا جو بخار سے جل رہی تھی۔ اس نے نوراں کو گود میں اٹھایا اور ڈاکٹر کو بلانے کے لیے گھر سے نکل گیا۔

وہ ڈاکٹر کو اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگایا اور کچھ دوائیں لکھ کر دے دیں۔ یہ ہدایت بھی کر دی کہ صغرا کو سونے دیا جائے۔ صبح تک اس کا بخار اتر جائے گا۔

”یہ جس وقت بھی اٹھے اسے کچھ کھلا دینا پھر دوا دینا۔“

”اگر یہ رات میں نہ اٹھے؟“

”کوئی بات نہیں۔ دوا صبح کھلا دینا۔ میں نے انجکشن لگا دیا ہے۔ بخار خود بخود اتر جائے گا۔ دوا تو اس لیے دے رہا ہوں کہ بخار کے بعد کی کمزوری دور ہو جائے گی۔“

فیض محمد کب سے اس گھر میں اکیلا رہ رہا تھا لیکن آج اسے یہ گھر بہت اکیلا لگ رہا تھا۔ اتنا اکیلا کہ اسے ڈر لگنے لگا۔ تھوڑی دیر کو تو یہ لگا جیسے اندر صغرا نہیں اس کی لاش لیٹی ہو۔ وہ بھاگتا ہوا گیا اور صغرا کی نبض دیکھنے کے لیے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ایک مرتبہ اسے پھر جھٹکا لگا۔ اس کی کلائی پسینے سے تر تھی۔ مردے کو پسینا نہیں آتا۔ میری صغرا زندہ ہے، اس کا بخار اتر گیا ہے۔ اس نے سرگوشی میں صغرا کو آواز دی۔

”میری عزت مت لوٹو۔ میں دستخط کر دوں گی۔ مجھے بے عزت مت کرو۔“

صغرا بری طرح چیخ رہی تھی اور اس طرح مچل رہی تھی جیسے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسی وقت نوراں روتے ہوئے کمرے میں آ گئی۔ ماں کو دیکھ کر وہ پوری آواز سے رونے لگی تھی۔ اسی وقت صغرا نے آنکھیں کھولیں اور میری بچی کہتے ہوئے اسے لپٹا لیا۔ پھر اس نے باپ کی طرف دیکھا۔

”ابا، کیا میں مر گئی تھی؟“

”نہیں بیٹا، مریں تیرے دشمن۔ بخار کی بے ہوشی تھی، کچھ کھا لے پھر دوا بھی لینا۔“

فیض محمد نے جلدی جلدی کھانا گرم کیا اور صغرا کے سامنے رکھ دیا۔ نوراں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ فیض محمد دوسری چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔

”ابا تم نے پوچھا نہیں میں اپنی سسرال سے کیوں آ گئی؟“ صغرا نے کھانا ختم کرنے کے بعد پوچھا۔

”پہلے دوا کھا لے پھر پوچھ لوں گا۔“

”ابا میری ٹانگوں میں سخت درد ہے۔“

”یہ دوا کھا لے۔ درد یوں چلا جائے گا۔“

صغرا کو دوا دینے کے بعد وہ نوراں کو لے کر باہر نکل آیا۔ بچی نے بھی سمجھ لیا تھا کہ ماں سو رہی ہے۔ غیر متوقع طور پر وہ دن بھر میں فیض محمد سے مانوس بھی ہو گئی تھی لہٰذا ہنس بھی رہی تھی اور نامکمل جملوں میں کچھ بتا بھی رہی تھی۔

”تم بہت اچھے ہو۔ چاچا نے مارا۔ روٹی بھی نہیں دی۔ اب میں یہیں رہوں گی۔ دادی بھی گندی ہیں۔ سب نے اماں کو مارا۔“

فیض محمد نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ صغرا کے ساتھ کیا بیت گئی ہے۔ میری عقل پر بھی پتھر پڑ گئے ہیں۔ ابھی تک کچھ پوچھا ہی نہیں۔ پوچھتا کہاں سے۔ آتے ہی تو وہ بیمار پڑ گئی۔ اب اسے یاد آیا۔ صغرا کہہ رہی تھی، ابا تم نے پوچھا ہی نہیں کہ میں اپنی سسرال سے کیوں آ گئی۔ وہ اکیلی آئی ہے۔ کوئی اسے چھوڑنے بھی نہیں آیا۔ ضرور کوئی بات ہوئی ہے۔ اس نے نوراں سے پوچھنا چاہا لیکن وہ تو صرف اتنا ہی بتا سکتی تھی جتنی اس میں بولنے کی قوت تھی۔ وہ گود سے اتری اور قریب پڑی کرسی پر اترنے چڑھنے لگی۔ اسے یہ نیا کھیل مل گیا تھا۔ اب اسے فیض محمد کی پروا نہیں تھی۔ فیض محمد نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ ”ہم نہیں بتاتے۔“ کہہ کر پھر اپنے کھیل میں لگ گئی۔

فیض محمد پھر کمرے میں آ گیا تھا۔ پیلی روشنی میں صغرا کا اجلا چہرہ چھپکلی کے پیٹ کی طرح پیلا نظر آ رہا تھا۔ فیض محمد کو جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پیلا بلب بجھا دیا۔ اندھیرے کا داؤ چل گیا۔ اس کی آنکھوں نے دیکھنا چھوڑ دیا تو اس نے دیوار ٹٹول کر بٹن دبا دیا۔ بلب پھر روشن ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے صغرا کے چہرے پر کسی کی انگلیوں کے نشان ہیں۔ اس نے اپنی دونوں آنکھیں زور زور سے رگڑ ڈالیں۔ صغرا کے چہرے سے نشان غائب ہو گئے۔ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ اسی وقت نوراں کے رونے کی آواز آئی۔ وہ باہر اکیلی رہ گئی تھی۔ کھیل سے ذرا دل بھرا تو اس نے رونا شروع کر دیا۔ فیض محمد کا وہم اس منزل پر پہنچ گیا تھا کہ نوراں کے رونے سے وہ یہ سمجھا کہ صغرا کی سسرال سے کوئی آیا ہے اور نوراں کو اغوا کر کے لے جا رہا ہے۔ وہ اندھادھند باہر کی طرف بھاگا۔

”کیا ہوا نوراں۔ کون تھا۔ کون تجھے لے جا رہا تھا؟“

”کوئی بھی نہیں، میں کرسی سے گر پڑی۔“

فیض محمد نے اسے گلے سے لگا لیا اور اس کے ساتھ خود بھی رونے لگا۔

انسان جو کچھ دیکھنا چاہتا ہے بعض اوقات وہی اسے نظر آتا ہے۔ فیض محمد کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ نوراں کی زبانی یہ ادھوری معلومات اسے مل گئی تھیں کہ صغرا کی سسرال میں اسے مارا پیٹا گیا ہے۔ اب اسے اس کی آنکھیں یہی مناظر دکھا رہی تھیں۔ صغرا رات بھر سوتی رہی۔ نوراں بھی تھک ہار کر فیض محمد کے سینے پہ سر رکھ کر سو گئی تھی۔ صغرا صبح سو کر اٹھی تو ہشاش بشاش تھی۔ بخار اتر چکا تھا، تھکن بھی جاتی رہی تھی۔

ناشتا کرنے کے بعد فیض محمد نے صغرا سے پوچھا۔

”تیری عدت پوری ہو گئی جو تو چلی آئی؟“

”میرا شوہر کب مرا تھا جو میری عدت ہوتی۔“

”ہاں پتر، تیرے لیے تو وہ زندہ ہی ہوگا مگر حقیقت تو یہی ہے کہ اللہ نے اسے اپنے پاس بلا لیا ہے۔“

”وہ میرا شوہر نہیں میرے دیوروں کا بھائی تھا۔ میرا شوہر مرتا تو میرا حصہ مجھے ملتا۔“

”ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ تو ابھی غم میں ہوں گے۔ تیرا حصہ تجھے ضرور ملے گا۔“

”افسوس تو یہی ہے کہ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور وہ لوگ مجھ سے تقاضا کر رہے ہیں کہ میں اپنا حصہ چھوڑ دوں۔“

”کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تجھے آزما رہے ہوں گے۔“

”نہیں ابا نہیں، وہ میرا حصہ کبھی نہیں دیں گے۔ اس خوف سے کہ میں اپنا حصہ مانگ نہ لوں، میرے دیور مجھے جان سے مار دینا چاہتے ہیں۔ میں اپنی جان اور عزت بچا کر

یہاں تک آئی ہوں۔"

وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ کب کے رکے ہوئے آنسو صبر کے کنارے پھلانگ کر باہر آگئے۔ پھر ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان اس نے اپنی بپتا باپ کے سامنے دہرا دی۔ فیض محمد سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی بیٹی پر یہ قیامت بیت گئی ہوگی۔ کچھ دیر کے لیے اس کے آنسو بھی صغرا کے آنسوؤں میں گھل مل گئے پھر اس نے ایک عزم کے ساتھ صغرا کا سر اپنی چھاتی سے الگ کر دیا۔

"پھول کی پتیاں نازک ہوتی ہیں لیکن پھول کی حفاظت کرنے والا مالی اگر کمزور نہ ہو تو کس کی مجال کہ پھول کو ہاتھ بھی لگا سکے۔ میں تیرا حق تجھے دلاؤں گا۔ تجھ پر ہونے والے ایک ایک ظلم کا حساب لوں گا۔"

"نہیں ابا نہیں۔ میں نوکری کر کے اپنی بچی کو پال لوں گی۔ مجھے نہیں چاہیے اپنا حق۔"

"ایسا نہیں ہے کہ تیرا باپ تجھے روٹی نہیں کھلا سکتا لیکن تیرا حق تجھے ملنا چاہیے۔ میں جا کر ان سے پوچھوں تو سہی کہ وہ کس مذہب کے ماننے والے ہیں جو حق دینے سے انکار کر رہے ہیں۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ لوگ بڑے ظالم ہیں اور اب تو اور بھی غصے میں ہوں گے کہ میں ان کی دیواریں پھلانگ کر آگئی ہوں۔"

"اچھا نہیں جاتا وہاں لیکن عدالت کے دروازے تو کھلے ہیں۔ میں انہیں عدالت میں کھینچوں گا۔ میں خود کچھ نہیں لیکن ماسٹر فیض محمد بہت کچھ ہے۔ میرے شاگرد اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ تیرا حق تجھے دلوا کر رہوں گا۔ بس تو اتنی احتیاط کرنا کہ میں جب بھی گھر سے باہر جاؤں، دروازہ اندر سے بند رکھنا۔ ایسا نہ ہو تیرے دیور تیرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آجائیں۔"

فیض محمد کو مسجد جانا تھا لہٰذا صغرا اندر سے دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ فیض محمد مسجد کی طرف جاتے ہوئے بھی صغرا کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ نماز کے دوران بھی یہی خیال آتے رہے۔ نماز کے بعد گھر پہنچا تب بھی یہی خیال اس کے ساتھ ساتھ چلے آئے۔

وہ پڑھا لکھا تھا۔ تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے عرضی لکھ سکتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ جب تک کسی بڑے آدمی کی سفارش نہ ہو عدالتوں میں بھی فیصلے بدل جاتے ہیں۔ صغرا کی سسرال کے لوگ پیسے والے بھی ہیں اور بااثر بھی۔ ان سے ٹکرانے کے لیے کسی مضبوط سفارش کی ضرورت ہوگی۔

اس کے ایک دوست اپنے بیٹے کے پاس لندن گئے تھے۔ واپس آئے تو عجیب عجیب کہانیاں ساتھ لائے۔ وہاں آدمی کی قدر کی جاتی ہے، عہدے کی نہیں۔ ایک عام آدمی بھی انصاف کا طلب گار ہوتا تو مجال ہے اس کے ساتھ بے انصافی ہو جائے۔ وہ درخواست دے کر گھر بیٹھ جاتا ہے۔ درخواست خود بخود آگے بڑھتی رہتی ہے۔ جب اس کی ضرورت پڑتی ہے اسے بلا لیا جاتا ہے۔ بلاوجہ زحمت نہیں دی جاتی۔ ایک میرا ملک ہے۔ یہاں وکیل کہتے پھرتے ہیں، فلاں جج تو ہماری مٹھی میں ہے جو فیصلہ چاہیں گے لکھوا لیں گے۔ وکیلوں کا خیال آیا تو اسے اپنے ایک شاگرد کا بڑا بھائی یاد آگیا جو وکیل تھا اور شہر کی بڑی عدالت کے کیس لیتا تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ قصبے میں نہیں تھا، شہر میں رہتا تھا۔ اس سے ملنے کے لیے شہر جانا پڑتا۔ صغرا کا معاملہ ایسا تھا جسے ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ فیض محمد نے اسکول سے چھٹی کی اور شہر جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔

وہ بڑی امیدیں لے کر شہر آیا تھا لیکن یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ جس کی تلاش میں آیا تھا وہ بیرون ملک جا چکا ہے۔ فیض محمد جھنجلا کر رہ گیا۔ ہمارے ملک کے نوجوانوں کو کیا ہو گیا ہے؟ جس میں ذرا بھی قابلیت ہوتی ہے ملک چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ کیا سائنس داں، کیا انجینئر، کیا وکیل سب باہر جا رہے ہیں۔ ایک دن آئے گا کہ مجھ جیسے اسکول ماسٹر ہی یہاں پڑے رہ جائیں گے۔ وہ دل ہی دل میں باہر جانے والے نوجوان کو برا بھلا کہتا رہا پھر خود ہی اپنے خیالات کو رد کر دیا۔ یہ نوجوان بھی کیا کریں، یہاں کسی کی کوئی قدر ہی نہیں۔ سفارش اور رشوت کا زہر ایسا پھیل گیا ہے کہ نوجوان کاسۂ گدائی لیے در در گھومتے رہتے ہیں۔ کوئی انہیں نوکری کی بھیک دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ جنہیں نوکری مل جاتی ہے ان کی ترقی کے لالے پڑے رہتے ہیں۔ خیر مجھے کیا، اس وقت تو مجھے صغرا کے بارے میں سوچنا ہے۔ اس کے اردگرد بہت سے کالے کوٹ والے گھوم رہے تھے۔ اس نے سوچا ان میں سے کسی سے بات کر لوں لیکن مسئلہ سفارش کا تھا۔ وہ ایک بس سے گیا تھا، دوسری بس سے واپس آگیا۔

وہ رات کو سونے کے لیے لیٹا تو صغرا کی سسرال اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ نہایت بااثر لوگ ہیں۔ ان کا دماغ درست کرنے کے لیے ان جیسا ہی کوئی بااثر چاہیے، کوئی ایسا بااثر آدمی ہو جو ان لوگوں پر دباؤ ڈال سکے۔ پھر ممکن ہے عدالت کچہری کی ضرورت بھی نہ پڑے اور معاملہ بھی حل ہو جائے۔ اس کا ذہن قصبے کی گلیوں میں گھوم رہا تھا کہ اچانک بڑی حویلی کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ اس وقت چودھری ارشاد ہی میرے کام آسکتے ہیں۔ ان کے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں۔ وہ صغرا کی سسرال والوں پر دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ مجھ پر مہربان بھی بہت ہیں۔ میری بات ٹالیں گے نہیں۔ اس خیال کے آتے ہی اسے خود پر افسوس ہونے لگا تھا۔ دو دن بے کار ضائع کر دیے۔ چودھری صاحب کا خیال اسے پہلے کیوں نہیں آگیا۔ یہ تو وہی بات ہوئی، بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا۔ اس وقت تو رات بہت ہو گئی۔ صبح ہوتے ہی میں چودھری صاحب کی طرف جاؤں گا۔ اگر صغرا جانے پر تیار ہوئی تو اسے بھی لیتا جاؤں گا۔ شاید وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہیں۔ جس کا معاملہ ہے اسے ساتھ ہونا چاہیے۔

☆☆☆

بڑی حویلی کا اونچا دروازہ نیچے لوگوں کے لیے بند تھا۔ نیچے لوگ قصبے کے عام لوگ تھے۔ کبھی کبھی وہ غیر ملکی سیاح جو پہاڑوں کی سیر کو آتے تھے اور قصبے میں اتر آتے تھے اس ہاتھی قد دروازے میں داخل ہوتے تھے۔ یہاں بیٹھے چودھری ارشاد ان کا شمار اونچے لوگوں میں کرتے تھے اور ان کی میزبانی میں آنکھیں بچھاتے تھے یا پھر وہ طوائفیں تھیں جو خوش کرنے کے لیے حویلی میں آتی تھیں اور خوش ہو کر واپس جاتی تھیں۔ قصبے کے نوجوان جنہوں نے حویلی کے پھاٹک کو صرف باہر سے دیکھا تھا ان طوائفوں اور غیر ملکیوں کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔

اس شوق تماشا کی وجہ یہ تھی کہ اس حویلی کے بارے میں طرح طرح کی داستانیں مشہور تھیں۔ اندر تو کوئی جا نہیں سکتا تھا، بعض کہانیاں دیواریں پھلانگ کر باہر آجاتی تھیں جنہیں لوگ ایک دوسرے کو سنایا کرتے تھے۔ ان کہانیوں کے مطابق حویلی کے اندر مجرے ہوتے تھے، طوائفیں ڈیرے ڈالے رہتی تھیں۔ چودھری ارشاد ان پریوں کی دلجوئی میں ہفتوں زنان خانے کا رخ نہیں کرتے تھے جہاں ان کی ایک چھوڑ تین تین بیویاں قید میں پڑی تھیں۔ بزرگوں کے مطابق حویلی کی کسی عورت نے جیتے جی دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ خود چودھری ارشاد بھی عید، بقرعید ہی باہر نکلتے تھے اور وہ بھی جامع مسجد تک۔

چودھری ارشاد بڑی شان سے کہا کرتے تھے کہ خدا نے دو قومیں بنائی ہیں۔ ایک انسان دوسری جاگیردار۔ گویا وہ جاگیرداروں کو عام انسانوں سے الگ مخلوق تصور کرتے تھے۔ اسی لیے عام انسان ان کی ملازمت میں رہ سکتے تھے، ان کی برابری نہیں کر سکتے تھے۔

کہنے والے یہ بھی کہتے تھے کہ چودھری ارشاد کے بزرگ بھی کبھی انسان تھے۔ انہوں نے ایک انگریز عورت کی جان بچائی تھی۔ اس کے صلے میں انہیں جاگیریں عطا ہوئیں اور وہ انسان سے جاگیردار بن گئے۔ اس کے جواب میں چودھری ارشاد کا فرمانا یہ تھا کہ ان کے بزرگوں نے انگریزوں سے جنگ کی تھی۔ انگریز جب عاجز آگئے تو جاگیریں دے کر صلح کر لی۔

چودھری صاحب کے حوالے سے اخلاقی جرائم کی لمبی فہرست تھی جو زبانوں کی دکانوں پر آویزاں تھی لیکن ان پر طویل بحثوں کے بعد نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ بڑے لوگوں کے بڑے شوق۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ان کہانیوں پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ انہی لوگوں میں ماسٹر فیض محمد کا بھی شمار کیا جاتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا، چودھری صاحب کو مجرے کا شوق ضرور ہے۔ طوائفیں ہوتی بھی اسی لیے ہیں کہ اگر جیب میں پیسے ہوں تو ان کا مجرا دیکھا جائے لیکن چودھری صاحب کسی شریف عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

یہ باتیں اور بھی چند لوگ کرتے تھے لیکن فیض محمد کے دعوے میں اس لیے اثر تھا کہ وہ حویلی کی سیر اندر سے کر چکا تھا۔ ایک مرتبہ چودھری نے اسے اپنی بیوہ بیٹی کے بچوں کو پڑھانے کے لیے حویلی میں طلب کیا تھا۔ فیض محمد ٹیوشن پڑھانے جانے لگا تھا۔ لوگ اس سے حویلی کی باتیں پوچھتے تھے اور وہ چودھری کی شرافت کی قسمیں کھاتا تھا۔ ظاہر ہے فیض محمد ہر وقت تو چودھری صاحب کے ساتھ نہیں بیٹھا رہتا تھا۔ ٹیوشن پڑھا کر واپس آجاتا تھا لیکن کہانیاں اس طرح بیان کرتا تھا جیسے چودھری سے برابر کا یارانہ ہو اور حویلی کے شب و روز کا چشم دید ہو۔ پھر چودھری کی بہن شہر چلی گئیں۔ ٹیوشن چھوٹ گئی۔ حویلی میں جانا بھی چھوٹ گیا لیکن حویلی کی باتیں نہیں چھوٹیں۔ کبھی رعب ڈالنے کو کہہ دیا کرتا تھا کہ کل چودھری صاحب نے بلایا تھا۔ میں حویلی کے اندر گیا تو میں نے دیکھا......

"ماسٹر جی، تم تو اندر کی خبر لاتے ہو، یہ بتاؤ نور جہاں کا کیا قصہ تھا؟"

"کیسا قصہ؟"

"یہی کہ اس کے کہنے کے مطابق چودھری نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور بعد میں اس کی لاش ملی تھی۔ لوگ تو اس وقت یہی کہہ رہے تھے کہ چودھری نے اسے مروا دیا۔"

"لوگوں کا کیا ہے، لوگ تو جانے کیا کیا کہتے رہتے

ہیں۔ اس کا قصہ یہ تھا کہ وہ چودھری صاحب کو بدنام کر کے ان سے رقم اینٹھنا چاہتی تھی۔"

"قتل کیوں ہوگئی؟"

"ہوسکتا ہے چودھری ہی نے اسے قتل کرایا ہو۔ اپنی عزت بچانے کے لیے آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اس کی جسارت تو دیکھو، چودھری صاحب جیسے شریف آدمی پر تہمت لگا رہی تھی۔ تہمت لگانے والے کی سزا یہی ہونی چاہیے تھی۔"

"سوال یہ ہے کہ حویلی کے دروازے سب پر بند ہیں، نور جہاں کیسے چلی گئی تھی؟"

"وہ گئی ہی نہیں تھی۔ لوگوں سے جھوٹ بولتی پھرتی تھی ورنہ آپ لوگ خود سوچیں کوئی شریف عورت اپنی عزت لٹنے کی داستان سناتی پھرتی ہے؟"

اس قسم کی باتیں روز ہوتی تھیں اور فیض محمد، چودھری ارشاد کے دفاع کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔

☆☆☆

فیض محمد نے جب صغرا سے حویلی چلنے کے لیے کہا تو وہ ان کا منہ تکنے لگی۔ وہ بچپن سے یہی سنتی چلی آئی تھی کہ بڑی حویلی میں کوئی چھوٹا آدمی قدم بھی نہیں رکھ سکتا اور اس کا باپ اسے حویلی میں چلنے کو کہہ رہا تھا۔

"ابا، تم ہوش میں تو ہو۔ کوئی ہمیں حویلی میں گھسنے دے گا۔ ہم کوئی جاگیردار ہیں جو وہاں جائیں گے۔"

"صغرا، تو ماسٹر فیض محمد کی بیٹی ہے۔ میں جاگیردار نہیں لیکن اسکول ماسٹر ضرور ہوں۔"

"چودھری صاحب تمہیں جانتے ہیں؟"

"جاننا کیسا۔ کچھ دن پہلے تک وہ میرے ساتھ بیٹھ کر شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ وہ تو میں نے خود ہی جانا چھوڑ دیا۔ میرے پاس اتنا وقت کہاں کہ شطرنج کھیلتا پھروں۔ وہ بڑے آدمی ہیں۔ ان کے پاس بہت وقت ہے۔ وہ وقت گزارتے ہیں، میں وقت کماتا ہوں۔ بڑا فرق ہے دونوں میں۔ اب بھی بلاتے رہتے ہیں۔ ٹیوشن پڑھاؤں یا ان کے پاس جا کر بیٹھ جاؤں۔ بہت دن سے نہیں گیا۔"

"ان سے آپ کی دوستی کیسے ہوگئی۔"

"وہ پڑھے لکھے لوگوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ تو جب اپنی سسرال میں تھی انہوں نے مجھے اپنی بیٹی کے بچوں کو پڑھانے کے لیے بلایا تھا۔ یہ سلسلہ تو زیادہ دن نہیں چل سکا۔ ان کی بہن شہر والی حویلی میں منتقل ہوگئی لیکن چودھری صاحب سے میری دوستی پکی ہوگئی جو اب تک چلی آرہی ہے۔"

"آپ نے اتنے دن بے کار ضائع کر دیے۔ جب میں سسرال سے آئی تھی اسی دن ان کے پاس چلنا تھا۔"

"مجھے شرم آرہی تھی کہ اپنا کام ان سے کہوں لیکن اب ضروری ہوگیا ہے۔ تو بس جلدی سے تیار ہوجا۔"

صغرا بچپن سے یہی سنتی چلی آرہی تھی کہ حویلی میں کوئی عام آدمی نہیں جاسکتا۔ اب جو وہاں جانے کی نوید اسے ملی تھی تو اس پر سخت گھبراہٹ طاری ہو رہی تھی۔ وہ چودھری کی عیاشیوں کی داستانیں بھی سن چکی تھی۔ اس نے باپ کے سامنے کچھ نہیں کہا تھا لیکن سوچ ضرور رہی تھی کہ چودھری نہ جانے اس کے ساتھ کس طرح پیش آئے۔ فیض محمد، چودھری کی تعریفیں کرتا رہتا تھا اس لیے وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ ممکن ہے ان کہانیوں میں کوئی صداقت نہ ہو۔ یہ شوق بھی ہو رہا تھا کہ وہ حویلی کو اندر سے دیکھے، بہر حال وہ جلدی جلدی تیار ہوئی اور کمرے سے نکل آئی۔ نوراں کو گود میں اٹھایا اور فیض محمد کے ساتھ حویلی کی طرف چل پڑی۔

فیض محمد اس حویلی میں کچھ دنوں تک آتا جاتا رہا تھا۔ دروازے پر بیٹھے ہوئے چودھری کے ملازم اسے جانتے تھے اس لیے کسی نے نہیں روکا۔ وہ اس حویلی کے سب راستوں اور ادب آداب سے واقف تھا۔ وہ سیدھا اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں بیٹھ کر چودھری کے بلاوے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ایک ملازم نے چودھری تک یہ اطلاع پہنچا دی کہ ماسٹر فیض محمد آیا ہے۔ چودھری کی محفلیں تو رات میں جمتی تھیں، اس وقت تو وہ اکیلا بھی تھا اور فارغ بھی۔ اس نے فیض محمد کو اسی وقت بلوا لیا۔ فیض محمد نے صغرا کو وہیں چھوڑا اور خود چودھری کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ چودھری اس وقت ایک جہازی سائز کے پلنگ پر کئی گاؤ تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا۔

"آؤ ماسٹر آؤ۔ کیا ضرورت لے آئی۔ کیسے آنا ہوا؟"

"چودھری صاحب، بات ذرا تفصیل کی ہے۔ آپ کہیں تو بیٹھ جاؤں؟"

"اب آگئے ہو تو بیٹھ بھی جاؤ۔" چودھری نے کروٹ اس کی طرف بدلتے ہوئے کہا۔ "کہو کیا کہنے آئے ہو؟"

"حضور ایک کام ایسا آن پڑا ہے کہ آپ ہی کرسکتے ہیں۔"

"خوشامد چھوڑو۔ صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے؟"

"میری بیٹی بیوہ ہو کر گھر آگئی ہے۔"

"پھر میں کیا کروں۔ اس کے شوہر کو زندہ کردوں؟"

"نہیں مائی باپ۔ بات یہ ہے کہ اس کی سسرال والے اسے اس کا حصہ نہیں دے رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں آپ ان پر دباؤ ڈالیں تاکہ وہ اسے اس کا حصہ دے دیں۔"

"بندۂ خدا، میرے پاس کیوں آئے ہو، عدالت میں جاؤ۔"

"میں کہاں عدالتوں کے چکر کاٹتا پھروں گا... میرا خیال ہے کہ آپ بیچ میں پڑ جائیں گے تو ان لوگوں کو یہ احساس ہوگا کہ صغرا کا بھی کوئی ہے۔"

"یہ صغرا کون ہے؟"

"میری بیٹی ہے جناب۔ کہیں تو بلا لوں۔ یہیں بیٹھی ہے آپ کے مہمان خانے میں۔ وہ خود آپ کو پوری بات بتا دے گی۔"

"بلا لو۔ میں اس سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔ اس سے مل لوں تو پھر سوچوں گا کام مشکل ہے یا آسان۔"

فیض محمد نے صغرا کو بلا لیا۔ چودھری نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی عمر بہ مشکل بیس سال ہوگی۔ اسے خوبصورت بھی کہا جاسکتا تھا۔ چودھری نے اسے دیکھا تو اس کے منہ میں زبان ہی دوسری آگئی۔

"فیض محمد، تم میرے بچوں کے استاد ہو اس لیے تمہاری عزت مجھ پر فرض ہے۔ تمہارا کام نہیں کروں گا تو کس کا کروں گا۔ یہاں تو جو آتا ہے اس کی خدمت مجھ پر فرض ہوجاتی ہے۔"

"بڑی مہربانی چودھری صاحب۔ یہ بے چاری بڑی دکھی ہے۔ اس کی ماں پہلے ہی دنیا سے چلی گئی اب شوہر بھی نہیں رہا۔ یہ بچی بھی اس کی جان کو لگی ہوئی ہے۔"

چودھری نے اپنے ملازم کو آواز دی اور اس سے کہا، بچی کو تھوڑی دیر کے لیے یہاں سے لے جائے اور اس کا عذر یہ پیش کیا کہ بچی ہمیں بات نہیں کرنے دے گی۔

"بچوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا کس وقت رونا شروع کر دیں اور میرا دل ایسا ہے کہ بچوں کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔"

ملازم بچی کو لے کر چلا گیا تو چودھری نے کہا۔ "کوشش کیا کرو کہ بچی تمہارے ساتھ نہ آئے یا اگر لاؤ تو میرے کسی ملازم کو دے دیا کرو، وہ بہلاتا رہے گا۔"

"جی چودھری صاحب، آئندہ ایسا ہی ہوگا۔ اس مرتبہ بھول ہوگئی۔"

"کوئی بات نہیں۔" پھر وہ صغرا سے مخاطب ہوا۔ "تم مجھے پوری بات بتاؤ۔"

صغرا نے اٹک اٹک کر اپنی پوری کہانی سنا دی۔ چودھری سے یہ التجا بھی کی کہ وہ جس طرح بھی ہو اس کا حق اسے دلا دے۔ وہ اپنے باپ کی محتاج ہو کر رہنا نہیں چاہتی۔

چودھری نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔ "دیکھو صغرا، یہ مسئلہ ایک دو دن میں تو حل ہوگا نہیں۔ تمہیں میرے پاس بار بار آنا پڑے گا۔ ماسٹر صاحب کے پاس اتنا وقت ہے نہیں کہ ہر وقت تمہارے ساتھ آسکیں۔ اکیلی آجاؤ گی میرے پاس؟"

اس سے پہلے کہ صغرا کچھ بولتی، فیض محمد سراپا اقرار بن گیا۔ "اس کا کام ہے، ہزار مرتبہ آنا پڑا تو آئے گی۔ جب آپ کو ضرورت ہو، اسے بلا لیا کریں۔"

"میں بس یہی اجازت تم سے لینا چاہتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی وقت تم گھر پر نہ ہو اور صغرا کی ضرورت پڑ جائے۔ یہ وقت پر نہ پہنچے اور وقت نکل جائے۔ عدالت کچہری کے معاملے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"آپ جب بلائیں گے یہ چلی آئے گی۔" فیض محمد نے کہا اور صغرا کو بھی سرزنش کی۔ "میں گھر پر نہ بھی ہوں اور چودھری صاحب بلائیں تو فوراً آ پہنچنا۔"

وہ بے چاری کیا کہتی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ چودھری صاحب کی آواز گونجی۔ "اب جاؤ، جب ضرورت ہوگی بلا لوں گا۔"

وہ اٹھنے لگی تو چودھری صاحب نے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "تم حویلی میں پہلی مرتبہ آئی ہو اور فیض محمد کی بیٹی ہو۔ یہ رکھ لو، کچھ خرید لینا۔"

وہ دونوں حویلی سے باہر آئے تو دونوں مطمئن تھے۔ خاص طور پر صغرا کی تو ہر فکر دور ہوگئی تھی۔ وہ چودھری ارشاد کے رویے سے ایسی خوش ہوئی تھی کہ ان کی تعریف کے سوا اس کی زبان پر کوئی اور بات ہی نہیں تھی۔ ان کے بارے میں جو بھی الٹی سیدھی باتیں اس نے سن رکھی تھیں وہ سب جھوٹی نظر آنے لگی تھیں۔ فیض محمد بھی سرخرو ہوگیا تھا۔ صغرا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ چودھری کی نظروں میں فیض محمد کی کتنی وقعت ہے۔

☆☆☆

"دیدار احمد!" چودھری نے اپنے ملازم کو مخاطب کیا جو اس کے پاؤں داب رہا تھا۔

"جی چودھری صاحب۔"

"فیض محمد کی بیٹی کب ہمارے پاس آئی تھی؟"

"پرسوں سرکار۔ کل کا دن بیچ میں گزرا ہے۔"

"فیض محمد اس وقت کہاں ہوگا؟"

"قاعدے سے تو اسے اسکول میں ہونا چاہیے۔"

"اسکول کے بعد وہ اپنے گھر ہی جائے گا؟"

"جی سرکار۔ اپنی بیٹی کی وجہ سے آج کل وہ ادھر ادھر نہیں بیٹھتا۔ سیدھا گھر جاتا ہے۔"

"آج اسے کسی طرح شام سے پہلے گھر نہ پہنچنے دو۔"
"ایسا ہی ہوگا سرکار۔ میں اسے کسی کام میں الجھا کر قصبے سے باہر لے جاتا ہوں۔"
"لیکن ذرا ہوشیاری سے۔ فیض محمد پڑھا لکھا ہے، پڑھے لکھوں سے میں بہت چوکنا رہتا ہوں۔"
"اچھا ہوا آپ نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ فیض محمد ان دنوں پیسوں کی طرف سے بہت پریشان ہے۔ میں اسے ایک بھاری ٹیوشن دلانے کے بہانے قصبے سے باہر لے جاؤں گا۔"
"بے وقوف انسان، مجھے یہ سب کیوں بتا رہا ہے۔ دفع ہو جا یہاں سے۔ جو کرنا ہے کر۔"
دیدار احمد نے جوتے پاؤں میں ڈالے اور نکل بھاگا۔
چودھری کے لیے یہ معاملات نئے نہیں تھے۔ اسے معلوم تھا کون سا مہرا کس وقت چلنا ہے۔ اس کا شاطر ذہن مسلسل حرکت میں تھا۔ صغرا جس روز سے اس کے پاس سے ہو کر گئی تھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس کھیل کو کس وقت اور کس طرح انجام دینا ہے۔ دیدار احمد کے جاتے ہی اس نے اپنے ایک اور ملازم کو آواز دی تھی۔
"اسی وقت ماسٹر فیض محمد کے گھر جاؤ۔ ماسٹر سے کہنا، چودھری صاحب یاد کر رہے ہیں۔ اگر وہ گھر پر نہ ہو تو اس کی بیٹی سے کہنا فوراً مجھ سے آ کر ملے۔ اس کی سسرال کے لوگ آئے بیٹھے ہیں۔"
یہ تو معلوم پہلے ہی ہو چکا تھا کہ فیض محمد گھر پر موجود نہ ہو۔ چودھری کا ملازم پہنچا تو صغرا ہی دروازے پر آئی۔ چودھری کا پیغام سن کر پریشان ہو گئی۔ اس نے وہی کہا جو اسے کہنا چاہیے تھا۔ "ابا تو گھر پر نہیں ہیں۔" پھر اسے معلوم ہوا کہ چودھری صاحب نے اسے بلایا ہے تو سوچ میں پڑ گئی۔ پھر یہ سوچ کر تیار بھی ہو گئی کہ اس کے نہ جانے سے کہیں کام بگڑ ہی نہ جائے۔ اس نے چودھری کے نوکر سے کہہ دیا کہ وہ بس کچھ ہی دیر میں حویلی پہنچ جائے گی۔
اس نے جان بوجھ کر کچھ دیر بھی لگائی تھی کہ شاید فیض محمد اسکول سے واپس آ جائے لیکن جب وہ نہیں پہنچا تو وہ خود ہی حویلی پہنچ گئی۔ اس نے نوراں کو ایک ملازم کے حوالے کیا اور خود چودھری کے پاس چلی گئی۔ آج چودھری کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ وہ اس کے دیر سے آنے پر سخت برہم تھا۔
"تمہارا باپ میرے پاس آیا تھا تو یہ کام میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ بیٹھا تمہارا انتظار کرتا رہوں۔"
"وہ ابا نہیں آئے تھے اس لیے دیر ہو گئی۔"
"جاؤ تو پھر ابا کا انتظار کرتی رہو۔ جب وہ آ جائیں تو انہیں لے کر آ جانا۔"
"چودھری صاحب معاف کر دیں۔ آئندہ دیر نہیں کروں گی۔"
"میرے نوکر فالتو نہیں ہیں جو تمہیں روز بلانے جائیں گے۔ تمہارا کام ہے تم روز حویلی آؤ گی۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ فیض محمد کے ساتھ آئی ہو یا اکیلی۔"
"میں روز صبح حویلی پہنچ جایا کروں گی۔ اس مرتبہ معاف کر دیں۔"
"دیکھو برا مت ماننا۔ تمہارا کام ہے، جب تم ہی دلچسپی نہیں لو گی تو میرے سیکڑوں بکھیڑے ہیں۔ مجھے کب یاد رہے گا۔"
"میں روز خود ہی آ جایا کروں گی۔ آپ کسی کو نہ بھیجا کریں۔"
"ٹھیک ہے۔" چودھری نے کہا۔ "میں نے یہ بتانے کو تمہیں بلایا تھا کہ تمہاری سسرال والوں سے میری بات ہوئی تھی۔ وہ لوگ تو بہت نخرے کر رہے ہیں۔ انہوں نے گاؤں کے مکھیا کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔"
"میں نے ابا سے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ لوگ اتنی آسانی سے میرا حصہ مجھے نہیں دیں گے۔ اسی لیے تو وہ مجھے آپ کے پاس لے کر آئے تھے۔"
"مایوس کیوں ہوتی ہو۔ بس تم جو میں کہتا جاؤں کرتی جاؤ۔ حصہ تو تمہیں ایسا دلاؤں گا کہ تم یاد کرو گی۔"
چودھری اس سے باتیں کرتا جا رہا تھا لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ بار بار اپنا سر بھی تھام لیتا تھا۔ صغرا سے آخر رہا نہیں گیا۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔
"چودھری صاحب کیا سر میں درد ہو رہا ہے؟"
"تمہاری سسرال والے آئے تھے۔ ان سے اتنی مغز ماری کرنی پڑی کہ سر میں درد ہو گیا۔ آج وہ نوکرانی بھی نہیں آئی جو میرے سر میں تیل ڈالتی ہے۔"
"آپ کہیں تو میں سر میں تیل ڈال دوں؟"
"ارے نہیں۔ تم کوئی نوکرانی ہو۔"
"اس میں نوکرانی کی کیا بات ہے۔ کبھی ابا کے سر میں درد ہوتا ہے تو میں ہی تیل ڈالتی ہوں۔"
دیوار پہ بنے ایک طاق میں تیل کی شیشی رکھی تھی۔ صغرا نے وہ شیشی اتار لی اور اس کرسی کے پیچھے آ گئی جہاں چودھری

بیٹھا ہوا تھا۔ بوتل کا کاگ کھولا اور چودھری کے سر میں تیل ٹپکا دیا۔
"صغرا تیرے ہاتھوں میں تو جادو ہے۔" چودھری کہہ رہا تھا۔
صغرا دل ہی دل میں ہنس رہی تھی۔ یہ سارے مرد ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ جب میں ابا کے سر میں تیل ڈالتی ہوں تو وہ بھی ہمیشہ یہی کہتا ہے۔
وہ اس وقت اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھی۔ لوگ چودھری کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ترستے ہیں۔ حویلی میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ میں حویلی میں بھی ہوں اور چودھری کو قریب سے دیکھ بھی رہی ہوں۔ چودھری صاحب خوش ہو کر میرا کام جلد سے جلد کریں گے۔
چودھری نے اپنے سر پر رینگتے ہوئے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "بس کر صغرا۔ تھک گئی ہو گی۔"
صغرا نے اپنے چکنے ہاتھ چودھری کے کھردرے ہاتھوں کے نیچے سے نکالے اور دوپٹے کے پلو سے پونچھتے ہوئے کرسی کے پیچھے سے ہٹ گئی۔ چودھری نے پھر اس کے حصے کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ اس کے حصے سے کچھ زیادہ ہی اسے دلائے گا۔ باتیں اتنی دلچسپ تھیں کہ صغرا کو ہوش ہی نہیں رہا اور شام ہو گئی۔ اب چودھری کو بھی رات کی محفلوں کی تیاری کرنی تھی۔ اس نے صغرا کو اس شرط پر اجازت دے دی کہ وہ بلاناغہ حویلی میں آیا کرے گی۔ اس کی ضرورت کسی وقت بھی پڑ سکتی ہے۔
وہ گھر پہنچی تو فیض محمد آیا بیٹھا تھا۔ اس نے وہ تمام باتیں اس کے سامنے دہرا دیں جو چودھری نے اس سے کی تھیں البتہ یہ چھپا لیا کہ وہ چودھری کے سر میں تیل ڈال کر آ رہی ہے۔ اس نے سوچا کہیں ابا برا نہ مان جائے۔
وہ بلاناغہ حویلی جانے لگی تھی۔ حویلی کے چھوٹے موٹے کام بھی اس کے سپرد کیے جانے لگے تھے۔ وہ یہ سوچ کر یہ کام کیے جا رہی تھی کہ بڑے لوگ ہیں، ان کا کام کرنے میں کوئی حرج نہیں اور پھر چودھری صاحب خوش ہو جائیں گے تو اس کا کام بھی جلدی کرا دیں گے۔ وہ اپنے کام کے متعلق روز پوچھ رہی تھی۔ تسلی کے دو بول روز مل جاتے تھے۔
نوکروں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ وہ جب حویلی میں داخل ہوتی اور بے تکلفانہ چودھری کے کمرے کی طرف بڑھتی تو نوکروں کی معنی خیز مسکراہٹ اس کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ کوئی ہوشیار لڑکی ہوتی تو مسکراہٹوں کے اس تیور کو پہچان لیتی لیکن وہ سیدھی بھی تھی اور اس کے دل میں چور بھی نہیں تھا۔ اسے شک بھی نہیں ہوا کہ ان مسکراہٹوں میں کتنے سوال چھپے ہوئے ہیں۔ چودھری کی طرف سے بھی کوئی ایسی حرکت نہیں ہوئی تھی کہ وہ خطرے کو قریب دیکھتی۔
نوکروں کے درمیان ہونے والی باتوں کو چودھری کا سر چڑھا ملازم دیدار احمد بھی سن رہا تھا۔ اگر یہ باتیں حویلی سے باہر گئیں تو خوامخواہ بدنامی ہو گی۔ معاملہ فیض محمد کا تھا جس کی قصبے میں بہت عزت تھی۔ وہ چودھری کو روک بھی نہیں سکتا تھا لیکن اسے یہ ضرور معلوم تھا کہ چودھری جب تک پیٹ بھر کے کھا نہیں لیتا، دسترخوان سے نہیں اٹھتا لہٰذا چودھری کو یہ مشورہ دینا لازمی تھا کہ وہ جلد سے جلد آخری نوالہ توڑ لے۔ اس دن موقع بھی تھا کیونکہ صغرا ہی کے معاملے پر چھوٹی بیگم سے چودھری کی چق چق ہوئی تھی۔ چودھری نے حکم دیا تھا کہ اس جرم میں چھوٹی بیگم ایک مہینے تک اس کے سامنے نہیں آئے گی۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھ کیا ہو گا یہ ایک مہینے بعد معلوم ہو گا۔
"حضور، فیض محمد کی بیٹی کو کب نوازیں گے۔ بے چاری آتے آتے تھک گئی ہو گی۔"
"مچھلی کو کب چارا ڈالنا ہے یہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے۔ اگر وقت سے پہلے کانٹے میں اٹک گئی تو مچلے گی بہت، ہاتھ سے پھسلی تو لہروں میں گم ہو جائے گی۔ بس ذرا اس کی جائداد کا قصہ نمٹ جائے۔ اپنی جاگیر میں اضافہ کر لوں پھر ایک ٹکڑا اسے بھی ڈال دوں گا۔"
"میں سمجھا نہیں سرکار۔ آپ کی جاگیر کا اس کی جائداد سے کیا تعلق؟"
"اگر اتنی بات سمجھ لیتے تو دیدار احمد تمہیں چودھری دیدار احمد ہوتے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔"
"حضور، میں تو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کھانے کی خوشبو نوکروں تک جانے لگی ہے۔"
"کھانے تو اس حویلی میں پکتے ہی رہتے ہیں۔ کب تک لوگوں کے نتھنے بند کرتے رہو گے۔" چودھری نے بے پروائی سے کہا لیکن پھر کچھ خیال بھی آ گیا۔ اس نے دیدار احمد سے کہا۔ "کل تم صغرا کی سسرال جاؤ اور اس کے دیوروں میں سے کسی کو میرے پاس لے کر آؤ۔"
"اگر انہوں نے آنے سے انکار کیا؟"
"گاؤں کے مکھیا کے پاس جانا اور میرا پیغام دینا۔ وہ خود انہیں میرے پاس لے کر آئے گا۔"

☆☆☆

فیض محمد کے گھر میں رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ فیض محمد ابھی تک جاگ رہا تھا۔ جو باتیں وہ سن کر آیا تھا وہ

اس کی نیند اڑانے کے لیے کافی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ صغرا سے ان کا ذکر کرے یا نہیں۔ اس نے تکیے سے سر اٹھا کر صغرا کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ فیض محمد نے دوبارہ تکیے پر سر رکھ دیا۔ نیند اب بھی اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ اسے چلتی ہوئی زبانوں پر غصہ آرہا تھا۔ قصبے کے لوگ اسی طرح ہوا میں گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ یہ سب چودھری صاحب کی دولت سے جلتے ہیں۔ انہیں بدنام کرنے کے لیے ایسی باتیں پھیلاتے ہیں۔

اس کے خیالات کا تانا بانا نوراں کی آواز نے بکھیر دیا تھا۔ اس نے سوتے سوتے نہ جانے کیوں رونا شروع کر دیا تھا۔ صغرا اس کی آواز سن کر اٹھ گئی تھی۔ فیض محمد نے بھی یہی ظاہر کیا کہ وہ نوراں کے رونے سے اٹھا ہے۔ صغرا اٹھی اور نوراں کے لیے دودھ گرم کر کے لے آئی۔ فیض محمد کو موقع مل گیا تھا کہ وہ اس سے بات کرے۔

”صغرا۔“

”جی ابا۔“

”آج تو حویلی میں گئی تھی؟“

”میں تو روز ہی جاتی ہوں۔ چودھری صاحب کا یہی حکم ہے۔“

”اب مت جانا۔“

”کیوں، ابا؟“

”مجھے تیرے حصے سے زیادہ اپنی عزت پیاری ہے۔ قصبے میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ابھی تو صرف آپس میں باتیں کر رہے ہیں کل کلاں کو مجھ سے براہ راست سوال کریں گے۔“

”ابا لوگوں کا کیا ہے۔ وہ تو اسی طرح باتیں بناتے ہیں۔“

”نہیں بیٹا، بزرگ کہتے ہیں دین سے دنیا بھاری ہوتی ہے۔ لوگوں کا خیال تو کرنا ہی پڑتا ہے۔“

”مگر چودھری صاحب تو بہت اچھے آدمی ہیں۔“

”اب میں کس کس کو سمجھاتا پھروں گا۔“

”ابا، میں وہاں نہیں گئی تو میرے حصے کا کیا ہوگا۔ چودھری صاحب بے چارے اتنی محنت کر رہے ہیں اور میں انہیں منع کر دوں۔“

”میں ان سے کہہ دوں گا کہ تجھے نہ بلایا کریں۔ میں اسکول سے چھٹی لے کر ان کے ساتھ عدالتوں کے چکر کاٹ لوں گا۔“

”ٹھیک ہے ابا۔ میں کل جا کر خود ان سے بات کیے لیتی ہوں۔ بس مجھے کل اور جانے دے۔“

”ٹھیک ہے لیکن غصے میں کوئی ایسی ویسی بات مت کر آنا۔“

صغرا کروٹ بدل کر سو گئی۔ فیض محمد کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا پھر اسے بھی نیند آگئی۔

دوسرے دن فیض محمد اسکول چلا گیا۔ صغرا نے چادر اوڑھی اور بجھے دل سے حویلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ رات کی باتیں ابھی تک اس کے دماغ میں گردش کر رہی تھیں۔ اسے یوں لگا جیسے راستے سے گزرنے والا ہر آدمی اس کی طرف دیکھ کر ہنس رہا ہے۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ آج چودھری صاحب سے صاف بات کرے گی۔ وہ نوکروں کی طرح اس سے حویلی کا کام لے رہے ہیں اور ابھی تک اسے عدالت بھی لے کر نہیں گئے حصہ دلانا تو بڑی بات۔ ابا ٹھیک کہتا ہے، بدنامی کے بعد حصہ ملا بھی تو کیا فائدہ۔

انہی خیالوں میں سرگرداں وہ حویلی تک پہنچ گئی۔ اسے یاد آیا، راستے میں کچھ اوباشوں نے اس پر فقرے بھی اچھالے تھے۔ یہ باتیں اسے غصہ دلانے کے لیے بہت تھیں۔ اسی غصے میں وہ چودھری صاحب کے سامنے پہنچ گئی۔

چودھری بھی ایک کائیاں تھا۔ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ اس کے تیور کیسے ہیں۔ آگ کے لیے پانی اور غصے کے لیے تسلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے صغرا کے بیٹھتے ہی اس کا دل ہاتھوں میں لے لیا۔ ”بھئی، تمہارا کام تو سمجھو ہو گیا۔ تمہاری سسرال والوں سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ تمہارا حصہ دینے پر تیار تو ہو گئے ہیں لیکن......“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”لیکن کیا، چودھری صاحب؟“ صغرا سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”لیکن یہ کہ وہ سمجھ رہے ہیں، یہ حصہ تمہیں نہیں تمہارے باپ کو چاہیے۔ تمہیں جو کچھ ملے گا وہ اس پر قبضہ کر لے گا۔“

”کیسے قبضہ کر لے گا۔ مجھے جو کچھ ملے گا وہ میرے نام ہوگا۔“

”میں نے بھی ان لوگوں سے یہی کہا تھا مگر وہ کہتے ہیں صغرا اس کے قبضے میں ہے۔ وہ جب چاہے گا جائداد اپنے نام منتقل کرا لے گا۔“

”میری چیز ہے۔ میں جس کو چاہوں دوں، انہیں اس سے کیا؟“

”یہ تو تم کہہ رہی ہو نا۔ جسے کوئی چیز نہیں دینی ہوتی وہ دس بہانے تراشتا ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم ان کی ہر چال

ناکام بنادیں۔"

"انہیں آپ یقین دلائیں کہ جائداد میرے نام رہے گی۔ چاہیں تو لکھ کرلے لیں۔"

"ایک ترکیب اور ہے اگر تم مجھ پر اعتماد کرو۔"

"آپ پر اعتماد نہ ہوتا تو میں روز آتی کیوں؟"

"تمہیں جو بھی حصہ ملے اس کا مختار تم مجھے بنادو۔ یہ صرف تمہاری سسرال والوں کو مطمئن کرنے کے لیے ہوگا۔ جیسے ہی معاملہ ٹھنڈا ہو یہ مختار نامہ منسوخ کر دینا۔"

"مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ مختار نامہ ہوتا کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ تمہیں عدالت کے سامنے جا کر ایک کاغذ پر دستخط کرنے ہوں گے جس میں لکھا ہوگا، جائداد کی مالک تم ہو لیکن میری مرضی کے بغیر کسی کو دے نہیں سکتیں۔"

چودھری نے آدھی بات اسے بتائی آدھی نہیں بتائی۔ اس کے باوجود بھی صغرا سوچ میں پڑ گئی۔ وہ میٹرک پاس ضرور تھی لیکن ان قانونی پیچیدگیوں سے واقف نہیں تھی البتہ یہ ضرور سوچ رہی تھی کہ اس طرح تو چودھری کا نام ہمیشہ میرے کاغذات میں رہے گا۔ اگر کبھی مجھے کچھ بیچنا پڑا تو مجھے چودھری صاحب کی اجازت لینی ہوگی۔

"پریشان مت ہو۔ یہ سب تمہاری سسرال والوں کو مطمئن کرنے کے لیے کر رہا ہوں۔ میرے پاس جو زمینیں ہیں وہ ہی نہیں سنبھالی جارہی ہیں، میں تمہاری زمین لے کر کیا کروں گا۔ تمہیں صرف اتنا کہنا ہوگا کہ تم مجھے مختار بنارہی ہو۔ میں اس مختار نامے کو کچھ دن بعد خود ہی منسوخ کر دوں گا۔"

صغرا اب بھی کچھ سمجھی کچھ نہیں سمجھی لیکن دل ہی دل میں چودھری کی شکر گزار ضرور ہو رہی تھی جو اس کے لیے اتنی کوشش کر رہے تھے۔ اس کا غصہ ختم ہو گیا تھا۔

"میں آپ کی بات سمجھ تو گئی ہوں لیکن ابا سے پوچھ لوں پھر کوئی جواب دوں گی۔"

"فیض محمد سے پوچھنا بھی مت۔ یہ کام ہمیں چپکے چپکے کرنا ہے۔ اگر انہوں نے منع کر دیا تو تمہارا حق تمہیں نہیں مل سکتا۔ مجھے مختار بنائے بغیر تمہاری سسرال والے تمہیں کچھ نہیں دیں گے۔"

"اگر یہ بات غلط نہیں ہے تو ابا کیوں منع کریں گے؟"

"فرض کرو انہوں نے منع کر دیا پھر؟ انہیں ابھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے بس یہ کہنا کہ سسرال والے حصہ دینے پر راضی ہو گئے ہیں۔ جس دن عدالت جانا ہوگا وہ بھی ساتھ ہوں گے۔ وہ خود دیکھ لیں گے تمہارا حصہ تمہیں مل گیا۔"

صغرا یہ سوچ کر حویلی آئی تھی کہ بس وہ آج آخری دن آئی ہے۔ چودھری سے صاف بات کرلے گی اور پھر وہ کبھی حویلی نہیں آئے گی لیکن چودھری نے اسے ایسی امید دلائی کہ اس کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا بلکہ اب اسے ابا پر غصہ آرہا تھا کہ اس نے کیوں حویلی نہ آنے کو کہا تھا۔ چودھری صاحب تو اس کی خاطر اتنی زحمت اٹھا رہے ہیں اور ابا ان کی طرف سے بدگمان ہو رہے ہیں۔

دوپہر کے قریب وہ گھر آئی تو فیض محمد گھر پہنچ چکا تھا۔ صغرا نے گھر میں گھستے ہی اسے خوش خبری سنادی کہ بس دو چار دن میں فیصلہ ہونے والا ہے۔ مختار نامے کا ذکر وہ گول کر گئی۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ جب تک فیصلہ نہیں ہو جاتا وہ حویلی جانا نہیں چھوڑے گی۔ اس وقت چودھری صاحب کو خوش رکھنا ضروری ہے۔ اگر انہوں نے ہاتھ اٹھالیا تو بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔ فیض محمد بھی اب مطمئن ہو گیا تھا۔ صغرا کی باتوں میں اتنا یقین پوشیدہ تھا کہ اسے یقین کرنا ہی پڑا۔ اس نے بھی صغرا کی طرح یہی سوچا کہ دو چار دن کی بات اور ہے۔ لوگ باتیں بناتے ہیں تو بنایا کریں۔ صغرا بھی جائے گی، میں بھی جاؤں گا۔ جنہیں حویلی میں گھسنے کی اجازت نہیں وہ اسی طرح جلتے رہیں۔ وہ اسی وقت تیار ہوا اور صغرا کو کچھ بتائے بغیر حویلی کی طرف چل دیا۔ اسے چودھری صاحب کا شکریہ ادا کرنا تھا جنہوں نے بھاگ دوڑ کر کے معاملے کو یہاں تک پہنچا دیا۔

چودھری اس وقت تک سونے کے لیے لیٹ چکا تھا لیکن وہ فیض محمد کو واپس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جاننا چاہتا تھا کہ خلاف معمول وہ کیسے آگیا۔ ایک شک نے اس کے ذہن میں سر ابھارا تھا۔ وہ اس شک کو دور کرنا چاہتا تھا۔ اسے شک ہوا تھا کہ شاید صغرا نے مختار نامے کا ذکر کر دیا ہے۔ فیض محمد اسی کے بارے میں بات کرنے کے لیے آیا ہے۔

چودھری اس سے ملا تو ساری غلط فہمی دور ہو گئی۔ فیض محمد تو اس کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا کہ وہ اس کے بیٹی کو اس کا حق دلانے کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کر رہا ہے اور اب اس کا حق اسے ملنے ہی والا ہے۔ چودھری نے اس سے بھی یہی کہا کہ دو چار دن میں عدالت جانا ہوگا۔ وہ خود دیکھ لے گا کہ اس کی بیٹی کو اس کا حق مل گیا۔ فیض محمد نے ایک مرتبہ پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس گھر چلا آیا۔

چودھری ارشاد کو اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے مشکلات پیش آرہی تھیں۔ صغرا کے سسرال والے حصہ دینے کے لیے تیار نہیں ہو رہے تھے۔ گاؤں کا کھیا بھی کہہ کہہ کر تھک چکا تھا۔ بہت تنگ آکر چودھری کو وہی حربہ استعمال کرنا

پڑا جو اس سے پہلے بھی ایک زمین پر قبضہ کرنے کے لیے وہ اختیار کر چکا تھا۔

اس نے دیدار احمد کو بلوایا۔

"یہ کمرا بند کر دو۔"

"جی سرکار۔" وہ اٹھا اور دروازہ بند کر دیا۔

"میرے پاس آکر بیٹھو۔" اس نے تعمیل کی۔ "یہ بتاؤ صغرا کی سسرال میں کتنے آدمی ہیں؟"

"چار آدمی ہیں کل۔ ایک صغرا کی ساس۔ دو دیور اور ایک نند۔"

"ان میں سے ایک تو وہ تھا جو تمہارے کہنے کے مطابق کھیا کے پاس آیا تھا۔"

"جی ہاں۔ ایک اور ہے۔"

"جو کھیا کے پاس نہیں آیا تھا اس کا کیا نام ہے۔"

"محمد ایاز۔"

"اسے کسی بہانے سے میرے پاس لاسکتے ہو؟"

"سرکار، بہت مشکل ہے۔"

"میں یہ سننے کو تیار نہیں کہ کوئی کام مشکل ہے۔ اس سے جا کر کہو، تھوڑے سے پیسے صغرا کو دے دو، میں اس سے یہ لکھوا کر دے دوں گا کہ وہ اپنا حصہ چھوڑ رہی ہے۔ تھوڑے سے پیسے دے کر بہت سی زمین اپنے نام کرالے۔ اس بات کو راز میں رکھے اور کسی کو کچھ نہ بتائے۔"

"وہ پھر بھی تیار نہ ہوا تو بندے ساتھ لے جاؤں۔ اٹھا کر لے آؤں؟"

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔"

"اگر دونوں بھائی ساتھ آئے تو کیا کروں؟"

"آتے ہیں تو آنے دو۔ کوشش یہی کرنا کہ ایک بھائی آئے۔ اس سے کہنا تمہارا بھائی اس سودے پر تیار ہے مگر چودھری صاحب یہ زمین تمہیں دینا چاہتے ہیں۔"

دیدار احمد نے ایک آدمی اپنے ساتھ لیا اور مشن پر روانہ ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب چودھری کیا کرنے والا ہے۔ اب اسے اسی انداز سے بات آگے بڑھانی تھی۔

صغرا کے دو دیور تھے۔ بڑے کا نام فیاض احمد تھا اور چھوٹے کا ایاز احمد۔ جس وقت دیدار احمد گاؤں پہنچا، فیاض احمد شہر گیا ہوا تھا۔ ایاز احمد کھیتوں سے گھر کی طرف پلٹ رہا تھا کہ دیدار احمد سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ دیدار احمد نے چودھری کی بتائی ہوئی اسکیم اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ ضرورت سے زیادہ لالچی ثابت ہوا۔ پیشکش سنتے ہی اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ صغرا کے شوہر کی ساری زمین اس کے نام ہو رہی تھی۔ یہ سن کر اسے اور بھی غصہ آیا کہ بڑا بھائی اس سودے پر پہلے ہی تیار ہو چکا ہے۔ ساری زمین وہ ہتھیا لے یہ اسے کیسے گوارا ہو سکتا تھا۔ صغرا کے شوہر کی زمین اور مکان کے کاغذات اسی کے پاس رہتے تھے۔ اس لیے اسے کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی تھی۔ صغرا کی رضامندی سے یہ سب اس کے نام منتقل ہو سکتا تھا۔ بس اب یہ طے کرنا تھا کہ صغرا اس کے عوض کتنی رقم کا مطالبہ کرتی ہے اور یہ چودھری سے مل کر ہی طے ہو سکتا تھا۔ وہ دیدار احمد کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

دیدار احمد کو معلوم تھا کہ ایاز کو کہاں لے جانا ہے لیکن پھر بھی چودھری سے معلوم کرنا ضروری تھا۔ چودھری نے اسے غضب ناک نظروں سے دیکھا۔ "بچپن سے جوانی آگئی تجھے میرے پاس کام کرتے ہوئے۔ تجھے آج تک بھی معلوم نہ ہو سکا کہ ایسے لوگوں کو میں کہاں مہمان رکھتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے سرکار۔ پھر بھی آپ سے پوچھ لیا۔"

"لے جا کر ڈال دو سالے کو اور ایس ایچ او کو فون کر کے کہو مجھ سے آکر ملے۔"

چودھری نے حویلی کے ایک حصے میں تہ خانہ بنایا ہوا تھا۔ یہ اس کی نجی جیل تھی۔ اس کی طرف سے دی گئی سزا کے مجرم اسی تہ خانے میں مہمان رکھے جاتے تھے۔ صغرا کے دیور کو اسی تہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔

ایس ایچ او حویلی پہنچ گیا تھا اور اس وقت چودھری کے سامنے بیٹھا تھا۔ "کہیے چودھری صاحب، کیسے یاد فرمایا؟"

"یہ بتانے کو بلایا ہے کہ میرے مہمان خانے میں ایک مہمان آکر ٹھہرا ہے۔"

"واہ چودھری صاحب، واہ! آپ کی مہمان نوازی کے تو ہم قائل ہو گئے۔ ابھی ایک ہفتہ گزرا نہیں کہ ایک مہمان اور آگیا۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"میں نے تمہیں بتا دیا ہے تاکہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو سنبھال لو۔"

"ذرا احتیاط سے کام لیجیے چودھری صاحب۔ نیا ایس پی آیا ہے۔ یہ قصبہ یوں بھی افسران بالا کی نظروں میں آگیا ہے۔"

"پچھلے دنوں شہر گیا تھا تو کمشنر صاحب سے بھی ملا تھا۔ تمہاری ترقی کی بات کر کے آیا ہوں۔"

"حضور، میں تو خود کو آپ کا زرخرید کہتا ہوں۔"

"شام کو میرا آدمی آئے گا۔ لفافہ تمہیں پہنچ جائے گا۔"

"اگر مہمان کی تواضع کے لیے میری ضرورت پڑے تو تکلف مت کیجیے گا۔ مجھے بلا لیجیے گا۔"

"فرید پور کا کھیا، مہمان کو ڈھونڈتا ہوا آئے گا

ضرور۔"

"آپ تو ایک مہینے کے لیے شکار پر گئے ہوئے ہیں۔ کھیا آپ سے ملے گا بھی تو ایک مہینے بعد ملے گا۔"

"کتنے جھوٹے مرے تھے جو تم پیدا ہوئے ہو۔"

"حضور آپ کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ کوئی جادوگر بھی آگیا تو آپ کے مہمان کا کھوج نہیں لگا سکے گا۔"

"لفافہ پہنچ جائے گا۔ اب تم جاؤ۔"

ایس ایچ او نے سیلوٹ مارنے کے انداز میں سلام کیا اور رخصت ہوگیا۔

صغرا کی سسرال فرید پور کا تھانہ وہی لگتا تھا جس کا ایس ایچ او ابھی ابھی چودھری کے پاس سے اٹھ کر گیا تھا۔ چودھری کے تجربے نے اسے بتادیا تھا کہ جب ایاز گھر نہیں پہنچے گا تو اس کا بھائی اغوا یا گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے تھانے ضرور جائے گا۔ اسی لیے اس نے پیش بندی کے طور پر ایس ایچ او کو اشارہ دے دیا تھا تاکہ وہ رپورٹ درج ہی نہ کرے۔ آنے والے کو جانے کا راستہ دکھادے۔

پولیس کس کی دوست ہوئی ہے جو چودھری کی ہوتی۔ فیاض احمد جب بھائی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا تو وہ تھانے پہنچ گیا۔ اس کی سرگزشت سن کر ایس ایچ او کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ چودھری کے مہمان خانے میں جو مہمان ہے وہ اسی فیاض کا بھائی ہے۔ فیاض احمد بار بار ماسٹر فیض محمد کا نام لے رہا تھا اور اسی کے خلاف رپورٹ درج کرانا چاہتا تھا لیکن ایس ایچ او کو معلوم تھا کہ ماسٹر کے خلاف کارروائی کرنے سے اسے کچھ نہیں ملے گا۔ وہ چودھری سے رقم وصول کرچکا تھا، اب دوسری پارٹی کی باری تھی۔

"تمہیں فیض محمد پر کیوں شک ہے؟" ایس ایچ او نے پوچھا۔

"وہ میرے مرحوم بھائی کا سسر ہے۔ اس کی بیٹی صغرا میری بھابی ہے۔"

"اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔ ماسٹر سے تو تمہاری رشتہ داری ہے۔ وہ تمہارے بھائی کو کیوں اغوا کرائے گا؟"

"ہم اپنی بھابی کو اس کا حصہ دے رہے تھے لیکن وہ زیادہ طلب کررہی تھی۔ بس یہی جھگڑا تھا۔ اس کے باپ نے ہم پر دباؤ ڈالنے کے لیے میرے بھائی کو اغوا کرایا ہے۔ آپ ماسٹر کو تھانے بلوائیں۔ وہ فوراً اگل دے گا۔"

"تم جو اپنی بیوہ بھاوج کا حصہ دبائے بیٹھے ہو اس میں سے کتنا میرے سامنے اگلو گے؟"

"میں سمجھا نہیں تھانے دار صاحب۔"

"کوئی خرچہ پانی دو تو ابھی بتادوں تمہارا بھائی کہاں ہے۔ باقی معاملات تم خود طے کرلینا۔"

"میرے پاس اس وقت آٹھ ہزار روپے ہیں۔ وہ میں دے سکتا ہوں۔"

"دیکھ لو۔ اگر تلاشی کے بعد اور نکل آئے؟"

"تین ہزار روپے اور ہیں۔" اس نے بنیان کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ "یہ بھی رکھ لو۔ اب نہیں ہیں۔"

"ہیں تو کم لیکن چلو ٹھیک ہیں۔ میں تمہارے بھائی کے بارے میں بتاتا ہوں۔ تمہارا بھائی چودھری ارشاد کے پاس ہے۔"

"چودھری ارشاد کے پاس؟ مگر اس کے پاس کیوں ہے۔ اس کا ہم نے کیا بگاڑا ہے؟"

"یہ سب مجھے نہیں معلوم۔ ہوسکتا ہے وہ ماسٹر فیض محمد کی حمایت کررہا ہو۔"

"حمایت تو وہ کررہا ہے۔" فیاض احمد نے کہا۔ "اس کا آدمی کھیا کے پاس آیا تھا اور ہم پر زور ڈالا تھا کہ ہم صغرا کو اس کا حصہ دے دیں۔"

"اب بات تمہاری سمجھ میں آجانا چاہیے۔ وہ تمہارے بھائی کو اپنے پاس رکھ کر تمہیں مجبور کرنا چاہتا ہے کہ صغرا کا حصہ اسے دے دو۔"

"آپ چودھری کے خلاف پرچہ کاٹیں۔ میں اسے عدالت میں گھسیٹوں گا۔"

"مجھے ابھی بہت دن نوکری کرنی ہے۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہیں پالا جاتا۔ میں چودھری کے خلاف پرچہ نہیں کاٹ سکتا اور تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ عدالت کا خیال دل سے نکال دو۔ اپنے بھائی کی زندگی چاہتے ہو تو چودھری سے جاکر بات کرو۔"

چودھری کا نام سن کر فیاض ڈر گیا تھا۔ ایس ایچ او کو بھی کانپتے ہوئے دیکھا تو اسی میں بہتری نظر آئی کہ صغرا کو اس کا حصہ دینے کے لیے چودھری سے بات کرلی جائے۔ وہ چودھری سے بات کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ وہ جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ ایس ایچ او نے اسے پھر بٹھالیا۔

"تم چودھری سے ہرگز یہ نہیں کہو گے کہ تم میرے پاس سے ہوتے ہوئے آئے ہو۔ تمہیں یہ کہنا ہے کہ تمہیں شک ہے۔ یاد رکھو اگر میرا نام درمیان میں آیا تو تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تمہاری نسلیں یاد کریں گی۔"

"میں آپ کا نام نہیں لوں گا۔" فیاض احمد نے ہاتھ

جوڑتے ہوئے کہا۔

فیاض احمد یہاں کئی مرتبہ آچکا تھا۔ چودھری کی حویلی سے بھی واقف تھا اور چودھری کے مزاج سے بھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ صغرا کی حمایت میں اتنا آگے چلا گیا ہے تو اس کا حصہ دینا پڑے گا۔

وہ حویلی کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ کچھ دیر تک اپنی بے ترتیب سانسوں کو درست کرتا رہا پھر دروازے پر بیٹھے ہوئے دربان کے پاس پہنچ گیا۔

"مجھے دیدار احمد سے ملنا ہے۔"

"تم کون ہو؟"

"میں اس کا رشتہ دار ہوں۔ کہنا فرید پور سے فیاض احمد آیا ہے۔"

کھیا کے گھر وہ دیدار احمد سے مل چکا تھا۔ اسے یہ نام یاد رہ گیا تھا۔ اس کے ذریعے چودھری سے ملا جاسکتا تھا لہٰذا اس نے جلدی میں وہی نام لے دیا۔ کچھ دیر وہ حویلی کے سامنے ٹہلتا رہا۔ پھر دیدار احمد آگیا۔ اسے بھی فیاض کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ یہاں بات کرنی مناسب نہیں تھی۔ وہ اسے حویلی کے اندر لے گیا۔

"مجھے چودھری سے ملنا ہے۔"

"چودھری سے تمہیں کیا کام پڑگیا؟"

"میرا بھائی ایاز حویلی میں ہے۔ اسی کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

"تمہارا بھائی اور یہاں؟ عقل کی بات کرو فیاض احمد۔"

"میں یونہی نہیں آگیا ہوں۔ پوری معلومات لے کر آیا ہوں۔ اس کے تاوان میں تم لوگ کیا لینا چاہتے ہو؟"

"پتا نہیں تم کون سے بھائی کی بات کررہے ہو۔ میں چودھری صاحب سے تمہیں ملوائے دیتا ہوں۔ تم خود ہی بات کرلینا۔"

چودھری سو کر اٹھ گیا تھا لیکن اسے معلوم تھا فیاض جیسے لوگوں کے اعصاب توڑنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ فیاض کو بیٹھے بیٹھے شام ہوگئی تب کہیں جاکر اسے چودھری صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ چودھری بڑی دیر تک اس کے ساتھ لفظوں کا کھیل کھیلتا رہا۔ پھر ایک دم اس کے تیور بدل گئے۔

"تم ایک بیوہ عورت کا حق دبائے بیٹھے ہو اور تمہیں یہ جرأت ہوگئی کہ میرے پاس چلے آئے۔ میری حویلی گدھوں گھوڑوں کے لیے نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے منہ اٹھا کر چلا آئے۔ اب اپنے کھیا کے پاس جاؤ اور اس سے کہو اس میں دم ہے تو تمہارے بھائی کو آکر لے جائے۔"

"چودھری صاحب میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"

"یہ معافی مجھ سے نہیں اس بیوہ عورت سے جاکر مانگو جس کا نام صغرا ہے۔"

"چودھری صاحب، مجھے اس بے عزتی سے بچالو۔ آپ بڑے آدمی ہیں۔ میں آپ سے معافی مانگ سکتا ہوں مگر صغرا سے نہیں۔"

"اس کا حق دبا سکتے ہو اور اس سے معافی نہیں مانگ سکتے۔"

"میں اس کا حق اسے دینے کو تیار ہوں۔ میرے بھائی کو چھوڑ دیجیے۔ اماں کا رو رو کر برا حال ہوگیا ہے۔"

"تمہارا بھائی اس وقت تک میرے پاس رہے گا جب تک تم مجسٹریٹ کے سامنے کاغذات کی منتقلی پر دستخط نہیں کردیتے۔"

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، باقاعدہ عدالت جاکر جو صغرا کا حصہ بنتا ہے، اس کے نام کردوں گا۔"

"واپسی میں اپنے بھائی کو ساتھ لیتے جانا۔"

اس نے بہت ضد کی لیکن چودھری اتنا سیدھا نہیں تھا کہ ایاز کو اس کے ساتھ جانے دیتا۔ طے یہ ہوا کہ دو دن بعد وہ ضلع مجسٹریٹ کے پاس پہنچ جائے۔ صغرا بھی وہاں آجائے گی۔ تمام کارروائی اس کے سامنے ہونی چاہیے۔

فیاض احمد کے جاتے ہی چودھری نے دیدار احمد کو بلایا۔ چودھری کا چہرہ اس وقت اتنا سپاٹ تھا کہ دیدار احمد کو ایاز کی موت صاف نظر آنے لگی۔ اسے اس حویلی میں برسوں ہوگئے تھے۔ چودھری کے چہرے کا یہ رنگ اس وقت ہوتا تھا جب کسی کو راستے سے ہٹانا ہوتا تھا۔ وہ یہی سمجھا کہ فیاض سے معاملہ طے نہیں ہوسکا۔ اب اس سے کہا جائے گا، ایاز تہ خانے سے زندہ واپس نہ جائے لیکن چودھری کچھ اور کہہ رہا تھا۔ اس نے یہ حکم اس طرح سنا جیسے کوئی نیند میں کسی کی بات سنتا ہے۔

"ابھی اسی وقت کمشنر کو فون لگاؤ۔"

"اس وقت تو دفتر بند ہوچکا ہوگا۔"

"گدھے۔ اس کے گھر ملاؤ۔"

دیدار احمد اٹھ کر اس کمرے میں چلا گیا جہاں فون رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ آگیا۔ کمشنر لائن پر تھا۔ چودھری نہایت اطمینان سے اٹھا۔ سر پر پگڑی رکھی۔ کچھ دیر آئینے میں اپنا جائزہ لیتا رہا جیسے کمشنر سے ملنے جارہا ہو۔ اسے یہ جلدی تھی ہی نہیں کہ کمشنر ہولڈ کیے ہوئے ہوگا، نہایت اطمینان سے چلتا ہوا دوسرے کمرے میں پہنچ گیا اور فون اٹھا کر کان سے

لگا لیا۔ دیدار احمد ہاتھ باندھے پیچھے کھڑا تھا۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ کس کی شامت آئی ہے۔

''تھانہ فرید پور کا ایس ایچ او مجھ سے چرب زبانی کا مرتکب ہوا ہے۔ میں کل سے اسے تھانے میں نہ دیکھوں..... جی ہاں فوری معطلی...... میں کل تک انتظار نہیں کر سکتا۔ معطلی کے احکامات گھر پر بھی پہنچائے جا سکتے ہیں۔ جی ہاں حشمت اللہ کھوکھر...... ایک بہت پیاری سی چیز آئی ہوئی ہے۔ بہت جلد آپ کی خدمت میں پیش کروں گا...... جی نہیں یہ نذرانہ ہے رشوت نہیں۔ میرے اور آپ کے درمیان رشوت کا کوئی تعلق نہیں۔''

وہ بات ختم کر چکا تو دیدار احمد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''حضور، کھوکھر تو ہمارے اعتماد کا آدمی تھا۔''

''اس نے ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اس کی مخبری کے بغیر فیاض کو معلوم ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ ایاز میرے پاس ہے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ فیاض پہلے تھانے نہ گیا ہو۔ کھوکھر کو معلوم تو ہو چودھری کی حکم عدولی کی کم سے کم سزا کیا ہو سکتی ہے۔''

دیدار احمد اس کے بعد کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

صغرا اس دن حسب معمول حویلی آئی ہوئی تھی کہ اچانک عدالت جانا پڑ گیا۔

''ابھی اسی وقت عدالت چلنا ہے۔ تمہیں تمہاری جائداد مل رہی ہے۔ میرے ساتھ عدالت چلو تمہیں مختار نامے پر دستخط بھی کرنے ہوں گے۔''

''ابا تو اسکول گئے ہوئے ہیں۔''

''ان کی وہاں کیا ضرورت ہے۔ کام تو تمہارا ہے۔''

''وہ بھی ہوتے تو اچھا تھا۔'' صغرا نے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ عدالت کل چلیں۔ میں ابا سے کہہ دوں گی، وہ اسکول سے چھٹی کر لیں گے۔''

''عدالت میری ماتحت نہیں ہے۔ آج بلایا ہے تو آج ہی جانا ہوگا۔ بات ٹل گئی تو پھر ٹل گئی۔ بڑی مشکل سے تمہارے دیور کو بلوایا ہے۔ آگے تمہاری مرضی۔ میرا تو کوئی فائدہ ہے نہیں۔ تمہارے ہی فائدے کی بات ہے۔''

''آپ جو کہہ رہے ہیں ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔ چلتی ہوں۔''

اس نے نوراں کو حویلی میں چھوڑا اور حویلی سے لگی کار میں بیٹھ گئی۔ ایک مرتبہ پھر اس کا سر فخر سے تن گیا۔ اسے نہ صرف اس کا حصہ مل رہا تھا بلکہ وہ اس وقت چودھری کی گاڑی میں بیٹھی تھی۔ لوگ جس حویلی میں جانے کو ترستے تھے وہ اس کے مالک کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھی تھی۔ اس کے دل سے چودھری کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔ لوگ خواہ مخواہ ان کے خلاف باتیں بناتے ہیں۔ یہ تو فرشتہ ہیں فرشتہ۔ مجھے ملنے والی زمین اور مکان سے انہیں کیا لینا دینا لیکن وہ خود میرا حق مجھے دلانے میرے ساتھ جا رہے ہیں۔ ابا ٹھیک کہتا تھا، چودھری صاحب فرشتہ ہیں۔ پھر اسے اپنے دیوروں کا خیال آیا۔ کیسے مرد بنے ہوئے تھے۔ اب بھیگی بلی بنے میرے سامنے آئیں گے۔ مکان اور زمین ملنے دو۔ دونوں کو بیچ کر پیسے بینک میں رکھوا دوں گی۔ نوراں کے کام آئیں گے۔ اسے اچھی تعلیم دلاؤں گی۔ بہت بڑے گھر میں اس کی شادی کروں گی۔ وہ انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ گاڑی ایک عمارت میں جا کر رک گئی۔ اس کے خواب تو اس وقت ٹوٹے جب ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور اسے اترنے کو کہا۔ وہ یوں اتری جیسے نہ اتری تو چودھری صاحب اسے چھوڑ کر بھیڑ میں گم ہو جائیں گے حالانکہ وہ خود کھڑے اس کے اترنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ چودھری صاحب کی انگلی تھام کر چلنے لگتی۔ چودھری صاحب نے بے پروا باپ کی طرح آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اندازہ ہو گیا کہ کوئی ان کے برابر آ کر کھڑا ہوا ہے اور قدموں کو زمین پر چلا دیا۔ یہاں اتنی بھیڑ تھی کہ صغرا کو حیرت ہو رہی تھی۔ کتنی بری ہے یہ دنیا۔ لوگ دوسروں کا حق دیتے کیوں نہیں ہیں جو سب کو یہاں آنا پڑا ہے۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ سب لوگ اپنا اپنا حصہ لینے آئے ہوئے ہیں۔

وہ چودھری صاحب کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی کہ کہیں وہ اس کی آنکھ کی گرفت سے نکل نہ جائیں۔ چودھری صاحب نے ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر پیچھے مڑ کر دیکھا کہ صغرا ان کے ساتھ ہے یا نہیں۔ پھر چق اٹھا کر اندر چلے گئے۔ صغرا نے بھی یہی کیا۔ کمرے میں ایک آدمی جس کے آدھے بال سفید آدھے کالے تھے۔ آنکھوں پر موٹی عینک لگی ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جیسے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوں۔ صغرا کو ہنسی آ گئی۔ یہ مجسٹریٹ ہے؟ اس سے اچھے تو چودھری صاحب دکھائی دے رہے ہیں۔

چودھری صاحب اس آدمی کے پاس گئے۔ ''اپنے صاحب کو بتاؤ چودھری ارشاد آیا ہے۔''

''بتانے کی ضرورت نہیں۔ صاحب آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔ دیکھیے ان سب کو روکا ہوا ہے کہ پہلے آپ کا کام ہو جائے۔''

انہوں نے صغرا کو وہیں بیٹھنے کے لیے کہا اور خود ایک

کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ مجسٹریٹ کا کمرا تھا۔ مجسٹریٹ انہیں داخل ہوتے دیکھ کر خود دروازے پر آیا اور بڑی عزت سے اپنے سامنے بٹھا دیا۔

''مجسٹریٹ صاحب، کاغذات وغیرہ تیار کرا لیے تھے۔ سب تیار ہیں۔ دوسری پارٹی کہاں ہے؟''

''فیاض احمد پہنچنے ہی والا ہوگا۔ میں جلدی اس لیے پہنچ گیا کہ شاید آپ کاغذات تیار کرانا بھول گئے ہوں۔''

''اور وہ خاتون جنہیں ''سیل ڈیڈ'' پر دستخط کرنے ہیں؟''

''وہ باہر بیٹھی ہے۔ رقم اسے دے چکا ہوں۔ آپ جب کہیں گے وہ آ کر دستخط کر دے گی۔''

صغرا دوسرے کمرے میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی کہ کب چودھری صاحب بلائیں اور وہ اندر جائے۔ اتنی دیر میں فیاض احمد اندر داخل ہوا۔ صغرا نے منہ دوسری طرف پھیر لیا کہ کہیں اس کی نظر نہ پڑ جائے۔ فیاض احمد میز کے قریب آیا اور وہاں بیٹھے ہوئے آدمی سے اندر جانے کی اجازت مانگی۔ چودھری صاحب کے نام سے اسے بھی اجازت مل گئی۔ وہ جب اندر جانے لگا تو اس کی نظر صغرا پر پڑ گئی۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔

''صغرا، میں چودھری صاحب کی وجہ سے تجھے تیرا حصہ دے رہا ہوں مگر یاد رکھ نہ تجھے وہ مکان بیچنے دوں گا نہ تجھے وہاں رہنے دوں گا۔ دیکھتا ہوں چودھری میرا کیا بگاڑ لے گا۔''

وہ کیا جواب دیتی۔ بس اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد صغرا کو بھی مجسٹریٹ کے پاس بلا لیا گیا۔ منتقلی کے کاغذات تیار ہو گئے تھے۔ نئے کاغذوں پر فیاض احمد اور صغرا نے دستخط کر دیے۔ فیاض احمد کے باہر جاتے ہی مجسٹریٹ نے دوسرا کاغذ صغرا کے سامنے رکھ دیا۔ صغرا نے اس پر بھی دستخط کر دیے۔ ایک جانب چودھری کے دستخط ہو گئے۔ چودھری یہ کہہ کر صغرا کو لایا تھا کہ تمہیں مختار نامے پر بھی دستخط کرنے ہوں گے۔ وہ یہی سمجھی کہ یہ مختار نامہ ہے جبکہ وہ سیل ڈیڈ تھی یعنی حصہ ملتے ہی صغرا نے جائداد چودھری کے ہاتھ فروخت کر دی۔

وہ باہر نکلی تو بہت خوش تھی۔ چودھری ابھی اس سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن صغرا تو کسی بچی کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ اسے کمی محسوس ہو رہی تھی تو فیض محمد کی۔ وہ اس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی۔

''اگر اس وقت ابا ہوتے تو کتنے خوش ہوتے۔ خیر اب تو میں گھر جا ہی رہی ہوں۔ گھر پہنچتے ہی انہیں بتاؤں گی کہ چودھری صاحب کی مہربانی سے میرا حصہ مجھے مل گیا۔''

''ابھی حصہ ملا کہاں ہے جو بتاؤ گی۔''

''میرا دیور تو کہہ رہا تھا، میرا حصہ مجھے مل گیا۔''

''وہ جھوٹا آدمی ہے اس کی باتوں میں آنا بھی نہیں۔ ابھی حصہ ملا نہیں ہے مگر مل جائے گا۔ کچھ دن ابھی اور لگیں گے۔''

''میں نے دستخط تو کر دیے ہیں۔ مجسٹریٹ صاحب مجھے مبارک باد بھی دے رہے تھے۔''

''وہ تو تم نے مختار نامے پر دستخط کیے ہیں۔ یہ دستخط کیے ہیں کہ تم مجھے یہ اختیار دے رہی ہو کہ میں تمہاری جائداد کے حصول کے لیے کوشش کر سکتا ہوں۔''

صغرا کی خوشی شعلہ بن کر ابھری تھی، چنگاری بن کر بجھ گئی۔ اتنی دیر میں وہ دونوں گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ ڈرائیور نے اگلا دروازہ کھولا لیکن وہ پچھلی سیٹ پر صغرا کے برابر بیٹھ گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ چودھری صاحب کے اتنے قریب بیٹھی تھی۔ حیران بھی ہو رہی تھی کہ چودھری صاحب اس سے لگ کر کیوں بیٹھے ہیں؟ گاڑی چل پڑی تھی، وہ گاڑی سے کود بھی نہیں سکتی تھی۔

''تم کہہ رہی ہوگی میں تمہارے ساتھ کیوں بیٹھا ہوں۔''

''آپ ابا کی عمر کے ہیں۔ بیٹھ گئے تو کیا ہوا۔''

''سوچ سمجھ کر بات کیا کر صغرا۔'' چودھری کے تیور بدل گئے۔ ''چودھری ارشاد کی برابری ماسٹر فیض محمد سے کر رہی ہے۔''

''میں نے تو چودھری صاحب یونہی کہہ دیا۔ بھلا آپ کا ابا سے کیا مقابلہ۔ کہاں زمین کہاں آسمان۔''

''میں تیرے قریب اس لیے بیٹھا ہوں کہ تجھے کچھ باتیں سمجھا سکوں۔ ابھی اپنے ابا کو کچھ مت بتانا۔ وقت آنے پر میں خود ہی بتا دوں گا۔''

''ابا پوچھے تو کیا کہوں؟''

''ان سے کہہ دینا کہ عدالت کے کام ہیں۔ ابھی وقت لگے گا۔ مختار نامے کا ذکر بھی مت کرنا بلکہ یہ بتانا ہی مت کہ تو نے کسی کاغذ پر دستخط کیے تھے۔ اگر اس نے مجھ سے کچھ آ کر پوچھا تو میں کام سے ہاتھ اٹھا لوں گا۔ پھر مل چکا تجھے تیرا حق۔''

''ٹھیک ہے چودھری صاحب۔ جو آپ نے کہا ہے وہی کہوں گی۔''

وہ گھر پہنچی ہی تھی کہ فیض محمد نے اس سے پوچھ لیا۔ ''تو عدالت گئی تھی۔ کیا ہوا وہاں؟'' اسے کہیں سے معلوم ہو گیا تھا کہ صغرا چودھری کے ساتھ عدالت گئی ہے۔ اسی لیے وہ پوچھ رہا تھا۔ وہ شاید اسے یہ بھی نہ بتاتی کہ وہ عدالت گئی تھی لیکن

WWW.PAKSOCIETY.COM

جب اس نے خود ہی پوچھ لیا تو اسے بتانا پڑا لیکن اس نے وہی بتایا جو چودھری نے اسے سکھایا تھا۔

”ہاں عدالت کے کاموں میں دیر تو لگتی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ بات عدالت تک پہنچی تو سہی۔ چودھری کے تعلقات بڑے ہیں، وہ جس طرح دلچسپی لے رہا ہے اس سے تو یہی لگتا ہے کہ کام جلدی ہو جائے گا۔“

صغرا اس کی باتوں پر ہوں ہاں کر کے چپ ہو گئی تو فیض محمد کو کچھ شک ہوا۔ اس نے صغرا سے پوچھا۔ ”تو چودھری صاحب کی طرف سے مطمئن تو ہے؟“

”ابا مجھے قانونی پیچیدگیوں کا کیا پتا۔ تم ہی نے یہ کام ان کے حوالے کیا ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ کر ہی رہے ہوں گے۔“

”ارے وہ بڑے غریب پرور ہیں اور پھر میری بہت عزت کرتے ہیں پھر بھی میں کسی دن جا کر پوچھ لوں گا کہ کام کہاں تک پہنچا۔“

”ابا تم وہاں نہ جانا۔“

”کیوں بھئی، ایک طرح سے میری دوستی ہے اس سے۔“

”ابا۔ وہ کہہ رہے تھے میں تمہیں اس بیچ میں نہ ڈالوں۔ میں جو کروں گا اپنے بل بوتے پر کروں گا۔ کسی اور کو شریک نہیں کروں گا۔“

”میں شریک کہاں ہو رہا ہوں۔ میں تو بس پوچھوں گا۔“

”نہیں ابا، تم کچھ نہ پوچھنا۔ چودھری صاحب ناراض ہو گئے تو میرا حق مجھے مل چکا۔“

”چل نہیں پوچھتا۔ مجھے تو کام سے مطلب ہے۔ تجھے تیرا حق مل جائے اور بس۔ میں نے بہت کچھ سوچ رکھا ہے تیرے اور نوراں کے لیے۔“

وہ نوراں کو سلانے کے بعد خود بھی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرنے لگی تو دن بھر کی تمام باتیں اس کے اردگرد آ کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ سوچ رہی تھی جب مجھے کچھ ملا ہی نہیں تو میں نے دستخط کیوں کیے۔ کہیں میرا دیور اور چودھری آپس میں مل تو نہیں گئے؟ پھر اسے خیال آیا، اس کا دیور کہہ رہا تھا، تیرا حق میں تجھے چودھری کی وجہ سے دے رہا ہوں۔ وہ یہ بات کیوں کہہ رہا تھا۔ جھوٹ کہہ رہا ہوگا۔ چودھری صاحب کیوں جھوٹ بولیں گے۔ اس میں ان کا کیا فائدہ ہے۔ سوچ سوچ کر اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ گھر میں گھپ اندھیرا ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ لیا۔ حلق میں کانٹے سے نکل آئے تھے۔ اسے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ وہ اسی اندھیرے میں چارپائی سے اتر گئی۔ اندھیرے کی دیوار کو ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے وہ مٹکے تک پہنچی۔ کٹورا بھر کے پانی ایک ہی سانس میں پی گئی۔ پانی پی کر پلٹ رہی تھی کہ کسی چیز سے ٹکرا گئی۔ فیض محمد کی آنکھ کھل گئی۔

”کون ہے؟“ فیض محمد نے للکارا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ابا میں ہوں۔ پانی پینے اٹھی تھی۔“

”تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔“ فیض محمد پھر لیٹ گیا۔

صغرا اندھیرے کو ٹٹولتے ہوئے بستر تک آ گئی۔ بستر پر سر رکھ دیا لیکن نیند اس کے بستر سے دور کھڑی ہنس رہی تھی۔ میٹرک پاس، سیدھی سادی لڑکی اس وقت فلسفیوں کی طرح سوچ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی چودھری نے یہ کیوں کہا کہ اگر ابا نے کچھ پوچھا تو میں کام سے ہاتھ اٹھا لوں گا۔ چودھری کے دل میں چور تو نہیں۔ پھر اس نے دل ہی دل میں توبہ کی، چودھری کے دل میں کیا چوری ہو گی۔ شاید ابا کچھ بتا سکے۔

”ابا۔ سو رہے ہو کہ جاگ رہے ہو؟“

”بڑھاپے کی نیند ہے۔ ایک مرتبہ اچٹ جائے تو پھر کہاں آتی ہے۔ جاگ رہا ہوں۔ پر تجھے کیوں نیند نہیں آ رہی ہے؟“

”ابا میں ایک بات سوچ رہی ہوں۔“

”کیا سوچ رہی ہے بچی؟“

”چودھری یہ کیوں چاہتا ہے کہ وہ تمہیں اس معاملے سے دور رکھے۔ اس نے یہ کیوں کہا کہ اگر فیض محمد نے مجھ سے آ کر کچھ پوچھا تو میں تیرے کام سے ہاتھ اٹھا لوں گا۔“

”تو بے کار سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہے۔ تجھے ان بڑے لوگوں کا تجربہ نہیں ہے۔ ان لوگوں میں ایک قسم کا غرور خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں بس ان کی تعریف ہو۔ کوئی بات پوچھی بھی جائے تو سمجھتے ہیں کہ ان کی نیت پر شک ہو رہا ہے۔ یہی سوچ کر چودھری صاحب نے کہہ دیا ہوگا۔ تو بے فکر ہو جا۔ میں کچھ پوچھوں گا نہیں۔ ان کے پاس جا کر بیٹھ جاؤں گا شاید وہ خود ہی کچھ بتا دیں۔“

فیض محمد نے صغرا کو تو مطمئن کر دیا تھا لیکن خود اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، واقعی کوئی گڑبڑ تو نہیں؟ چودھری کہیں صغرا کو بے وقوف تو نہیں بنا رہا ہے۔ جائداد ایسی چیز ہے کہ اچھے اچھوں کی نیت بدل جاتی ہے۔ کہیں چودھری کے دل میں بھی بے ایمانی تو نہیں آ گئی۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ وہ چودھری سے جا کر پوچھے گا لیکن دل ہی دل میں ڈر بھی گیا۔ چودھری نے سختی سے منع کر دیا ہے اگر وہ ناراض ہو گیا تو اسے دشمنی کرتے دیر نہیں لگے گی۔ پھر اس نے وہی کیا جو کچھ دیر پہلے صغرا کر چکی تھی۔ دل ہی دل میں توبہ کی کہ وہ

چودھری صاحب کے بارے میں ایسی باتیں سوچ رہا ہے۔

وہ صبح سو کر اٹھا تو پوری طرح خوش و خرم تھا۔ وہ پوری طرح مطمئن تھا کہ چودھری اس کی بیٹی کو اس کا حق ضرور دلائے گا۔ اس نے صغرا کو بھی ایک مرتبہ پھر سمجھایا کہ وہ چودھری صاحب کے بارے میں ایسی باتیں نہ سوچا کرے۔

وہ اسکول چلا گیا اور صغرا نے حویلی کا راستہ پکڑا۔

وہ حویلی پہنچی تو زنان خانے کی دیواروں نے اسے جکڑ لیا۔ چودھری کے نوکروں نے اسے چودھری کے پاس بھیجنے کے بجائے زنان خانے میں چودھری کی بڑی بیوی کے پاس بھیج دیا۔ وہ اس سے پہلے بھی ان کے بہت سے کام کر دیا کرتی تھی لیکن آج ان کا لہجہ ہی دوسرا تھا۔ انہوں نے اس طرح اسے حکم دیا تھا جیسے انہوں نے نئی نوکرانی رکھی ہو۔

”چل ادھر آ۔ میرے سر میں تیل ڈال۔ اور ہاں کل سے جلدی آنا۔ جھاڑو بھی تجھ ہی کو نکالنی ہو گی۔“

”بی بی جی۔ ابا کو اسکول بھیجنا ہوتا ہے، پھر نوراں بھی اٹھنے میں دیر کرتی ہے۔“ اس نے سر میں تیل ڈالتے ہوئے کہا۔

”باتیں بنانا کوئی تم لوگوں سے سیکھے۔ تیز ہاتھ چلا۔“

وہ ادھر سے فارغ ہوئی تو اسے چودھری کی دوسری بیگم کے پاس بھیج دیا گیا۔ وہاں کے کام نمٹائے۔ پھر اس نے چودھری سے ملنے کی کوشش کی لیکن معلوم ہوا وہ آرام کر رہے ہیں کسی سے نہیں مل سکتے۔

اس نے سوچا کوئی بات نہیں، کل مل لے گی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ حویلی میں آئی تھی اور چودھری سے نہیں مل سکی تھی اس لیے اس نے کوئی خیال بھی نہیں کیا۔ ایک دن پہلے ہی تو عدالت گئی تھی، اس لیے پوچھنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ گھر چلی آئی۔

دوسرے دن پھر حویلی پہنچتے ہی اسے کام پر لگا دیا گیا۔ چودھری پھر اس سے نہیں ملا۔ گھر پہنچی تو اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔

وہ نوکرانیوں کی طرح کام کر رہی تھی۔ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کہیں چودھری صاحب ناراض نہ ہو جائیں۔ دو چار مرتبہ دبے لفظوں میں باپ سے کہا بھی تو اس نے یہی سمجھایا کہ ابھی کام اٹکا ہوا ہے۔ وہ صبر سے کام لے۔ فیض محمد خود اتنا ڈر گیا تھا کہ چودھری سے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

جب صغرا کو حویلی کے فرش رگڑتے ہوئے ایک مہینا ہو گیا تو اسے یہ آس ہونے لگی کہ نوکری ہی سہی تنخواہ تو ملے گی۔ ابا کا کچھ بوجھ ہی ہلکا ہوگا لیکن اسے تو مفت کی نوکرانی سمجھ لیا گیا تھا۔ اس نے مطالبہ بھی کیا تو جواب یہ ملا۔ ”دو پہر کی روٹی یہاں کھا لیتی ہے، اب تجھے تنخواہ بھی چاہیے۔“

اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ چودھری سے بات کرے گی۔ اس سے پوچھے گی کہ اس کے حصے کا کیا ہوا۔ حصہ مل جائے تو اس گھر کی چاکری سے نجات ملے۔

اس دن فیض محمد کے اسکول کی چھٹی تھی۔ وہ گھر پر تھا۔ صغرا نے نوراں کو باپ کے پاس چھوڑا اور اکیلی حویلی چلی گئی۔ وہ نوراں کو جان بوجھ کر چھوڑ گئی تھی کیونکہ آج اسے گھر کا کام کاج نہیں کرنا تھا، چودھری سے بات کرنی تھی اور فوراً واپس آ جانا تھا۔

وہ حویلی پہنچی اور سیدھی اس طرف بڑھتی چلی گئی جہاں چودھری بیٹھا کرتا تھا۔ نوکروں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ بڑھتی چلی گئی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ چودھری اس وقت چھت والے کمرے میں ہے۔ اس نے زینہ چڑھا اور چھت پر پہنچ گئی۔

”چودھری صاحب، میرے کام کا کیا ہوا؟“

”کیسا کام؟“

”اس کے بعد آپ مجھے عدالت لے کر بھی نہیں گئے۔“

”کیا بات ہے آج ہماری بلبل بہت چہک رہی ہے؟“

”چودھری صاحب اب میں بہت تنگ آ چکی ہوں۔“

”بھئی عدالتوں کے کام ہیں وقت تو لگے گا۔“

”پھر میں گھر بیٹھ جاتی ہوں۔ جب عدالت جانا ہو تو بلا لینا۔“

”گھر بیٹھ کر کیا کرو گی ہمارے پاس بیٹھو۔ ہم تمہیں دل میں بٹھائیں گے۔“

وہ عورت تھی۔ شادی شدہ زندگی گزار چکی تھی۔ مرد کی نظروں کو پہچانتی تھی۔ اس کے اندر کی عورت نے فوراً اطلاع دی کہ چودھری کی نیت میں فتور آ گیا ہے۔ اس پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ چودھری اس وقت نشے میں ہے۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کی کلائی چودھری کی مضبوط گرفت میں آ گئی۔ چودھری نے ایک جھٹکا دیا اور وہ دور جا پڑی۔ چودھری باہر نکلا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ صغرا بپھر کر اٹھی اور دروازہ پیٹ ڈالا لیکن سب کان بہرے تھے۔ چھت پر ہونے والا شور نیچے پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ مسلسل چیخ رہی تھی کہ شاید کوئی سن لے۔ پھر اس نے سنا کوئی باہر سے دروازہ کھول رہا ہے۔ وہ دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی کہ دروازہ کھلتے ہی باہر کی طرف بھاگ کھڑی ہو گی۔ یہی اس کی

غلطی تھی۔ دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ جیسے ہی کسی نے دروازے کو دھکا دیا وہ دور جا گری۔

چودھری اس مرتبہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دیدار احمد بھی اندر داخل ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر صغرا کی ڈھارس بندھی تھی۔ اس کے سامنے چودھری ایسی ویسی حرکت نہیں کرسکتا تھا لیکن جب اس نے اندر آکر دروازے کی کنڈی چڑھائی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔

دیدار احمد مکروہ ہنسی ہنستا ہوا اس کے لباس کی طرف بڑھا تو صغرا نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔ دونوں پر شیطان سوار تھا۔ نہ اس کی بددعائیں کوئی سن رہا تھا نہ التجا کا اثر تھا۔

جب وہ بالکل بے بس ہوگئی اور اس قابل نہ رہی کہ باہر بھاگ سکتی تو دیدار احمد کمرے سے باہر چلا گیا۔ چودھری اب اکیلا تھا لیکن صغرا اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ دیوروں سے بچ کر آئی تھی' چودھری کے ہاتھوں لٹ گئی۔

طوفان گزر گیا۔ دروازہ کھلا۔ اس نے لباس کو کفن بنایا۔ لاش کی طرح چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ چل رہی تھی۔ چھت سے اترنے کے لیے زینہ ہوتا ہے لیکن وہ کھلی چھت پر چلتی رہی۔ وہ جلدی میں تھی۔ یہ دیکھ ہی نہیں سکی کہ چھت ختم ہوگئی ہے۔ اس نے پاؤں آگے بڑھایا، ایک چیخ بلند ہوئی۔ صغرا خون میں لت پت حویلی کے باہر پڑی تھی۔ لاش سے لاش تک کا سفر زندگی اور موت کی کہانی سنا رہا تھا۔ وہ زندہ لاش کی صورت چودھری کے کمرے سے نکلی تھی اور اب واقعی مرگئی تھی۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ کچھ لوگوں نے پہچان بھی لیا کہ یہ لاش فیض محمد کی بیٹی صغرا کی ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسلا ہوگا اور یہ نیچے گر گئی۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے، یہ گری نہیں ہے اسے گرایا گیا ہے۔ چودھری ہماری بہو بیٹیوں پر بری نظر رکھتا ہے۔ انہیں برباد کرتا ہے اور پھر وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔ نور جہاں کی باتیں ایک مرتبہ پھر زبانوں پر آگئی تھیں۔ اس ظالم نے اسے بھی مروا دیا تھا۔ اس مرتبہ صغرا نے خودکشی کی ہے۔

فیض محمد گھر میں بیٹھا نوراں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ کسی نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ وہ نوراں کو اندر چھوڑ کر دروازے پر آیا۔ وہاں یہ خوفناک خبر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے یہ بھی ہوش نہ رہا کہ وہ نوراں کو اندر چھوڑ کر آیا ہے۔ دروازہ کھلا چھوڑا اور ان لوگوں کے ساتھ حویلی کی طرف دوڑ پڑا۔ دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ خدا کرے چھت سے گرنے والی صغرا نہ ہو کوئی اور ہو۔

وہ بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھا' اس کی دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔ کوئی اور نہیں اس کی صغرا تھی جو زمین پر پڑی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح چیختا ہوا حویلی کے دروازے کی طرف بھاگا۔ کچھ لوگوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس کی دیوانگی کسی کے قابو میں نہیں آئی۔ کچھ لوگ اب بھی اسے پکڑے ہوئے تھے اور وہ زور زور سے چودھری کو گالیاں بک رہا تھا۔ کچھ دیر میں دروازہ کھلا اور چودھری باہر نکلا۔ چودھری کے نوکروں نے بے قابو فیض محمد کو اچھی طرح قابو کرلیا۔ اب صرف اس کی زبان تھی جو آزاد تھی۔ گالیوں کے سوا اس کی زبان پر کچھ نہیں تھا۔

"ماسٹر، تیرا غصہ جائز ہے۔ تیری بیٹی مری ہے۔ تو گالیاں نہیں بکے گا تو کیا کرے گا۔ میں اس کا قطعی برا نہیں مان رہا ہوں اس لیے کہ تو اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہے مگر تجھے میرا ابھی یقین کرنا چاہیے۔ وہ کسی کام سے اوپر گئی تھی اور اپنی غلطی سے نیچے گر گئی۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں۔ اس کی موت کا مجھے بھی دکھ ہے۔ میں اس نقصان کا ازالہ کر دوں گا۔ جتنی رقم تو کہے گا تجھے دے دوں گا۔ صغرا کے کفن دفن کا انتظام بھی میں کروں گا۔"

"چودھری، میں تیرے خلاف عدالت میں جاؤں گا۔ میں نور جہاں کا باپ نہیں ہوں جو خاموش ہوکر بیٹھ جاؤں۔ تو نے میری بیٹی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ہے اور پھر اسے چھت سے نیچے پھینک دیا تاکہ وہ کسی کو کچھ نہ بتا سکے۔"

"اگر تو عدالت میں جانا چاہتا ہے تو شوق سے جا۔ جب میرا قصور ہی نہیں تو مجھے فکر کس بات کی۔" چودھری نے کہا اور دوبارہ حویلی میں چلا گیا۔

لوگوں کا اشتعال بڑھتا جا رہا تھا۔ چودھری کے خلاف نعرے لگ رہے تھے۔ اب آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ چودھری کے خلاف پرچا کٹواؤ۔ قصبے کے رہنے والوں نے یہ آوازیں پہلی مرتبہ سنی تھیں۔ چودھری کے خلاف رپورٹ درج کرانے کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا لیکن اس وقت فضا ایسی بن گئی تھی کہ ان آوازوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ نوجوان چارپائی لے آئے۔ صغرا کی لاش کو چارپائی پر ڈالا، اوپر سے چادر ڈال دی اور چودھری کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے تھانے کی طرف چل دیے۔ چودھری نے تھانے دار کو فون کردیا تھا کہ ایف آئی آر میں اس کا نام ہرگز نہ ڈالا جائے لہٰذا جب یہ مجمع تھانے کے سامنے پہنچا تو دروازے بند تھے۔ یہاں بھی خوب نعرے بازی ہوئی۔ مجبور ہوکر تھانے دار نے فیض محمد کو اندر بلایا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ

چودھری کے نام سے پرچا نہ کٹوائے۔ فیض محمد بضد تھا۔ دونوں میں خوب تکرار ہوئی۔ تھانے دار نے پرچہ کاٹنے سے انکار کردیا۔

"یہ میرا حق ہے کہ میں کسی پر بھی الزام لگاؤں۔ میرا الزام درست ہے یا نہیں اس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔" فیض محمد نے کہا۔

"رپورٹ میں یہ لکھوا دو کہ کسی نے اسے دھکا دیا۔ میں چودھری کا نام براہ راست نہیں ڈال سکتا۔"

"جب چودھری نے قتل کیا ہے تو پرچہ بھی اسی کے نام کا کٹے گا۔"

"چودھری صاحب ایک باعزت آدمی ہیں ان پر تم الزام نہیں لگا سکتے۔"

فیض محمد مایوس ہوکر تھانے سے باہر آگیا۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ پرچا نہیں کاٹا جا رہا ہے۔ لوگوں کا اشتعال بڑھ گیا۔ انہوں نے تھانے پر پتھراؤ شروع کردیا۔

قانون کے رکھوالوں نے قانون کا پاس نہیں کیا اور مظاہرین پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ قانون فوراً حرکت میں آیا۔ تھانے میں چھپی پولیس باہر آگئی۔ کچھ دیر لاٹھی چارج ہوتا رہا۔ جب لوگ بھاری پڑنے لگے تو پولیس نے ہوائی فائرنگ کردی۔ جس کا جس طرف منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ صغرا کی چارپائی کے پاس فیض محمد تنہا کھڑا رہ گیا۔ وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بلا رہا تھا۔ پولیس بھی تھانے میں جا چکی تھی۔ بڑی مشکل سے آٹھ دس نوجوان فیض محمد کی مدد کو آئے اور صغرا کی چارپائی اٹھا کر فیض محمد کے گھر کی طرف چل دیے۔

اسی دن اس کی صغرا منوں مٹی کے نیچے دفن ہوگئی۔ وہ صغرا کی تدفین سے فارغ ہوا تو اسے نوراں کی فکر ہوئی۔ چودھری سے اب کوئی امید نہیں تھی۔ وہ کہیں نوراں کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ اس نے نوراں کو گود میں اٹھایا، مکان کو تالا لگایا اور برابر کے ایک گاؤں میں چلا گیا جہاں اس کا سوتیلا بھائی رہتا تھا۔

نوراں کو وہاں چھوڑ کر وہ شہر چلا گیا۔ ایک وکیل سے ملا اور عدالت میں درخواست دے دی کہ اس کی بیٹی کا قتل ہوا ہے۔ تھانے والے رپورٹ درج کرنے سے انکاری ہیں کیونکہ چودھری بااثر آدمی ہے۔

عدالت نے حکم جاری کردیا کہ ایف آئی آر چودھری کے نام کاٹی جائے۔ چودھری بہت بھاگ دوڑ کر رہا تھا لیکن پرچا اس کے نام کٹ چکا تھا۔ چالان عدالت میں پیش ہوا۔ عدالت نے پولیس کو حکم دیا کہ چودھری کو عدالت میں پیش کیا جائے۔

چودھری کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ عدالت میں پیش ہوسکتا ہے مگر اسے پیش ہونا پڑا۔ فیض محمد کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ صغرا کو دھکا دے کر نیچے گرایا گیا ہے۔ اسے قصبے کے لوگوں سے بڑی امیدیں تھیں کہ وہ اس کی طرف سے عدالت میں پیش ہوکر چودھری کی بدکرداری کی گواہی دیں گے لیکن کوئی گواہی دینے پر تیار نہیں ہوا جبکہ چودھری کے نوکروں نے گواہی دی کہ صغرا کسی کام سے اوپر گئی تھی۔ اس کا پاؤں پھسلا اور نیچے گر گئی۔ چودھری تو اس وقت حویلی میں موجود ہی نہیں تھا۔

چودھری نے عدالت کے سامنے یہ پیش کش بھی کی کہ حادثہ اس کی حویلی میں ہوا ہے لہٰذا وہ فیض محمد کو جتنی رقم وہ کہے بہ طور مدد دینے کو تیار ہے۔ عدالت نے اس کے اس جذبے کی تعریف کی لیکن فیض محمد نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

عدالت نے فیصلہ سنایا۔ "صغرا کی موت قتل ہے نہ خودکشی بلکہ ایک حادثہ ہے۔ چودھری ارشاد کو اس مقدمے سے باعزت بری کیا جاتا ہے۔"

چودھری اس مقدمے سے مکھن کے بال کی طرح نکل آیا۔ قصبے میں اس کے خلاف باتیں ضرور ہو رہی تھیں لیکن اب کچھ دوسری باتیں بھی شامل ہوگئی تھیں۔ یہ آوازیں فیض محمد کے خلاف اٹھ رہی تھیں۔ سرعام کہا جا رہا تھا کہ صغرا بدکردار تھی۔ فیض محمد سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا لیکن بیوہ بیٹی کے سامنے بے بس تھا۔ یا پھر چودھری کی طرف سے ملنے والی دولت کے لالچ میں آگیا ہوگا۔ صغرا بھی چودھری کو ورغلا کر دولت بٹورتی رہی۔ پھر بے شک چودھری نے اسے مروا دیا ہوگا کہ کہیں یہ بھی نور جہاں کی طرح حویلی سے نکل کر اسے بدنام کرنے کی جسارت کرے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صغرا نے اسے بدنام کرنے کی دھمکی دی ہو۔ آدمی اپنی عزت بچانے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ جب نور جہاں مری تھی تو فیض محمد بھی تو یہی کہا کرتا تھا۔ اب اپنے گھر میں آگ لگی تو چودھری برا ہوگیا۔ بعض لوگ کھلے عام کہتے پھر رہے تھے کہ چودھری جیسے آدمی کو عدالت میں بلانے کے لیے کوئی معمولی رقم خرچ ہوئی ہوگی۔ اتنی رقم فیض محمد کے پاس کہاں سے آگئی؟ یہ وہی رقم ہوگی جو صغرا نے اسے کما کردی ہوگی۔

☆☆☆

فیض محمد اس امید پر قصبہ آتا جاتا رہا کہ شاید قصبے کے لوگ اس کا ساتھ دیں گے لیکن اسے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ ہوا اس کے خلاف ہے۔ خوف سے یا لالچ سے، لوگ اس کی

مخالفت کررہے ہیں۔ لوگ جہاں چودھری کی عیاشیوں کی پرلطف داستانیں سنا رہے ہیں وہیں زیب داستاں کے طور پر اس کی بیٹی صغرا کا نام بھی آرہا ہے۔ وہ اپنے ان دوستوں کے پاس گیا جو اسے پڑھا لکھا اور عقل مند سمجھتے تھے، اس سے مشورے لیتے تھے لیکن اب وہ اس سے ملنے سے گریز کررہے تھے کہ کہیں چودھری کا عذاب ان پر نہ ٹوٹے۔ اس ماحول میں اگر نوراں یہاں رہی تو صغرا کی بیٹی ہونے کے طعنے اسے بھی ملتے رہیں گے۔ وہ جوان ہوگی تو میری تو اسی نہیں صغرا کی بیٹی کہلائے گی۔ اگر وہ بدنام نہیں بھی ہوگی تو صغرا کے متعلق باتیں سن کر ماں کو برا سمجھنے لگے گی۔ صغرا کی روح کو چین نصیب نہیں ہوگا۔ نوراں کو اس ماحول سے دور لے جانا ہی بہتر ہے تاکہ وہ جلد سے جلد اپنی ماں کو بھول جائے۔ چار ساڑھے چار سال کی بچی کتنے دن ماں کو یاد رکھے گی، رفتہ رفتہ بھول جائے گی۔ یہی سب سوچ کر اس نے قصبے والا مکان بیچ دیا اور خود مستقل طور پر اپنے سوتیلے بھائی کے پاس رہنے لگا۔ نوراں کو بھی اس نے وہیں کے ایک اسکول میں داخل کرادیا۔ گھر پر ٹیوشن پڑھانے کے لیے وہ خود موجود تھا۔

ایک دن فیض محمد کے بھائی دین محمد نے اس سے کہا۔ ”فیض محمد، یہ مت سمجھنا کہ تو مجھ پر بوجھ ہے۔ تو مجھ سے زیادہ کماتا ہے۔ چار پیسے مجھ پر ہی خرچ کردیتا ہے لیکن نوراں کا مستقبل تیرے سامنے ہے۔ اس کو تعلیم دلانی ہے۔ اس کا بیاہ کرنا ہے۔ اس کے باپ کی جائداد ہے تو اسے دلانے کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتا؟“

”یار، اب میں عدالتوں کے چکر کاٹ کاٹ کر تھک چکا ہوں۔ پھر صغرا ہی نہیں رہی تو کیسا حصہ اور سچ پوچھو تو مجھے نفرت سی ہوگئی ہے صغرا کو ملنے والی جائداد سے۔ یہ جائداد ہی تو تھی جس کے حصول کے لیے میں نے صغرا کو چودھری کے گھر بھیجا تھا۔ صغرا کا قاتل میں ہوں کوئی اور نہیں۔“ وہ بلک بلک کر رونے لگا۔

”دیکھ فیض محمد!“ دین محمد نے اسے مخاطب کیا۔ ”تجھے جائداد کی ضرورت نہ ہو لیکن نوراں کو اس کی ضرورت پڑے گی۔“

”نہیں بھائی، اب مجھے عدالتوں سے نفرت ہوگئی ہے۔“

”عدالت جانے کو کون کہہ رہا ہے۔ ہم تو صغرا کی سسرال والوں سے کہیں گے کہ تم نے صغرا کو اس کا حصہ نہیں دیا۔ وہ اپنا خون تمہاری گردنوں پر رکھ کر چلی گئی۔ اب وہ حصہ نوراں کو دو۔“

”اگر اتنی آسانی سے انہیں حصہ دینا ہوتا تو دے چکے ہوتے۔ لامحالہ ہمیں پھر عدالت میں جانا پڑے گا۔“

”میں تیرے ساتھ ہوں فیض محمد۔“

”چودھری بھی میرے ساتھ تھا مگر کیا ہوا، مٹی ڈال یار! نوراں کی نانی کا بہت سا زیور میرے پاس ہے۔ یہ سب نوراں ہی کا تو ہے۔ میں دوں گا حصہ۔“

دین محمد اس وقت تو خاموش ہوگیا لیکن اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ اس کے پاس ایسے لوگ بھی تھے جو گریبان پکڑ کر جھولنا جانتے تھے۔ اس نے زیادہ نہیں صرف دو لٹھ برداروں کو ساتھ لیا اور صغرا کی سسرال پہنچ گیا۔ لڑنے نہیں صرف یہ پوچھنے کہ نوراں کو حصہ دینا ہے یا نہیں۔ فیاض اور ایاز دونوں بیٹھے تھے اور دونوں کے لیے یہ مطالبہ تعجب خیز تھا۔ البتہ یہ ضرور ظاہر ہوتا تھا کہ فیض محمد کے دل میں بے ایمانی آگئی ہے۔ وہ ڈرا دھمکا کر کچھ اور وصول کرنا چاہتا ہے۔ فیض محمد ساتھ نہیں آیا تھا لہٰذا اس شک کو اور بھی تقویت مل رہی تھی۔

”ہمارے پاس اتنا فالتو نہیں ہے کہ صغرا کو حصہ دے چکے، اب نوراں کو بھی دیں۔“

”ہم صغرا ہی کا حصہ تو مانگ رہے ہیں۔“

”اس کا جو حصہ بنتا تھا ہم نے دے دیا۔ اب اور کیا مانگ رہے ہو؟“

”فیض محمد تو کہہ رہا ہے، صغرا کا حصہ نہیں ملا۔“

”اسے ذرا سامنے تو لاؤ۔ ہم نے عدالت میں جاکر مجسٹریٹ کے سامنے صغرا کا حصہ اسے دیا ہے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ صغرا نے یہ جائداد چودھری کے ہاتھ فروخت بھی کردی ہے۔ اس کی قیمت فیض محمد ہی نے وصول کی ہوگی۔ ہمیں تو اب یہ بھی شک ہورہا ہے کہ صغرا کے قتل میں بھی فیض محمد کا ہاتھ ہے۔ اس نے ثبوت مٹانے کے لیے صغرا کو بھی قتل کرادیا ہو۔“

”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم نے حصہ دے دیا؟“

”کورٹ کا وہ کاغذ ہے جس کی ایک نقل ہمیں بھی ملی تھی۔ ہمارا اب اس جائداد سے کوئی تعلق نہیں۔“

فیاض احمد اور ایاز نے دین محمد کو ثبوت بھی دکھادیا جس میں جائداد کی منتقلی کی تفصیل تھی۔ صغرا کے دستخط بھی موجود تھے۔ اب شک کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ دین محمد ان سے معذرت کرکے اٹھ آیا۔

دین محمد اس ثبوت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

فیض محمد کی طرف سے اس کا بدگمان ہوجانا لازمی تھا۔ جائداد کتنی بری چیز ہے۔ اس کی چمک کے سامنے ہر رشتہ ماند پڑجاتا ہے، اس نے سوچا اور اپنے گاؤں کی طرف چل دیا۔ راستے میں یہ سوچتا بھی جارہا تھا کہ وہ اس کا ذکر فیض محمد سے کرے یا نہ کرے۔ پھر اس نے سوچا، جھوٹے کو اس کے گھر تک ضرور پہنچانا چاہیے۔ فیض محمد کو شرمندہ تو کرنا چاہیے۔ جتنی شرمندگی مجھے فیاض احمد اور ایاز کے سامنے ہوئی ہے اس کا ازالہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ فیض محمد کو بتاؤں کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔

اس نے فیض محمد کو بتایا تو قسمیں کھانے کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس نے قرآن اٹھا کر بتایا کہ جائداد منتقل نہیں ہوئی تھی۔ چودھری ہمیشہ یہ کہتا رہا تھا کہ ابھی وہ کوشش کررہا ہے۔ صغرا کی سسرال والے جھوٹ بول رہے ہیں۔ دین محمد نے جب اسے بتایا کہ وہ عدالت کے کاغذ خود دیکھ کر آیا ہے تو فیض محمد سوچ میں پڑ گیا۔ اسے یاد آیا کہ چودھری نے اسے اس معاملے سے بالکل الگ رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ صغرا کی سادگی سے فائدہ اٹھاسکے۔ اسے وہ رات یاد آگئی جب صغرا بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اسی دن وہ عدالت گئی تھی۔ کچھ باتیں وہاں ایسی ضرور ہوئی تھیں جن پر اسے شک تھا۔ وہ کچھ باتیں چھپا رہی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ چودھری تمہیں کیوں دور رکھنا چاہتا ہے۔ چودھری نے اس سے یہ کیوں کہا تھا کہ اگر تمہارے باپ نے مجھ سے کچھ پوچھا تو پھر مل چکا تمہیں تمہارا حق۔ صغرا کے حق پر چودھری نے قبضہ کرلیا ہے۔ کاغذات کی ایک نقل صغرا کی سسرال والوں کے پاس بھی ہے۔ اگر وہ میری طرف سے عدالت میں گواہی دیں اور کاغذات عدالت میں پیش کریں تو ممکن ہے صغرا کا حق نوراں کو مل جائے۔ وہ دین محمد کی نظروں میں جھوٹا بن گیا تھا اس لیے بھی ضروری تھا کہ یہ معاملہ عدالت میں لے جاکر صاف کرایا جائے۔ اس نے عدالت میں جانے سے توبہ کرلی تھی لیکن اب ضروری ہوگیا تھا۔ چودھری کی طرف سے اس کے دل میں دبی ہوئی نفرت ایک مرتبہ پھر ابھر آئی۔ وہ دنیا کو چودھری کا اصل چہرہ دکھائے گا۔ وہ بتائے گا کہ اس خوبصورت چہرے کے پیچھے کیسا بھیانک چہرہ چھپا ہوا ہے۔ بے پناہ دولت ہونے کے باوجود اس نے کوڑیوں کی جائداد ہتھیانے کے لیے ایک جان لے لی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر جائداد کا غبن ثابت ہوگیا تو ممکن ہے صغرا کے قتل کا ذمے دار بھی چودھری ٹھہرے۔

اس نے دین محمد کو ایک مرتبہ پھر صغرا کی سسرال بھیجا۔ اس نے فیاض احمد سے ملاقات کی اور یہ وعدہ لے آیا کہ اگر چودھری کے خلاف مقدمہ ہوا تو وہ فیض محمد کی طرف سے گواہی دے گا۔

فیض محمد ایک مرتبہ پھر شہر گیا اور اسی وکیل سے ملا جس نے صغرا کے قتل کا مقدمہ لڑا تھا۔ اس مقدمے میں شہادتیں نہیں ملی تھیں لیکن اب فیاض احمد کی گواہی موجود تھی۔ عدالت کے کاغذات موجود تھے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ جائداد صغرا کے نام پر منتقل ہوئی۔ بس یہ ثابت کرنا تھا کہ چودھری نے جائداد منتقل کرائی مگر کاغذات صغرا کے حوالے نہیں کیے بلکہ اس سے یہ کہا کہ ابھی کارروائی ہورہی ہے۔ پھر صغرا کو قتل بھی کرادیا تاکہ وہ کوئی دعویٰ نہ کرسکے۔ اس لیے وہ جائداد پر قبضہ کرنے کا مرتکب ٹھہرتا ہے۔ کیس بہ ظاہر بہت آسان تھا۔ وکیل نے بھی یقین دلایا کہ فیض محمد یہ مقدمہ جیت جائے گا۔

وکیل نے فیس وصول کی اور چودھری ارشاد کے خلاف مقدمہ دائر کردیا۔ عدالت نے چودھری اور صغرا کے دیور فیاض احمد کے نام نوٹس جاری کردیے، تاریخ پڑ گئی۔

عدالت میں فیاض احمد پیش ہوا۔ اس نے حلف اٹھا کر کہا کہ وہ اپنی بھابی صغرا کو اس کے حق میں ملنے والی جائداد منتقل کرچکا ہے۔ اس نے کاغذات بھی پیش کردیے۔

چودھری نے بیان دیا کہ جائداد منتقل ہوئی تھی لیکن اسی دن اس کی سیل ڈیڈ ہوگئی تھی۔ سیل ڈیڈ پر صغرا کے دستخط موجود ہیں۔ جتنے میں یہ سودا طے ہوا تھا اتنی رقم میں نے صغرا کی موجودگی میں فیض محمد کو ادا کردی تھی اور اس پر ایک گواہ بنالیا تھا۔ رسید لینا میں نے ضروری نہیں سمجھا تھا کیونکہ فیض محمد کو میں ایماندار آدمی سمجھتا تھا۔ مجھے اپنی حیثیت کا بھی علم تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے رقم لے کر انکار کرنے کی جرأت نہیں کرسکے گا لیکن اب وہ کسی کے بہکاوے میں آکر انکار کررہا ہے۔ چودھری ارشاد نے قصبے کے ایک آدمی کو گواہ کے طور پر پیش بھی کردیا۔ اس نے گواہی دی کہ میرے سامنے چودھری نے فیض محمد کو رقم دی تھی۔

فیض محمد حیران تھا کہ اس کا عزیز ترین دوست اس کے خلاف جھوٹی گواہی دے رہا ہے۔ عدالت نے فیض محمد سے پہلے ہی پوچھ لیا تھا کہ وہ اس شخص کو جانتا ہے؟ فیض محمد نے اپنے دوست کی حیثیت سے اسے پہچانا تھا۔ اب وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ چودھری کا آدمی ہے۔ فیض محمد کا وکیل، عدالت کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ چودھری نے جعل سازی سے کام لیا ہے۔ صغرا سے دھوکے سے دستخط کرائے ہیں۔ صغرا اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی، سچی بات کون بتاتا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

عدالت نے ایک مرتبہ پھر چودھری کو بری کر دیا بلکہ اسے یہ اجازت دی کہ وہ چاہے تو فیض محمد پر ہتک عزت کا دعویٰ کرسکتا ہے لیکن چودھری نے ایک مرتبہ پھر فیض محمد کو معاف کر دیا۔

فیض محمد کے بھائی دین محمد کے دل میں اس کی طرف سے بدگمانی پیدا ہوگئی تھی۔ اسے یہ شک ہوگیا تھا کہ اس نے واقعی رقم وصول کرلی ہے اور چودھری کو بدنام کر رہا ہے۔ اگر وہ سچا ہوتا تو عدالت میں اس کا سچ ظاہر ہوچکا ہوتا۔ تمام ثبوت اس کے خلاف گئے ہیں۔ اس نے سب کو بے وقوف بنایا اور بیٹی کی دولت پر قبضہ جما کر بیٹھ گیا۔ صغرا کی سسرال والے بھی اس پر لعن طعن کرکے عدالت سے رخصت ہوگئے تھے۔

دین محمد منہ سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا لیکن اس کے رویے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ فیض محمد کو اچھا آدمی نہیں سمجھتا۔ فیض محمد نے کئی مرتبہ اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن دین محمد اب کسی ہمدردی کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ فیض محمد اس کے رویے کو دیکھ رہا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ جہاں عزت ہی نہ ہو وہاں رہنے کا کیا فائدہ۔ نوراں کل کو بڑی ہوگی تو دین محمد نہیں تو اس کی بیوی نوراں کے ذہن میں یہ زہر ضرور بھر دے گی کہ تیرے نانا نے تیری جائداد پر قبضہ جمالیا ہے۔ صغرا کی ایک ہی نشانی ہے۔ اگر وہ بھی مجھ سے روٹھ گئی تو میں کہاں جاؤں گا۔ اب بھی وقت ہے، میں نوراں کو بھی بچالوں اور خود کو بھی۔ کسی ایسی جگہ جا کر رہوں جہاں کوئی مجھے نہ جانتا ہو۔ اب میری زندگی، میری محبت، میرا مقصد، سب کچھ نوراں ہے۔ وہ مجھے جانے کوئی اور نہ جانے اور اچھے لفظوں میں جانے۔ میں اسے اس کی ماں بن کر پالوں گا، کوئی اور مجھے اچھا نہ سمجھے، وہ تو اچھا سمجھے۔

اس کے ریٹائرمنٹ میں دو سال رہ گئے تھے۔ اس نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے لیے درخواست دے دی اور اس کی منظوری کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ جلدی کرتے کرتے بھی چھ مہینے لگ گئے۔

قصبے کا مکان بیچ کر جو رقم ہاتھ آئی تھی، وہ وکیلوں کی نذر ہوگئی تھی۔ ریٹائرمنٹ کا پیسا مل گیا۔ کچھ پنشن طے ہوگئی۔ صغرا اور اس کی ماں کا کچھ زیور بھی اس کے پاس تھا۔ وہ گاؤں سے شہر چلا آیا۔ یہاں اس نے ایک چھوٹا سا مکان لے لیا۔ ادھر ادھر جانے کے لیے ایک سائیکل خرید لی۔

نوراں، گاؤں میں رہتے ہوئے چوتھی جماعت میں آ گئی تھی۔ پڑھنے میں تیز تھی۔ فیض محمد اس پر توجہ دیتا رہا تھا۔ اس نے ٹیسٹ دلا کر پانچویں جماعت میں داخل کرادیا۔ پھر وہ کسی ایسے پرائیویٹ اسکول میں نوکری تلاش کرنے لگا جہاں وہ خود پڑھائے اور نوراں کو بھی وہاں داخل کرادے تاکہ وہ اس کی نظروں کے سامنے تعلیم حاصل کرتی رہے۔ وہ بہت جلد اپنی کوششوں میں کامیاب ہوگیا۔ اسے ایک اسکول میں نوکری مل گئی۔ نوراں بھی وہیں پڑھنے لگی۔

گھر اپنا تھا۔ پنشن مل رہی تھی۔ نئی ملازمت کی تنخواہ بھی تھی۔ یہ آمدنی اس کے اور نوراں کے لیے کافی تھی۔ اب بس اس دعا کی ضرورت تھی کہ وہ نوراں کی کسی اچھی جگہ شادی تک زندہ رہے۔ وہ جب نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا تو یہی دعا اس کے ہونٹوں پر ہوتی۔ نوراں بھی اس کے ساتھ شامل ہوجاتی۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتی "اللہ میاں، میرے ابو (وہ اسے نانا نہیں، ابو کہتی تھی) کو صحت دے، زندگی دے۔ میں بڑی ہوجاؤں۔ میری شادی ہوجائے، وہ جب بھی زندہ رہیں، میرے ساتھ رہیں۔"

یہ وہ الفاظ تھے جو فیض محمد نے اسے یاد کرادیے تھے اور وہ بڑی پابندی سے اس کا ورد کرتی رہتی تھی۔

پوری دنیا نوراں کی ذات میں سمٹ آئی تھی۔ فیض محمد کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ بس وہ تھا اور اس کی نوراں۔ شام کو وہ اسے سائیکل پر بٹھاتا اور سیر کے لیے نکل جاتا۔ ایک دو ٹیوشنیں مل گئی تھیں، نوراں وہاں بھی اس کے ساتھ جاتی۔ وہ اپنے اسکول کا کام لے کر بیٹھ جاتی اور وہ پرائے بچوں کو پڑھاتا رہتا۔

وقت گزرتا رہا۔ نوراں عمر اور تعلیم کی منزلیں طے کرتی رہی۔ کڑے دن گزر گئے۔ اب اس کی خدمت اور گھر کی دیکھ بھال کے لیے نوراں جوان ہوگئی تھی۔

☆☆☆

نوراں بستر چھوڑ کر یوں اٹھی جیسے پلنگ کے نیچے آگ لگ گئی ہو۔ گھبرا کر گھڑی کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، اتنی دیر ہوگئی، آگ بجھانے والی گاڑیاں اب تک پہنچیں کیوں نہیں۔ پھر جیسے سب کچھ یاد آ گیا ہو۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے فیض محمد کو پکارا۔ جب اس پکار کی آواز کے جواب میں کوئی آواز نہیں آئی تو اس نے بستر کی طرف حسرت سے دیکھا اور باہر نکل آئی۔ فیض محمد اس وقت باورچی خانے میں تھا۔

"ابو، آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے، آپ باورچی خانے میں نہ آیا کریں۔"

"کیوں نہ آیا کروں، میرا گھر ہے جہاں بھی جاؤں۔"

"یہ کام میرا ہے آپ کا نہیں۔"

"اگر تیرا انتظار کرتا رہوں تو ناشتے کے بغیر ہی تجھے یونیورسٹی جانا پڑے۔"

"وہ تو اب بھی ناشتے کے بغیر ہی جانا پڑے گا، آپ مجھے اٹھاتے ہی نہیں ہیں۔"

"اٹھاتے اٹھاتے تھک جاتا ہوں، تیری تو نیند ہی بالکل......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے ہونٹوں پر صغرا کا نام آنے ہی والا تھا۔ صغرا بھی نیند کی ایسی ہی متوالی تھی۔ وہ بھی جواب میں یہی کہتی تھی جو اس وقت نوراں کہہ رہی تھی۔

"اتنا اچھا خواب دیکھ رہی تھی کہ اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا ورنہ میں جاگ تو رہی تھی۔"

بالکل صغرا پر گئی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ نوراں اسے چھوڑ کر غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ روز یہی کہتی ہے اور روز دیر سے اٹھتی ہے۔ اپنی ماں کی طرح یہ بھی خواب بہت دیکھتی ہے۔ مالک! اس کے اچھے خوابوں کو پورا کرنا، اسے وہ تمام خوشیاں دینا جو آج تک کسی کو نہ ملی ہوں۔ وہ بڑبڑاتا جا رہا تھا اور ناشتا بناتا جا رہا تھا۔

نوراں تیار ہو کر آ گئی تھی "ابو مجھے دیر ہوگئی ہے، میں جا رہی ہوں۔"

"جا کہاں رہی ہے، ناشتا تو کرتی جا۔"

"ناشتے کا ٹائم نہیں ہے۔ بس نکل جائے گی۔" اس نے کہا اور دروازے تک پہنچ گئی۔

"ایک کپ چائے تو پی لے۔ بس نکل گئی تو میں تجھے سائیکل پر چھوڑ آؤں گا۔" نوراں کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"پھر کیسی لگوں گی سائیکل پر جاتے۔ دوپہر کا کھانا آپ کے ساتھ کھاؤں گی۔" نوراں کی آواز آئی اور پھر دروازہ بند ہونے کی۔

فیض محمد اب بہت بوڑھا ہوگیا تھا لیکن صحت اچھی تھی اور زندگی محنت کرتے گزری تھی اس لیے قویٰ مضبوط تھے۔ اس کے باوجود اب وہ گھر کے چھوٹے چھوٹے کام کرنے کے لائق رہ گیا تھا یا اپنی سائیکل پر سوار ہو کر بازار سے سودا سلف لے آتا تھا۔ ایک سال پہلے تک اسکول بھی جاتا رہا تھا لیکن اب اسکول کی نوکری اس کے بس کی نہیں رہی تھی۔ نوراں کو شام کے وقت دو ٹیوشنیں مل گئیں تو اس نے اپنی قسم دلا کر فیض محمد کو گھر بٹھا دیا۔ پنشن اور ٹیوشن فیس پر گزارہ تھا۔ تنگی ضرور تھی لیکن نوراں پر امید تھی کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسے کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی۔ وہ انگریزی ادب میں ایم اے کر رہی تھی۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ اسٹاپ تک پہنچی تو یونیورسٹی کی بس نکل چکی تھی۔ پہلا پیریڈ ضرور اٹینڈ کرنا تھا۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا تھا جب وہ پرائیویٹ بس کا انتظار نہ کرے بلکہ رکشا کرکے یونیورسٹی چلی جائے۔ اس نے پرس کھول کر پیسے گنے۔ اتنے پیسے تھے کہ وہ رکشا کا کرایہ دے سکتی تھی۔ وہ رکشا کے انتظار میں تھی کہ ایک کار اس کے قریب آ کر رکی۔

"جلدی آیئے، یونیورسٹی کو دیر ہو رہی ہے۔" اندر کوئی لڑکا بیٹھا تھا جو چیخ کر کہہ رہا تھا۔

وہ اس آواز پر ہرگز کان نہ دھرتی لیکن یونیورسٹی کا نام سن کر اس کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً یونیورسٹی کا کوئی لڑکا ہوگا، اس نے سوچا۔

"جلدی آؤ بھئی، کیا سوچ رہی ہو۔" لڑکے نے پھر کہا۔

اس کے پاؤں اب بھی جنبش نہ کرتے لیکن یونیورسٹی کو واقعی دیر ہو رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔ لڑکا واقعی جلدی میں تھا۔ گاڑی نے ایک جھٹکا لیا اور ہوا ہوگئی۔

"میرا نام جاوید ہے۔ چودھری جاوید اور آپ یقیناً نوراں ہیں۔"

"آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟"

"اس لیے کہ ہم دونوں ایک ہی ڈپارٹمنٹ میں ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایک ہی کلاس میں ہیں۔"

"میں نے تو آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔"

"عجیب بے خبر خاتون ہیں آپ۔ میں روز کلاس میں ہوتا ہوں اور آپ نے مجھے دیکھا ہی نہیں حالانکہ کلاس میں بیس پچیس سے زیادہ اسٹوڈنٹ نہیں ہوتے، انسانوں کا میلہ نہیں لگا ہوتا وہاں۔"

"آئی ایم سوری!"

"صرف سوری سے کام نہیں چلے گا۔ جرمانہ یہ ہے کہ آپ واپس بھی میرے ساتھ آئیں گی۔ آپ جہاں کھڑی تھیں وہاں سے میں روز گزرتا ہوں لہٰذا یونیورسٹی آتے ہوئے بھی آپ کو لے لیا کروں گا۔ اگر آپ کے پاس گاڑی نہیں ہے تو۔"

"یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی، جو آپ کہہ رہے ہیں۔"

"ارے واہ، اس میں کون سی بری بات ہوگئی؟"

"مجھے اچھا نہیں لگے گا کہ میں روز آپ کے ساتھ آؤں، آپ کے ساتھ جاؤں۔"

"دیکھو نوراں، ہم لوگ کلاس فیلو ہیں، اتنی مروت تو

دونوں میں ہونی چاہیے۔ پھر میں روز ادھر سے گزرتا ہی ہوں، الگ سے آنا نہیں پڑے گا۔"

اس کے بعد اگر نوراں کو کچھ کہنا بھی ہوتا تو ممکن نہیں تھا کیونکہ گاڑی... یونیورسٹی میں داخل ہو چکی تھی اور پلک جھپکتے میں پارکنگ میں تھی۔

نوراں نے رسٹ واچ دیکھی۔ ابھی کلاس شروع ہونے میں پورے پندرہ منٹ باقی تھے۔ وہ اگر رکشا سے آتی بھی تو اتنی جلدی نہیں آسکتی تھی۔ جاوید کو کوئی دوست مل گیا اور نوراں کلاس کی طرف بڑھ گئی۔ ابھی کلاس شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے اسے سوچنے کا موقع مل گیا۔ اسے یہ سوچ کر شرمندگی ہو رہی تھی کہ وہ جاوید کو پہچان نہیں سکی جبکہ چھ مہینے سے وہ اس کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ وہ اپنی حالت پر غور کر رہی تھی۔ حالات نے مجھے دنیا سے اتنا بے گانہ کر دیا ہے۔ اپنے اردگرد کا مجھے ہوش ہی نہیں۔ اسے تو کوئی نفسیاتی بیماری ہی کہا جاسکتا ہے۔ میں صرف پڑھنے آتی ہوں اور پڑھ کر چلی جاتی ہوں۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو سوشل ہونا چاہیے۔ پھر وہ یہ سوچ کر رنجیدہ ہوگئی کہ جو لڑکیاں تتلیوں کی طرح اڑتی پھرتی ہیں، ان کے ماں باپ زندہ ہوتے ہوں گے۔ میں تو وہ بدنصیب ہوں جس نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا۔ کوئی تصویر بھی ان کی نہیں ہے۔ بس کبھی کبھی وہ کوٹھری یاد آتی ہے جہاں بیٹھ کر میں رویا کرتی تھی اور میری ماں مجھے بہلانے کی کوشش کرتی تھی۔ ماں کا چہرہ بھی میرے تصور میں دھندلا سا ابھرتا ہے۔ ایک حویلی یاد آتی ہے جہاں میری ماں اکثر مجھے لے جاتی تھی۔ خدا جانے وہ کون سی جگہ تھی۔ شاید اماں کی سسرال ہو۔ نانا سے پوچھتی ہوں تو وہ کوئی جواب ہی نہیں دیتے۔ ہوسکتا ہے اماں انہیں بتا کر نہ جاتی ہوں۔ وہ یہیں تک سوچ پائی تھی کہ پروفیسر نے کلاس روم میں قدم رکھا۔ وہ ان کی تعظیم کے لیے کھڑی ہوئی پھر بیٹھ گئی۔ اسے یاد آیا کہ وہ جاوید کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور جاوید اسے نظر آگیا۔ اس کا ذہن نہ جانے کیوں الجھ سا گیا۔ پروفیسر شیرازی اس کے پسندیدہ تھے۔ نوراں کو انگریزی ڈرامے سے ایک خاص شغف تھا اور شیرازی اس وقت شیکسپیئر پڑھا رہے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ سانس روکے بیٹھی ہوتی لیکن وہ جاوید سے مل کر نہ جانے کیوں اپنے ماضی سے الجھ سی گئی۔

پیریڈ ختم ہونے کے بعد جاوید اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ اسے اس لڑکے کی یہ بات اچھی لگی تھی۔ وہ تو یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ لفٹ دینے کے بعد وہ اس پر اپنا حق سمجھنے لگے گا۔ کلاس ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ اس کے پاس آکر بیٹھ جائے گا یا کینٹیریا میں چائے پینے کے لیے کہے گا لیکن وہ تتلیوں کے درمیان بھونروں کی طرح منڈلانے والا لڑکا ثابت نہیں ہوا۔ اسے اب خیال آیا کہ وہ اسے کیوں نہیں پہچانی تھی۔ وہ لڑکیوں سے دور رہتا تھا اس لیے وہ اس کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔ دوسری کلاس شروع ہوئی تو وہ پھر کلاس میں آگیا مگر اس نے ایک مرتبہ بھی نوراں سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

چھٹی کا وقت ہونے لگا تو نوراں پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ وہ اب ضرور مجھ سے کہے گا کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ صبح کی بات اور تھی۔ اس وقت دیر ہو رہی تھی مگر اب ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ جیسے ہی کلاس ختم ہوئی وہ تیزی سے باہر نکل گئی اور تیزی سے ٹرمینل کی طرف بڑھ گئی جہاں پوائنٹس کی بسیں کھڑی ہوتی تھیں تاکہ مطلوبہ بس میں سوار ہوجائے۔ دوسرے لفظوں میں چھپ کر بیٹھ جائے لیکن وہاں پہنچتے ہی جاوید کی گاڑی اسے نظر آگئی۔ وہ باہر ہی کھڑا تھا۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم میرے خلوص کا غلط مطلب لوگی اور بس سے جانے کی کوشش کروگی۔"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں، میری طبیعت خراب ہو رہی تھی اسی لیے جلدی نکل آئی۔"

"جلدی نکلی ہو تو جلدی پہنچنا بھی ہوگا، جلدی بیٹھو گاڑی میں۔"

اب انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کی طبیعت خراب نہیں ہے۔" جاوید نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھیں، اس لیے آپ جلدی چلی آئیں۔"

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔"

"میں نے تمہاری اس سوچ کا برا نہیں منایا۔ میں خود بھی اسی مزاج کا ہوں۔ یونیورسٹی میں تم پہلی لڑکی ہو جس سے میں نے بات کرنے کی جسارت کی ہے۔"

"وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔"

"اگر پہلی کوشش ہی ناکام ہوگئی تو زندگی بھر کسی لڑکی سے بات نہیں کرسکوں گا۔"

نوراں اس کی اس بات پر ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔ "میں نے آپ کی جسارت پر ملامت تو نہیں کی۔"

"یہ وعدہ بھی نہیں کیا کہ آپ میری گاڑی کو عزت بخشتی رہیں گی۔"

"یہ آپ کی عجیب ضد ہے۔"

"ضد نہیں، میری خواہش ہے۔"

"کیا حرج ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہی آجایا کروں گی۔"

"یہ ہوئی نا لڑکیوں والی بات۔" جاوید نے کہا۔ "اسی بات پر راستے میں کہیں رک کر آئس کریم کھائی جائے؟"

"سوری، کھانے پر میرا انتظار ہو رہا ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے جلدی جانا ہوتا ہے۔"

"یار، یہ مائیں تو سب ہی کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی دیر ہوجائے تو کوئی حرج بھی نہیں۔"

"پھر بھی سہی۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ میں نے تو یوں ہی پوچھ لیا تھا ورنہ کہوگی..... کہ کیسا کنجوس لڑکا ہے۔"

گھر کے قریب پہنچ کر نوراں نے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ جاوید نے کہا بھی کہ یہاں سڑک پر کہاں اتروگی، وہ اسے گھر تک چھوڑ آئے گا لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ جاوید اس کا گھر دیکھے یا نانا دیکھ لیں کہ وہ کسی لڑکے کے ساتھ آئی ہے۔

وہ گھر پہنچی تو شاید اس میں کوئی تبدیلی آچکی تھی جسے فیض محمد کی بوڑھی آنکھوں نے فوراً بھانپ لیا۔ تبدیلی خوش گوار تھی اس لیے پوچھ بھی لیا۔

"نوراں، تو ہمیشہ ہنستی رہے۔ آج میں دیکھ رہا ہوں، تو کچھ زیادہ ہی خوش ہے؟"

"ابو پتا ہے کیا ہے، ایک بہت اچھی لڑکی مجھے ملی ہے۔ ایک ہی دن میں میری دوست بن گئی۔"

"تو ہے ہی اتنی اچھی کہ جو تجھے دیکھتا ہے، پہلی ہی ملاقات میں دوست بن جاتا ہے۔"

"اس لڑکی کے پاس اپنی کار ہے۔ اب میں اس کی کار میں یونیورسٹی جایا کروں گی۔"

"چل بھائی جہاں جی چاہے جا۔ مجھے اپنی تربیت پر ناز ہے۔ مجھے یقین ہے تو ایسا ویسا قدم کبھی نہیں اٹھائے گی۔"

"ابو، میں نے کھانا کھا لیا۔ اب میں کچھ دیر کے لیے لیٹ جاؤں؟"

"ہاں بیٹا۔ تھک گئی ہوگی۔ جاکر آرام کرلے، میں بھی کچھ دیر کے لیے کمر لگاؤں گا۔"

وہ دوپہر میں اپنی نیند ضرور پوری کرتی تھی لیکن آج وہ مستقل جھوٹ بول رہی تھی۔ یہ بھی جھوٹ تھا کہ وہ تھک گئی ہے۔ آج اسے سونے کے لیے نہیں سوچنے کے لیے تنہائی درکار تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جاوید کے بارے میں دیر تک

سوچتی رہے۔ اس نے آج تک اپنے اور فیض محمد کے سوا کسی کے بارے میں نہیں سوچا تھا حتیٰ کہ اپنے ماضی کے بارے میں بھی نہیں لیکن جاوید سے ملتے ہی اس کے ذہن کے تمام گوشے جیسے کھل گئے ہوں۔ اسے اپنے ماضی کے بارے میں بھی فکر ہو رہی تھی اور ایک چوری وہ یہ کر رہی تھی کہ ایک غیر لڑکے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس سے پہلے بھی کئی بار مل چکی ہے۔ اس کا یہ بھی جی چاہ رہا تھا کہ کوئی اس کا ہمراز ہو اور وہ اس سے جاوید کی تعریف کرتی رہے۔ وہ ہے بھی تعریف کے لائق۔ کتنا شائستہ، کتنا مہذب، ایک میں ہوں جس کا کوئی ماضی ہی نہیں۔ چند ادھوری سی یادیں ہیں۔ اگر کبھی اس نے میرے بارے میں پوچھ لیا تو اسے کیا جواب دوں گی۔ اس کے سوالوں سے بچنے کے لیے کیا میں اس سے ملنا چھوڑ دوں؟ نہیں اس طرح تو وہ مجھے غیر مہذب سمجھے گا لیکن ٹھہر نوراں، تو اس کے بارے میں اتنی سنجیدہ کیوں ہے؟ کون لگتا ہے وہ تیرا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تو محبت کی پیاسی ہے۔ باپ کا پیار بھی تجھے نہیں ملا۔ ماں کی قربت تجھے نصیب نہیں ہوئی۔ اس لڑکے نے محبت سے دو باتیں کرلیں تو تیری پیاس نے تجھے بے حال کر دیا۔ تیرے نانا تجھے کب سے سنبھالے پھر رہے ہیں۔ اگر تیرے دل میں کسی اور کی محبت آباد ہو گئی تو ان پر کیا گزرے گی۔ کیا اس لڑکے سے ملنا تیری بے وفائی نہیں ہو گی جو تو نانا سے کر رہی ہو گی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں اس لڑکے کی حوصلہ افزائی نہیں کروں گی۔ میں ابو کے لیے بنی ہوں۔ ان کے ساتھ رہوں گی۔ اگر میں جاوید سے ملتی رہی تو یہ راز کبھی نہ کبھی کھل ہی جائے گا۔ ابو نے اگر جاوید کو پسند نہیں کیا تو میرے فیصلے پر انہیں کتنی تکلیف ہو گی۔ پھر وہ یہ سوچنے لگی کہ ہر لڑکی اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ سب اس سے محبت بھی کرتے ہیں لیکن شادی کر کے اسے رخصت بھی کر دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر رشتے کی نوعیت الگ ہوتی ہے۔ ایک محبت سے دوسری محبت ختم نہیں ہو جاتی۔ نانا ابو مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں لیکن جب میری ماں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ ان کے دل میں میری ماں بھی ہے اور میں بھی ہوں۔ اگر میں اپنے دل میں تھوڑی سی جگہ جاوید کو دے دوں تو نانا کی محبت کم تو نہیں ہو جائے گی۔ وہ خود کہتے رہتے ہیں کہ میری تعلیم ختم ہونے کے بعد وہ میری شادی کر دیں گے۔ شادی کی بات الگ ہے لیکن وہ یہ چوری برداشت نہیں کر سکیں گے جو مجھ سے سرزد ہونے والی ہے۔ مجھے یہ سلسلہ یہیں روک دینا چاہیے۔ میں اس کے ساتھ جانا چھوڑ دوں تو وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے گا۔

دوسرے دن وہ وقت سے پہلے ہی سو کر اٹھ گئی۔ فیض محمد کے لیے اپنے ہاتھوں سے ناشتا بنایا اور ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا۔ فیض محمد اس تبدیلی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

”جو لڑکی تیری دوست بنی ہے، وہ بہت سلیقے والی معلوم ہوتی ہے۔“

”کیوں ابو؟“

”اسی نے تجھے بتایا ہو گا کہ صبح جلدی سو کر اٹھا کرو۔ ناشتا خود بنایا کرو اور اپنے نانا کے ساتھ بیٹھ کر کھایا کرو۔ یہ نہیں کہ دیر سے اٹھیں، منہ پر چھینٹے مارے اور بھاگ کھڑی ہوئیں۔“

”وہ کیوں بتائے گی مجھے۔ ابھی ایک دن تو ہوا ہے اس کی دوستی کو۔ وہ تو آج کوئی خواب نہیں دیکھا۔ اس لیے جلدی اٹھ گئی۔“

”اچھا اب جلدی سے تیار بھی ہو جا۔ کہیں پھر دیر نہ ہو جائے۔“

نوراں رات ہی کو طے کر چکی تھی کہ وہ بس سے جائے گی، جاوید کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اسی لیے جلدی اٹھ بھی گئی تھی۔ بس آنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ وہ گلیاں عبور کر کے سڑک پر آئی تھی کہ جاوید کی گاڑی اسے نظر آ گئی۔ وہ یہ بھول ہی گئی کہ اسے بس سے جانا ہے۔ چلتی ہوئی گئی اور جاوید کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ پھر یہ ہوا کہ بس میں جانا بھول گئی۔ رفتہ رفتہ اس دوستی نے بے تکلفی کا رنگ اختیار کر لیا۔ اب وہ کلاس سے نکل کر کینٹے نیریا میں بھی بیٹھنے لگے تھے۔ راستے میں رک کر آئس کریم بھی کھانے لگے تھے۔ اس نے جھوٹ بولنا سیکھ لیا تھا۔ اسے جب بھی دیر ہو جاتی، وہ فیض محمد کو اپنی نئی دوست کا نام لے کر مطمئن کر دیتی۔ اس نے اس نئی دوست کا فرضی نام بھی رکھ لیا تھا۔ آج انیلا کو شاپنگ کرنی تھی اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔ آج انیلا زبردستی مجھے اپنے گھر لے گئی تھی، وغیرہ وغیرہ۔ فیض محمد بڑا خوش تھا کہ نوراں کی کوئی دوست تو بنی۔ وہ تو اس کی طرف سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی کوئی دوست ہی نہیں تھی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ جس کا کوئی دوست نہ ہو اسے یقیناً کوئی ذہنی بیماری لاحق ہے۔

”نوراں، اگر تیری ماں زندہ ہوتی تو یقیناً تو انیلا کو گھر لے کر آتی پھر بھی تو اسے کسی روز کھانے پر بلا لے۔ ساتھ بیٹھ کر کھانے سے محبت بڑھتی ہے۔“ فیض محمد کئی مرتبہ کہہ چکا تھا۔

جاوید اسے ایک شاندار ہوٹل میں کھانے پر لے گیا تھا۔ اس کا کہنا بھی یہی تھا کہ ساتھ بیٹھ کر کھانے سے محبت بڑھتی ہے۔ جاوید کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے اسے اپنے

نانا کی بات یاد آ رہی تھی۔

جاوید سے یہ بات اس کی ماں نے کہی تھی۔ وہ بتا رہا تھا ”تمہیں یہ سن کر تعجب ہو گا کہ تم سے پہلے میرا کوئی دوست نہیں تھا۔ نہ لڑکی، نہ لڑکا۔ میری والدہ میرے اس اکیلے پن سے بہت فکر مند تھیں۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ ایک لڑکی میری دوست بن گئی ہے تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اس لڑکی کو کھانے پر بلاؤں۔ ساتھ کھانا کھانے سے محبت بڑھتی ہے۔“

”اور تم مجھے گھر کے بجائے ہوٹل میں لے آئے۔“

”آج کل وہ میرے نانا کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ آجائیں گی تو ضرور تمہیں ان سے ملواؤں گا۔“

”کہاں رہتے ہیں تمہارے نانا؟“

”ایک جگہ ہے قصبہ مراد نگر۔ وہاں ان کی بہت بڑی حویلی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ان کی وہاں نوابی تھی۔ پورا قصبہ ان کے نوکروں کی طرح تھا۔ اب تو خیر وہ بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن کروفر وہی ہے۔ کبھی موقع ملا تو تمہیں وہاں لے کر چلوں گا۔ میں کوئی پانچ سال کا تھا جب میں وہاں سے آ گیا تھا۔ اماں ہم بھائیوں کی تعلیم کی خاطر شہر کی حویلی میں آ گئی تھیں۔“

نوراں کو اس کی زبانی معلوم ہوا کہ جاوید کے والد کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا۔ وہ تین بھائی ہیں۔ دو اس سے بڑے ہیں، ایک بھائی ڈاکٹر ہے، دوسرا لندن میں وکالت کرتا ہے۔

وہ اپنے بارے میں صرف اتنا بتا سکی تھی کہ اس کے والدین کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا۔ اس وقت سے اب تک وہ اپنے نانا کے ساتھ رہتی ہے۔ ان ہی کو وہ ابو کہتی ہے، وہی اس کی امی ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتی کہ کس گاؤں میں پیدا ہوئی ہے لیکن اسے گاؤں کا نام معلوم ہی نہیں تھا اور یہ کوئی ایسا ضروری بھی نہیں تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ انہیں احساس ہونے لگا تھا کہ ان کی دوستی محض دوستی نہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔ اپنی پسند میں بڑوں کو شامل کرنے کے لیے جاوید اسے اپنے گھر لے گیا۔ نوراں نے اس حویلی نما مکان میں قدم رکھا تو اسے ہر لڑکی کی طرح اپنی قسمت پر فخر ہونے لگا۔ نانا کو کتنی خوشی ہو گی جب انہیں یہ معلوم ہو گا کہ ان کی نوراں اتنے بڑے گھر میں بیاہ کر جائے گی۔ یہ دیکھ کر اسے دکھ بھی ہوا تھا کہ اتنے بڑے گھر میں صرف چار آدمی رہتے ہیں۔ وہ تو یہ کہیے کہ بڑے بھائی کے دو بچے تھے جو اس حویلی کی اداسی کو دور کیے رکھتے ہوں گے۔

جاوید کی والدہ کو دیکھ کر اسے خوشی ہوئی تھی۔ شکل ایسی تھی جیسے کوئی مہارانی بیٹھی ہو لیکن نہایت سادہ اور خوش اخلاق۔ غرور نام کو نہیں تھا۔ دیر تک اسے گلے سے لگائے رہیں۔ یہ پیار شاید اس لیے بھی تھا کہ اللہ نے انہیں کوئی بیٹی نہیں دی تھی۔ انہیں یہ سن کر بالکل اپنوں کی طرح دکھ ہوا تھا کہ نوراں کے والدین بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اور اب وہ اپنے نانا کے ساتھ اکیلی رہتی ہے۔

☆☆☆

”مجھے تو لڑکی پسند آئی۔“ جاوید کی والدہ کہہ رہی تھیں پھر انہوں نے اپنی بہو کو مخاطب کیا۔ ”کیوں فضیلہ! تمہیں کیسی لگی؟“

”لڑکی تو مجھے بھی اچھی لگی لیکن غریب ہے۔ کہہ رہی تھی، اس کے نانا اسکول ماسٹری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔“

”ہاں، ہمارے معیار کی تو نہیں ہے لیکن جاوید کی پسند ہے۔ اب وہ زمانہ بھی نہیں رہا کہ جاگیر دار، جاگیر داروں میں ہی شادی کرتے تھے۔“

”عجیب بات یہ بھی ہے کہ اسے اپنے باپ کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔ وہ کیا کرتے تھے، کہاں رہتے تھے، اسے کچھ بھی نہیں معلوم۔ شاید کچھ چھپا رہی ہے۔“

”یہ تو خیر اس کے بڑوں سے مل کر معلوم ہو سکتا ہے۔“

جاوید کی والدہ نے کہا۔ ”معاملہ بابا جانی کی اجازت پر جا کر اٹکے گا۔ ان کی اجازت کے بغیر میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی اور وہ کبھی نیچے خاندان میں شادی پر رضامند نہیں ہوں گے۔“

”امی جان، اس کی ایک ترکیب ہے میرے پاس!“ ان کی بہو نے کہا۔ ”انہیں کسی طرح لڑکی دکھا دی جائے۔ لڑکی تو خوبصورت ہے، وہ ضرور پسند کر لیں گے۔ ان سے کہا جائے کہ لڑکی کے والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی زمین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس کے باوجود لڑکی کے حصے میں سیکڑوں ایکڑ اراضی آئی ہے۔“

”بیٹی، تم کہہ تو ٹھیک رہی ہو لیکن وہ کون سا زمیندار ہے جسے وہ نہیں جانتے، فوراً شجرہ پوچھنے بیٹھ جائیں گے۔“

”پھر ایسا کرتے ہیں۔ ان سے کہتے ہیں لڑکی کے والد بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ جاوید کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی پر تیار نہیں ہیں۔ لڑکی ان کی مرضی کے بغیر شادی کر رہی ہے۔ کسی کو شکست دینے میں انہیں بہت مزہ آتا ہے۔ وہ ضرور اجازت دے دیں گے۔ بعد میں ہم کہہ بھی سکتے ہیں کہ لڑکی کا اپنے والدین سے ملنا جلنا ہے ہی نہیں۔“

"سوال یہ ہے کہ انہیں کیسے دکھائی جائے لڑکی؟"

جاوید یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ اسے موقع ہاتھ آگیا۔ اس نے یہ ذمے داری اپنے سر لے لی۔ نوراں کئی مرتبہ کہہ چکی تھی کہ اس نے کبھی گاؤں نہیں دیکھا۔ وہ مراد نگر میں اس کی حویلی دیکھنے کی بھی خواہش کر چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس سے کہے گا تو وہ چلنے پر تیار ہو جائے گی۔ مراد نگر تو خیر قصبہ اور اب تو اس نے کسی چھوٹے شہر کی شکل اختیار کرلی تھی لیکن اس کے اردگرد کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ خود اس کے نانا کی زمینیں تھیں۔ اس نے سوچا وہ نوراں کو گاؤں بھی دکھا دے گا اور حویلی بھی لے جائے گا جہاں نانا سے اس کی ملاقات ہو جائے گی۔

اس نے نوراں سے ذکر کیا۔ وہ تو یہ سن کر مچل گئی کہ جاوید کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر جائے گی۔ گاؤں دیکھے گی۔ اس کی جدی پشتی حویلی دیکھے گی۔ اس کے نانا سے ملے گی۔ معلوم تو ہو جاگیردار کیسے ہوتے ہیں؟ مسئلہ صرف یہ تھا کہ نانا سے اجازت کیسے ملے۔ وہ انہیں یہ بتانا بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ شہر سے باہر جا رہی ہے۔

"بس دن بھر کی تو بات ہے۔ ہم صبح یہاں سے نکلیں گے اور شام تک آجائیں گے۔"

"پھر بھی نانا سے کچھ تو کہنا ہوگا۔"

"ان سے کہنا تم صبح یونیورسٹی جاؤ گی اور یونیورسٹی کے بعد کسی سہیلی کے گھر چلی جاؤ گی۔ اس کی منگنی ہے یا کچھ بھی بہانہ کر دینا۔"

اس کی ایک ہی فرضی سہیلی انیلا تھی جس سے اس کے نانا کا غائبانہ تعارف تھا۔ اس نے اسی کا سہارا لیا اور انیلا کے گھر جانے کے بہانے اجازت لے لی۔

وہ صبح صبح شہر سے نکل گئے۔ شہر سے نکلنے کے بعد کچھ دیر تک ویرانہ ان کے ساتھ چلتا رہا پھر ان کی گاڑی سبز کھیتوں کو چھوتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ پھر ایک گاؤں میں داخل ہوئی جہاں کھیتوں کے ساتھ ساتھ کچھ کچے پکے مکان بھی بنے ہوئے تھے۔ "یہ فرید پور ہے۔ یہاں بھی میرے نانا کی تھوڑی سی زمین ہے۔ اس گاؤں میں گھوم لیں پھر آگے مراد نگر ہے جہاں نانا کی حویلی ہے۔"

اس نے کھیتوں کے کنارے ایک جگہ گاڑی روک لی۔ "یہ میرے نانا کی زمین ہے جو انہوں نے میری والدہ کے نام کر دی تھی۔ ہم نے اسے پٹے پر دیا ہوا ہے۔ اماں کہتی ہیں شادی کے بعد وہ اسے میرے نام کر دیں گی اور میں اسے تمہارے نام کر دوں گا۔"

یہ دراصل وہی زمین تھی جو صغرا کے حصے میں آئی تھی اور جس پر چودھری ارشاد نے قبضہ جما لیا تھا۔ چودھری ارشاد ہی جاوید کے نانا تھے۔ نوراں اس حقیقت سے بے خبر اپنی ماں کی ملکیت میں گھوم رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی کہ ایک دن یہ تمام زمین اس کے نام ہو جائے گی۔

"پتا ہے یہاں ہمارا ایک مکان بھی ہے اور شاید اس گاؤں کا سب سے اچھا مکان ہے۔ نانا نے یہ مکان بیچ دیا ہے مگر یہاں جو لوگ رہ رہے ہیں وہ مجھے جانتے ہیں۔ ہم نے زمین بھی انہی کو پٹے پر دی ہوئی ہے۔ چلو وہاں چل کر چائے پیتے ہیں۔ تم یہ بھی دیکھ لو گی کہ گاؤں کے لوگ کیسے مہمان نواز ہوتے ہیں۔"

وہ اسے ایک مکان کے سامنے لے کر پہنچ گیا۔ دو منزلہ مکان تھا اور خاصا بڑا تھا۔ گاڑی کا ہارن سن کر ایک عورت دروازے پر آئی اور جاوید پر نظر پڑتے ہی اندر بھاگ گئی۔ پھر ایک آدمی باہر آیا۔

"چودھری جاوید آپ! ہمارے تو نصیب جاگ گئے، آج کیسے آنا ہو گیا؟"

"ایاز بھائی، بس ادھر سے گزر رہے تھے، سوچا ملتا چلوں۔"

"آؤ آؤ اندر آؤ۔ کل ہی آپ کا ذکر ہو رہا تھا کہ مالک بہت دن سے نہیں آئے۔"

نوراں اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے گھر میں چلی گئی۔ یہاں دو عورتیں تھیں۔ ایک بوڑھی عورت بستر پر لیٹی تھی اور شاید بہت بیمار تھی۔

ان عورتوں میں سے ایک ایاز احمد کی بیوی تھی دوسری اس کے بھائی فیاض احمد کی بیوی تھی۔ تین چار بچے کھیل رہے تھے جو ان کی اولاد میں سے کسی کے ہوں گے یا دونوں کے ہوں گے۔

نوراں اور جاوید کے اندر پہنچتے ہی بھونچال سا آگیا تھا۔ فیاض احمد اوپر تھا، اسے بھی بلا لیا گیا تھا۔ وہ دونوں بھائی ان کے سامنے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"ایاز بھائی، میں جب آتا ہوں آپ زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں جاگیرداروں کی ان رسموں کو پسند نہیں کرتا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے مالک کہ ہم آپ کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جائیں۔ آپ تو ہمارے سامنے ویسے ہی ہیں جیسے بڑے مالک!"

قسمت ایک مرتبہ پھر نوراں کے ساتھ مذاق کر رہی

تھی۔ یہ وہی مکان تھا جس میں وہ پیدا ہوئی تھی۔ جہاں اس کی ماں پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے تھے۔ وہ بوڑھی عورت جو بستر پر لیٹی ایڑیاں رگڑ رہی تھی، اس کی دادی تھی۔ فیاض اور ایاز اس کے سگے چچا تھے جو اس وقت اس کے قدموں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی چاچیاں اس کی خاطر داری میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ کوٹھری سامنے نظر آرہی تھی جس میں وہ اپنی ماں کے سرہانے بیٹھی روتی رہتی تھی۔ افسوس کہ اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ اس کے چچا بھی اسے پہچاننے سے قاصر تھے۔ وہ خوابوں میں بہت کچھ دیکھتی رہتی تھی لیکن اس وقت اسے کوئی خواب یاد نہیں تھا۔

چلتے وقت کسی نے پوچھا ضرور تھا کہ ساتھ آنے والی کون ہے؟ جاوید نے ہنس کر کہا تھا، بہت جلد تم لوگوں کو اپنی شادی میں بلاؤں گا۔ ابھی تو یہ میری منگیتر ہے۔

اس کی قسمت اب ایک اور تماشا دکھانے والی تھی۔ جاوید اب اسے مراد نگر لے جا رہا تھا جہاں اس کی آبائی حویلی تھی۔ جہاں چودھری ارشاد کا راج تھا۔ جہاں اب بھی بڑے دروازے سے چھوٹے لوگ نہیں گزر سکتے تھے لیکن اب بہت دن ہو گئے تھے چھت سے کوئی عورت نہیں گری تھی۔ اس لیے بھی کہ اب چودھری بوڑھا ہو گیا تھا اور اس لیے بھی کہ اب قصبے کے لوگ باشعور ہو گئے تھے۔

اس کی گاڑی حویلی کے سامنے پہنچی تو جیسے وزیراعظم آگیا۔ ملازموں کے سوکھے ہوئے ہاتھوں نے بھاری پھاٹک یوں کھول دیا جیسے کاغذ کا بنا ہو۔ گاڑی دروازے میں داخل ہوئی اور قطار سے بنی ہوئی کوٹھریوں کو عبور کرتی ہوئی ایک محراب نما دیوار کے پاس جا کر ٹھہر گئی۔ نوراں حیران تھی کہ یہ حویلی ہے یا قصبہ مراد نگر اسی کو کہتے ہیں۔

"تمہیں پتا ہے یہاں میری ایک نہیں، تین نانیاں رہتی ہیں۔"

"تین نانیاں؟"

"ہاں، میرے نانا نے تین شادیاں کی تھیں۔ اولاد صرف ایک ہوئی اور وہ میری ماں ہیں۔"

"مگر وہ ہیں کہاں؟ ابھی اور کتنے میل چلنا ہوگا۔ کتنی بڑی حویلی ہے؟"

"پہلے نانیوں کو سلام کرلیں، پھر میں تمہیں حویلی گھماتا ہوں۔"

وہ پیدل چلتے ہوئے ایک راہداری سے گزرے اور ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک عورت بیٹھی تھی۔ جاوید نے ان کے پاؤں چھوئے۔ نوراں نے بھی یہی کیا۔

اس عورت نے نوراں پر نظر ڈالتے ہوئے جاوید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جاوید نے ان کے کان میں کچھ کہا۔ یہی کہا ہوگا کہ وہ اپنی ہونے والی دلہن دکھانے لایا ہے۔ اس عورت نے کہا، اچھی ہے۔

یہاں سے اٹھ کر وہ دوسرے کمرے میں گیا۔ یہاں اس کی دوسری نانی تھیں۔ یہاں بھی وہی سب ہوا جو پہلے کمرے میں ہو چکا تھا۔

"اب میں تمہیں جہاں لے جا رہا ہوں وہ میری سگی نانی ہیں یعنی میری ماں کی سگی والدہ۔" جاوید کو دیکھ کر وہ بھی خوش ہوئیں لیکن نوراں کی موجودگی ان کے لیے بھی باعث حیرت تھی۔

"بیٹا، ہمیں اجازت نہیں کہ حویلی سے باہر قدم رکھیں لیکن اب ایسا بھی نہیں کہ تیرا سہرا بھی نہ دیکھ سکیں اور تو نے شادی بھی کرلی۔ اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ چودھری ارشاد کے بچے خود شادیاں کرتے پھریں۔"

"آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں نے شادی کرلی؟"

"پھر یہ کون ہے۔ تیری دلہن نہیں ہے تو اور بھی بے حیائی ہے۔"

وہ نوراں کے سامنے وہ سب کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا جو وہ بتانے آیا تھا اسی لیے وہ اپنی نانی کو ایک طرف لے گیا۔ واپس آیا تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا البتہ یہ گلہ کر رہی تھیں کہ وہ اکیلا کیوں آیا، ماں کو ساتھ کیوں نہیں لایا۔

چودھری صاحب کو شاید علم ہو گیا تھا کہ جاوید آیا ہوا ہے۔ ایک ملازمہ دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے بتایا کہ مالک اس طرف آرہے ہیں اور وہ آگئے۔ خوبصورت آدمی تھے۔ چہرے پر وہ کیفیت تھی جسے رعب سے نہیں دہشت سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ اسی (80) سے اوپر عمر ہو گئی لیکن صحت نے ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ دراز قد ہونے کی وجہ سے کمر میں تھوڑا سا خم آگیا تھا۔ چھڑی کے سہارے چل رہے تھے۔ سب انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ نوراں نے بھی کھڑے ہو کر سلام کیا۔ ان کی آنکھوں میں ضرور کوئی ایسی بات تھی کہ نوراں صرف ایک بار ان کی طرف دیکھ سکی تھی۔ وہ بیٹھے بھی بہت کم تھے۔ بس چند باتیں کر کے اٹھ گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد جاوید اسے حویلی دکھانے کے لیے نکلا۔ جب وہ اس حصے میں پہنچی جو حویلی کا مردانہ کہلاتا تھا۔ چودھری اپنا بیشتر وقت اسی حصے میں گزارتے تھے تو نوراں کو ایسا لگا جیسے وہ یہاں پہلے بھی آچکی ہے۔ ہر کمرا اسے

دیکھا بھالا لگ رہا تھا۔ اسے اپنی کیفیت پر پہلے تو ہنسی آئی کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ یہاں کیسے آسکتی تھی۔ پھر اس پر عجیب سی گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ اس کے کانوں میں کسی بچی کے رونے کی آواز آرہی تھی۔

"اس کوٹھری میں کون بچی رو رہی ہے؟" اس نے ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا بات ہے، تمہارے کان بج رہے ہیں، یہاں بچی کا کیا کام؟"

ان کی آواز سن کر کوئی آدمی کوٹھری سے باہر آیا اور جاوید کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا دیے "مالک، آپ کب آئے؟"

نوراں کو یوں لگا جیسے وہ اس آدمی کو اچھی طرح جانتی ہے۔ اب اسے یہ حویلی بھوت بنگلا نظر آرہی تھی۔ ذہن پر اتنا زور دیا کہ اسے چکر آنے لگے۔ پوری حویلی گھومتی نظر آرہی تھی۔

"جاوید، یہاں سے جلدی چلو، مجھے کچھ ہو رہا ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے، نوراں۔"

"میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔ جلدی چلو۔"

"چلو چھت پر چلتے ہیں، پورا مرادنگر نظر آتا ہے؟"

وہ بہ مشکل زینے تک گئی تھی کہ چکر آئے اور زمین پر بیٹھ گئی۔ جاوید گھبرا گیا۔ اس نے اسے سہارا دیا اور گاڑی تک لے آیا۔

"تم یہاں بیٹھو۔ میں تمہارے لیے دودھ لے کر آتا ہوں۔ کمزوری سے چکر آگئے ہوں گے۔"

"جاوید، مجھے یہاں سے لے چلو۔ یہاں آسیب ہے۔ میری سانس رک رہی ہے۔"

"اندر چل کر آرام کرو، ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"جاوید!" وہ اتنی زور سے چیخی کہ جاوید بھی ڈر گیا۔ "چلتے ہو یہاں سے یا میں خود چلی جاؤں؟"

"چلتا ہوں بابا!" اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ایک مرتبہ پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ کھانا لگ رہا ہے۔ بس کھانا کھا کر چلتے ہیں۔"

"جاوید۔ یہ میری بداخلاقی ہے لیکن میں یہاں کچھ دیر اور رہی تو میرا دم نکل جائے گا۔ پلیز! مجھے یہاں سے لے چلو۔"

"اچھا تم بیٹھو۔ میں کچھ کھانا پیک کرا لیتا ہوں۔ راستے میں کھا لیں گے۔ میں نانی سے کہتا ہوں تمہاری طبیعت خراب ہو رہی ہے، تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔"

وہ نوراں کی حالت دیکھ کر خود اتنا گھبرا گیا تھا کہ بھاگتا ہوا گیا۔ نہ جانے نانی سے کیا کہا کہ اجازت مل گئی۔ وہ کھانا لے کر آگیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے حویلی سے باہر آگیا۔

"کیا ہو گیا تھا تمہیں؟"

"میں خود حیران ہوں۔" اس نے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میرے ذہن پر ایسا بوجھ تھا جسے میں برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ہر چیز کو دیکھ کر لگتا تھا، یہ تو میری دیکھی ہوئی ہے۔ بعض چہرے بھی شناسا لگ رہے تھے۔"

"پچھلے جنم میں تم اس حویلی میں آئی ہو گی۔" جاوید نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا، یہ بتاؤ اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

"اب تو ٹھیک ہوں۔ بس اب تو یہ سوچ رہی ہوں کہ ایسا کیوں تھا۔ اس حویلی سے ضرور میرا کوئی رشتہ رہا ہے جو مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔"

"چلو آرام سے سوچتی رہنا، شہر سے باہر نکل آئے ہیں۔ تم کہو تو کھانا کھا لیں، بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

"یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ میری وجہ سے آپ بھی بھوکے چلے آئے۔ آپ تو کھانا کھا لیں۔"

"تم نہیں کھاؤ گی؟"

"آپ کے ساتھ کھا لوں گی۔"

وہ گھر پہنچی تو ہلکی سی حرارت ہو گئی تھی۔ سر میں شدید درد تھا۔ چہرے پر ایسی ہوائیاں اڑ رہی تھیں کہ فیض محمد اسے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"کہاں گئی تھی جو اتنی تھک گئی؟"

"کچھ نہیں ابو، بس اچانک طبیعت خراب ہو گئی۔"

"نظر لگی ہو گی میری بچی کو۔ لا میں نظر اتار دوں۔ تیری ماں مرچوں سے تیری نظر اتارتی تھی۔"

فیض محمد مرچیں لایا اور نظر اتار کر مرچیں چولھے پر رکھ دیں "ذرا سی دھانس نہیں آئی۔ نظر لگی تھی تجھے۔ اب دیکھنا، ذرا سی دیر میں ٹھیک ہو جائے گی۔"

وہ بیمار نہیں تھی۔ وہ اسی حویلی میں گئی تھی جہاں بچپن میں ماں کے ساتھ جاتی رہی تھی۔ وقت کے فاصلے نے حافظے پر گرد ڈال دی تھی۔ اس کا ذہن صرف محسوس کر رہا تھا، اسے یاد کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس کے لاشعور میں ہلچل تھی لیکن شعور خاموش تھا۔ یہی وہ جنگ تھی جو اس کے اندر لڑی جا رہی تھی۔ اس کا ذہن لاشعور کو شعور میں لانے کے لیے زور لگا رہا تھا مگر ناکام تھا۔

اس کی نظر اتر چکی ہے۔ یہ نفسیاتی احساس تھا جس نے اس کا بخار کم کر دیا تھا لیکن ذہن اب بھی بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ دل بہلانے کے لیے ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔ دوسرے دن یونیورسٹی کی چھٹی تھی اس لیے اسے یہ بھی

اطمینان تھا کہ کل پورے دن آرام کرے گی تو طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

یونیورسٹی جانا نہیں تھا لہٰذا دن چڑھے تک سوتی رہی۔ فیض محمد صبح اٹھ گیا تھا لیکن اسے سوتا دیکھ کر اس نے بھی کر ٹیک لی تھی۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ باورچی خانے میں تھی۔ وہ بھی وہیں چلا گیا۔ دونوں نے وہیں بیٹھ کر ناشتا کیا۔ ناشتا کرنے کے بعد نوراں نے عجیب سا سوال کر دیا۔

"ابو ایک بات بتائیں، میری ماں کیا چھت سے گر کر مری تھی؟"

"ایسی بے ہودہ بات تجھ سے کس نے کہہ دی؟"

"میں نے رات خواب دیکھا ہے۔ ایک بہت بڑی حویلی ہے۔ ایک عورت اس کی چھت پر گئی ہے۔ پھر شور مچ گیا ہے کہ کوئی عورت چھت سے گر گئی۔ بہت سے لوگ اس عورت کی لاش کے گرد جمع ہیں اور چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں، نوراں کی ماں چھت سے گر گئی۔ نوراں کی ماں چھت سے گر گئی۔"

"تجھے رات بخار تھا۔ بخار کی بے ہوشی میں ایسے ہی الٹے سیدھے خواب نظر آتے ہیں۔ لاحول پڑھ کر سویا کر۔"

"ابو سچ بتاؤ، یہ خواب ہی تھا ناں؟"

"ہاں میری بچی! یہ خواب تجھے شیطان نے دکھایا ہے۔ تیری ماں تو اپنی موت مر گئی تھی۔ وہ بھلا کیوں چھت سے گرتی۔"

"پھر مجھے ایسا خواب کیوں نظر آیا؟"

"شیطان۔ بیٹا شیطان!" فیض محمد نے کہا اور گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "دوپہر کے پکانے کے لیے سودا سلف لے آؤں۔"

وہ اپنی گھبراہٹ نوراں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی بہانے سے وہ اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ دو گلیاں چھوڑ کر چند دکانیں تھیں مگر آج اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ کسی اور طرف مڑ گیا۔ یہاں وہ کبھی کبھی آکر بیٹھ جاتا تھا۔ اس وقت بھی اسے بیٹھ کر سوچنے کے لیے وقت درکار تھا۔ وہ ایک طرف کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ہوٹل والے نے چائے لا کر رکھ دی۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ یہ کون ہے جو نوراں کے ذہن میں زہر بھر رہا ہے۔ میں اسے چلتی ہوئی زبانوں کے بازار سے بچا کر یہاں لے آیا تھا کہ کوئی اسے حقیقت تک نہ پہنچا دے۔ میرے خلاف بھڑکا نہ دے۔ اسے زندگی بھر یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی ماں کس ظلم کا شکار ہوئی تھی۔ آج وہ مجھ سے حقیقت معلوم کر رہی ہے۔ اگر میں اسے حقیقت بتا دوں تو خود اس کی زندگی تلخ ہو جائے گی۔ بعض سچ ایسے ہوتے ہیں جنہیں چھپا لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ایسے خواب اسے کیوں آرہے ہیں؟ اس کے ذہن کا کون سا گوشہ بیدار ہو گیا ہے۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں۔ اس کا ذہن الٹے قدموں چلنے لگا ہے۔ وہ اگر کسی روز بچپن کی گزرگاہ پر جا کھڑی ہوئی تو اس کی زندگی کتنی اذیت ناک ہو جائے گی۔ اس کی تنہائیاں اسے بچپن کی بھول بھلیوں میں گم کر دیں گی۔ اس سے پہلے کہ وہ گم ہو جائے اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔ میں ابھی اس سے جا کر بات کرتا ہوں۔ اس نے کرسی چھوڑ دی۔ چائے کی پیالی اس کے ہونٹوں کا انتظار کرتی رہ گئی تھی۔ وہ چائے پینا بھی بھول گیا تھا۔ کاؤنٹر پر پیسے دینے گیا تو اسے یاد آیا، اس نے چائے تو پی ہی نہیں۔ ہوٹل والا اس حاتم طائی کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جس نے چائے پیے بغیر ہی پیسے ادا کر دیے تھے۔

وہ گھر پہنچا تو اسے یوں لگا جیسے بات کرنے کی ہمت وہ باہر ہی چھوڑ آیا ہو۔ اس نے پچھلے کئی برسوں سے نوراں کے سوا کسی سے بات ہی نہیں کی تھی لیکن بات کرنے اور چوری پکڑنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہی فرق جو وکیل اور پولیس والے میں ہوتا ہے۔ ایک بات کرتا ہے۔ دوسرا چوری پکڑتا ہے۔ وہ اس وقت وکیل بھی تھا اور پولیس والا بھی۔ اس نے ان دونوں کو اپنے پاس کھڑا کیا اور نوراں کو آواز دی۔

"بیٹا نوراں، جب تو چار سال کی بھی نہیں تھی، اس وقت سے میری گود میں ہے۔ تیری ایک ایک ادا سے میں واقف ہوں۔ تو نے کب سچ کہا ہے، کب جھوٹ بولا ہے، سب مجھے معلوم ہو جاتا ہے۔ تو نے مجھ سے پہلا جھوٹ اس وقت بولا تھا جب تو نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک لڑکی تیری بہت اچھی دوست بن گئی ہے۔ اس کے بعد سے اب تک جھوٹ بولتی آرہی ہے۔ اب سچ بولنے کا وقت آگیا ہے۔ بتا وہ لڑکا کون ہے جسے تو "انیلا" کہتی رہی ہے؟"

"مم...... مگر ابو...... یہ سچ...... جھوٹ ہے۔" نوراں نے نانا کا یقین متزلزل کرنے کی کوشش کی تو فیض محمد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"جس دن سے میں نے تجھ میں تبدیلی نوٹ کی اسی دن سے میں نے اس کی وجہ جاننے کی کوشش بھی کی اور پھر میں نے وجہ جان لی۔"

"وہ کیسے؟" نوراں نے بے اختیار پوچھا۔

"بس چھوڑ اس قصے کو...... صرف یہ بتا دوں کہ میں نے جان لیا کہ وہ کوئی لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہے جو روز تجھے اپنی گاڑی میں لاتا لے جاتا ہے۔"

نوراں رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔ اس کے پاس اپنی

صفائی میں کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ خود یہ چاہتی تھی کہ چوری پکڑی جائے۔ اب پکڑی گئی تھی تو اقرار کا حوصلہ نہیں تھا۔

"نوراں، مجھے معلوم ہے یہ باتیں میرے کرنے کی نہیں ہیں لیکن مجبوری ہے۔ تیری ماں ہوتی تو تیرے لیے یہ مشکل آسان ہوگئی ہوتی۔"

"وہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔"

"تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

"ہاں۔"

"اسے کسی وقت میرے پاس لے کر آؤ۔" فیض محمد نے کہا اور عدالت برخاست کردی۔

نوراں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ مرحلہ اتنی جلدی طے ہوجائے گا۔ وہ کئی مرتبہ سوچ چکی تھی کہ جاوید کا ذکر فیض محمد سے کردے، اب انہوں نے خود ہی اجازت دے دی تھی۔

وہ اگلے دن یونیورسٹی گئی تو جیسے جاوید کی پروفیسر بن گئی۔

"آج شام میں تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"سوچ رہا ہوں تمہیں مرادنگر لے جاؤں۔ میرے نانا کی حویلی تمہیں بہت پسند آئی تھی۔"

"بکواس کرو بند، ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔"

"پتا تو چلے میری شام کی دشمن کیوں بن گئی ہو؟"

"تمہارے نانا سے تو میں مل چکی ہوں۔ سوچ رہی ہوں اب تمہیں اپنے نانا سے ملوادوں۔ معلوم تو ہو کس کے نانا اچھے ہیں؟"

"مقابلہ نانا اور نانا کے درمیان ہے تو انہیں آپس میں ملواؤ۔ مجھے کیوں گھسیٹ رہی ہو؟"

"نہیں، پہلے تمہارا ملنا ضروری ہے۔"

"جو حکم آپ کا۔ کب آجاؤں؟"

"میرے خیال میں پانچ بجے ٹھیک رہے گا۔"

"بندہ حاضر ہوجائے گا۔"

وہ پہلے امتحان میں تو کامیاب ہوگیا۔ ٹھیک پانچ بجے تھے کہ اس کی سواری بادِ بہاری فیض محمد کے گھر پہنچ گئی۔ نوراں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ گھر اتنا بڑا تو تھا نہیں کہ کسی کی آمد ہو اور کسی کو پتا ہی نہ چلے جبکہ آنے والے کا انتظار بھی ہو رہا ہو۔ اس سے پہلے کہ نوراں خبر کرتی، فیض محمد خود کمرے میں آگئے۔ کچھ دیر رسمی گفتگو کے بعد انہوں نے نوراں کو اشارہ کیا کہ وہ کمرے سے چلی جائے۔ وہ نہ بھی کہتے تو نوراں اٹھ کر چلی جاتی۔ اس کے جانے کے بعد انہوں نے جاوید کو مخاطب کیا۔

"میاں، میں تکلفات کا عادی نہیں ہوں اس لیے براہ راست بات کروں گا۔ یہ بتاؤ تم نوراں سے واقعی محبت کرتے ہو یا اس نے سمجھ لیا ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو؟"

"وہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔"

"اس سے شادی کروگے یا محض دوستی کے قائل ہو؟"

"مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آدمی جس سے محبت کرتا ہے اسے حاصل بھی کرنا چاہتا ہے۔"

"اگر میں انکار کردوں؟"

"مجھے آپ کے انکار کی پروا نہیں ہوگی۔ ہاں اگر انکار نوراں کی طرف سے ہو تو بات الگ ہے۔"

"بہت خوب! اس کا مطلب ہے میری کوئی حیثیت ہی نہیں؟"

"آپ نوراں کے نانا ہیں بلکہ جو مجھے معلوم ہے اس کے مطابق، اس کے سب کچھ ہیں۔ اس سے بڑی آپ کی حیثیت اور کیا ہوگی۔ ایسے بزرگ تو پرستش کے لیے ہوتے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ، تمہاری تو ابھی نوکری بھی نہیں، نوراں کو کھلاؤ گے کہاں سے؟"

"مجھے نوکری کی ضرورت بھی نہیں۔ ہماری زمینیں ہیں۔ گھر بیٹھے ہماری آمدنی ہوتی رہتی ہے لیکن میں اپنی تعلیم کو ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ تعلیم مکمل ہوگئی تو نوکری ضرور کروں گا، شوقیہ ہی سہی۔"

"اب یہ بتاؤ، نوراں کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ اس نے تمہیں اپنے بارے میں کیا بتایا ہے؟"

"وہ مجھے سب بتا چکی ہے۔"

"مثلاً......؟"

"مثلاً یہ کہ اس کے والدین کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ آپ ہی نے اسے ماں بن کر پالا ہے۔ وہ آپ کی بہت شکر گزار ہے۔"

"اب تم کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"نوراں کی طرح باپ کی شفقت سے میں بھی محروم رہا ہوں۔ مجھ سے بڑے دو بھائی ہیں۔ ایک لندن میں ہے، دوسرا بھائی یہیں، اس شہر میں ڈاکٹر ہے۔ والد کے انتقال کے بعد ہمیں نانا نے اپنے پاس بلوالیا تھا۔ میں تو خیر چھوٹا تھا لیکن بڑے بھائیوں کی تعلیم کا مسئلہ تھا لہٰذا والدہ ہمیں شہر لے آئیں۔ ہم قصبہ مرادنگر سے یہاں چلے آئے اور اب تک یہیں ہیں۔"

"کیا کہا تم نے...... کس قصبے کا نام لیا؟"

"یہاں سے بیس پچیس کوس کے فاصلے پر قصبہ مرادنگر ہے۔"

قصبہ مرادنگر کا نام سن کر فیض محمد کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں لیکن اس وقت اپنی کیفیت چھپا لینے ہی میں عافیت تھی۔

"میں تو وہاں ایک آدھ دفعہ گیا ہوں۔ بعض لوگوں کو جانتا بھی ہوں۔ کیا نام ہے تمہارے نانا کا۔"

"چودھری ارشاد۔ ان کا مکان بڑی حویلی کے نام سے مشہور ہے۔"

"تم چودھری ارشاد کے نواسے ہو؟"

"آپ جانتے ہیں انہیں؟"

"وہ اتنے بڑے آدمی ہیں کہ میں کیا پورا قصبہ مرادنگر بلکہ ارد گرد کے علاقے کے لوگ بھی ان کے نام اور کارناموں سے واقف ہوں گے۔ تمہاری والدہ حیات ہیں؟"

"جی، ان کا سایہ ابھی ہمارے سروں پر قائم ہے۔"

"اللہ قائم رکھے۔" فیض محمد نے کہا "میں دیکھتا ہوں نوراں کیا کرنے لگی۔"

نوراں ان کے باہر آنے کا انتظار ہی کررہی تھی۔ جیسے ہی وہ نکلے، اس نے ناشتے کا سامان ڈرائنگ روم میں پہنچادیا۔ فیض محمد کو بھی ان کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔

جاوید رخصت ہوا تو فیض محمد بھی باہر سے باہر ہی کہیں چلا گیا۔ جانا کہاں تھا۔ دو گلیاں چھوڑ کر اسی ہوٹل پر جا بیٹھا جہاں وہ اکثر بیٹھ جاتا تھا۔ اس وقت اس کی حالت بالکل اس آدمی کی طرح تھی جس کے خزانے میں بیش قیمت جواہرات ہوں اور چوروں کو اس کے خزانے کا علم ہوگیا ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس خزانے کا دفاع کس طرح کرے؟

وہ ساری زندگی بھاگتا رہا تھا اور پھر وہیں کھڑا تھا جہاں سے چلا تھا۔ اب وہ بوڑھا ہوگیا تھا۔ بھاگنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی لیکن بھاگنا تو تھا۔ وہ نوراں کو اس چودھری کے نواسے کے حوالے کیسے کرسکتا تھا جو نوراں کی ماں کا قاتل تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جب شادی ہوگی یا شادی سے پہلے چودھری ارشاد کو معلوم ہوگا کہ نوراں، صغرا کی بیٹی ہے تو وہ اسے قبول کرلے گا؟ اس وقت کیسی جگ ہنسائی ہوگی۔ وہ تو یہ بھی کہے گا کہ میں نے صغرا کی جائداد پر قبضہ کرلیا تھا۔ نوراں کے سامنے میری کیا عزت رہ جائے گی۔ اگر چودھری نے مجھے نیچا دکھانے کے لیے اس رشتے کو قبول کر بھی لیا تو یہ اس کی ایک اور فتح ہوگی۔ میں اس مرتبہ اسے جیتنے نہیں دوں گا۔ میں اپنی نوراں کو لے کر کہیں اور بھاگ جاؤں گا۔

نوراں اب بچی نہیں رہی تھی جسے گود میں اٹھا کر وہ بھاگ جاتا۔ اس کا اندازہ اسے گھر پہنچ کر ہوا جب نوراں نے اس سے یہ پوچھا کہ جاوید اسے کیسا لگا۔

"نوراں، اگر میں یہ کہوں کہ میں اس لڑکے سے تیری شادی نہیں کرسکتا تو تیرا جواب کیا ہوگا؟"

"میں وجہ پوچھوں گی۔"

"وجہ میں بتا نہیں سکتا۔"

"تو پھر ابو، میں آپ کے احسانات کے بدلے آپ کا فیصلہ قبول کرلوں گی لیکن اس طرح جیسے کوئی زہر کھاتا ہے۔ میں زندہ تو رہوں گی لیکن زندگی بھر ہنسوں گی نہیں۔"

"میری بچی، میرا کہا مان لے اور جاوید کا خیال دل سے نکال دے۔"

"ابو، یہ میرے اختیار میں نہیں ہے لیکن آپ سے مجھے جتنی محبت ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ میں اس سے شادی نہ کروں لیکن اسی شرط کے ساتھ جو میں نے آپ کو بتائی۔ میں اپنی ہنسی فروخت کرکے یہ قربانی دوں گی۔"

"میری نوراں!" فیض محمد نے اسے آغوش میں بھرلیا۔ "تیری ہنسی تو میری زندگی ہے تو کیوں مجھے ماردینا چاہتی ہے؟"

"نانا ابو (وہ جب بہت لاڈ دکھاتی تو اسی نام سے پکارتی تھی) آپ کی زندگی ہی تو میری زندگی ہے۔ آپ کوئی معقول وجہ بتائیں گے تو میں اس شادی سے انکار کردوں گی۔ آپ کی خوشی کے لیے ہنستی بھی رہوں گی۔ کوئی بات ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ بتائیے نا۔"

"کوئی بات نہیں بیٹا، میں تو تیرا امتحان لے رہا تھا۔"

"آپ بڑے خراب ہیں۔ میں نہیں بولتی آپ سے۔ میرا تو دم ہی نکال دیا تھا آپ نے۔" اس نے فیض محمد کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"تیری شادی جاوید ہی سے ہوگی۔ اس سے کہنا، ایک مرتبہ مجھ سے اور مل لے۔"

"آپ کتنے اچھے ہیں۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ اس مذاق نے آپ کو بھی تو تھکا دیا ہوگا۔"

فیض محمد نے یہ فیصلہ تو کیا تھا کہ وہ نوراں کی شادی جاوید سے نہیں کرے گا لیکن اس نے دیکھ لیا تھا کہ نوراں، جاوید کے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ نوراں کی زندگی اسی میں ہے کہ جاوید اسے دے دیا جائے۔ بڑوں کی دشمنی میں بچوں کا نقصان کیوں ہو؟ اسے چودھری سے بات کرنی ہوگی۔ اپنی نوراں کی خاطر وہ ان کے قدموں میں گر جائے گا۔ وہ چاہتا یہ

تھا کہ سب کچھ چودھری کے علم میں ہوتا کہ بعد میں نوراں، چودھری کے انتقام سے بچی رہے۔ اس کی رضامندی ضروری ہے۔ نوراں جس طرح خوش ہوکر باورچی خانے کی طرف بھاگی تھی، وہ اسی طرح اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا۔

جاوید، نوراں کے گھر پہنچ گیا تھا اور یقیناً یہ سننے کی آرزو لے کر پہنچا تھا کہ فیض محمد اس شادی کے لیے تیار ہیں۔ اس کی یہ توقع غلط نہیں تھی لیکن فیض محمد اس سے یہ کہہ رہا تھا کہ چودھری ارشاد اس کے گھر آئیں اور اپنی زبان سے رشتہ طلب کریں تاکہ بعد میں انہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔

''انہیں کیا اعتراض ہوگا انکل!''

''بیٹا، ہم بہت چھوٹے لوگ ہیں۔ تمہارے نانا کے معیار کے ہرگز نہیں ہیں۔ انہیں یہ معقول اعتراض ہوسکتا ہے۔''

''انکل، آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرے تمام فیصلے میری والدہ کرتی ہیں۔ نانا تو بس شادی میں شریک ہوں گے اور وہ بھی ان کی مرضی پر منحصر ہے۔''

''وہ اس وقت بھی کوئی اعتراض کرسکتے ہیں۔''

''میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ وہ کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔''

''پھر بھی بیٹا۔ بڑوں کے درمیان جو بات ہوتی ہے، وہ بڑی ہوتی ہے۔''

''میں اپنی والدہ کو لے آؤں۔ وہ آپ کو ضمانت دے دیں گی۔''

''چودھری صاحب کا آنا ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ آجائیں۔''

''وہ میرے پاس اکیلے آئیں گے۔ آپ کے گھر کا کوئی فرد ان کے ساتھ نہیں ہوگا۔''

''میں ہی تو انہیں لے کر آؤں گا۔''

''تم انہیں چھوڑ کر چلے جانا۔''

☆☆☆

اس اطلاع نے جاوید کے گھر میں سنسنی پھیلادی۔ یہاں تو یہ طے ہوا تھا کہ چودھری ارشاد کو یہ بتایا جائے گا کہ نوراں بہت بڑے بزنس مین کی بیٹی ہے۔ اگر چودھری صاحب نوراں کے گھر چلے جاتے ہیں تو سارا معاملہ ہی الٹ جائے گا۔ وہ گھر بار دیکھ کر اندازہ کرلیں گے کہ نوراں کسی غریب باپ کی بیٹی ہے۔ چودھری صاحب نے اگر انکار کردیا تو یہ شادی کبھی نہیں ہوسکے گی۔ جاوید کی والدہ بیٹے کی محبت سے مجبور تھیں جبکہ کسی اور کے سامنے کوئی مجبوری نہیں تھی۔ ان کی بہو نے تو صاف کہہ دیا کہ اگر یہ شرط ہے تو رشتہ ختم کردو۔ وہ ہمیں دیکھ کر شادی کررہے ہیں۔ انہیں چودھری صاحب سے کیا لینا دینا۔ جاوید کا بھائی بھی اس شرط پر کچھ زیادہ خوش نہیں تھا۔ جب بحث بہت طول کھینچ گئی اور اس شرط سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو جاوید نے اعلان کردیا کہ وہ چودھری صاحب کو لے کر آئے گا اور نوراں کے نانا سے ملاقات کرائے گا۔

''دماغ چل گیا ہے تمہارا۔'' جاوید کے بھائی نے کہا۔ ''اگر انہوں نے انکار کردیا تو تمہاری شادی کبھی نہیں ہوسکے گی۔ ہم سب بھی کچھ نہیں کرسکیں گے۔''

''وہ انکار کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ میں ان کے انکار کے باوجود بھی نوراں سے شادی کروں گا۔ زندگی مجھے گزارنی ہے انہیں نہیں۔''

''گستاخ!'' اس کی ماں نے اسے ڈانٹا۔ ''تمہاری یہ ہمت ہوگئی۔ تم اپنے نانا سے بغاوت کروگے؟''

''امی، میں جاگیرداروں کے بہت سے تماشے دیکھ چکا ہوں۔ یہ لوگ صرف اپنا حکم منوانے کے عادی ہوتے ہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کس کا دل ٹوٹا، کس کی آنکھ نم ہوئی۔''

''بیٹا، تو ٹھیک کہتا ہے لیکن ہم اس نظام کا حصہ ہیں۔ ہم اس سے نہیں ٹکرا سکتے۔ تیری خالہ...... میری بڑی بہن اس نظام سے ٹکرائی تھی۔ اس کی لاش بھی نہیں مل سکی تھی حالانکہ وہ چودھری صاحب کی سگی بیٹی تھی۔''

''مجھے معلوم ہے مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ انہیں میری پسند کا خیال رکھنا پڑے گا۔''

''زمانہ کبھی نہیں بدلتا، ہم بدلتے ہیں۔ حویلی میں رہنے والے ابھی نہیں بدلے۔ بڑے دروازے میں چھوٹے لوگ اب بھی داخل نہیں ہوسکتے۔''

''امی، آپ ہی نے کہا تھا کہ آپ مجھے نوراں دلوائیں گی۔''

''میں نے پورا بندوبست کرلیا تھا۔ تیری خاطر جھوٹ بولنے کی تیاری کرلی تھی لیکن نوراں کے نانا نے ایسی شرط رکھ دی ہے کہ بس۔ تو انہیں کہتا کیوں نہیں کہ وہ یہ شرط چھوڑ دیں۔''

''وہ بھی ٹھیک کہتے ہیں اگر شادی کے بعد نانا کو اعتراض ہوا یا شادی کے وقت، نتائج تو پھر وہی سامنے آئیں گے۔ اس کا فیصلہ ابھی ہونا چاہیے۔''

اس کی ماں نے دیکھ لیا تھا کہ ایک طرف اس کی

روایات ہیں اور دوسری طرف اس کے بیٹے کی خوشی۔ اس نے بیٹے کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا۔

”تو اپنے نانا کو لے کر آجا۔ اس کے بعد جو ہوگا اس کا مقابلہ تیری ماں کرے گی۔“

جاوید جانتا تھا کہ چودھری صاحب کو لے کر آنا اتنا آسان نہیں ہوگا لیکن جذبہ صادق ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ وہ نہ صرف گیا بلکہ کسی طرح ہاتھ پاؤں جوڑ کر چودھری ارشاد کو ساتھ لے کر آ گیا۔

”یہ تو مجھے کس اصطبل میں لے جا رہا ہے؟“ چودھری صاحب نے نوراں کے گھر کے سامنے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

”یہ اصطبل نہیں، میری سسرال ہے۔“

”تو یہاں شادی کر رہا ہے۔ اپنا معیار تو دیکھا ہوتا۔ تو چودھری ارشاد کا نواسا ہے۔“

”لڑکی مجھے پسند تھی۔“

”جاگیردار، لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے، انہیں استعمال کرتے ہیں۔ کیسا مرد ہے تو، ایک لڑکی کے لیے خاندانی وقار کو داؤ پر لگا دیا اور اس میں مجھے بھی شریک کرنا چاہتا ہے۔ میں نے زندگی میں ایسے گھروں میں رہنے والوں کو منہ نہیں لگایا، اب کیا بات کروں گا۔“

”نانا جانی! آپ اندر تو چلیں، پھر چاہے انکار کر دینا۔“

”میری طرف سے انکار ہی سمجھ۔ تیرے کہنے سے اندر بھی چلا جاتا ہوں۔“

ان کی طرف سے اجازت ملتے ہی اس نے دروازے پر دستک دے دی۔ دروازے پر نوراں آئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا ضرور لیکن فوراً ہی اندر بھاگ گئی۔ جاوید نے باہر کھڑے رہنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں چودھری صاحب کا ارادہ نہ بدل جائے۔ اس نے دروازہ پھلانگا۔ گھر اس کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔ انہیں بٹھا کر باہر نکلا تو فیض محمد اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

”تم نوراں کو لے کر کہیں چلے جاؤ۔ آدھے گھنٹے بعد آجانا۔ میں چودھری صاحب سے اکیلے میں بات کروں گا۔“

وہ چودھری جس کے سامنے فیض محمد کھڑے ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، اس کے ڈرائنگ روم میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں جاوید کو گالیاں تو ضرور دے رہا تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہاں بیٹھ کر وہ خود ایک گالی بن گیا ہے۔ اس نے سر کھجانے کے لیے پگڑی اتار کر میز پر رکھی تھی کہ فیض محمد نے کمرے میں قدم رکھا۔ چودھری نے جیسے ہی دیکھا کہ کوئی کمرے میں داخل ہوا ہے، وہ ننگے سر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی عزت میز پر دھری رہ گئی تھی۔ اس نے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر یہ ہاتھ راستے ہی میں رک گیا۔ فیض محمد کو پہچاننے میں اسے ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔

”چودھری بیٹھو۔ میرے احترام کے لیے اٹھتے ہوئے تم اچھے نہیں لگتے۔“

چودھری یوں بیٹھ گیا جیسے غلطی سے اٹھ گیا ہو۔ بیٹھتے ہی پگڑی پر ہاتھ گیا۔ پگڑی اٹھا کر فوراً سر پر رکھ لی۔ فیض محمد اس کی بدحواسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”فیض محمد!“ چودھری کی آواز میں پہلے سا دم خم نہیں تھا۔ ”کوا اگر اپنے پروں پر سفیدی مل لے تو بگلا نہیں بن جاتا۔ شہر میں آ کر اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تمہاری اصلیت چھپ گئی ہے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔“

”میں نے کوئی سفیدی نہیں ملی ہے چودھری۔ میں وہی فیض محمد ہوں۔“

”تم نے عزت دار بننے کے لیے میرے نواسے کو جال میں پھانسا ہے۔ تمہاری بیٹی صغرا میرے گھر کے برتن مانجھتی تھی اور غالباً اسی کی بیٹی نوراں کو تم میری بہو بنانے پر تلے ہوئے ہو۔“

فیض محمد ابھی تک یہ سوچے بیٹھا تھا کہ چودھری کا غصہ ذرا اترے گا تو وہ اس کے پاؤں پکڑ کر نوراں کی خوشی مانگ لے گا لیکن چودھری نے صغرا کا طعنہ دے کر اسے طیش دلا دیا۔

”ہاں، نوراں اسی صغرا کی بیٹی ہے جس کی جائداد پر تم قابض ہوئے تھے۔ جاوید جب یہاں آیا تھا تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ تمہارا نواسا ہے۔ میں نے تو اس کے کسی بڑے کو بلایا تھا۔ جواب میں تم آئے ہو۔ چودھری، تمہارے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے لیکن میں خوں بہا لینے کو تیار ہوں۔ تم نوراں کو عزت کے ساتھ لے جاؤ، میں تمہیں معاف کرنے کو تیار ہوں۔“

”فیض محمد، تم میری رعایا تھے، رعایا رہو گے۔“

”دیکھو چودھری، ہم اپنی زندگیاں گزار چکے۔ اب بچوں کی خوشیوں کا سوال ہے۔ ہم اپنی اپنی انا کو بالائے طاق رکھ کر ان بچوں کو آپس میں ملا دیں تو ہماری روحوں کو سکون ملے گا۔“

”فیض محمد! مخمل میں ٹاٹ کے پیوند نہیں لگا کرتے۔ مجھے تو یہ سوچ کر ہی گھن آ رہی ہے کہ میں، چوہدری ارشاد تمہارے گھر میں بیٹھا ہوں۔“

اب فیض محمد کو بھی طیش آ گیا تھا۔ ”چودھری، یہ ہے تمہاری چودھراہٹ کہ قسمت تمہیں میرے دروازے پر لے آئی ہے۔ تم بھکاری کی طرح بھیک مانگنے آئے ہو۔ یہ دینے والے کی مرضی کہ تمہیں بھیک دیتا ہے یا نہیں۔ جاؤ، میں تمہیں بھیک نہیں دیتا۔ میں نے یہ چاہا ضرور تھا کہ تمہارے ہاتھ پر کچھ نہ کچھ رکھ دوں لیکن تم بے توفیق ہو۔ میرے ہی نہیں اپنے نواسے کے بھی دشمن ہو۔ اب تم اتنے کمزور ہو گئے ہو کہ بچوں سے لڑنے لگے ہو۔ مجھے اپنی نواسی کی طرح تمہارے نواسے کی خوشی بھی عزیز ہے لیکن جب تک تم زندہ ہو یہ رشتہ طے نہیں پا سکتا۔ تمہارے مرنے کے بعد اگر جاوید رشتہ لے کر آیا تو شاید میں سوچوں گا۔ تم ابھی زندہ ہو چودھری، اس لیے میری طرف سے انکار سمجھو۔ میں نوراں کا گلا گھونٹ دوں گا لیکن تمہاری موجودگی میں نوراں کی شادی تمہارے نواسے سے نہیں کر سکتا۔ غیرت ہے تو کل کے مرتے آج مر جاؤ۔“

چودھری بولنا بھول گیا تھا۔ کہتے ہیں مرنے سے پہلے دانہ پانی اٹھ جاتا ہے۔ چودھری کا بولنا، منہ کھولنا اٹھ گیا تھا۔ شاید اس کی زندگی کا یہ پہلا سانحہ تھا جب کوئی اس سے بلند آواز میں بول رہا تھا۔

بڑے بول کی شکست ہی موت ہوتی ہے۔ فیض محمد نے یہ شکست اسے دے دی تھی۔ چودھری انکار سننے کا عادی نہیں تھا اور فیض محمد اس کے سامنے انکار کر رہا تھا۔

فیض محمد کو اب اور کچھ نہیں کہنا تھا۔ وہ چودھری کو وہیں چھوڑ کر اٹھ گیا۔ اسے اب جاوید کا انتظار تھا کہ وہ آئے اور اس لاش کو یہاں سے اٹھا کر لے جائے۔

جاوید کی گاڑی آ کر رکی۔ پہلے نوراں اندر آئی پھر جاوید گھر میں داخل ہوا۔ دونوں کی نظریں فیض محمد پر جمی ہوئی تھیں۔

”کیا ہوا انکل! کیا کہا نانا نے؟“

”تم انہیں لے کر جاؤ تو راستے میں پوچھ لینا۔ ہو سکے تو مجھے بھی بتا دینا۔“

”انکل، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔ اگر انہوں نے انکار بھی کیا تو میں اپنے فیصلے پر اٹل ہوں۔“

”وہی کرنا جو تمہارے بڑے کہیں۔ جاؤ بیٹا! اپنے نانا کو لے جاؤ۔“ فیض محمد نے کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

چودھری ڈرائنگ روم سے نکلا تو جاوید کا سہارا لیے ہوئے اس طرح چل رہا تھا جیسے اس کے پاؤں اس کا ساتھ نہ دے رہے ہوں۔

نوراں نے آگے بڑھ کر سلام کرنا چاہا تو چودھری نے ایسی قہر آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گئی۔

☆☆☆

”نانا، میں پوچھ سکتا ہوں آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“

”میں نے مکان دیکھ کر مکینوں کا اندازہ کر لیا تھا۔ یہ شخص جس کا نام فیض محمد ہے بس اتنی عزت رکھتا ہے کہ تیرے دونوں بڑے بھائیوں کو پڑھانے حویلی آیا کرتا تھا۔“

”اس سے بڑی عزت اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”عزت کیسی، ملازم تھا میرا، فیس لیتا تھا۔“

”فیس تو سبھی لیتے ہیں۔“

”یہ لڑکی جسے تو اپنی بیوی بنا کر لانا چاہتا ہے، اس کی ماں تیری ماں کے سر میں تیل ڈالا کرتی تھی۔“

”پھر تو نوراں بھی اپنی ماں کی طرح خدمت گزار ہوگی۔ میری ماں کی خدمت کرے گی۔“

”ہمارے ٹکڑوں پر پلتے تھے یہ لوگ۔“

”ہر جاگیردار یہی سمجھتا ہے۔ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں آپ کا اب کیا فیصلہ ہے؟“

”میں اس شادی کے حق میں نہیں ہوں اور تجھے میرا فیصلہ ماننا ہوگا۔“

”میں نوراں سے وعدہ کر چکا ہوں۔“

”تو میری حکم عدولی کرے گا؟“

”آپ مجھے اس گستاخی کا موقع فراہم نہ کریں۔ ہر انسان برابر ہوتا ہے۔ کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔ میری تعلیم نے مجھے یہی بتایا ہے۔ میرا مذہب بھی یہی کہتا ہے۔ بڑا وہ ہے جس کا کردار بڑا ہے۔ اس اعتبار سے فیض محمد ہم سے بڑے ہیں۔ ہم نے دوسروں کی محنت کی کھائی ہے، انہوں نے اپنی محنت سے کمایا ہے۔ جاگیردارانہ مجبوریوں نے آپ کو خدا بننا سکھایا ہے، وہ اللہ کے عاجز اور شکر گزار بندے ہیں۔“

”میں تیری شادی نوراں سے نہیں ہونے دوں گا۔“

”میں نوراں کے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گا۔“

”حویلی میں جنم لینے والے قصوں کا تمہیں کوئی علم نہیں؟“

”کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ ایک قصے کا اور اضافہ ہو جائے گا۔“

☆☆☆

اب وہ قصبے میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں چودھری

ارشاد کا حکم چلتا تھا۔ جاوید کو اس خطرے کا احساس تھا۔ راستے میں چودھری سے اتنی تکرار ہو چکی تھی کہ اب وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتے تھے۔ اسے ابھی حویلی میں بھی جانا تھا جو چودھری کی راج دھانی تھی۔ دور کیا تھی، حویلی وہ سامنے کھڑی تھی۔ وہ حویلی کے دروازے پر ہی رک گیا۔ دروازہ کھل گیا تھا مگر اس نے گاڑی کو باہر ہی روک لیا۔ اسے معلوم تھا اندر ایک تہ خانہ بھی ہے۔

"نانا جان، رات ہوگئی ہے۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔ آپ حویلی میں جائیں۔"

"تو نہیں اترے گا؟" چودھری نے اترتے ہوئے کہا۔

"میرا شمار اب چھوٹے لوگوں میں ہوتا ہے۔ حویلی کا دروازہ بہت بڑا ہے۔"

"اپنی ماں سے کہنا اب وہ بھی بہت چھوٹی ہوگئی ہے۔ میری حویلی کے دروازے بہت بڑے ہیں۔" انہوں نے کہا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

حویلی کی روشنیوں نے قطار باندھ کر چودھری کا استقبال کیا۔ ملازموں نے سہارا دیا اور اسے اندر لے گئے۔ نوکروں نے پوچھا بھی کہ کس بیگم کے کمرے میں آرام فرمائیں گے لیکن اس نے کہا کہ اسے ملاقاتیوں کے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔ یہ آراستہ کمرا اسے بہت پسند تھا۔ کیسے کیسے لوگوں سے یہاں ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ نازنین چہری جمال اسی کمرے میں آتی رہی تھیں۔ حکم ہوا کہ رات کا کھانا یہیں پہنچا دیا جائے۔ وہ کچھ دیر بیٹھا رہا پھر تکیے پر سر رکھ دیا۔

وہ سوچ رہا تھا، جب رعایا بغاوت پر اتر آئے تو حکومتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ آج جس طرح جاوید نے اس سے بات کی تھی، وہ بغاوت ہی تو تھی۔ وہ بہت دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ پھر فیض محمد کے گھر ہونے والی گفتگو یاد آئی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا، ہم اپنی زندگی گزار چکے، اب بچوں کو خوشیاں بانٹنے کا وقت ہے، تو کیا کروں......؟ اسے شادی کی اجازت دے دوں؟ صغرا کی بیٹی کو قبول کرلوں؟ یہ تو میری شکست ہوگی۔ مجھے اپنی شکست قبول مگر یہ تو چودھری ارشاد کی شکست ہے، نہیں ہرگز نہیں۔ میرے انکار کے بعد بھی جاوید نے شادی کرلی تو یہ بھی میری شکست ہوگی۔ چودھری ارشاد کے حکم سے کوئی سرتابی کرے اور سزا سے بچ جائے، ایسی عظیم شکست! میں سزا دوں تو کسے، اپنے نواسے کو' سزا نہ دوں تو میری شان و شوکت......؟ اگر فیض محمد نے اپنا قول پورا کیا تو کیا ہوگا؟ اس نے کہا ہے جب تک میں زندہ ہوں، ان بچوں کی شادی نہیں ہوسکتی۔ کیا خبر میں کب مروں۔ مجھے جاوید کی خوشی بھی تو عزیز ہے۔ دنیا سمجھتی ہے چودھری کے سینے میں دل نہیں مگر مجھے اپنی شان و شوکت بھی تو عزیز ہے۔ اپنے دل کو مار کر اپنے غرور کا بھرم رکھنا بھی تو میرے نظام نے مجھے سکھایا ہے۔ میں جاگیردار ہوں، میں مر تو سکتا ہوں لیکن اپنی روایات سے انحراف نہیں کرسکتا۔ میں جب تک زندہ ہوں اپنے نظام کی حفاظت کروں گا۔ مر گیا تو الگ بات ہے۔ میرے بعد میری بلا سے میری نسل میں ٹاٹ کا پیوند لگے یا مخمل کا۔

ملازم کھانا لے آیا تھا۔ اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کچھ دیر وسیع کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر بستر پر لیٹ گیا۔ سوچنے کو اب بھی بہت کچھ تھا لیکن اس نے کسی سوچ کو قریب نہیں آنے دیا۔

آدھی رات سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ قصبہ سو چکا تھا۔ سڑکوں پر لگے بلب جاگ رہے تھے۔ حویلی کسی آسیب کے حصار میں آئی ہوئی تھی۔ چودھری بستر سے اٹھا۔ اس طرح تیار ہوا جیسے کہیں باہر جانے کی تیاری ہو۔ پگڑی سر پر رکھی اور کمرے سے نکل گیا۔ پیدل چلتے ہوئے چھت پر جانے والے زینے تک گیا اور زینہ چڑھ گیا۔ اپنی پگڑی اتار کر ایک اونچی جگہ رکھ دی اور چھت سے سڑک پر کود گیا۔ کسی چیخ نے کسی کو نہیں جگایا۔

صبح قصبے کے لوگ باہر نکلے تو کسی انسانی لاش کو کتے بھنبھوڑ رہے تھے۔ لوگ قریب پہنچے تو چیخیں بلند ہوگئیں۔ "ارے، یہ تو چودھری ارشاد ہیں۔ کسی نے دھکا دیا یا پاؤں پھسلا؟"

جاوید حویلی سے واپس آیا تو رات زیادہ ہوگئی تھی۔ صبح ہوتے ہی وہ نوراں کے گھر گیا۔ فیض محمد سے اپنا عزم پھر دہرایا۔

"نانا نے انکار کردیا ہے لیکن میں اور میرے گھر والے اس شادی پر تیار ہیں۔ آپ تیاری کریں۔ حویلی کے دروازے اب ہم پر بند ہو چکے ہیں۔"

وہ یہ اطلاع دے کر گھر آیا ہی تھا کہ مراد نگر سے چودھری ارشاد کی موت کی اطلاع آگئی۔ یہ اطلاع فیض محمد تک بھی پہنچ گئی۔

اب نوراں اور جاوید کی شادی میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔

● ●
● ●